پاکستان کی سیاسی تاریخ 4

جناح لیاقت تضاد اور پنجابی مہاجر تضاد

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ
جلد 4

جناح ۔ لیاقت تضاد

اور

پنجابی ۔ مہاجر تضاد

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

اس کتاب کے کسی بھی حصے کی کسی بھی شکل میں دوبارہ اشاعت کی اجازت نہیں ہے۔ باقاعدہ قانونی معاہدے کے تحت جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں۔ کتاب کا کسی بھی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مرتب سے قبل ازیں اجازت ضروری ہے۔ بصورت دیگر مرتب قانونی چارہ جوئی کا حق محفوظ رکھتا ہے۔

دوسرا ایڈیشن

ISBN 978-969-9806-26-1

© جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ ہیں

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42-35183166
E-mails: hjzaidi@gmail.com
khalidmehboob@tehqeeq.org
Website: www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: 2013ء

قیمت: -/450 روپے

قیمت بیرون ملک: $ 25/-

فہرست

دیباچہ ایڈیشن دوم

آج سے 22 برس پیشتر جب پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا تب لفظ ''تضاد'' کا وہ مطلب عام فہم تھا جس کے لئے یہ لفظ اس کتاب کے عنوان میں دیا گیا تھا۔ کیونکہ اسوقت سیاسی تجزیوں میں کہیں نہ کہیں جدلیاتی سائنس کارفرما ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب اس کا وہی عامیانہ مطلب سمجھا جاتا ہے جس سے مراد کسی شخصیت کا دوغلا پن یا متضاد رویہ کا اظہار لیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب پہلے تو لفظ ''تضاد'' کے اُس مفہوم کا اعادہ کرنا ضروری ہے جو اس کتاب کے عنوان میں لیا گیا ہے۔ یہاں ''تضاد'' کے لفظ سے دو یا زیادہ قوتوں کے مابین جدلیاتی ٹکراؤ مراد ہے۔ یہ قوتیں دو شخصیتوں کی صورت میں یا قومیتوں یا قوموں یا طبقوں کی صورت میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو سکتی ہیں۔

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح اور ملک کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کے درمیان تضاد کی بات جب 22 برس پہلے کی گئی تھی تو بہت کم لوگ اس سے واقف تھے لیکن اس کتاب کی اشاعت کے بعد بہت سے حلقے اس کا برملا اعتراف اور اظہار کرنے لگے اور اب تو اس حقیقت کا تحریروں اور ٹی وی ٹاک شوز میں کھل کر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ یہ دو شخصیتوں کا نہیں بلکہ دو طبقوں کا تضاد تھا۔ ایک جناح کی شکل میں جدید بورژوا جمہوری طبقہ جو پاکستان میں بہت محدود تھا اور دوسرا لیاقت کی شکل میں زوال پذیر جاگیردار طبقہ جو اقتدار کے ایوانوں میں اکثر و بیشتر بالادست حیثیت کا حامل رہا۔

دوسرا تضاد جس پر اس کتاب کا زیادہ حصہ مشتمل ہے وہ ہے پنجابی شاونزم اور مہاجر

شاونزم کا تضاد۔ جب 1990ء میں یہ کتاب شائع ہوئی تو ایم۔کیو۔ایم کراچی اور حیدرآباد میں ایک بھرپور قوت کے ساتھ اُبھر کر سامنے آچکی تھی۔ اُدھر پنجابی شاونزم کی قوتیں ضیاء الحق کے گیارہ سالہ مارشل لاء کے دور میں ایک عفریت بن کر ملک کے طول وعرض پر اپنا شکنجہ مضبوط کرچکی تھیں کیونکہ ملک کی اسٹیبلشمنٹ کا بڑا حصہ اس شاونزم کی نمائندگی کرتا تھا۔ گزشتہ 22 برس میں پنجابی شاونزم اور مہاجر شاونزم کی قوتوں نے بعض موقعوں پر دوسری قومیتوں کے خلاف عارضی اتحاد بھی کئے لیکن بالعموم ان کے مابین محاذ آرائی رہی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کراچی شہر تمام قومیتوں کے شاونزم کے ٹکراؤ کی جنگ وجدال کا اکھاڑہ بن چکا ہے۔ ہر روز لاشیں گر رہی ہیں، ہر شاونسٹ قوت کا اپنا ایک مافیا، ایک بھتہ خور اور ایک قبضہ گروپ ہے جس کی اپنی اپنی ریاست ہے جہاں اصل ریاست کا کوئی کنٹرول نہیں ہے۔

جن تضادات پر یہ کتاب روشنی ڈالتی ہے ان کے بارے میں اب تک کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ ان حالات میں اس کتاب کی افادیت پہلے سے بھی کہیں زیادہ ہوگئی ہے کہ یہ اُن قوتوں کی نشاندہی کرتی ہے جنہوں نے ابتدا ہی میں ان جھگڑوں کے بیج بو دیئے تھے جن کی فصل ہم آج کاٹ رہے ہیں اور نہ جانے اگلی کتنی نسلیں اس میں کٹتی رہیں گی۔ اگر یہ متحارب قوتیں اپنے شاونزم کا ڈنک نکال کر پرامن بقائے باہمی اور ایک دوسرے کے جیو اور جینے دو کے حق کو تسلیم کرکے مفادات کی تقسیم پر کوئی باہمی سمجھوتہ کرلیں تو شاید امن کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

ہم تاریخ کے بھاری بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب ہمیں اس بوجھ سے آزاد کرنے میں کچھ معاون ثابت ہوسکے گی۔

حسن جعفر زیدی

15رفروری 2013ء

دیباچہ ایڈیشن اوّل

پاکستان کیسے بنا؟......اور بننے کے بعد بھارت کے ساتھ قومی تضاد کی نمود اور مسئلہ کشمیر کا گزشتہ جلدوں میں احاطہ کیا جا چکا ہے۔ پاکستان کے خارجی تضاد کے تذکرے کے بعد اب ہم ان داخلی تضادات کی سرگزشت بیان کرتے ہیں جو روز اول سے ہمارے ملک کو درپیش ہو گئے تھے یہ تضادات حکمران طبقوں کے مابین بھی تھے اور اس ملک میں بسنے والی مختلف قومیتوں کے درمیان بھی۔ ہماری سیاسی تاریخ کے مدوجزر انہی تضادات کی لہروں سے اٹھتے رہے ہیں اور آج جو تلاطم بپا ہے اس کی تہہ میں بھی یہی تضادات پنہاں ہیں۔ ان تضادات کے تاریخی پس منظر سے واقفیت آج کی صورت حال کا تجزیہ کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے اور یوں ان تضادات کے حل کی کوئی راہ بھی دکھا سکتی ہے۔

ہمارے ہاں سمجھا جاتا ہے کہ تاریخ محض اسلاف کے کارناموں کا بیان ہے۔ ہم نے کبھی تاریخ کو سائنس کا درجہ نہیں دیا اور کبھی اپنے ماضی کا معروضی تجزیہ نہیں کیا۔ ہمارے ہاں تاریخ عقیدے کا درجہ رکھتی ہے۔ اسلاف فقط کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ان کے مابین کبھی کوئی تضاد نہیں ہوتا، اگر کوئی تضاد تھا تو بھی اس کا تذکرہ ان کی توہین کے مترادف گردانا جاتا ہے۔ تاریخ کے بارے میں اس دقیانوسی رویے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج ان تضادات کے تاریخی پس منظر سے ناواقف ہیں جو ہمارے سیاسی جسم میں سرطان کی طرح سرایت کر چکے ہیں۔ اس کا تریاق یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کا بے رحم تجزیہ روز اول سے کریں۔

ملک کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کی عزت اور احترام پر کوئی حرف نہیں آتا ہے

اگر ان کے بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کے ساتھ تضاد کی تلخ حقیقت کو بیان کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف تاریخ کے سنجیدہ طالب علموں کا بھلا ہوگا بلکہ عوام الناس بھی بہت کچھ سمجھ لینے کے قابل ہو جائیں گے۔ یہ محض دو شخصیتوں کے مابین تضاد نہیں تھا، اس کی بنیاد طبقاتی تھی اور اس حوالے سے ان کے اندازِ فکر میں اختلاف پایا جاتا تھا۔ قائداعظم جناح کا طبقاتی پس منظر بورژوا تھا جبکہ لیاقت علی خان یو۔ پی کے زوال پذیر جاگیردارانہ پس منظر کا حامل تھا۔ بعدازاں پاکستان کی سیاست میں ابھرتے ہوئے تجارتی سرمایہ دار طبقے اور زوال پذیر جاگیردار طبقے کے مابین بڑا شدید تضاد کارفرما رہا ہے۔ اس کی بدولت ملک کئی مرتبہ شدید سیاسی بحرانوں کا شکار ہوا اور بعض بڑی سیاسی تبدیلیاں اسی تضاد کی مرہون منت رہی ہیں۔ فرق صرف یہ رہا ہے کہ جناح ایک آزاد خیال بورژوا تھے اور ملک کی سیاست، معیشت اور ثقافت کو سیکولر انداز سے جدید اور ترقی پسندانہ خطوط پر استوار کرنا چاہتے تھے جبکہ بعد میں سرمایہ دار اور تاجر طبقے کے نمائندوں نے رجعت پسندی، فوجی آمریت اور کٹھ ملائیت کو اپنے سیاسی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ ان میں غالب اکثریت پنجابی شاونسٹوں کی ہے جو ٹھوس تاریخی وجوہ کی بنا پر مذہبی نعروں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان تاریخی وجوہ کا بھی آگے چل کر جائزہ لیا جائے گا۔

شاونزم سے کیا مراد ہے؟ جب کوئی گروہ یا قوم یہ سمجھ بیٹھے کہ دنیا کی تمام خوبیاں اس میں سمٹ آئی ہیں اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنا ان کا پیدائشی حق ہے، مزید برآں وہ جس قدر شدت سے خود کو بالاتر اور بالادست سمجھے اسی شدت سے دوسروں سے نفرت اور تعصب کے جذبات بھی رکھتا ہو تو اس گروہ یا قوم کے بارے میں کہا جائے گا کہ وہ شاونزم کا شکار ہے۔ یہ فرانسیسی اصطلاح نپولین کے ایک سپاہی نکولس شاون (Nicolas Chauvin) کے نام سے شروع ہوئی جو اپنے آقا کی اندھی تقلید اور دوسروں کے خلاف جارحانہ تعصب کے اظہار میں اس انتہا تک پہنچ گیا تھا کہ اس پر اس کا مذاق اڑایا جانے لگا تھا۔ انیسویں صدی میں اس اصطلاح کا مطلب جارحانہ قوم پرستی اور جنگجویانہ تعصب تک محدود تھا لیکن بیسویں صدی میں اس کے معنی زیادہ عمومی اور وسیع ہوتے گئے یہاں تک کہ تنگ نظر مفاد پرستی اور تعصب کے اظہار کا قومی، علاقائی، نسلی، قبائلی، لسانی، گروہی بلکہ جنسی حوالہ بھی اس سے موسوم کیا جانے لگا مثلاً مردانہ شاونزم وغیرہ۔ اردو میں عصبیت کا لفظ کسی حد تک شاونزم کا مفہوم ادا کرتا ہے لیکن زیادہ جامع اظہار کے

لئے شاونزم کے متبادل کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے زیر نظر جلد میں جہاں کہیں شاونزم کا مفہوم ادا کرنے کی ضرورت پڑی، لفظ شاونزم ہی استعمال کیا گیا ہے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد اپنی برتری جتا کر جن گروہوں نے زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کی ان میں مہاجر اور پنجابی دونوں پیش پیش تھے۔ بنگالی، سندھی، پٹھان اور بلوچ ان سے پیچھے رہ گئے تھے۔ مہاجروں میں جہاں لٹ پٹ کر آنے والے نچلے اور درمیانے طبقے کی اکثریت تھی وہاں بڑے جاگیردار اور تعلقہ دار بھی تھے جو پاکستان میں ''بہتر مواقع'' کی وجہ سے جہازوں میں بیٹھ کر کراچی پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ سرکاری محکمے جو پاکستان کو منتقل ہوئے تھے ان میں اعلیٰ افسروں سے لے کر نچلے اہلکاروں تک مہاجرین کی اکثریت تھی۔ ان میں سے بیشتر برخود غلط تھے اور خود کو دنیا کی اعلیٰ ترین تہذیب کا نمائندہ قرار دیتے تھے اور پاکستان کے مقامی لوگوں کو گنوار، ڈھگے اور چوپائے جیسے القاب سے نواز کر ان سے نفرت اور حقارت کا اظہار کرتے تھے۔ وہ انہیں رعیت گردانتے ہوئے اس نئے ملک پر اپنی حکمرانی کا خواب دیکھتے تھے۔

دوسری طرف پنجاب کے ابھرتے ہوئے درمیانے طبقے کے عزائم بھی بہت اونچے تھے۔ ہندو اور سکھ، جو ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ تھے، ان سے آزادی حاصل کرنے کے لئے انہوں نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اب ہندوؤں اور سکھوں کے چلے جانے سے یہاں جو مواقع خالی ہوئے تھے، ان پر مہاجر دعویدار بن کر آ گئے تھے۔ پنجاب میں تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان ملازمتیں چاہتے تھے، جبکہ وہ جو ملازمتوں میں تھے وہ راتوں رات ترقی کر کے اعلیٰ افسر کی اس سیٹ پر پہنچنا چاہتے تھے جو ہندو، سکھ یا انگریز خالی کر کے گیا تھا۔ پنجاب میں اس صدی کے اوائل میں جو وسیع آبادکاری ہوئی تھی اس کے نتیجے میں مشرقی پنجاب سے سکھوں کے علاوہ بڑی تعداد میں مسلمان آبادکاروں کی مغربی پنجاب میں نقل مکانی عمل میں آئی تھی۔ وہ زیادہ تر کاشتکار اور چھوٹے زمیندار تھے اور بہت کم ایسے تھے جو آڑھت اور کاروبار میں موجود تھے۔ منڈیوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی اجارہ داری تھی۔ ان کے جانے کے بعد پنجابی مسلمان، آڑھت، منڈی اور کاروبار پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنا چاہتا تھا اور بڑی حد تک قبضہ کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔ غیر مسلموں کے چلے جانے کے بعد پولیس اور مسلح افواج میں ان کو ویسے ہی

بالادستی حاصل ہوگئی تھی۔ اس بنیاد پر پنجابی مسلمانوں میں جاگیرداروں کے علاوہ متذکرہ طبقوں کا دل بھی اس نئے ملک پر حکمرانی کے لئے مچل رہا تھا۔ یہی ان کے شاونزم کی بنیاد تھی۔ مگر ''بھیئے'' آ گئے۔ چنانچہ انہوں نے بھی انہیں ''تلیئر''، ''بھگوڑے''، ''پناہ گیر'' اور کئی حقارت آمیز القابات سے نوازا۔ تضاد نا گزیر ہوا اور محاذ آرائی شروع ہوگئی جو لیاقت علی خان کے قتل پر منتج ہوئی۔

زیرنظر جلد میں اس تضاد کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ہمارے ملک کی سیاسی تاریخ پر جتنا گہرا اثر پنجابی شاونزم کا رہا ہے شاید ہی کسی اور عنصر نے اتنا اثر ڈالا ہوگا۔ مارشل لاؤں کا طویل دورانیہ بھی اس کا شاخسانہ ہے۔ پنجابی شاونسٹوں اور مہاجر شاونسٹوں کے درمیان تضاد ان ادوار میں شدید تر ہوا جب ان میں سے کوئی ایک کلی اقتدار کا مالک بن گیا۔ مہاجروں کو یہ موقع لیاقت علی خان کی صورت میں اور پنجابیوں کو یہ موقع غلام محمد، چودھری محمد علی، ایوب خان اور ضیاالحق کی صورت میں حاصل ہوا۔ لیکن پنجابی شاونسٹوں اور مہاجر شاونسٹوں میں اس وقت فوراً ملاپ ہوجاتا رہا ہے جب کبھی کسی تیسری قومیت نے سر اٹھایا اور حصول اقتدار کے یا تو قریب پہنچ گئے یا اس کا کوئی فرد اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کے کسی فرد کو بطور کٹھ پتلی اقتدار دے کر اس قومیت کا منہ بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان میں خواجہ ناظم الدین، مولوی تمیز الدین، محمد علی بوگرہ، حسین شہید سہروردی، نورالامین اور محمد خان جونیجو جیسے کمزور لوگ بھی تھے اور شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو جیسے شہ زور بھی۔ وہ جو کمزور تھے آسانی سے رخصت کر دیئے گئے، مگر جو شہ زور تھے ان کا انجام برا ہوا۔ حال ہی میں ضیاء الحق کے دور میں مہاجروں کا پنجابیوں کے خلاف شدید تضاد تھا لیکن حالیہ دور میں سندھی قوم پرستی کی لہر کے مدمقابل ان دونوں کا متحدہ محاذ قائم ہو گیا ہے جیسا کہ اس سے پیشتر بنگالیوں کے خلاف قائم رہ چکا ہے۔

زیرنظر جلد کے ماخذوں میں، دوسری دستاویزات، کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے علاوہ ایک ماخذ کا استعمال نسبتاً کثرت سے کیا گیا ہے اور وہ ہے لاہور کا روزنامہ نوائے وقت۔ اس کی تاریخی وجہ ہے اور وہ یہ کہ یہ اخبار اسلام کی آڑ میں پنجابی شاونزم کی جس جارحانہ انداز میں کھل کر ترجمانی کرتا رہا ہے اور جس کی بدولت اسے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک خاص حیثیت حاصل رہی ہے یہ حیثیت کسی اور اخبار کو حاصل نہیں رہی۔ یہاں یہ بھی وضاحت ضروری ہے کہ پنجاب کے وسیع تر عوام الناس پر پنجابی شاونزم کا غلبہ نہیں...... پنجاب میں مخصوص مفادات

کے گروہ ہیں جو پنجابی شاونزم کا شکار ہیں۔

اس جلد کا مواد لائبریریوں سے جمع کرنے میں سمیع اللہ ظفرؔ اور خالد محبوب نے میری معاونت کی۔ حسب سابق اشاریہ بھی خالد محبوب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس تحقیقی منصوبے کے محرک ڈاکٹر مبشر حسن صاحب نے بھی بھرپور معاونت کی۔ انہوں نے مسودے کو پڑھا اور بعض قیمتی مشورے بھی دیئے۔ ان کے علاوہ جن احباب کا دست شفقت اور تعاون ہمہ وقت دراز رہا ان میں میاں دلاور محمود صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، صدیق درانی صاحب، صفدر قریشی صاحب، خورشید عالم صاحب، اورنگ زیب صاحب اور حسین نقی صاحب شامل ہیں۔ ان سب کی ہمت افزائی نے ہی مجھے آگے کی منزلیں طے کرنے کا حوصلہ دیا ہے۔

مصطفیٰ وحید صاحب کے حوصلے بھی بڑے بلند ہیں۔ وہ جس ذوق وشوق اور محبت سے اس کام کو طباعت واشاعت کے مراحل سے گزار رہے ہیں، اس کو دیکھ کر ان کے جذبوں کو داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ اس سلسلے میں نعیم احسن صاحب اور آصف جاوید صاحب کی کوششیں بھی قابل ستائش ہیں۔

جن لائبریریوں کے عملے نے زیر نظر جلد کے لئے مواد کے حصول میں تعاون کیا۔ ان میں پنجاب پبلک لائبریری لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، برٹش کونسل لائبریری لاہور، ادارہ قومی دستاویزات پاکستان، اسلام آباد شامل ہیں۔ جناب کے۔ کے۔ عزیز صاحب کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے بعض اہم دستاویزات کی فراہمی میں میری مدد کی۔

قارئین نے جس علمی ولولے کے ساتھ گزشتہ جلدوں کی پذیرائی کی ہے اس پر بے حد ممنون ہوں کہ انہی سے مجھے مستقبل کے لئے تحقیق وتالیف کے صبر آزما عمل سے گزرنے کا حوصلہ ملا ہے۔

8/جولائی، 1990

حسن جعفر زیدی

لاہور

جزوِ اوّل

جناح۔لیاقت تضاد اور جناح کا انتقال

باب: 1

نوزائیدہ پاکستان کی جغرافیائی، تاریخی اور معاشی صورت حال

جب پاکستان کے قیام کے دو دن بعد 16/اگست 1947ء کو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بین الاقوامی سرحد بندی کے لئے برطانوی سامراج اور ہندوستانی توسیع پسندوں کی ملی بھگت سے مرتب کردہ ریڈ کلف ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو معلوم ہوا کہ برصغیر میں مسلمانوں کی یہ نوزائیدہ ریاست فی الحقیقت کرم خوردہ ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے 30/اکتوبر 1947ء کو لاہور میں اپنی ایک نشری تقریر میں اس ایوارڈ کو نہایت غیر منصفانہ اور ناقابل فہم قرار دیا۔ انہوں نے کہا کہ "بلاشبہ اس عظیم، آزاد و خودمختار مسلم ریاست کی تشکیل میں بہت بے انصافیاں کی گئی ہیں۔ جہاں تک ممکن ہوسکا ہمیں سکیڑ دیا گیا ہے اور جو آخری ضرب لگائی گئی ہے وہ حد بندی کمیشن کا ایوارڈ ہے۔ یہ ایوارڈ غیر منصفانہ، ناقابل فہم اور بے انتہا غلط ہے۔"[1]

برطانوی ایوارڈ کے مطابق پاکستان کو جو علاقہ دیا گیا اس کا کل رقبہ 934818 مربع کلومیٹر تھا۔ اس میں سے مغربی پاکستان تقریباً 85 فی صد علاقے یعنی 794920 مربع کلومیٹر پر مشتمل تھا اور مشرقی پاکستان کا علاقہ صرف 139898 مربع کلومیٹر تھا۔ 1951ء کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک کی کل آبادی 75842000 افراد پر مشتمل تھی جس میں سے 42063000 افراد یعنی 55.5 فی صد، مشرقی پاکستان میں اور بقیہ 33779000 مغربی پاکستان میں رہائش پذیر تھے۔ بالفاظ دیگر مشرقی پاکستان کی فی مربع کلومیٹر اوسطاً آبادی 300 تھی اور مغربی پاکستان میں فی مربع کلومیٹر اوسطاً آبادی صرف 42 تھی۔ ملک کے دونوں

حصوں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ایک علاقے کے لوگوں کو دوسرے علاقے میں جانے کے لئے تقریباً 1900 کلومیٹر ہندوستانی علاقے پر سے پرواز کرنا پڑتی تھی اور بحری جہاز کے 5500 کلومیٹر لمبے سفر میں تقریباً دو ہفتے لگتے تھے۔

جغرافیائی لحاظ سے ملک کے دونوں حصوں کے قدرتی خصائص بھی ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔مغربی پاکستان کے شمال میں کوہ ہندوکش اور کوہ سلیمان کی برف پوش چوٹیاں تھیں۔ان فلک بوس پہاڑوں کے دامن میں پنجاب وسندھ کے میدان اور صحرا تھے۔جنہیں پانچ دریا سندھ، جہلم، چناب، راوی اور ستلج سیراب کرتے تھے۔ یہاں بارش کی اوسط سالانہ شرح 30 سینٹی میٹر تھی۔کراچی میں تقریباً 23 سینٹی میٹر اور لاہور میں تقریباً 50 سینٹی میٹر۔گرمیوں میں سخت گرمی اور سردیوں میں سخت سردی پڑتی تھی۔زراعت کا زیادہ تر انحصار نہری آبپاشی پر تھا۔جو علاقے ان دریاؤں کی نہروں سے سیراب ہوتے تھے ان میں خاصی خوشحالی اور آسودگی تھی۔بڑی فصلیں گندم اور کپاس تھیں۔گنے، چاول، مکئی اور تمباکو کی بھی کاشت کی جاتی تھی۔سنگتروں اور آموں کے باغات افراط سے تھے۔بلوچستان کا علاقہ بہترین انگوروں اور سیبوں کے لئے مشہور تھا اور سرحد میں گنے اور تمباکو کی فراوانی تھی۔غیر منقسم برصغیر کی تقریباً 40 فیصد کپاس مغربی پاکستان کے علاقے میں پیدا ہوتی تھی اس میں امریکی قسم کی بہترین درمیانی لمبائی کے ریشے والی کپاس بھی شامل تھی۔یہاں گندم اتنی زیادہ پیدا ہوتی تھی کہ اسے برصغیر کا اناج گھر کہا جاتا تھا۔ یہاں کی فالتو گندم ہندوستان کے غذائی قلت والے علاقوں حتیٰ کہ انتہائی جنوب میں واقع مدراس تک کو بھیجی جاتی تھی۔

مشرقی پاکستان کی آب و ہوا مرطوب ملکوں کی سی تھی۔اوسطاً 223 سینٹی میٹر سالانہ بارش ہوتی تھی۔بیشتر زمین ہموار اور دلدلی تھی۔تین بڑے دریا گنگا، برہم پتر اور میگھنا اسے سیراب کرتے تھے۔ان کے علاوہ ہزاروں ندیاں تھیں جو سیلابی آبپاشی کے علاوہ آمدورفت کا بھی ذریعہ تھیں۔زمین کی زرخیزی اور گرم مرطوب آب وہوا کے باعث سارا علاقہ سبزہ زار تھا۔بے شمار پھل دار درختوں اور ہری بھری فصلوں کا منظر بہت دلکش دکھائی دیتا تھا۔اہم فصلیں پٹ سن، چائے اور چاول کی تھیں۔گرم ملکوں کے پھل مثلاً کیلا، اناس اور ناریل افراط سے ہوتے تھے۔ دنیا بھر کے سنہری ریشے کی 75 فیصد فصل اور ساری اعلیٰ اقسام اس علاقے میں پیدا ہوتی تھیں۔اس لئے یہ فصل پاکستان کے ابتدائی سالوں میں غیر ملکی زرمبادلہ کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

تاریخی لحاظ سے بھی ملک کے دونوں حصوں میں بڑا فرق تھا۔ مشرقی پاکستان تقریباً دوسو سال تک برطانوی سامراج کی غلامی میں رہا تھا اور وہاں کے عوام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا عہد حکومت بھی دیکھا تھا جس کے دوران کمپنی کے انگریز افسروں، ان کے چھوٹے بڑے ہندو کارندوں اور ہندو زمینداروں نے ایسا ظلم و ستم کیا تھا کہ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ اس کے بمقابلہ مغربی پاکستان کا علاقہ تقریباً ایک سو سال تک انگریزوں کے زیر تسلط رہا تھا۔ جب کمپنی نے اپنی فوجی حکمت عملی کے تقاضوں کی بنا پر اس علاقے پر قبضہ کیا تھا تو اس کے تھوڑی ہی دیر بعد حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی سلطنت کی باگ ڈور براہ راست خود سنبھال لی تھی۔ چونکہ مشرقی پاکستان کے عوام کا عہد غلامی طویل تھا اس لئے ان کی جدوجہد آزادی بھی اتنی ہی طویل اور شدید تھی۔ ان کے مقابلے میں مغربی پاکستان کے عوام کی جدوجہد آزادی کی مدت مختصر تھی اور اس جدوجہد میں بھی بوجوہ کوئی زیادہ شدت نہیں رہی تھی۔ پنجاب کے بعض اضلاع کے ''مارشل'' لوگوں نے فوجی فراہم کر کے 1857ء کے ہنگامہ ''غدر'' کے دوران اور اس کے بعد نہ صرف برصغیر کے اندر بلکہ برصغیر کے باہر بھی برطانوی سلطنت کی توسیع و استحکام میں بہت سے ''کارہائے نمایاں'' سرانجام دیئے تھے۔ اسی لئے پنجاب کو برطانوی سلطنت کا بازوئے شمشیر زن کہا جاتا تھا جبکہ مشرقی پاکستان کے عوام کی وفاداری کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور انہیں ''نان مارشل'' قرار دے کر فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم دونوں حصوں کے عوام میں ایک بات مشترک تھی اور وہ یہ تھی کہ دونوں ہی نے ہندو زمینداروں، سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی غلبہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے بیسویں صدی کے چوتھے اور پانچویں عشرے میں مشترکہ طور پر جدوجہد کی تھی۔ لیکن یہ اشتراک عمل پاکستان کے قیام کے فوراً ہی بعد ختم ہونا شروع ہو گیا اور چند سال بعد اس کے خاتمہ کی رفتار بہت تیز ہو گئی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ محض مذہبی نعرے کے ذریعے مشرقی اور مغربی پاکستان کو اکٹھا نہیں رکھا جا سکتا۔ معدنی وسائل کے لحاظ سے پاکستانی علاقے کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ مشرقی پاکستان معدنی طور پر بالکل خالی تھا البتہ 1947ء سے قبل مغربی پاکستان میں کوئلہ، تیل اور بعض دھاتوں کے ذخائر کی نشاندھی کی گئی تھی لیکن انہیں زیر استعمال لانے کے لئے کوئی خاص کام نہیں ہوا تھا۔ بلوچستان میں جو کوئلہ پایا جاتا تھا، وہ گھٹیا تھا اور اس کی مقدار ملک کی ضروریات کے لئے بہت ناکافی تھی۔ راولپنڈی

ڈویژن کے بعض علاقوں سے سالانہ 6.8 کروڑ لیٹر پٹرول نکالا جاتا تھا لیکن اس چلو بھر کا منافع بھی انگریزوں کی اٹک آئل کمپنی لے جاتی تھی۔ سیمنٹ کے لئے چونا اور پتھر موجود تھا لیکن برطانوی ارباب اقتدار نے اس صنعت کی طرف خاص توجہ دینے کی کوئی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔ نتیجتاً پاکستان کے دونوں حصوں کی معیشت زرعی تھی۔ مشرقی پاکستان کے 95 فیصد لوگ اور مغربی پاکستان کے 85 فیصد لوگ دیہات میں رہتے تھے۔ 48-1947ء میں مشرقی حصے کے غریب کسانوں کا استحصال ہندو زمیندار، بنیئے اور ساہوکار کرتے تھے اور مغربی حصے کے غریب کسان اپنے ہم مذہب جاگیرداروں کے استحصال کا شکار ہوتے تھے۔ صدیوں پرانے جاگیرداری نظام کے باعث زراعت کے طور طریقے بہت پرانے تھے۔''49-1948ء میں یعنی پہلے مکمل مالی سال میں کل قومی آمدنی 18 ارب روپے سے کم تھی اور فی کس اوسط آمدنی تقریباً 230 روپے سالانہ تھی 50-1949ء میں کل قومی سالانہ آمدنی 18 ارب ساٹھ کروڑ روپے تھی۔ جس کا ساٹھ فیصد سے زائد حصہ زراعت سے حاصل ہوا تھا اور فی کس سالانہ آمدنی صرف 237 روپے تھی۔ اکثر لوگ بڑی تنگی سے گذر اوقات کرتے تھے۔ خشک سالی یا سیلاب کے زمانہ میں قحط کا ڈر رہتا تھا۔ تعلیم اور طبی امداد کی سہولتیں ناکافی تھیں۔ زیادہ تر آبادی (87 فیصد) دیہات میں رہتی تھی۔ بمشکل 16 فیصد خواندہ تھے۔''[2]

1947ء میں پاکستان کی صنعتی پسماندگی کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ برصغیر کے کل 14677 صنعتی یونٹوں میں سے پاکستان کے حصے میں صرف 1414 صنعتی یونٹ آئے تھے جن میں مزدوروں کی تعداد 2061000 تھی۔ یہ تعداد برصغیر کے صنعتی مزدوروں کی کل 31418000 تعداد کا 6.5 فیصد تھی۔ تقسیم سے پہلے پورے برصغیر میں مختلف قسم کے بجلی گھروں سے کل 1375000 کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی تھی ان بجلی گھروں میں سے جو تھوڑی سی تعداد پاکستان کے نصیب میں آئی تھی ان سے صرف 72700 کلوواٹ بجلی پیدا ہو سکتی تھی اور بجلی کی اس قوت میں سے مشرقی پاکستان میں نصب شدہ قوت صرف 15600 کلوواٹ تھی۔ پاکستان کے 1414 صنعتی یونٹوں میں سے بیشتر میں سارا سال کام نہیں ہوتا تھا کیونکہ ان میں صرف کپاس اور پٹ سن کی گانٹھیں باندھی جاتی تھیں۔ مشرقی پاکستان کے 335 یونٹوں میں کوئی ریلوے ورکشاپ نہیں تھی اور کوئی انجینئرنگ اور کیمیکل فیکٹری نہیں تھی۔ سیمنٹ کا صرف ایک چھوٹا سا

کارخانہ تھا جس کی مشینری بہت بوسیدہ ہو چکی تھی۔ چائے کے بیشتر باغات پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور پٹ سن کا کاروبار کلکتہ کے ہندو مارواڑیوں اور انگریزوں کے ہاتھوں میں تھا۔ مغربی پاکستان میں تیل اور معدنیات کے اخراج اور کیمیکل کی صنعتوں پر انگریزوں کی اجارہ داری تھی اور بینکنگ کا 90 فیصد کاروبار بھی انگریزوں کے پاس تھا۔ فولاد سازی اور مشین سازی کا کوئی ایک بھی قابل ذکر کارخانہ ملک کے دونوں حصوں میں نہیں تھا۔ لاہور میں مکند آئرن ورکس کے نام سے ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جس میں پرانے لوہے سے کچھ سریا اور زرعی آلات بنتے تھے مگر اگست 1947ء میں یہ بھی بند ہو گیا تھا کیونکہ اس کے ہندو مالکان ترکِ وطن کر گئے تھے۔ پارچہ بافی کے 394 کا رخانوں میں سے 380 ہندوستان میں تھے اور صرف 14 پاکستان میں۔ مغربی پاکستان کے علاقوں میں پیدا ہونے والی روئی کا بیشتر حصہ ریل اور سمندر کے ذریعے احمد آباد اور بمبئی میں پارچہ بافی کے مراکز میں بھیج دیا جاتا تھا اور وہاں سے اس کے بدلے میں کپڑا آتا تھا۔

مشرقی پاکستان میں پٹ سن کا ایک بھی کارخانہ نہیں تھا اور یہاں پیدا ہونے والی ساری پٹ سن کلکتہ بھیج دی جاتی تھی جہاں مارواڑیوں کی بہت سی جیوٹ ملیں تھیں۔ ان ملوں میں مشرقی پاکستان کی پٹ سن سے بوریاں اور دوسری مصنوعات تیار کی جاتی تھیں یا اس کی گانٹھیں باندھنے کے بعد اسے بحری جہازوں کے ذریعے برآمد کر دیا جاتا تھا۔ چونکہ کلکتہ کی منڈی میں بہت سٹہ بازی ہوتی تھی اس لئے پٹ سن کے کاشت کار یہاں کے بھاؤ کے اتار چڑھاؤ کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ برطانیہ میں ڈنڈی کی جیوٹ ملوں کے مالکان بھی خام پٹ سن کے بھاؤ کو کم از کم سطح پر رکھنے کے لئے ہر قسم کا ہیر پھیر کرتے تھے اور اس طرح وہ مارواڑیوں کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کے غریب کاشتکاروں کی خون پسینے کی کمائی سے ہاتھ رنگتے تھے۔ مئی 1947ء میں شملہ میں ''ماؤنٹ بیٹن۔ نہرو'' ساز باز کی بنا پر کلکتہ کے ہندوستان کو دیئے جانے سے مشرقی پاکستان کو بہت نقصان پہنچا تھا۔ قائداعظم جناح کے بقول کلکتہ کے بغیر مشرقی پاکستان ایک بے روح جسد کی حیثیت رکھتا تھا۔ بنگال کے 90 فیصد صنعتی ادارے کلکتہ میں تھے۔ بنک، بیمہ کمپنیاں، تجارتی مراکز، درآمدی و برآمدی ادارے، مواصلاتی مراکز، بجلی گھر اور اعلیٰ تعلیمی ادارے سب کے سب کلکتہ میں تھے جو غیر منقسم بنگال کا دارالحکومت اور اس کی بڑی بندرگاہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی بنگال کے مقابلے میں دگنی تھی لیکن اس کی آمدنی مغربی

بنگال کی آمدنی سے آدھی تھی۔ یہاں صرف ایک چھوٹی سی بندرگاہ چٹاگانگ میں تھی۔اس میں سالانہ صرف پانچ لاکھ ٹن سامان کی درآمدو برآمد کی گنجائش تھی اور اس کی استعداد کار کی توسیع اور ذرائع مواصلات کا رخ اس کی طرف موڑنے کے لئے سالہا سال درکار تھے۔47-1946ء میں بنگال کے مسلم لیگی وزیر اعلیٰ حسین شہید سہروردی نے اس صورت حال کے پیش نظر 3رجون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے اعلان کے بعد کلکتہ کے ایک ممتاز کانگرسی لیڈر سرت چندر بوس کے ساتھ مل کر ''آزاد وخود مختار متحدہ بنگال'' کی تحریک چلائی تھی۔ جسے قائداعظم جناح کی تائیدوحمایت حاصل تھی اور جس کے برطانوی سرمایہ کار بھی حق میں تھے۔لیکن اس تحریک کو کلکتہ، احمد آباد اور بمبئ کے توسیع پسند ہندو سرمایہ داروں کے نمائندہ ''مہاتما'' گاندھی نے سبوتاژ کر دیا تھا اور اس کے نتیجے میں حسین شہید سہروردی کو بالآخر 1949ء میں پاکستان میں سیاسی پناہ لینا پڑی۔

پاکستان میں انتظامی مشینری کی حالت بھی بہت بری تھی۔ چونکہ بٹوارا کونسل کے فیصلے کے تحت برصغیر کے سارے چھوٹے بڑے سرکاری ملازموں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ آئندہ ہندوستان اور پاکستان میں سے جس ملک میں چاہیں ملازمت اختیار کر سکتے ہیں۔اس لئے پاکستانی علاقوں میں متعین سارے ہندو اور سکھ ملازمین ارادۃً یا مجبوراً ہندوستان چلے گئے تھے اور اپنے پیچھے ایک بہت بڑا انتظامی خلا چھوڑ گئے تھے۔ بالخصوص مرکزی حکومت کے پاس تو کوئی انتظامی ڈھانچہ تھا ہی نہیں۔غیر منقسم ہندوستان میں انڈین سول سروس اور انڈین پولیٹیکل سروس کی افسر شاہی، جسے برطانوی سامراج کی انتظامیہ کا ''فولادی ڈھانچہ'' کہا جاتا تھا، کے ارکان کی کل تعداد تقریباً ایک ہزار تھی۔جس میں مسلمان افسر ایک سو سے کم تھے۔اگرچہ یہ تھوڑے سے مسلمان افسر اپنے معاشرتی طور طریقے میں ''پکے صاحب'' تھے لیکن ان میں انتظامی صلاحیت اور تجربہ کی بہت کمی تھی کیونکہ ان میں سے بیشتر قیام پاکستان سے چند سال قبل مسلمانوں کے لئے مقرر کردہ 25 فیصد کوٹے کی پیداوار تھے۔1947ء میں ان میں سے کوئی ایک بھی ہندوستان کی مرکزی حکومت کے سیکرٹری کے عہدہ پر فائز نہیں ہوا تھا۔صرف چار جائنٹ سیکرٹری تھے اور ان کا تقرر بھی دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد کے ہنگامی حالات کی وجہ سے ہوا تھا۔دوسری سروسز مثلاً انڈین پولیس سروس ''انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس، انڈین میڈیکل سروس اور انڈین سروس آف انجینئرز میں بھی مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی اور دوسرے فنی ملازمین کی بھی شدید کمی تھی۔

ہندوستان کی مرکزی حکومت کے چھوٹے درجے کے ملازمین میں مسلمانوں کی تعداد تقریباً 25000 تھی اور ہندوستانی علاقوں کی ریلویز میں کام کرنے والے، مسلمان مزدوروں، کاریگروں اور دوسرے فنی ملازمین کی تعداد 83500 تھی۔ لیکن برصغیر کی تقسیم کا کام اس قدر عجلت میں ہوا تھا اور اس موقع پر اتنا زیادہ خون خرابہ ہوا تھا کہ ان چھوٹے درجہ کے مسلمان ملازمین میں سے بیشتر اگست 1947ء میں پاکستان میں نہیں پہنچ سکے تھے کیونکہ راستے میں ان کی اسپیشل گاڑیوں پر اکالی دل اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے مسلح جتھے حملے کرتے تھے۔ بالآخر ستمبر 1947ء میں برٹش اوورسیز ائیرویز کارپوریشن کے بیس چارٹرڈ ہوائی جہازوں کے ذریعے کئی ہزار ملازمین کو دہلی سے کراچی منتقل کیا گیا جبکہ مشرقی پنجاب سے خانماں برباد مسلمان مہاجرین کے لمبے لمبے قافلے براستہ واہگہ پاکستان کی سرزمین میں پناہ لے رہے تھے اور مغربی پاکستان کے مختلف علاقوں سے ہزاروں لاکھوں تباہ حال ہندو اور سکھ شرنارتھی ہندوستان کی جانب رواں دواں تھے۔ نظم و نسق تقریباً ناپید تھا اور ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جگہ قتل و غارت اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ چاروں طرف قیامت برپا تھی۔

مشرقی پاکستان میں لوگوں کے ذہن میں 1943ء کے ہولناک قحط کی یاد ابھی تازہ تھی جس میں لاکھوں لوگ جاں بحق ہو گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ پاکستان کی نوزائیدہ ریاست کے لئے یہ صورت حال زیادہ حوصلہ افزانہ تھی اور اس بنا پر اس مملکت خداداد کے حکمرانوں کو بہت سی غیر متوقع مشکلات پیش آئی تھیں۔ لیکن دنیا کی جدید تاریخ میں یہ صورت حال کوئی فقید المثال نہیں تھی۔ پہلی جنگ عظیم سے پہلے یورپ میں اور اس کے بعد ایشیا میں جتنی بھی قومی ریاستیں وجود میں آئی تھیں ان میں سے بیشتر کو اپنی پیدائش کے موقع پر ایسی ہی ناگفتہ بہ صورت حال کا مقابلہ کرنا پڑا تھا۔ ان میں بھی بہت خون خرابہ ہوا تھا اور کوئی انتظامی مشینری نہیں تھی۔ فرانس، روس اور ترکی میں توپے درپے بے شمار جنگوں اور انقلاب کے باعث اینٹ سے اینٹ بج گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ان ریاستوں کے عوام نے اپنے دانش منداور مخلص حکمرانوں کی زیر قیادت ہر شعبۂ زندگی کی خوش اسلوبی سے تعمیر کی۔ اس سلسلہ میں اگر چین کی مثال دے دی جائے تو غیر مناسب نہ ہوگا کیونکہ ظہور پاکستان کے تقریباً دو سال بعد جب اس ملک کے عوام نے غیر ملکی سامراجیوں اور مقامی رجعت پسندوں کے چنگل سے

آزادی حاصل کی تھی تو اس کے انتظامی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچے کے پرخچے اڑ چکے ہوئے تھے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یکم اکتوبر 1949ء کو جب ماؤزے تنگ نے پیکنگ میں چین کی مکمل آزادی کا اعلان کیا تھا تو اس وسیع وعریض ملک کی انتظامی، معاشی اور معاشرتی صورت حال پاکستان کی 1947ء کی صورت حال سے بہت زیادہ خراب تھی۔ بے شمار عالمی مبصرین کو یقین تھا کہ 60 کروڑ کی آبادی کا یہ ملک 1840ء کے بعد انگریزوں، فرانسیسیوں، امریکیوں، جرمنوں، روسیوں اور جاپانیوں کے حملوں اور 1911ء کے بعد مسلسل خانہ جنگی کے باعث اس قدر زخمی، مفلوج اور نحیف ہو چکا ہے کہ یہ کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔

لیکن ماؤزے تنگ نے چین کی ہولناک سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی صورت حال کے پیش نظر اپنی پارٹی کے کارکنوں سے کہا تھا کہ ''اس وقت چین ہر لحاظ سے بالکل ایک کورے کاغذ کی طرح ہے۔ یہ بہت بری بات ہے لیکن اس برائی میں ایک اچھائی بھی مضمر ہے۔ تم اس کورے کاغذ پر جیسی چاہو تصویر بنالو۔ چین کی از سر نو تعمیر کرو۔ تعمیر کا یہ کام بہت کٹھن اور لمبا ہوگا لیکن اگر تم مزدوروں، غریب کسانوں اور دوسرے محب الوطن عوام کا بھرپور تعاون حاصل کر کے لگن اور خلوص سے کام کرو گے تو صدیوں کا یہ کام عشروں میں مکمل ہو جائے گا۔'' بلاشبہ 1947ء میں نوزائیدہ مملکت پاکستان کی حالت بھی بہت بری تھی۔ تاہم یہ بالکل کورا کاغذ نہیں تھی۔ 1947ء میں پاکستان کے علاقوں میں پٹ سن، کپاس، گندم، چاول اور دوسری زرعی اجناس وافر پیدا ہوتی تھیں اور ان اجناس کی بین الاقوامی منڈیوں میں بہت مانگ تھی۔ پاکستان کا پہلا بجٹ اس لحاظ سے اہم نہیں تھا کہ وہ متوازن تھا بلکہ اس کی اصل اہمیت یہ تھی کہ اس نے ثابت کر دیا تھا...... کہ پاکستان کے پاس نہ صرف انتظامیہ کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی وسائل ہیں بلکہ دفاع اور ترقی و تعمیر کے لئے وسائل میسر ہیں۔ پاکستان کے مخالفین کی یاس انگیز پیش گوئیاں غلط نکلیں۔ پاکستان کی صلاحیت بقا محقق ہوگئی اور پاکستان کے معاشی استحکام سے لوگوں کے یقین کو بڑی تقویت پہنچی۔ چنانچہ یکم اپریل 1948ء کو قائداعظم نے ایک تقریر میں کہا کہ جب ہم نے پہلے پہل پاکستان کی آزاد و خود مختار مملکت کے لئے مطالبہ کیا تھا تو ایسے جھوٹے پیغمبروں کی تعداد کم نہ تھی جو ہمیں اپنے نصب العین سے یہ کہہ کر منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ پاکستان معاشی اعتبار سے ممکن العمل نہیں ہے۔ اولین بجٹ نے ہی ان جعلی پیغمبروں کو سخت صدمہ پہنچایا ہوگا۔ اس

نے پاکستان کے مالیاتی استحکام اوراس کی حکومت کے اس عزم کا پورا مظاہرہ کر دیا ہے کہ وہ اسے مستحکم تر اور مضبوط تر بنائیں گے۔''[3]

نوزائیدہ پاکستان میں اچھائی صرف یہی نہیں تھی کہ یہاں زرعی اجناس کی افراط تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ اچھائی یہ تھی کہ یہاں افرادی قوت بہت اچھی تھی۔ مغربی پاکستان کے عوام برطانوی سامراج کے مسلط کردہ جاگیرداری نظام کے باوجود بالعموم تندرست وتوانا تھے اور مشرقی پاکستان کے عوام بڑے باشعور اور محنتی تھے۔ زمین اور پانی کی کوئی کمی نہیں تھی جبکہ آبادی ساٹھ ستر لاکھ مہاجرین کی آمد کے باوجود بہت کم تھی۔ غریب عوام الناس میں قومی خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا۔ بابائے قوم قائداعظم جناح نے اس حوصلہ افزا صورت حال کے پیش نظر 14 راگست 1948ء کو پاکستان کے پہلے یوم آزادی کے موقع پر اپنے بستر مرگ سے قوم کے نام جو پیغام جاری کیا تھا۔ اس کے آخر میں کہا تھا کہ ''قدرت نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔ تمہارے پاس غیر محدود وسائل ہیں۔ تمہاری ریاست کی بنیادیں رکھی جا چکی ہیں۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس کی تعمیر کرو۔ جلدی سے جلدی اور اچھی سے اچھی تعمیر کرو۔ آگے بڑھو۔ میری دعا ہے کہ تمہاری تعمیر وترقی کی رفتار تیز ہو۔ پاکستان زندہ باد۔[4] لیکن پاکستان کے عوام دشمن اور سامراج نواز حکمران طبقوں نے یہاں ایسا غیر منصفانہ اور ظالمانہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام نافذ کئے رکھا کہ یہ مملکت خداداد ابتدائی سالوں میں تعمیر وترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی بجائے روبہ تنزل ہوگئی۔ ان حکمران طبقوں نے ملک وقوم کے اندرونی اور بیرونی تضادات کو حل کرنے کی کچھ اس طرح کوشش کی کہ یہ تضادات خوش اسلوبی سے حل ہونے کے بجائے روز بروز شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔

باب: 2

پاکستان کی تعمیر وترقی کے راستے میں اندرونی تضادات کی دیواریں

پاکستان میں جن اندرونی تضادات نے قومی تعمیر وترقی کے کام میں عوام الناس کی حوصلہ شکنی کی اور ملک کی سیاست، انتظامیہ اور معیشت پر بری طرح اثر انداز ہوئے ان میں پہلا تضاد وہ تھا جو قیام پاکستان کے بعد چند ہی ماہ کے اندر گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح اور وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کے درمیان رونما ہوگیا تھا۔ جب تک بابائے قوم صاحب فراش نہیں ہوئے تھے اس وقت تک کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی اور حکومت کا ہر چھوٹا بڑا کام ان کی مرضی اور منظوری سے ہوتا تھا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا منتخب وزیراعظم نہیں تھا بلکہ اسے اور اس کی کابینہ کے سارے ارکان کو قائداعظم نے نامزد کیا تھا۔ لہٰذا لیاقت علی خان نے ابتدائی چند مہینوں میں دراصل وزارت عظمیٰ کے فرائض سرانجام نہیں دیئے تھے بلکہ اس نے گورنر جنرل کی کابینہ کے ایک سینئر وزیر کی حیثیت سے محض اوپر کے احکامات کی تعمیل کی تھی لیکن جب مئی 1948ء میں 71 سالہ قائداعظم پر تپ دق کا شدید حملہ ہوا اور ان میں سرکاری کام کی طرف پوری طرح توجہ کرنے کی سکت نہ رہی تو قدرتی طور پر وزیراعظم لیاقت علی خان نے پَر پُرزے نکالنے شروع کئے۔ یہ کوئی انہونی اور غیر معمولی بات نہیں تھی بلکہ بدقسمتی سے لیاقت علی خان کی بتدریج آزادروی نے ملک کی ان دونوں بڑی شخصیتوں کے درمیان تضاد میں شدت پیدا کر دی اور پھر جولائی میں قائداعظم کی حالت زیادہ ہی خراب ہوگئی تو ان دونوں کے تضاد نے معاندانہ صورت اختیار کر لی۔ اس بنا پر وزیراعظم لیاقت علی خان کے عوامی

وقار کو بہت ضرب لگی اور گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح 11ستمبر 1948ء کو نہایت کسمپرسی کی حالت میں جاں بحق ہوئے۔

ملک کے ان دونوں بڑے سربراہوں کے درمیان یہ تضاد یکا یک پیدا نہیں ہو گیا تھا اور نہ ہی اس کی نوعیت محض انفرادی تھی۔ اس تضاد کا ایک تاریخی وسیاسی پس منظر تھا اور اس کی بنیاد سراسر طبقاتی تھی۔ تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ قائداعظم محمد علی جناح کراچی میں آغا خانی فرقہ کے ایک متوسط درجے کے بیوپاری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد جناح پونجا اپنے بڑے بھائی ولجی پونجا کی چمڑے کی برآمدی فرم میں حصہ دار تھے۔ ان کے سات بچے تھے جن میں محمد علی سب سے بڑے تھے۔ اس بچے کی پرائمری تعلیم اپنے والدین سے الگ بمبئی کے گوکل داس تیج پال سکول میں ہوئی۔ انہیں اتنی چھوٹی سی عمر میں بمبئی کیوں بھیج دیا گیا، اس کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جاتا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد انہیں واپس کراچی بلا لیا گیا جہاں انہوں نے چرچ مشن ہائی سکول سے بمبئی یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ اسکول میں اس بچے کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ اس لئے اسے ایک انگریز دوست کے مشورے کے مطابق بیرسٹر بننے کے لئے 1892ء میں لندن بھیج دیا گیا۔ ابھی یہ بچہ لندن میں ہی تھا کہ اس کے والد کو کاروبار میں بہت خسارہ ہوا۔ کراچی میں بعض قرض خواہوں نے اس کے خلاف مقدمہ بازی کی اور دو ایک مقدموں کے فیصلے اس کے خلاف ہوئے۔ چنانچہ وہ دیوالیہ ہو گیا اور اس بنا پر وہ اپنے رشتہ کے بھائی قاسم موسیٰ، جو آغا خان کا سینئر وزیر تھا، کی تجویز پر اپنے سارے اہل وعیال کے ہمراہ بمبئی منتقل ہو گیا۔ محمد علی جناح بیرسٹری کرنے کے بعد 1896ء میں واپس ہندوستان آئے تو انہیں اپنے والد کی معاشی زبوں حالی کے باعث بڑے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے بمبئی میں وکالت شروع کی لیکن ان کے پہلے تین سال بڑی تنگدستی میں گزرے۔ بالآخر انہوں نے اپنے ایک پرانے دوست کی مہربانی سے بمبئی کے ایڈووکیٹ جنرل کے دفتر میں بطور ریڈر کام کیا اور پھر وہ 1900ء میں اس انگریز ایڈووکیٹ جنرل کی سفارش پر چھ ماہ تک پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ جناح نے اس عدالتی عہدہ کے فرائض اتنی خوش اسلوبی سے سرانجام دیئے کہ بمبئی کے گورنر کی کونسل کا جوڈیشل ممبر سر چارلس اولیونیٹ ان سے بہت خوش ہوا اور اس نے نوجوان جناح کو اس قسم کی مستقل ملازمت دینے پر آمادگی ظاہر کی لیکن

اب محمد علی جناح کو کسی قسم کی سرکاری ملازمت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنی تنخواہ میں سے خاصی بچت کر چکے تھے اور بمبئی کے مقدمہ باز حلقوں میں بھی ان کی قابلیت کی شہرت پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے سر چارلس سے معذرت کی، پھر وکالت کے میدان میں داخل ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک نہایت کامیاب وکیل بن گئے۔ انہوں نے ایک وسیع المشرب پارسی دادا بھائی نارو جی اور پھر ایک اعتدال پسند ہندو گوپال کرشن گوکھلے کی قابلیت اور بصیرت سے متاثر ہو کر 1905ء میں سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی۔ 1906ء میں وہ انڈین نیشنل کانگرس کے صدر دادا بھائی نارو جی کے پرائیویٹ سیکرٹری کی حیثیت سے عملی طور پر سیاسی میدان میں آ گئے۔ پھر انہوں نے ساری زندگی ایک اعلیٰ پایہ کے سیاست دان اور کامیاب وکیل کی حیثیت سے گزاری۔ آپ کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں جبکہ وہ کراچی کے مشن سکول میں پڑھتے تھے، کاٹھیاواڑ کے ایک آغا خانی خاندان میں ہوئی تھی لیکن ان کی پردہ دار بیوی کا چند سال بعد انتقال ہو گیا تھا جبکہ جناح ابھی لندن میں ہی تھے۔ انہوں نے دوسری شادی اپریل 1918ء میں اکتالیس سال کی عمر میں، بمبئی کے ایک پارسی رئیس سر ڈنشا پٹیت کی اٹھارہ سالہ بیٹی رتن بائی سے کی۔ رتن بائی نے یہ شادی اپنے والدین کی مرضی کے خلاف کی تھی اور انہوں نے اس سے قبل اسلام قبول کر لیا تھا لیکن یہ ازدواجی رشتہ بوجوہ کامیاب نہ رہا اور بیگم جناح، جو بمبئی کے اعلیٰ سوشل حلقوں میں ''رتی پٹیت'' کے نام سے مشہور تھی، کئی سال کی تکرار و نزاع کے بعد اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر کے تاج محل ہوٹل میں رہائش پذیر ہو گئی اور وہیں 1929ء میں اس کا انتقال ہوا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے اس مختصر خاکے سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا یا ان کے خاندان کا جاگیرداریت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔ وہ ایک آزاد خیال کاروباری خوجہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا نظریۂ زندگی سراسر بورژوا تھا۔ قدرتی طور پر یو۔ پی، پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمان جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کو جناح کی آزاد خیالی اور وسیع المشربی پسند نہیں تھی۔ وہ جناح کے ہندوؤں اور پارسیوں کے ساتھ سیاسی اور معاشرتی میل جول سے بہت چیں بہ جبیں ہوتے تھے۔ چنانچہ میرٹھ کا ایک جاگیردار نواب سر محمد یامین خان مرکزی اسمبلی میں 1925ء کے اہم واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''میں نے دیکھا کہ کانگرس اور لبرل پارٹی تو بحیثیت پارٹی کے اسمبلی میں کام کرتی ہیں اور ہندو ہر مسئلہ پر متفق ہو جاتے ہیں اور ان پارٹیوں

کے ممبر کونسل آف سٹیٹ میں بھی متفق ہوتے ہیں لیکن مسلمان ممبر ایک پارٹی میں نہیں۔ کچھ مسلمان تو آزاد ہیں اور اپنی رائے کا استعمال اپنی مصلحت سے کرتے ہیں اور کچھ مسلمان اسمبلی میں مسٹر جناح اوران کی پارٹی کے ہیں۔ مسلمان بحیثیت ایک پارٹی، مسلمانوں کے معاملات کی نمائندگی نہیں کرتے اور زیادہ تر ان میں ایسے ممبر ہیں جو مسلمان پبلک سے میل جول نہیں رکھتے نہ ان کے حقوق پر لڑتے ہیں۔ مسٹر جناح سے امید تھی کہ وہ لڑیں گے لیکن ان کے خیالات اس زمانے میں یہ تھے کہ وہ ہندوؤں اور پارسیوں سے میل جول رکھیں اور ان میں ہر دلعزیز ہوں۔ اس لئے میں نے ایک میٹنگ سب مسلمان ممبران اسمبلی و کونسل آف سٹیٹ کی اسمبلی کے بڑے کمرے میں، جو ممبرز روم تھا، طلب کی۔ اس میں بہت سے ممبر شریک ہوئے۔ میں نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک مسلم پارٹی بنائی جائے اور اس میں اسمبلی کے سب مسلمان ممبر شریک ہوں اور ان پر یہ پابندی ہو کہ ان معاملات میں جو مسلمانوں سے متعلق ہوں ایک ساتھ ووٹ دیں۔ مسٹر ایم۔ اے جناح نے اس کی مخالفت کی اور اپنی پارٹی کے ہندو اور پارسی ممبروں سے علیحدگی پر کسی طرح رضامندی دینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ مسٹر جناح تیار نہ ہوئے اس لئے اسمبلی کے اور ممبر بھی پارٹی نہ بنا سکے۔ مسٹر جناح نے تو اس تحریک کو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ظاہر کیا لہٰذا یہ میٹنگ برخاست ہوگئی۔"[1]

سر محمد یامین خان نے 6 راگست 1933ء کے ایک اور واقعہ کا بھی ذکر کیا ہے جبکہ محمد علی جناح پریوی کونسل کے ایک مقدمے کی پیروی کے لئے عارضی طور پر لندن میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ "میں اتوار کے دن مسٹر جناح سے ملنے گیا جو دو سال سے یہاں رہ پڑے ہیں...... میں نے کہا کہ آپ مسلم لیگ کو پھر ہاتھ میں لیجئے۔ ہم نے اس سال یہ پاس کیا ہے کہ آپ دوبارہ مستقل صدر کا عہدہ سنبھال لیں، اس پر مسٹر جناح نے کہا کہ مسلم لیگ سے مجھے کیا فائدہ ہوا۔ میری ہندوؤں میں وہی عزت تھی جو گاندھی کی ہے لیکن جب سے انتخاب جداگانہ کا جھگڑا شروع ہوا ہے ہندو مجھ کو نہیں مانتے اور اب ان کے دلوں میں میری عزت نہیں رہی۔ میں نے کہا کہ جو آپ نے ہندوؤں کے دلوں سے کھویا وہ مسلمانوں کے دلوں سے حاصل کیا۔ پہلے ہندو جو آپ کو لیڈر مانتے تھے وہ قدرتی نہ تھا۔ اب مسلمان آپ کو لیڈر مانتے ہیں یہ قدرتی تعلق ہے۔ دراصل جب سے گاندھی گردی شروع ہوئی ہے آپ کی قیادت ہندوؤں میں ختم ہوگئی اس لئے آپ نے کانگرس سے علیحدگی کر لی۔ اب اگر ہندو آپ کی عزت کریں گے تو وہ صرف دو وجہ سے ایک تو آپ

کی بیرسٹری کی قابلیت کی وجہ سے اور غالباً آپ کو مقدمات اس صورت میں دیتے ہیں جب آپ مسلم لیگ سے اور مسلمانوں کے حقوق مانگنے سے علیحدہ رہیں یا اس صورت میں کریں گے کہ آپ مسلمانوں کا گلا کٹوانے پر رضامندی دے دیں۔ لیکن دولت کمانے کی خاطر اگر مسلمانوں کے کام سے علیحدگی اختیار کریں گے تو یہ دولت زیادہ دن کام نہیں دیتی۔ دوسری یا تیسری پشت میں ختم ہو جاتی ہے اور آپ اگر مسلمانوں کا گلا کٹوانے میں ہندوؤں کا ساتھ دیں گے تو مسلمان کبھی آپ کو نہ بخشیں گے اور ہندو بہت دن ساتھ نہ دیں گے اور آئندہ ہسٹری آپ کو کیا لکھے گی لہٰذا قدرتی طریقہ اختیار کیجئے جو صاف ہے کہ مسلمانوں کی قیادت کر کے ان کے اصل حقوق حاصل کرنے میں ان کی مدد کیجئے۔ آپ کی پوزیشن ایسی ہے کہ آپ کو فوراً لیگ کا پریذیڈنٹ باضابطہ منتخب کر لیا جائے گا اور اگر آپ انتخاب جداگانہ میں مسلمانوں کی کافی نمائندگی مجالس قانون ساز و ملازمتوں کی تقرری میں ساتھ دیتے رہے تو آپ مسلمانوں کے لیڈر اس طرح ہو جائیں گے جیسے آغا خان ہیں لیکن اگر آپ ہندوؤں کی طرف ڈھلے رہے تو آپ نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے ہوں گے۔ آپ کی لیڈری صرف یہ ہو گی کہ لوگ آپ کی تعریف کر دیا کریں گے لیکن آپ کی رائے پر عمل کوئی نہ کرے گا۔"[2] قطع نظر اس کے کہ محمد یامین خان نے محمد علی جناح سے لندن میں اپنی اس ملاقات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ کس حد تک صحیح ہے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ میرٹھ کا یہ دقیانوسی جاگیردار جناح کی بورژوا وسیع المشربی کو ناپسند کرتا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ جناح لندن اور بمبئی میں ہندوؤں اور پارسیوں کے مقدمات میں وکالت کرنے کے بجائے ہندوستان کے مسلمان جاگیرداروں کی سیاسی وکالت کریں۔

بظاہر نواب سر محمد یامین خان کو یہ امید تھی کہ جناح ہندوستان آئیں گے تو وہ متوقع اصلاحات کے تحت ہونے والے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے مسلمان جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔ ان جاگیردارانہ مفادات کو وہ ''مسلمانوں کے حقوق'' کا نام دیتے تھے۔ یامین خان سے قبل نوابزادہ لیاقت علی خان بھی لندن میں اپنے ہنی مون کے دوران اپنی دوسری دلہن کے ہمراہ محمد علی جناح سے مل کر یہ تجویز پیش کر چکا تھا کہ '' آپ ہندوستان واپس آ جائیں۔ لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ صرف آپ ہی لیگ کو حیات نو دے سکتے ہیں اور اسے بچا سکتے ہیں'' اور جناح نے کہا تھا کہ '' آپ ہندوستان جا کر حالات کا جائزہ لیں اور ملک کے تمام حصوں کے جذبات و احساسات کی آزمائش کریں۔ مجھے

آپ کے فیصلہ پر بھروسہ ہے۔ اگر آپ مجھے لکھیں گے کہ میں ہندوستان واپس آ جاؤں تو میں یہاں کی رہائش ترک کر کے واپس آ جاؤں گا۔"[3] قبل ازیں حکومت برطانیہ اگست 1932ء میں کمیونل ایوارڈ کا اعلان کر چکی تھی اور مارچ 1933ء میں راؤنڈ ٹیبل کی مجوزہ آئینی اصلاحات پر مشتمل وائٹ پیپر بھی شائع ہو چکا تھا۔

کمیونل ایوارڈ میں جداگانہ انتخاب کے طریقۂ کار کو برقرار رکھا گیا تھا جبکہ مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کو اور غیر مسلم اقلیت کے صوبوں میں غیر مسلموں کو ویٹیج یعنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی دی گئی تھی۔ ان اصلاحات کی خاص بات یہ تھی کہ پہلی مرتبہ صوبوں کو قانون سازی کی ایک اکائی کے طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ وفاقی اور صوبائی شعبوں کی علیحدہ فہرست بندی کی گئی تھی۔ سندھ کو صوبہ بمبئی سے جدا کر کے علیحدہ صوبہ بنا دیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد کو پہلی مرتبہ مکمل صوبائی اختیارات دے کر اسے باقاعدہ مکمل صوبہ بنا دیا گیا تھا۔ صوبوں میں حق رائے دہی کا دائرہ بھی وسیع کیا گیا تھا۔ یہ اصلاحات مستقبل کی سیاست کے حوالے سے خاصی پر کشش تھیں۔

چنانچہ جناح 1934ء کے اوائل میں ہندوستان واپس آئے۔ فروری میں راجہ سلیم پور نے انہیں دہلی کے سیسل ہوٹل میں ایک عشائیہ دیا۔ چودھری خلیق الزماں کا دعویٰ ہے کہ وہاں کھانے کی میز پر جناح نے مجھ سے یہ کہا کہ "اگر اب تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کرو گے تو میں واپس نہیں آؤں گا۔"[4] گویا نواب سر محمد یامین خان، نوابزادہ لیاقت علی خان اور چودھری خلیق الزماں میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ ہے کہ جناح کی لندن سے واپسی اس کے کہنے پر ہوئی تھی اور بے چارے جناح کو تو کوئی سیاسی سوجھ بوجھ نہیں تھی۔ تاہم 4/مارچ 1934ء کو مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں انہیں مسلم لیگ کا مستقل صدر منتخب کر لیا گیا۔ 2/اپریل کو دہلی میں ان کی صدارت میں مسلم لیگ کونسل کا اجتماع ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے "کمیونل ایوارڈ کو اس وقت تک تسلیم کر لیا گیا جب تک کہ کوئی ایسا متبادل حل نہیں ملتا جس پر سب کو اتفاق ہو۔" بعد ازاں جناح نے ایک پریس انٹرویو میں کہا کہ "اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مکمل تعاون اور دوستی ہو جائے تو مجھے انتہائی خوشی ہو گی اور میرا تاثر ہے کہ میری اس خواہش میں مجھے مسلمانوں کی بھاری حمایت حاصل ہے۔
کونسل کے اجلاس کے بعد جناح فوراً ہی واپس لندن چلے گئے۔ وہ لندن میں ہی تھے کہ اکتوبر میں 1919ء کے ایکٹ کے تحت مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے تو ان کا بمبئی میں مسلمانوں

کے لئے مخصوص کردہ ایک حلقے سے بلا مقابلہ انتخاب ہو گیا۔ اس پر وہ نئی اسمبلی کے پہلے سیشن میں شرکت کے لئے جنوری 1935ء میں پھر ہندوستان آئے اور 23/اپریل کو پھر لندن واپس چلے گئے۔ جولائی 1935ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی ''شاہی منظوری'' کے تقریباً تین ماہ بعد 24/اکتوبر 1935ء کو جناح مستقل طور پر واپس ہندوستان آ گئے۔ 1935ء میں ان کی ہندوستان سے عدم موجودگی کے باعث مسلم لیگ کا کوئی سالانہ اجلاس نہیں ہوا تھا۔ اپریل 1936ء میں اُن کی زیر صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں نواب زادہ لیاقت علی خان کو مسلم لیگ کا آنریری جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ اس اجلاس میں لکھنؤ کے چودھری خلیق الزماں کے یونٹی بورڈ کے ارکان کے علاوہ جمیعت العلمائے ہند کے مندوبین نے بھی شرکت کی تھی۔

محمد علی جناح کے برعکس نوابزادہ لیاقت علی خان بہت بڑا خاندانی جاگیردار تھا۔ اس کے دادا نواب احمد علی خان نے 1857ء کی جنگ آزادی کے دوران برطانوی سامراج کی قابل قدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ چنانچہ لارڈ کیننگ نے پنجاب کے چیف کمشنر کے نام ایک مراسلے میں نواب احمد علی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ہدایت کی تھی کہ چونکہ نواب احمد علی نے برطانوی حکومت کی خدمت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اس لئے یہ فراخدلانہ معاوضے کا حق دار ہے۔ اسے اور اس کی اولاد کو پانچ ہزار روپے کا مالیہ ہمیشہ کے لئے معاف کر دیا جائے اور دس ہزار روپے کی خلعت دی جائے۔ علاوہ بریں اسے گورنر جنرل کی سند بھی عطا کی گئی جس میں اس کی وفاداری اور گراں قدر خدمات کا اعتراف کیا گیا۔''[5] نواب سر محمد یامین خان لکھتا ہے کہ ''لیاقت علی خان بڑے رئیس ہیں اور ان کے ہاں نواب کا خطاب پشتینی ہے جو ان کے بڑے بھائی سجاد علی خان کو ملا ہے جن سے دربار میرٹھ میں میری ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ لیاقت علی خان بہت خود دار ہیں اور ریاست کا بھی زعم ہے۔ پہلے تو کانگرسی خیالات کے تھے اور انتخابات مشترکہ کے حامی تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہندو کاشتکار اسی طرف ووٹ دیں گے جس طرف ہم زمیندار کہیں گے۔ میں ہر طرح سمجھاتا تھا لیکن نہ مانتے تھے۔ میرے دوست مسٹر عبدالباری بیرسٹر میرٹھ جن کو میں نے میرٹھ، علی گڑھ اور آگرہ سے صوبائی اسمبلی کا ممبر بنوایا تھا ان کی بڑی دوستی نوابزادہ لیاقت علی خان سے تھی، وہ بھی سمجھاتے تھے مگر یہ نہ سمجھتے تھے لیکن گزشتہ (1937ء)

صوبائی الیکشنوں نے آنکھیں کھول دیں کہ کاشت کار اب زمیندار کے دباؤ میں نہیں رہے بلکہ زمیندار کو دشمن سمجھتے ہیں حالانکہ بلا مقابلہ ممبر ہو گئے اور چودھری خلیق الزماں کی ٹولی کسی کو ان کے مقابلے پر کھڑا نہ کر سکی تاہم یہ سمجھ گئے کہ اب مسلمانوں کا لیڈر ہونا چاہیے نہ کہ کاشت کاروں پر بھروسہ کرنا۔''[6] لیاقت علی خان کی ریاست کا وسیع رقبہ یو۔پی اور پنجاب دونوں صوبوں میں تھا۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، جو پنجاب میں مسلم لیگ کی علامہ اقبال کی صدارت (38-1937ء) کے دوران جائنٹ سیکرٹری رہا تھا، کا بیان ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے امداد و اعانت اور تائید وحمایت کلیتہً (پنجاب کے یونینسٹ وزیر اعلیٰ) سر سکندر کے لئے وقف ہو چکی تھی۔ جہاں تک ان سے ہو سکتا تھا وہ ہر موقع پر سر سکندر کی مدد اور ہماری مخالفت کرتے تھے۔ اس دوران کئی بار ایسے مواقع پیش آئے کہ ہم راستی پر تھے اور سر سکندر کا رویہ غلط تھا لیکن نوابزادہ نے ہمیشہ سر سکندر کا ساتھ دیا......ان کے خاندان کے تمام لوگ اور جملہ اعزہ واقارب کرنال میں رہتے تھے جنہیں آئے دن حکومت پنجاب کی امداد واعانت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ سر سکندر بڑے زیرک وہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے نوابزادہ مرحوم کے اس کمزور پہلو کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ خود لیاقت علی خان کے بڑے بھائی نواب سجاد علی خان پنجاب اسمبلی کے ممبر اور یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ سر سکندر اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے درمیان ہر قسم کا نامہ و پیام انہی کے توسل سے ہوتا تھا۔''[7]

مسلم لیگ کے دونوں بڑے سربراہوں کے طبقاتی منظر میں اتنے واضح اختلاف کی بنا پر ان کے نظریہ وطرز زندگی میں اختلاف ناگزیر تھا اور اس اختلاف کا مسلم لیگ اور پاکستان کی سیاست پر اثر انداز ہونا بھی ناگزیر تھا۔ مغرب کے نوآبادیاتی مگر جدید سرمایہ دارانہ نظام کے سانچے میں ڈھلے ہوئے محمد علی جناح اور برصغیر کے دقیانوسی جاگیردارانہ نظام کے پروردہ لیاقت علی خان کا سیاسی طور پر زیادہ دیر تک ہمسفر وہم رکاب رہنا ممکن نہیں تھا۔ دونوں کے اندازِ فکر اور نصب العین میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔

جناح اور جاگیرداروں کا اختلاف 37۔1936ء میں زیادہ کھل کر سامنے آیا جب 1935ء کے ایکٹ کے مطابق اسمبلیوں کے انتخابات عمل میں آنے والے تھے اور مسلم لیگ ان انتخابات کی حکمت عملی وضع کرنے میں مصروف تھی۔ مسلم لیگ 1927ء میں دو دھڑوں میں بٹ

جانے کے بعد انتشار کا شکار رہی تھی اور اگرچہ 1934ء میں جناح کے مستقل صدر بن جانے کے بعد یہ دوبارہ مجتمع ہو گئی تھی لیکن اس کی باقاعدہ تنظیم نو 1936ء کے اوائل میں جناح کی لندن سے مستقل واپسی کے بعد شروع ہوئی تھی اور ساتھ ہی انتخابات کا چیلنج بھی سامنے آ گیا تھا۔ ان حالات میں جناح چاہتے تھے کہ کانگرس کے ساتھ مل کر انتخابات میں حصہ لیا جائے تاکہ بعد ازاں صوبوں میں مخلوط حکومتیں تشکیل ہوں تو مسلم لیگ ان میں حصہ دار بن سکے اور کانگرس کو بلا شرکت غیرے حکومتیں بنا کر مسلمانوں کے لئے مشکلات پیدا کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ اس دوران بہت سے مسلمان رہنماؤں نے بعض علاقائی اور بعض ملک گیر سطح کی پارٹیوں کی رکنیت اختیار کی ہوئی تھی۔ جناح چاہتے تھے کہ ان سب کو دوہری رکنیت کی بنیاد پر مسلم لیگ کی صفوں میں شامل کیا جائے اور برصغیر کے تمام مسلمان ایک وسیع تر انتخابی اتحاد کی صورت میں انتخابات میں حصہ لیں۔ اس حکمت عملی سے یو۔پی اور بہار کے بعض مسلم درمیانے طبقے کے رہنماؤں کے لئے مسلم لیگ میں گنجائش نکل آئی تھی جو اس وقت کانگرس یا دوسری پارٹیوں میں شامل تھے۔ یہ بات یو۔پی کے مسلمان جاگیردار جغادریوں کو ناگوار گزری جو پہلے سے مسلم لیگ میں شامل تھے۔ چنانچہ اس مسئلے پر ان کے ساتھ جناح کا تضاد پیدا ہوا۔

نواب سر محمد یامین خان کے بیان کے مطابق جناح بڑے زمینداروں کے سخت خلاف تھے اور وہ انہیں اسمبلیوں میں زیادہ نمائندگی دینے کے حق میں نہیں تھے۔ نواب یامین اپنی 16 رفروری 1936ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ ''مسٹر جناح نے ابھی تک اپنا دل بڑے زمینداروں سے صاف نہیں کیا چونکہ وہ سب متفقہ طور پر انتخاب جداگانہ کے حامی تھے۔ اس لئے ''شفیع لیگ'' میں تھے اور ''جناح لیگ'' جو کلکتہ میں دسمبر 1928ء میں قائم ہوئی اس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے اور اس کے مخالف تھے...... مسٹر جناح بڑے زمینداران یو۔پی کو پسند نہیں کرتے لیکن ان کے قطعی مخالف ہو کر کامیابی نہیں دیکھتے۔ ادھر پنجاب میں سر فضل حسین کی پارٹی کے خلاف کوئی دال نہیں گل سکتی اس لئے اس پر تیار ہو گئے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے جائیں اور زمینداروں کو مشورہ میں شامل کیا جائے لیکن ان کو نمائندگی کم دی جائے اور پارلیمنٹری بورڈ جو نمائندے منتخب کرے گا اس میں زمیندار گروپ کو جو اس وقت برسر اقتدار ہے اور جس کی یو۔پی میں گورنمنٹ ہے، نمائندگی بہت کم دی جائے گی تاکہ ان کے نمائندے الیکشن میں صرف

وہ لئے جائیں جن کو مسلم لیگ شکست نہیں دے سکتی۔ بقیہ سب وہ لوگ ہوں گے جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ یعنی ہندوؤں کا جاسوس کہتے ہیں اور گورنمنٹ انگریزی کو کمزور کر کے مسلمانوں کی گردن میں رسی ڈال کر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں اس لئے ان سب کو مشورہ کے لئے بلائیں گے جو اس وقت کونسل آف انڈیا مسلم لیگ میں ہیں۔ اس کے بعد قطعی فیصلہ دیں گے۔ تاریخ اس مشورہ کی اپریل کو کوئی تاریخ ہوگی۔''[8]

26/اپریل 1936ء کو نوابزادہ لیاقت علی خان کا مسلم لیگ کے آنریری جنرل سیکرٹری کے طور پر انتخاب ہوا تو اسی دن ہی یو۔ پی کے جاگیرداروں اور محمد علی جناح میں اختلاف منظر عام پر آ گیا۔ نواب محمد یامین خاں کے مطابق جناح نے یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ ''تمام ہندوستان میں ایک ہی اصول پر تمام صوبوں میں لیگ الیکشن لڑے'' لیکن یو۔ پی کے مسلمان جاگیردار اس بات کو اپنے لئے سخت مضر سمجھتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ''اس سے مسلمان زمینداروں کی وزارت ختم ہو جائے گی اور لیگ کی وزارت کبھی نہیں بنے گی......نواب صاحب چھتاری اس میں زیادہ تر دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کی اور مسٹر جناح کی مفصل گفتگو ہوئی اور انہوں نے دکھایا کہ مسلمانوں کا وقار سب ختم ہو جائے گا۔ نواب صاحب چھتاری نے مسٹر جناح سے کہا کہ وہ یو۔ پی کے سربرآوردہ مسلمانوں سے مشورہ کر کے پھر دوبارہ گفتگو کریں۔''[9] 7/مئی کو نواب سر محمد یامین خان نے ان دنوں یو۔ پی کے گورنر سر ہیری ہیگ سے ملاقات کی تو اس نے ''اس امر پر تعجب کیا کہ مسٹر جناح تجربہ کار ہوتے ہوئے خلیق الزماں اور رفیع احمد قدوائی وغیرہ کے ہاتھ میں کیسے آ گئے اور یہ نہ سمجھے کہ کانگرس زمینداروں کا خاتمہ کرنا چاہتی ہے۔ اگر یو۔ پی میں زمیندار ختم ہو گئے تو مسلم اقلیت کا سب وقار جاتا رہے گا اور کانگرس اکثریت ان کو کیا دے گی۔'' چنانچہ اسی دن نواب یامین نے اخبار والوں کو ایک بیان دیا جس میں مسلم لیگ کے اس فیصلے کو کوتاہ اندیشی پر مبنی قرار دیا گیا کہ وہ کانگرس سے مل کر الیکشن لڑے گی۔ اس نے مزید کہا کہ ''یو۔ پی میں جو لوگ مسلم لیگی پہلے سے ہیں وہی لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں۔ ان لوگوں کو داخل نہ کیا جائے جو محض الیکشن کی خاطر لیگ میں آنا چاہتے ہیں۔''[10]

چودھری خلیق الزماں کا بیان ہے کہ محمد علی جناح کی لندن سے واپسی کے تقریباً دو ماہ بعد ''دسمبر میں یو۔ پی کے دو کانگرسی لیڈر پنڈت گوبند بلبھ پنت اور رفیع احمد قدوائی میرے پاس

آئے اور انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان دنوں یو۔ پی کے گورنر سر میلکم ہیلی نے یو۔ پی کے زمینداروں کو اس بات پر آمادہ کرلیا ہے کہ وہ اپنی ایک ایگریکلچرسٹ پارٹی بنائیں اور اس طرح آئندہ انتخابات میں اپنا زمینداری اثر و رسوخ اور سرکاری وقار استعمال کر کے کانگرس کا مقابلہ کریں۔ مسلمانوں کے حلقوں میں مسلم لیگی زمیندار مسلمانوں کے ٹکٹ پر لڑیں گے اور ان میں سے بیشتر بلا مقابلہ منتخب ہو جائیں گے۔"[11] لیکن نواب سر محمد یامین خان لکھتا ہے کہ یو۔ پی میں ایگریکلچرسٹ پارٹی بنانے کا فیصلہ 7ر جون 1936ء کو علی گڑھ میں نواب چھتاری کے ہاں منعقدہ زمینداروں کے ایک اجتماع میں کیا گیا کیونکہ مسٹر جناح نے ہمارا یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہمارے خیال کے زیادہ ممبر سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ میں مزید لئے جائیں۔ یو۔ پی کے کل ممبران جو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر ہیں وہ یو۔ پی صوبائی پارلیمنٹری بورڈ کے ممبر ہوں اور صوبائی بورڈ کو کلی اختیار ہو کہ جس کو چاہے کھڑا کرے اور مرکزی مداخلت کم از کم ہو۔ سر فضل حسین نے نواب صاحب چھتاری کو مشورہ دیا تھا کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر لڑ کر مسلمان گورنمنٹ میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس لئے زمیندار یا ایگریکلچرسٹ پارٹی بنا کر الیکشن لڑے جائیں کیونکہ ایسی پارٹی میں سب ہی گورنمنٹ میں آجائیں گے۔" اس سے قبل سر فضل حسین نے جناح سے کہہ دیا تھا کہ "خبردار پنجاب کو ہاتھ نہ لگانا۔"[12] جناح کے خلاف یو۔ پی اور پنجاب کے زمینداروں کے گٹھ جوڑ کا پس منظر یہ تھا کہ اپریل 1936ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں نوبزادہ لیاقت علی خان کے مسلم لیگ کا آنریری جنرل سیکرٹری منتخب ہونے کے بعد 10ر مئی کو بمبئی میں مسلم لیگ کا جو اجتماع ہوا تھا اس میں جناح کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ 1935ء کے ایکٹ کے تحت آئندہ صوبائی انتخابات کے لئے اپنی صوابدید سے 25 ارکان پر مشتمل ایک پارلیمانی بورڈ نامزد کرلیں چنانچہ انہوں نے یو۔ پی سے جن سات ارکان کو نامزد کیا تھا ان میں زمینداروں کی اکثریت نہیں تھی اگرچہ نواب اسماعیل خان اور نوابزادہ لیاقت علی خان ان میں شامل تھے۔ گویا اس اجلاس میں ہی جناح نے زمینداروں کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا تھا کہ "ہمارے خیال کے زیادہ ممبر پارلیمنٹری بورڈ میں لئے جائیں۔ صوبائی بورڈ کو کلی اختیار ہو کہ جس کو چاہے کھڑا کرے اور مرکزی مداخلت کم از کم ہو۔"

7ر جون 1936ء کو نواب چھتاری کے ہاں یو۔ پی کے زمینداروں کی متذکرہ میٹنگ کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خان نے ایک بار پھر صدر مسلم لیگ سے یہ مطالبہ کیا کہ یو۔ پی کے

صوبائی پارلیمانی بورڈ کو ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈ کے نمائندوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جناح نے اس مطالبہ پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے نوابزادہ لیاقت علی خان اور چودھری خلیق الزماں کو بمبئی طلب کیا اور ان سے بحث وتمحیص کے بعد لیاقت علی خان کا مطالبہ مسترد کر دیا۔ نوابزادہ کو بہت ناگوار گزرا اور اس نے مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہونے کے ڈھائی ماہ بعد مسلم لیگ اور اس کے پارلیمانی بورڈ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس نے اپنے اس استعفیٰ کے جواز میں ایک بیان بھی جاری کیا۔ جس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ ''مسٹر جناح نے پارلیمانی بورڈ میں صرف ایک خیال کے لوگوں کو کثرت سے بھر دیا ہے اور ان لوگوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور انتخاب میں الیکشن کے ذریعے آئے ہیں۔ میرا ایسے بورڈ میں ہونا فضول ہے جس میں اکثریت ایک پارٹی کے ہم خیال ممبران کی ہے جو عرصہ دراز سے مسلمانوں سے جدا ہیں اور اپنے اپنے پٹھوؤں کو لیگ کا ٹکٹ دلوا کر مسلمانوں میں رخنہ ڈلوانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں طے کر کے ایک ساتھ ووٹ دیتے ہیں اس لئے میرا اس بورڈ کا ممبر ہونا بے کار ہے۔ میں اس میں شریک نہیں رہ سکتا اور اس کو ملک وملت کے مفاد کے خلاف سمجھتا ہوں لہٰذا استعفیٰ دیتا ہوں۔''[13]

مطلب یہ تھا کہ چونکہ پارلیمانی بورڈ میں زمینداروں کی اکثریت نہیں ہے اس لئے یہ ''ملک وملت'' کے مفاد کے خلاف ہے۔ صوبائی گورنر سر ہیری ہیگ نے 7رمئی کو نواب یامین خان سے ملاقات کے دوران اسے یہی بات بتائی تھی۔ پنجاب کے یونینسٹ لیڈر سر فضل حسین کا بھی یہی خیال تھا کہ جناح کی قیادت میں مسلمان زمینداروں کا مفاد محفوظ نہیں ہوگا۔ وہ زمینداروں کی ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی بنانے کے حق میں تھا اور اس نے اسی بنا پر 10رمئی کو مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی صدارت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔'' اس اجلاس کے بعد مسلم لیگ کا جو پارلیمانی بورڈ بنا تھا اس کو سر فضل حسین نے کہا تھا کہ اس میں خودغرض ناتجربہ کار شامل ہیں جو اپنی اپنی خواہشات رکھتے ہیں اور ان خواہشات کے پورا نہ ہونے پر سب علیحدہ ہو جائیں گے۔ اس نے 9رجولائی کو اپنے مرنے سے چند دن پہلے سر سکندر حیات خان سے کہا تھا کہ (بمبئی سے) آن کر پنجاب سنبھالو۔ نواب صاحب چھتاری کو یہی سمجھایا تھا کہ یو۔ پی میں مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو جائے گا اگر لیگ ٹکٹ پر الیکشن لڑے لہٰذا ایگریکلچرسٹ پارٹی بنا کر کھڑے ہوں۔''[14]

نوابزادہ لیاقت علی خان کو صدر مسلم لیگ محمد علی جناح سے سیاسی رشتہ توڑنے کا فوری

طور پر یہ صلہ ملا کہ حکومت ہند نے اسے ایک سرکاری تجارتی وفد کے مشیر کی حیثیت سے لندن بھجوا دیا۔ یہ سرکاری تجارتی وفد وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے یونینسٹ رکن سر محمد ظفر اللہ خان کی زیر قیادت لندن گیا تھا۔ اس کا مقصد حکومت برطانیہ کے ساتھ کپاس اور کپڑے کی برآمد و درآمد کے بارے میں ایک نیا تجارتی معاہدہ کرنا تھا۔ اس وفد کے چھ غیر سرکاری مشیر تھے۔ نوابزادہ لیاقت علی خان، سردار تارا سنگھ اور سر ایڈورڈ بینتھال زمینداروں کے نمائندہ تھے اور پرشوتم داس ٹھاکر داس، کستور بھائی لال جی اور جی، ڈی برلا احمد آباد اور بمبئی کے مل اونرز کے نمائندہ تھے۔ ظاہر ہے کہ نوابزادہ کی اس سرکاری لندن یاترا میں صدر مسلم لیگ کی مرضی اور منظوری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایگریکلچرسٹ پارٹی کے ''ملک وملت'' کا مفاد مسلم لیگ کے ملک وملت کے مفاد سے متصادم تھا۔ فروری 1937ء میں نوابزادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر نہیں بلکہ ایگریکلچرسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا اور بھاری اکثریت سے یو۔ پی کی صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ مسلم لیگ نے یو۔ پی کی 36 مسلم نشستوں میں سے 29 جیتی تھیں۔ اس الیکشن کے بعد مارچ میں یو۔ پی کے مسلمان زمینداروں کے دو لیڈروں نواب محمد یوسف اور نواب چھتاری نے مسلم لیگ میں دوبارہ شامل ہونے کے لئے جناح سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر جناح نے ان سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ اُسے ان زمینداروں سے سخت نفرت تھی۔ پھر چند ماہ بعد جب صوبائی اسمبلی کا سیشن ہوا تو نواب چھتاری، نواب سر محمد یوسف اور نواب جمشید علی خان آف باغپت نے ایگریکلچرسٹ پارٹی کے ارکان کی حیثیت سے نشستیں سنبھالیں لیکن نوابزادہ لیاقت علی خان اور راجہ سلیم پور آزاد ارکان کی حیثیت سے بیٹھے کیونکہ وہ مسلم نشستوں پر مسلم لیگ کی شاندار کامیابی کے بعد اس میں واپسی کے لئے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے۔ مارچ 1938ء میں نواب سر محمد یوسف اور نواب چھتاری نے چودھری خلیق الزماں سے درخواست کی کہ ان کی ایگریکلچرسٹ پارٹی کے سارے مسلمان ارکان کو مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی میں شامل کر لیا جائے مگر اس نے انکار کر دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح یو۔ پی کے مسلمان غیر کسان مسلم لیگ سے بددل ہو جائیں گے۔ تاہم اس کے چند ہفتے بعد جب نوابزادہ لیاقت علی خان نے چودھری خلیق الزماں سے اس قسم کی درخواست کی تو اسے مسلم لیگ پارٹی کی نشستوں پر بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی۔ قبل ازیں 20 / مارچ 1938ء کو دہلی میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تھا جس میں صوبائی اور مرکزی

پارلیمانی پارٹیوں کی تشکیل کا فیصلہ کرنے کے علاوہ نوابزادہ لیاقت علی خان کو پھر مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب کرلیا گیا تھا۔ اس وقت تک کانگرس سات صوبوں میں برسر اقتدار آچکی تھی اور اس نے کسی غیر کانگرسی مسلمان کو وزارت میں شامل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مسلم لیگ کو مسلمانوں کی بااختیار نمائندہ جماعت بھی تسلیم نہیں کرتی تھی۔

دراصل کانگرس کے اس تنگ دلانہ رویہ سے بددل ہو کر ہی لیاقت علی خان مسلم لیگ میں قائداعظم جناح کی زیر قیادت دوبارہ کام کرنے پر تیار ہوا تھا۔ وہ لیگ میں پہلے بھی رہا تھا۔ 1935ء کی آئینی اصلاحات کے مجوزہ انتخابات میں حصہ لینے کے لئے صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل پر یو۔ پی کے جاگیرداروں کا جناح کے ساتھ اختلاف پیدا ہوا۔ اس پر لیاقت نے لیگ سے استعفیٰ دے دیا اور ایگریکلچرسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا جو پنجاب اور یو۔ پی کے جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی تاکہ "گورنمنٹ میں آجائیں"، لیکن جب اسمبلی میں اکثریت کی حامل کانگرس پارٹی نے ان کو حکومت میں لینے سے انکار کر دیا تو اس نے یو۔ پی کے بعض دوسرے مسلم جاگیرداروں کی طرح لیگ سے انحراف ترک کر کے پھر سے جنرل سیکرٹری کا عہدہ سنبھال لیا اور اس طرح جناح کے ساتھ متحدہ محاذ وضع کیا کہ ہندو بورژوازی کے خلاف مسلم بورژوا کے ساتھ متحدہ محاذ قائم کئے بغیر اب کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے درمیان طبقاتی تضاد کا دوسرا اہم مظاہرہ 28/مارچ 1939ء کو ہوا جبکہ مرکزی اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی نے اپنے لیڈر محمد علی جناح کی تجویز کے مطابق حکومت ہند اور حکومت برطانیہ کے درمیان تجارتی معاہدے پر رائے شماری میں حصہ لینے سے گریز کیا اور اس طرح اسمبلی میں یہ معاہدہ کانگرس کی اکثریت کی وجہ سے نامنظور ہو گیا۔ یہ وہی معاہدہ تھا جس کی خاطر لیاقت علی خان جولائی 1937ء میں مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر سر محمد ظفر اللہ خان کے ہمراہ غیر سرکاری مشیر کی حیثیت سے لندن گیا تھا۔ یہ معاہدہ کپاس پیدا کرنے والے پنجاب، سندھ اور یو۔ پی کے زمینداروں کے حق میں تھا اور احمد آباد اور بمبئی کے پارچہ بافی کے کارخانوں کے مالکان کے مفاد کے منافی تھا۔ جب مرکزی اسمبلی میں یہ معاہدہ منظوری کے لئے پیش ہوا تھا ان دنوں نوابزادہ اس اسمبلی کا رکن نہیں تھا بلکہ وہ یو۔ پی کی صوبائی اسمبلی میں بیٹھتا تھا۔ نواب سر یامین خان کہتا ہے کہ سر ظفر اللہ خان نے اس معاہدے پر رائے شماری سے قبل سارے

جاگیرداروں سے یہ وعدہ لئے لیا تھا کہ وہ اس کے حق میں ووٹ دیں گے۔ مگر مسٹر جناح کے اصرار پر مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ارکان کو غیر جانبدار رہنا پڑا۔ سر ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ لندن میں 1937ء میں تجارتی معاہدے کی ابتدائی بات چیت کے بعد" میں جب واپسی پر بمبئی پہنچا تو مجھے خیال ہوا کہ اس مرحلے پر (قائداعظم) مسٹر جناح سے مل لینا ہی مناسب ہوگا۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تجارتی معاہدے کی گفتگو جس نہج پر چل رہی تھی مختصراً گوش گزار کی۔ میں جانتا تھا کہ تفصیل انہیں سر پرشوتم داس ٹھاکر داس سے معلوم ہو جائے گی کیونکہ بمبئی کے تجارتی حلقوں کے ساتھ ان کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ میری بات سن کر انہوں نے فقط اتنا فرمایا کہ تم اپنی سی کوشش کئے جاؤ اگر نتیجہ ہندوستان کے حق میں فائدہ مند ہوگا تو مجھے نئے معاہدے کی تائید میں تامل نہ ہوگا...... 1938ء میں یہ معاہدہ ہو گیا تو اسے اسمبلی کے 1939ء کے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ کانگرس تو حزب مخالف تھی۔ انہوں نے معاہدہ کی مخالفت کرنا ہی تھی۔ سر ہومی مودی نے مجھے بتایا کہ مسٹر جناح نے ان سے دریافت کیا تھا کہ تم کس طرف رائے دو گے۔ سر مودی نے کہا میں مل اونرز ایسوسی ایشن کا صدر ہوں اور میری ایسوسی ایشن چاہتی ہے کہ میں اسمبلی میں معاہدے کے خلاف رائے دوں کیونکہ ان کی رائے میں اس معاہدے کا زیادہ فائدہ تو ملک کے زمینداروں کو ہے جن کی کپاس زیادہ مقدار میں اور اچھی قیمت پر خریدی جائے گی جس کے نتیجے میں ملک کے اندر بھی کپاس کی قیمت بڑھ جائے گی اور یہاں کے کارخانوں کا بنا ہوا کپڑا مہنگا ہو جائے گا۔ ادھر لنکا شائر کے بنے ہوئے کپڑے رعائتی شرح پر محصول عائد ہونے کے نتیجے میں ان کے کپڑے کی قیمت کم ہو جائے گی اس طرح ہندوستانی مل اونرز کو لنکا شائر والوں سے دونوں محاذوں پر مقابلہ کرنا ہوگا اور زمینداروں کو جو فائدہ پہنچے گا، اس کی قیمت انہیں ادا کرنا ہوگی۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ معاہدے کے اندر اس قسم کا توازن مدنظر رکھا گیا ہے کہ ہم اس قسم کے کپڑے میں جو ہمارے کارخانوں میں بنایا جاتا ہے پھر بھی لنکا شائر کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اس کے باوجود کارخانہ داروں کی خواہش ہے کہ میں معاہدے کے خلاف رائے دوں۔ میں غیر جانبدار رہوں گا اور کسی طرف رائے نہیں دوں گا۔ مسٹر مودی نے کہا کہ میں نے یہ گفتگو تمہیں اس لئے بتا دی ہے کہ تمہیں میرا مؤقف معلوم ہو جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ میں نے (قائداعظم) مسٹر جناح سے کیا کہا ہے۔"[15]

اس معاہدے پر رائے شماری کے بعد 11 اپریل کو نواب سر محمد یامین خان کی وائسرائے سے پرائیویٹ ملاقات ہوئی جس کے بارے میں اس نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ "ان کو مسلم لیگ سے شکایت ہے کہ ہم نے معاہدۂ تجارت میں خاموش رہ کر کانگرس کی مدد کی جن کا منشا صرف گورنمنٹ کے ہر کام میں حارج ہونا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ مسٹر جناح نے ترکیب سے بمبئی کے مل اونرز کی مدد اس طرح کی ہے کہ لیگ کو خاموش کرا دیا جس سے کانگرس کو کامیابی ہوئی جو بمبئی اور احمد آباد کے مل والے چاہتے تھے۔"[16]

سر محمد ظفر اللہ خان اور نواب سر محمد یامین خان کے ان بیانات کا مطلب یہ ہے کہ جناح نے بمبئی مل اونرز ایسوسی ایشن کے صدر سر ہومی مودی کی خواہش کے مطابق زمینداروں کے خلاف احمد آباد اور بمبئی کے ہندو اور پارسی مل اونرز کا ساتھ دیا تھا۔ قائداعظم جناح کی قیادت میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے متذکرہ تجارتی معاہدے پر رائے شماری میں حصہ نہ لینے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ پارٹی کے قائد کو زمینداروں کے مفاد سے زیادہ عزیز ملک کی صنعت و حرفت کے مفادات تھے۔ قطع نظر اس کے کہ ہندوستان میں صنعت کے مالکان ہندو ہوتے تھے اور یہ وہ دن تھے جبکہ کانگرس کی صوبائی وزارتوں کے باعث برصغیر میں ہندو مسلم تضاد اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ رہا تھا اور مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں مطالبہ پاکستان زور پکڑ رہا تھا۔ سندھ پراونشل مسلم لیگ کانفرنس 17 اکتوبر 1938ء کو اس مضمون کی قرارداد منظور کر چکی تھی کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں قوموں کی معاشی اور معاشرتی بہتری اور سیاسی حق خود ارادیت کے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم لیگ کو اس سوال پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ ہندوستان میں کس قسم کا آئین مناسب رہے گا اور ایک ایسی سکیم تیار کرنی چاہیے جس کے تحت مسلمانوں کو مکمل آزادی مل سکے۔ آل انڈیا فیڈریشن کی سکیم کو ترک کر دیا جائے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کوئی ایسا آئین قابل قبول نہیں ہوگا جو متذکرہ اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتا ہوگا"[17] اور اس تجارتی معاہدے پر رائے شماری سے دو دن قبل آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے میرٹھ میں اپنے اجلاس میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ ان مختلف آئینی سکیموں کا جائزہ لے جن کے تحت مسلمانوں سے انصاف ہو سکے۔

جناح۔ لیاقت تضاد کا تیسرا اہم مظاہرہ 45-1944ء میں ہوا جبکہ نوابزادہ لیاقت علی خان نے مرکز میں عبوری حکومت کے قیام کے لئے صدر مسلم لیگ سے بالا بالا کانگرس اسمبلی پارٹی

کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجوزہ سمجھوتہ یہ تھا کہ مسٹر ڈیسائی اور مسٹر جناح کو موجودہ آئین کے تحت عبوری حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ وائسرائے کی کونسل میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا تناسب مفاہمت سے طے کیا جائے گا۔ ڈیسائی اس بات پر آمادہ تھا کہ اگر ضروری ہو تو کانگرس اور مسلم لیگ کو مساوی نمائندگی دی جائے گی اور بیس فیصد نشستیں دوسرے عناصر کو ملیں گی۔ طویل المیعاد مسئلہ کے بارے میں کوئی وعدے وعید نہیں ہوں گے۔ مرکز اور صوبوں میں عام انتخابات نہیں ہوں گے۔ صوبوں میں موجودہ وزارتیں جاری رہیں گی اور جن صوبوں میں کانگرس کے مستعفی ہو جانے کے باعث گورنر راج نافذ ہے وہاں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارتیں قائم ہوں گی۔ نوابزدہ لیاقت علی خان نے اس سمجھوتے پر مرکزی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر کی حیثیت سے دستخط کئے تھے۔ اس عہدہ پر وہ 10 رفروری 1942ء کو فائز ہوا تھا کیونکہ قائداعظم جناح علالت اور دوسری مصروفیتوں کی وجہ سے اسمبلی میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ اسمبلی پارٹی کے سیکرٹری کا عہدہ نواب سر محمد یامین خان کے پاس ہی رہا تھا جو مارچ 1938ء میں اس عہدہ کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ نواب یامین خان نے اس لیاقت۔ ڈیسائی پیکٹ کے بارے میں اپنی یکم اپریل 1944ء کی ڈائری میں عجیب وغریب انکشاف کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ قائداعظم جناح کو ان دنوں کس قسم کی سازشوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یامین خان لکھتا ہے کہ ”قائداعظم محمد علی جناح تو بہت بیمار ہونے کے بعد دہلی سے بمبئی اور وہاں سے ملیر چلے گئے۔ یہاں بھولا بھائی ڈیسائی اور نوابزادہ لیاقت علی خان میں سے کوئی دوسرے کے گھر جانے کے لئے تیار نہ تھا اس لئے میں نے اپنے یہاں ان دونوں کو اور مسز سروجنی نائیڈو کو چائے پر بلایا۔ پھاٹک پر میں نے اپنے موٹر ڈرائیور شفیق احمد کو بٹھا دیا کہ اور کسی کو اندر نہ آنے دے اور کہہ دے کہ لیڈی یامین خان کی ملنے والی عورتیں آئی ہیں اس لئے اندر جانے کی ممانعت ہے۔ مسٹر شرما صحافی جو ہندوستان ٹائمز کے نمائندہ ہیں انہوں نے نوابزادہ کی اور بھولا بھائی ڈیسائی کی موٹریں دیکھ کر اندر آنا چاہا لیکن میرے ملازم نے احاطہ کے اندر نہیں آنے دیا مگر وہ اِدھر اُدھر منڈلاتے رہے۔

”چائے پر یہ طے ہوا کہ موجودہ حکومت کو نکالا جائے اور اس کی یہ صورت ہے کہ لیگ اور کانگرس متحد ہو کر گورنمنٹ بنائیں۔ لہٰذا یہ قرار پایا کہ پانچ مسلم لیگ کے اور پانچ کانگرس کے ایگزیکٹو کونسلر ہوں اور دو اقلیتوں میں سے لئے جائیں جن میں سے ایک سکھ، اگر ممکن ہو، لیا

جائے۔ یہ سب ایگزیکٹو کونسلر صرف لیجسلیٹو کے ممبر ہی نہیں ہوں گے، باہر سے بھی لئے جائیں گے اور جو بات یہ لوگ اسمبلی سے منوا سکیں گے اس کو گورنر جنرل کے حکم سے نہ منوایا جائے گا اور سب مل کر بطور ایک پارٹی کے کام کریں گے۔ کانگرس کے ممبروں کا اگر لیگ کے ممبروں سے کسی بات پر اختلاف ہوگا تو اس کو ووٹوں کی اکثریت سے کانگرس منوانے کی کوشش نہیں کرے گی بلکہ مسلمانوں کے خیال کا احترام کرے گی۔ بھولا بھائی نے کہا کہ وہ مہاتما گاندھی سے مل کر اس کی منظوری حاصل کرلیں گے تب یہ اسکیم وائسرائے کے سامنے پیش کی جائے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس وقت یہ بات زیر بحث نہیں آئی تھی کہ قائداعظم کی بھی منظوری لیاقت علی خان حاصل کریں گے۔ چونکہ لیاقت علی خان کا خیال، ڈاکٹروں کی رائے کی وجہ سے، یہ تھا کہ قائداعظم صرف چند دن کے اور مہمان ہیں اور اب ان کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں۔ بھولا بھائی نے کہا کہ وہ یہ باتیں ایک پرچہ پر تحریر کر کے دکھائیں گے۔ چنانچہ اگلے دن بھولا بھائی ڈیسائی نے اسمبلی میں نوابزادہ لیاقت علی خان کو اگریمنٹ دکھایا جو اس معاہدے کے مطابق بنایا تھا جو میرے گھر پر ہوا تھا۔ لیاقت علی خان نے اس پر چھوٹے دستخط کر دیئے چونکہ بھولا بھائی نے کہا کہ وہ مہاتما گاندھی کو پونا جیل میں جا کر دکھائیں گے تو ان کو یہ اطمینان دلانا ہوگا کہ لیگ تیار ہے۔ مسٹر شرما اور دوسرے اخباروں کے نمائندوں نے بہت کوشش کی کہ راز معلوم ہو جائے لیکن اس وقت کامیاب نہ ہو سکے۔ اس معاہدے کو لے کر بھولا بھائی پونا پہنچے اور اپنے اثر سے ملاقات مہاتما گاندھی سے کی جنہوں نے دیکھتے ہی اسکیم کی منظوری دے دی۔ بغیر بولے دستخط کر دیئے چونکہ وہ دن اُن کے بولنے کا نہ تھا۔

''جس معاہدہ پر ڈیسائی اور لیاقت کے دستخط ہوئے تھے وہ کسی طرح قبل از وقت پریس کے ہاتھ پڑ گیا اور 10 اپریل کو اخبار میں آ گیا۔ قائداعظم نے جس وقت ملیر میں یہ خبر پڑھی انہوں نے نواب اسماعیل خان کو جو کمیٹی آف ایکشن کے چیئرمین تھے اور مدراس گئے ہوئے تھے فون کیا اور کہا کہ میرے بغیر علم کے یہ کیسے کیا گیا۔ نواب اسماعیل خان نے کہا کہ وہ تو مدراس میں ہیں اور معاہدہ دہلی میں ہوا ہے جس کا علم لیاقت علی خان کو ہوگا۔ قائداعظم نے لیاقت علی خان کو فون کیا اور ڈانٹ کر کہا کہ میری اجازت کے بغیر یہ معاہدہ کیسے کیا گیا۔ لیاقت علی خان گھبرا گئے اور کہا کہ یہ طے پایا تھا کہ آپ کی اور گاندھی کی اجازت لی جائے گی اس وقت اس کو معاہدہ سمجھا جائے گا۔ یہ تو ایک مسودہ تھا اور میں نے کہا تھا کہ گاندھی کی منظوری لے لو تو تب

قائداعظم کودکھایا جائے گا اوراس وقت تک راز رہے گا۔لیکن قائداعظم یہ نہیں چاہتے تھے کہ دوسرا شخص کوئی معاہدہ کی بابت گفتگو کرے۔اس کو پارٹی پسند نہیں کرتی تھی لیکن قائداعظم کے احترام کی وجہ سے کچھ بول نہ سکتے تھے۔اب قائداعظم کوافاقہ بھی ہو گیا تھا اور روبہ صحت ہو چلے تھے اور لیاقت علی خان کو محسوس ہو گیا تھا کہ ڈاکٹروں کی رائے کہ چند دن کے اور مہمان ہیں غلط نکلی اس لئے لیاقت علی خان نے بیان دے دیا کہ یہ غلط ہے کہ ان کا اور بھولا بھائی ڈیسائی کا معاہدہ ہو گیا ہے۔"[18] اگر چہ یامین خان کے اس بیان میں تاریخوں کی غلطی ہے کیونکہ دوسرے مؤرخین کے بیان کے مطابق لیاقت، ڈیسائی معاہدہ جنوری 1945ء میں ہوا تھا۔تاہم یہ واقعہ جس تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس معاہدے کے سلسلے میں لیاقت اور ڈیسائی کے درمیان ابتدائی بات چیت 1944ء میں کسی وقت یامین کے گھر میں ہوئی تھی۔

لارڈ ویول نے اکتوبر 1943ء میں لارڈ لنلتھگو سے وائسرائے کے عہدے کا چارج لیا تھا۔ ہوڈسن لکھتا ہے کہ "چونکہ لیاقت۔ڈیسائی فارمولا وائسرائے ویول کے اپنے خیالات سے مطابقت رکھتا تھا اس لئے وہ اسے جامۂ عمل پہنانے کا خواہاں تھا چنانچہ اس نے 1945ء کے اوائل میں گورنر بمبئی کے ذریعے مسٹر جناح سے اس سلسلے میں استفسار کیا اور یہ کہلوا بھیجا کہ اگر وہ اس پلان کو قابل عمل سمجھتے ہیں تو کیا صلاح مشورہ کے لئے دہلی آ سکتے ہیں۔اس پر جناح نے جواب دیا کہ مجھے ڈیسائی۔لیاقت بات چیت کا کچھ علم نہیں تاہم میں مارچ میں دہلی آؤں گا تو اس سلسلے میں وائسرائے سے بخوشی تبادلۂ خیالات کروں گا۔بدقسمتی سے جناح جب دہلی آئے تو بیمار پڑ گئے اور اس بنا پر اس مسئلہ پر کوئی بات چیت نہ ہو سکی۔مسٹر لیاقت علی خان بعد میں اس معاہدے سے منکر ہو گیا اور کانگرس میں ڈیسائی کے خلاف جذبات برانگیختہ ہو گئے کیونکہ یہ محسوس کیا گیا کہ اس نے جماعت سے غداری کی ہے۔"[19] چودھری خلیق الزماں لکھتا ہے کہ "مسٹر جناح نے مجھ سے 7ر جولائی 1945ء کو شملہ میں دریافت کیا تھا کہ کیا تم ڈیسائی۔لیاقت پیکٹ کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔میں نے کہا اس سلسلے میں، میں نے بات نہیں کی البتہ مجھے اپنے ہندو دوستوں سے جو بھولا بھائی ڈیسائی کے بھی قریبی دوست ہیں، معلوم ہوا تھا کہ جنوری 1945ء میں جبکہ یہ دونوں اسمبلی میں تھے ڈیسائی نے ایک چٹ بھجوائی تھی جس پر 40:40:20 لکھا ہوا تھا اور نوابزادہ نے اس پر لکھ دیا تھا کہ "ہاں منظور ہے۔"[20] ابوالکلام آزاد کا بیان ہے کہ بعض مشترکہ دوستوں نے

نوابزادہ لیاقت علی خان اور بھولا بھائی ڈیسائی سے رابطہ پیدا کر کے عبوری حکومت کے قیام کے لئے مفاہمت کی کوشش کی تھی۔ لیاقت علی خان اس مقصد کے لئے بات چیت کے لئے آمادہ ہو گیا تو دونوں میں ملاقات ہوئی...... اس کے بعد بھولا بھائی ڈیسائی گاندھی سے ملا اور اسے لیاقت علی اور دوسرے دوستوں سے کی گئی بات چیت سے آگاہ کیا۔ گاندھی ہر پیر کو چپ رہا کرتا تھا لہٰذا اس نے بھولا بھائی سے کوئی بات تو نہ کی البتہ اس نے گجراتی زبان میں اس کا جواب لکھ دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ بات چیت جاری رکھو اور تفصیلات معلوم کرنے کے بعد مجھے بتاؤ۔ چنانچہ بھولا بھائی نے گاندھی سے یہ اختیار حاصل کرنے کے بعد بات چیت جاری رکھی جس کے نتیجہ میں یہ سمجھوتہ ہوا کہ ایگزیکٹو کونسل کی از سر نو تشکیل ہو گی۔ جس میں کانگرس پارٹی اور لیگ پارٹی کے ارکان شامل ہوں گے۔ بات چیت کرنے والوں کی خواہش تھی کہ بھولا بھائی ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہوں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کانگرس اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر عبدالقیوم خان کو کونسلر بنایا جائے۔ بھولا بھائی نے یہ ساری باتیں گاندھی کو بتائیں مگر بعض وجوہ کی بنا پر یہ گفت وشنید ناکام ہو گئی اور پھر اس معاملے کو ترک کر دیا گیا۔"[21]

خالد بن سعید لکھتا ہے کہ "جب گورنر بمبئی سر جان کولول نے وائسرائے ویول کی ہدایت کے مطابق جناح سے ملاقات کی تھی تو اس سے قبل جناح ایک بیان میں لیاقت۔ ڈیسائی بات چیت سے لاعلمی کا اظہار کر چکے تھے اور وہ یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ ان تجاویز کی تشکیل لیگ کی اتھارٹی کے بغیر ہوئی ہے۔ جناح کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ لیاقت علی خان نے جناح کو مطلع کئے بغیر ڈیسائی سے کوئی نہ کوئی خفیہ معاہدہ کر لیا تھا۔ اگر یہ بات صحیح تھی تو اس نے نہ صرف اعتماد شکنی کی تھی بلکہ مسلم لیگ پارٹی کی واضح ہدایات کی بھی خلاف ورزی کی تھی۔ ہر سال صدر کو یہ اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے آئندہ سالانہ اجلاس تک دوسری پارٹیوں سے گفت وشنید کرے اور ایسے اقدامات کرے جنہیں وہ مسلم لیگ کے مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھے۔ اس اسکیم میں لیاقت علی خان نے نہ صرف اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا بلکہ اس نے مسلم لیگ کے سیکرٹری کی حیثیت سے صدر کو ڈیسائی۔ لیاقت پیکٹ میں مشمولہ اہم تجاویز سے آگاہ بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے اس کے بارے میں اس زمانے کی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے کئی ایک ارکان کے علاوہ ایسے افراد سے بھی بات کی ہے جو جناح کے بہت قریب تھے۔ ان سب نے مجھے بتایا کہ

قائداعظم نے اس واقعہ کے بارے میں لیاقت کے رویے پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ لیاقت اپنی صفائی میں یہ کہتا تھا کہ چونکہ انگریز کسی وقت بھی یہاں سے دستبردار ہو جائیں گے اس لئے دونوں فرقوں کے درمیان مفاہمت ہو جانی چاہیے۔ چونکہ جناح اور گاندھی دونوں ہی بوڑھے ہیں اس لئے انہوں نے اب تک بے لچک رویہ اختیار کر رکھا ہے اور اس بنا پر وہ ہندو مسلم مفاہمت نہیں کرا سکے ہیں۔ لیاقت یہ محسوس کرتا تھا کہ ان سے کم عمر لوگوں کو اس سلسلے میں کوشش کرنی چاہیے۔''[22] خالد بن سعید کی اس اطلاع سے نواب سر محمد یامین خان کے اس بیان کی بہت حد تک تائید ہوتی ہے کہ لیاقت علی خان کی ڈاکٹروں کے ذریعے اطلاع یہ تھی کہ جناح بیمار ہیں۔ چند دن کے مہمان ہیں اس لئے انہیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں لیکن پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قریبی دوست اشتیاق حسین قریشی کا خیال ہے کہ ''اس پیکٹ کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ جن لوگوں نے اس بات چیت میں حصہ لیا تھا ان میں سے کسی نے بھی اس راز پر سے پردہ نہیں اٹھایا۔ ہمارا واحد ذریعہ معلومات (وی۔ پی) مینن ہے لیکن اس کے بیان میں واضح طور پر مبالغہ آمیزی ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ لیاقت علی خان اور ڈیسائی کے درمیان عارضی یا قطعی کوئی نہ کوئی سمجھوتہ ہوا تھا اور جناح نے بعد ازاں اس سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا تھا۔ ہمیں اب یہ بات کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی کہ جناح نے ایسا کیوں کیا تھا۔ آیا لیاقت نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا یا جناح نے اپنا خیال بدل لیا تھا؟''[23] یہ اشتیاق حسین قریشی تاریخ کا پرانا پروفیسر ہے۔ قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد لیاقت علی خان کابینہ میں وزیر اطلاعات مقرر ہوا تھا لیکن بظاہر اس دوران تاریخ کی ایک حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں اس کا جذبۂ تحقیق کبھی بیدار نہیں ہوا تھا اور اس نے قائداعظم یا لیاقت علی خان سے براہِ راست یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی کہ لیاقت ڈیسائی پیکٹ کی حقیقت کیا تھی۔ اس کے اس رویے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ شخص دراصل نہ صرف اپنے محسن و ممدوح لیاقت علی خان کی قائداعظم سے بے وفائی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے بلکہ اشارۃً یہ الزام عائد کر رہا ہے کہ جناح نے لیاقت۔ ڈیسائی پیکٹ سے لاعلمی کا اظہار کر کے غلط بیانی کی تھی۔ اس کی تاریخ نویسی میں دیانت کے معیار کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا کہ لیاقت علی خان نے اپریل 1936ء میں مسلم لیگ کا جنرل

سیکرٹری بننے کے تقریباً اڑھائی ماہ بعد مسلم لیگ سے محض اس لئے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ جناح نے یو۔پی کے پارلیمانی بورڈ کی تشکیل اس کی مرضی کے مطابق نہیں کی تھی اور اس نے صوبائی اسمبلی کا انتخاب زمینداروں کی ایگریکلچرسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لڑا تھا اور یہ کہ ایگریکلچرسٹ پارٹی یو۔پی کے اس وقت کے گورنر سر میلکم ہیلی یا پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کے سرغنہ سر فضل حسین کے کہنے پر بنائی گئی تھی۔ بظاہر اشتیاق قریشی کی رائے میں یہ واقعات تاریخی لحاظ سے قابل ذکر نہیں تھے۔

لیاقت۔ڈیسائی معاہدہ کے نتیجے میں قائداعظم محمد علی جناح کا لیاقت علی خان پر سے اعتماد بالکل اٹھ گیا تھا۔ ایک مرتبہ مس فاطمہ جناح کو پاکستان کے سول افسر مختار مسعود کے ہمراہ فیصل آباد سے لاہور تک کار میں اکٹھے سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مختار مسعود لکھتا ہے کہ ''مس فاطمہ جناح نے راستے میں بہت سی باتیں کیں اور یہ اکثر صاف اور کھری باتیں تھیں۔ مس جناح نے بتایا کہ قائداعظم نے لیاقت علی خان کی سوجھ بوجھ پر، لیاقت ڈیسائی پیکٹ کے بعد، کبھی بھروسہ نہ کیا اور اگر وقت اور واقعات کی رفتار اتنی تیز نہ ہوتی تو وہ ضرور کسی اور شخص کو ان کی جگہ دے دیتے۔''[24]

قائداعظم محمد علی جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے درمیان اختلاف کا چوتھا اہم مظاہرہ جولائی 1945ء میں ہوا جبکہ شملہ میں مرکزی عبوری حکومت کی تشکیل کی بات چیت محض اس لئے ناکام ہوگئی تھی کہ صدر مسلم لیگ نے پنجاب کے جاگیرداروں کی جماعت یونینسٹ پارٹی کے مسلمان نمائندہ سر محمد نواز خان نواب آف کوٹ کی مجوزہ حکومت میں شمولیت سے اتفاق کرنے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا۔ اس وقت قائداعظم جناح کا مؤقف یہ تھا کہ مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور کسی حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی کا کلی اختیار اسے ہی حاصل ہے۔ انہوں نے اپنے اس مؤقف کی بنا پر وائسرائے ویول کو مطلع کیا تھا کہ میں مسلم لیگ کی جانب سے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لئے تیار نہیں تاوقتیکہ دو شرائط نہ مان لی جائیں۔ اول یہ کہ پانچوں مسلمانوں کے نام مسلم لیگ کی فہرست سے لئے جائیں۔ دوئم یہ کہ ایگزیکٹو کونسل کی کارکردگی کا یہ ضابطہ مقرر کیا جائے کہ پوری کابینہ کی دو تہائی اکثریت کی حمایت کے بغیر کونسل کوئی فیصلہ نہ کر سکے گی۔ جناح نے ان شرائط کے معاملے میں بے لچک رویہ اختیار کیا اور کسی تصفیہ کے بغیر کانفرنس ناکام ہوگئی۔ جبکہ ہوڈسن لکھتا ہے کہ شملہ کانفرنس کے دوران جناح کو

مسلم لیگ پر مکمل کنٹرول حاصل نہیں تھا۔ یونینسٹ پارٹی ابھی تک طاقتور تھی اور لیاقت علی خان تصفیہ کے حق میں تھا۔"[25] وی۔ پی۔ مینن جو وائسرائے کے سٹاف میں مشیر برائے سیاسی امور کی حیثیت سے وہاں موجود تھا، لکھتا ہے کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ایک رکن حسین امام نے اسے کہا کہ وہ اس تعطل کا حل تلاش کرنے کے لئے لیاقت علی خان سے ملاقات کرے۔ حسین امام نے اُسے یہ تاثر دیا کہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ارکان وائسرائے کی پیش کش مسترد کرنے پر متفق نہیں ہیں۔ اس کے بعد مینن نے ٹیلی فون پر لیاقت علی خان سے رابطہ کیا تو "وہ اس کے ساتھ ملاقات کے لئے فوری طور پر تیار ہو گیا۔" چنانچہ شام کو ان کی ملاقات ہوئی۔ مینن نے لیاقت علی کو سمجھایا بجھایا اور لیاقت اسے یہ کہہ کر رخصت ہوا کہ "میں جناح سے مشورہ کر کے اس کے ردعمل سے کل آپ کو آگاہ کروں گا۔" تاہم مینن لکھتا ہے کہ "اس نے مجھے کوئی جواب نہیں بھیجا۔ ہماری گفتگو کے دوران اس کے رویے سے مجھے کہیں بھی یہ تاثر نہیں ملا تھا کہ وہ معاون نہیں ہو گا۔ اب آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کیا وجوہات تھیں جو میری تجویز کو آگے بڑھانے میں اس کے آڑے آئیں۔"[26] وی۔ پی۔ مینن کو وائسرائے کی انتظامیہ میں کانگرس کے انتہا پسند رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل کا آدمی سمجھا جاتا تھا اور کانگرس کی جانب سے شملہ کانفرنس کی ناکامی کی تمام تر ذمہ داری جناح کی "ہٹ دھری" پر ڈالی جا رہی تھی اس لئے یہاں اُن "وجوہات" سے مینن کی مراد دراصل جناح کی ذات تھی جو مینن کی تجاویز کو آگے بڑھانے میں لیاقت علی کے لئے سدِ راہ ثابت ہوئی۔

خالد بن سعید کا خیال ہے کہ "حسین امام نے جب مینن سے یہ بات کہی تھی تو اس کا اشارہ غالباً مجلس عاملہ کی اس اقلیت کی طرف تھا جو کانگرس سے مفاہمت کرنے کے حق میں تھی۔ وہ خضر حیات یا اس کے کسی نامزد شخص کو عبوری حکومت میں شامل کرنے کے خلاف تھے لیکن وہ غالباً کانگرس کے کوٹہ میں کسی مسلمان کی نامزدگی کے خلاف نہیں تھے۔ لیگ کی مجلس عاملہ میں یہ بھی احساس تھا کہ جناح نے مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے ساتھ مساوی نمائندگی کا جو مطالبہ کیا ہے وہ بہت اونچا ہے کیونکہ اونچی ذات کے ہندو برصغیر کی آبادی کا 60 فی صد تھے جبکہ مسلمانوں کا تناسب 25 فی صد تھا۔ ان سارے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ اگر جناح نام نہاد "غیر مصالحانہ" رویہ اختیار نہ کرتے تو قرارداد لاہور کے صرف سات سال بعد پاکستان وجود میں نہ آتا۔"[27] خالد بن سعید کا یہ خیال صحیح نہیں کہ شملہ کانفرنس کے دوران مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی

اقلیت، جن میں لیاقت علی خان بھی شامل تھا، پنجاب کے یونینسٹوں کے خلاف تھی لیکن وہ کانگرس سے مفاہمت کی خواہاں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کے پنجاب کے یونینسٹوں سے بوجوہ بہت دیرینہ تعلقات تھے اور اس کا بڑا بھائی نواب سجاد علی خان پنجاب کی یونینسٹ اسمبلی پارٹی کا رکن تھا۔ وہ جولائی 1936ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹوکونسل کے یونینسٹ رکن سر محمد ظفر اللہ خان کے ہمراہ جاگیرداروں کے نمائندہ کی حیثیت سے لندن گیا تھا اور پھر اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں وزیراعظم لیاقت علی خان پر یونینسٹ نوازی کے مسلسل الزامات عائد کئے جاتے تھے اور جب اس نے وزارت دفاع میں سر محمد نواز خان نواب آف کوٹ کو وزیر مملکت کے عہدہ پر فائز کیا تھا تو ان الزامات میں بڑی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ سر محمد نواز خان نواب آف کوٹ وہی شخص تھا جسے سر خضر حیات خان ٹوانہ شملہ کانفرنس کے دوران مجوزہ مرکزی عبوری حکومت میں شامل کروانا چاہتا تھا''[28] اور جناح نے اسے بالاصرار مسترد کر دیا تھا۔ شملہ کانفرنس میں وائسرائے کا مجوزہ فارمولا نام نہاد ''لیاقت۔ ڈیسائی پیکٹ'' کے فارمولے سے مطابقت رکھتا تھا اس لئے کانفرنس کے دوران یہ ''پیکٹ'' ایک بار پھر خبروں کا موضوع بن گیا۔

نواب سر محمد یامین خان لکھتا ہے کہ ''بھولا بھائی ڈیسائی نے تمام اخباری نمائندوں کے سامنے کہا کہ بتایئے آپ کے گھر آپ کے سامنے میرا اور لیاقت علی خان کا کیا معاہدہ ہوا تھا اور اب لیاقت علی خان کیوں انکار کرتے ہیں۔ میں نے کہا کہ جو قرار پایا تھا میں اس سے انکار نہیں کر سکتا اور لیاقت علی خان کی تردید کرنا بھی مناسب نہیں۔''[29] تاہم نوابزادہ لیاقت علی خان نے اگست 1945ء میں ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ اس نے بھولا بھائی ڈیسائی سے کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں کیا تھا۔ بات صرف اتنی ہوئی تھی کہ ڈیسائی نے 1944ء کے موسم خزاں میں مجھ سے ملک کی معاشی بدحالی پر تبادلۂ خیالات کیا تھا اور یہ پوچھا تھا کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹوکونسل کی تشکیل نو کے سلسلے میں مسلم لیگ کا رویہ کیا ہوگا اس پر اس نے اپنی اس ذاتی رائے کا اظہار کیا تھا کہ اگر اس صورت حال میں بہتری پیدا کرنے کے لئے کوئی تجاویز پیش کی جائیں تو مسلم لیگ ان پر لازمی طور پر بڑی توجہ سے غور کرے گی۔ تاہم نوابزادہ نے اپنے اس بیان میں یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سلسلے میں بات چیت 1944ء میں نواب یامین کے گھر میں شروع ہوئی تھی۔ چودھری خلیق الزماں

کا خیال ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کے اس بیان میں کوئی وزن نہیں تھا اور اس نے یہ محض مسٹر جناح کے کہنے پر جاری کیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کی یہ رائے بے بنیاد معلوم نہیں ہوتی کیونکہ ان دنوں نوابزادہ لیاقت علی خان، قائداعظم کی کھلم کھلا حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ جناح کو فی الحقیقت برصغیر کے مسلمانوں کی بھرپور اکثریت کی تائید وحمایت حاصل ہو چکی تھی۔ جس کا مظاہرہ چند ہی ماہ بعد 46-1945ء کے عام انتخابات میں ان کی زیر قیادت مسلم لیگ کی 90 فی صد مسلم نشستوں پر کامیابی سے ہو گیا تھا۔

ان انتخابات کے بعد برطانوی سامراج کی لیبر حکومت کا ایک وزارتی مشن برصغیر کی سیاسی وآئینی گتھی اپنے حق میں سلجھانے کے لئے آیا اور جب اس کی ایک تجویز کے مطابق مرکزی عبوری حکومت کی تشکیل ہوئی تو قائداعظم جناح کا جاگیرداروں سے تضاد ایک مرتبہ اور کھل کر سامنے آیا۔ جناح نے 15/اکتوبر 1946ء کو اس عبوری حکومت کے لئے مسلم لیگی نمائندوں کی نامزدگی کے لئے نوابزادہ لیاقت خان یا کسی اور زمیندار سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ازخود ہی جو پانچ مسلم لیگی نمائندے نامزد کئے تھے ان میں کوئی ایک بھی زمیندار نہیں تھا۔ ابوالکلام آزاد کہتا ہے کہ ”نوابزادہ لیاقت علی خان کے علاوہ بنگال کے خواجہ ناظم الدین اور یو۔پی کے نواب اسماعیل خان کے بارے میں یقین کیا جاتا تھا کہ انہیں عبوری حکومت میں شامل کیا جائے گا۔ شملہ کانفرنس کے دوران بھی ان کے نام بار بار لئے جاتے تھے لیکن اب جبکہ لیگ نے ایگزیکٹو کونسل میں شمولیت کا فیصلہ کیا تو جناح نے نہایت عجیب وغریب طریقے سے عمل کیا۔ خواجہ ناظم الدین اور نواب اسماعیل خان نے کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان تنازعہ میں کبھی انتہا پسندانہ مؤقف اختیار نہیں کیا تھا۔ بظاہر جناح ان کے اس رویے سے ناخوش تھے۔ انہوں نے سوچا کہ یہ ہر بات میں ان کی ہاں میں ہاں ملانے سے انکار کر دیں گے اس لئے انہوں نے ان کو مسلم لیگی کونسلروں کی فہرست میں شامل نہ کیا۔ اگر اس حقیقت کا قبل از وقت پتہ چل جاتا تو مسلم لیگ کونسل میں شور مچ جاتا۔ اس لئے انہوں نے لیگ کونسل سے پورے اختیارات پہلے ہی حاصل کر لئے تھے۔“[30]

قائداعظم جناح کی فہرست میں لیاقت علی خان کے علاوہ آئی۔آئی چندریگر، سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خان اور ایک اچھوت جوگندر ناتھ منڈل کے نام شامل تھے۔ ان میں نوابزادہ کے سوا باقی چاروں درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ جب جناح نے 25/اکتوبر کو اس

فہرست کا اعلان کیا تھا تو ''خواجہ ناظم الدین اورنواب اسماعیل خان دہلی کے امپیریئل ہوٹل میں اپنے ناموں کے اعلان کا انتظار کر رہے تھے۔انہیں اوران کے حامیوں کو پورا یقین تھا کہ ان کے نام جناح کی فہرست میں شامل ہوں گے۔ چنانچہ بہت سے مسلم لیگی ارکان ان کے لئے ہار اور گلدستے لائے ہوئے تھے لیکن جب ناموں کا اعلان ہوا تو ان میں سے کوئی بھی شامل نہیں تھا۔ ان کی مایوسی اور غصے کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے۔مسٹر جناح نے ان کی امیدوں پر برفانی پانی ڈال دیا تھا۔''[31] جناح نے مسلم لیگی کونسلروں کے ناموں کا جو اعلان کیا ان پر چودھری خلیق الزماں نے بھی اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی ہے۔''لیکن چونکہ صدر کو اس سلسلے میں اختیارات دیئے جا چکے تھے اس لئے کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا البتہ نواب اسماعیل نے جوگندر ناتھ منڈل کے نام پر اعتراض کیا۔خواجہ ناظم الدین جذبات سے مغلوب ہو کر جلدی سے میرے پاس آیا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں نواب اسماعیل کو اپنا اعتراض واپس لینے پر آمادہ نہیں کروں گا؟ میں نے اس سے اتفاق نہ کیا۔مسٹر جناح نے کانگرس کی طرف سے کسی مسلمان کی نامزدگی پر ہمیشہ اعتراض کیا تھا لیکن اس موقعہ پر انہوں نے خود مسلم کوٹہ میں ایک ہندو کا نام تجویز کر دیا تھا۔ یہ بات دوقومی نظریہ سے کیسے مطابقت رکھتی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین اورنواب اسماعیل خان کی عدم شمولیت کو عمومی طور پر ناپسند کیا گیا تھا کیونکہ چند دن قبل وائسرائے نے جو فہرست تیار کی تھی اس میں ان کے نام شامل تھے اور اس فہرست کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا۔''[32] خالد بن سعید کی رائے میں ''جناح نے ایسے کونسلروں کو نامزد کیا تھا جو اُن کی رائے میں لیگ کے مفادات کے لئے لڑ سکتے تھے۔نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں جیسے لوگ محض اس لئے شامل نہیں کئے گئے تھے کہ یہ لیگ کے اس دھڑے کی نمائندگی کرتے تھے جو کانگرس کے ساتھ مفاہمت کا خواہاں تھا۔ کونسل آف سٹیٹ میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر حسین امام کو بھی شامل نہیں کیا گیا تھا۔''[33] یہ لوگ اپنی عدم شمولیت پر کھل کر اپنے غم و غصے کا اظہار تو کر نہیں سکتے تھے کہ اس وقت تک جناح کا عوامی سیاسی قد کاٹھ اس درجہ بلند ہو چکا تھا کہ ان میں سے کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں تھی۔ چنانچہ جوگندر ناتھ منڈل کو نشانہ بنا کر جناح کی نامزدگیوں پر تنقید کی گئی۔ چودھری خلیق الزماں دراصل اپنی مایوسی کی بنا پر یہ کہتا تھا کہ ''ایک ہندو کی مسلم کوٹہ میں سے نامزدگی دوقومی نظریے کے منافی تھی۔'' حقیقت یہ تھی کہ قائداعظم جناح کا دوقومی نظریہ چودھری خلیق الزماں جیسے

دقیانوسی خلافتیوں اور ملاؤں کے دوقومی نظریہ سے مختلف تھا۔ جناح کے دوقومی نظریہ کا مطلب صرف یہ تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقوں میں ایک جدید جمہوری ریاست قائم ہوگی جس میں بلالحاظ مذہب وملت ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ قائداعظم جناح اسلام فروش ملاؤں کی طرح کوتاہ اندیش، تنگدل اور تنگدامن نہیں تھے۔ یہ جناح کی بدقسمتی تھی کہ ان کے اردگرد چودھری خلیق الزماں جیسے کھوٹے سکوں کے علاوہ ایسے جاگیردار موجود تھے جو کوئی کام کرنے سے پہلے اپنے ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے اجازت لیتے تھے۔ مسلم کوٹہ میں ایک ہندو اچھوت کو شامل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس طرح جناح یہ دکھانا چاہتے تھے کہ ہندو کانگرس ہندو کوٹہ میں کسی مسلم اچھوت کو شامل کرسکتی ہے تو ہم بھی ڈاکٹر امبیدکر کی پارٹی کے ہندو اچھوت کو ساتھ ملا سکتے ہیں۔

ہوڈسن کی رائے میں عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کے موقع پر نوابزادہ لیاقت علی وغیرہ پاکستان کے بارے میں ڈانواں ڈول تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جناح جو کچھ بھی کرتے تھے اس میں یہ مصلحت شامل ہوتی تھی کہ فیصلہ کن اقدام میں تاخیر کی جائے تا آنکہ برطانیہ، جو اس وقت تک بااختیار تھا اور ہندوستان کی مسلم رائے عامہ اور خاصی غیر مسلم رائے عامہ برصغیر کی تقسیم کے ناگزیر ہونے یا پسندیدہ ہونے کی حقیقت کو تسلیم کرلے لیکن جناح مسلم لیگ میں سب سے برتر ہونے کے باوجود اس کے واحد لیڈر نہیں تھے۔ اگر انہوں نے پختہ فیصلہ کرلیا تھا تو بظاہر دوسروں نے، جن میں لیاقت علی خان، سہروردی اور ناظم الدین شامل تھے ایسا نہیں کیا تھا۔"[34]

اپریل 1947ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک عیسائی رکن جان متھائی کا خیال تھا کہ لیاقت علی خان کے پیش کردہ بجٹ کے بارے میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان جو مفاہمت ہوئی تھی اس سے اس امر کا امکان پیدا ہوگیا تھا کہ اقتدار اس کابینہ کو منتقل کردیا جائے گا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ساری کابینہ زیادہ سے زیادہ اپنے ساتھ ملا رہا تھا۔ ڈاکٹر متھائی کی مزید رائے یہ تھی کہ مسٹر لیاقت علی خان اور پنڈت نہرو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کرسکتے تھے اگرچہ جناح بدستور ایک بڑی رکاوٹ تھے۔"[35] ڈاکٹر متھائی کی یہ رائے بے بنیاد نہیں تھی کیونکہ اس مہینے میں جب ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان کو اعتماد میں لے کر برصغیر کے مستقبل کے بارے میں مختلف تجاویز کا ذکر کیا تھا تو لیاقت علی خان نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اگر ماؤنٹ بیٹن وزارتی مشن کی طرح کا کوئی اپنا منصوبہ پیش کرے تو مسلم لیگ گروپ بی اور سی میں سکھوں کو تحفظات

دے کر ایک ہی ڈیفنس ہیڈ کوارٹرز کے تحت دونوں الگ الگ صوبوں کے ہیڈ کوارٹرز رکھنے پر آمادہ ہو جائے گی بشرطیکہ سنٹرل ڈیفنس فنڈ اور فوجوں کے مشترکہ ٹیکنیکل سکولوں کے اخراجات کے لئے گروپوں سے ان کی آبادی اور فوجوں کی تعداد کے مطابق خرچہ لیا جائے۔ اس ملاقات کا ریکارڈ قلم بند کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ ''یہ سن کر لیاقت اچھل پڑا اور کہنے لگا کہ یہ بہت اچھا منصوبہ ہوگا۔'' آگے چل کر ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ ''میں نے لیاقت کو بتایا کہ ہم تمہارے لیڈر کی باتوں کو کس قدر ناقابل عمل سمجھتے ہیں اور یہ کہ جناح کو پوری طرح اپنی بات سمجھانے میں ہم کس طرح ناکام رہے ہیں۔'' وہ لکھتا ہے کہ جواب میں لیاقت نے مجھے یہ کہہ کر حیران کر دیا کہ ''اگر آپ کے عملے کے ارکان بالکل صحیح حساب لگائیں کہ تقسیم کا مطلب کیا ہوگا اور پھر آپ یہ تمام مشکلات مسٹر جناح کے سامنے پیش کریں تو وہ بلاشبہ انہیں سمجھ جائیں گے کہ خود انہوں نے بھی ان کا کوئی حساب نہیں لگایا ہے۔'' آخر میں ماؤنٹ بیٹن نے لکھا ہے کہ ''میرا تاثر یہ ہے کہ مسٹر لیاقت علی خان اس پاگل پاکستان کی بجائے کوئی اس سے زیادہ معقول حل تلاش کرنے میں میری امداد کرنے پر آمادہ ہے۔''[36] گویا لیاقت علی خان اپریل 1947ء میں بھی کنفیڈرل ہندوستان کے قیام پر آمادہ تھا حالانکہ اس وقت تک کانگرس بھی برصغیر کی تقسیم کا اصول تسلیم کر چکی تھی بشرطیکہ پنجاب اور بنگال کو بھی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جاتا۔ پھر 2 رجولائی 1947ء کو مشترکہ گورنر جنرل کے مسئلے پر ماؤنٹ بیٹن اور جناح کے مابین تلخ کلامی ہوئی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کی رپورٹ وزیر ہند کو لندن ارسال کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''میں نے جناح سے دریافت کیا، معلوم ہے تمہیں یہ فیصلہ کتنا مہنگا پڑے گا؟ اس نے افسردہ لہجے میں جواب دیا، ہاں! املاک کی تقسیم میں غالباً کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا کہ کروڑوں کا نہیں بلکہ تم ساری املاک کھو بیٹھو گے اور پاکستان کا مستقبل بھی۔ یہ کہہ میں کھڑا ہو گیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔'' رپورٹ کے مطابق لنچ کے بعد لیاقت نے ماؤنٹ بیٹن کے پاس جا کر ملاقات کی۔ ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ لیاقت نے میری منت سماجت کی کہ مجموعی طور پر گورنر جنرل کا عہدہ قبول کرلوں'' جناح بھی منظور کر لے گا''، لیکن ماؤنٹ بیٹن لکھتا ہے کہ ''مجھے جناح سے اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ پاکستان کی صورت میں اپنی سب سے بڑی تمنا پوری ہونے کے بعد اس کے پہلے گورنر جنرل بننے کی خواہش سے کیسے دست بردار ہو سکتا تھا......؟ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت سے پوچھا،

لیاقت نے جواب دیا'' ہمیں اپنی پوری کوشش کرنی چاہیے۔لیکن خواہ کچھ بھی ہو آپ کو ہندوستان میں موجود رہنا چاہیے ورنہ بڑی خوفناک گڑبڑ پھیلے گی اور پاکستان کو اس کا بڑا نقصان ہو گا۔''[37]

ماؤنٹ بیٹن نے اس بات چیت کا جو ریکارڈ تیار کیا اس میں لکھا تھا کہ ''نواب بھوپال کی طرح لیاقت علی خان کا بھی یہ خیال تھا کہ برصغیر کی تقسیم کی مدت ختم ہونے تک مشترکہ گورنر جنرل رکھنے کے موقع کو مسترد کیا گیا تو یہ انتہائی احمقانہ حرکت ہو گی۔ لہٰذا میں نے یہ تاثر لیا تھا کہ مسٹر جناح نے مشترکہ گورنر جنرل کی تجویز مسترد کرنے کے سلسلے میں اپنے سوا کسی اور سے مشورہ نہیں کیا تھا۔''[38]

باب: 3

گورنر جنرل کی خودمختاری اور وزیراعظم کی بے اختیاری

قائداعظم محمد علی جناح اور نوابزادہ لیاقت علی خان کے ان اختلافات کی بنا پر جن کا اپریل 1936ء کے بعد کئی مرتبہ برملا اظہار ہو چکا تھا، جولائی 1947ء میں باخبر مسلم لیگی حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا تھا کہ قائداعظم جناح لیاقت علی خان کو پاکستان کا وزیراعظم مقرر نہیں کریں گے بلکہ اس کی بجائے یہ عہدہ نواب بھوپال کو پیش کیا جائے گا ''جو مسلمان ریاستی حکمرانوں میں سب سے زیادہ قابل سمجھا جاتا تھا جو پاکستان کی اعلیٰ سیاست میں حصہ لینے کے خلاف نہیں تھا اور کچھ عرصے سے جناح کا قریب ترین مشیر تھا۔''[1] وہ جولائی کے آخر میں اپنی ریاست کی حکمرانی سے اپنی بیٹی کے حق میں دستبردار ہونا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے ماؤنٹ بیٹن کے زبردست دباؤ کے تحت اپنا فیصلہ تبدیل کر کے طوعاً و کرھاً ہندوستان سے الحاق کر لیا تھا۔ تاہم اس نے یہ شرط منوالی تھی کہ اس کے الحاق کا اعلان آزادی کے دس دن بعد کیا جائے گا۔''[2] اس دوران وہ کراچی آیا اور اس نے قائداعظم جناح سے معذرت کی کہ وہ پاکستان میں موعودہ خدمات سرانجام نہیں دے سکے گا اور پھر وہ واپس ہندوستان چلا گیا۔ لہٰذا 15 اگست 1947ء کو پاکستان میں جس وزارت کی تشکیل ہوئی اس میں نوابزادہ لیاقت علی خان کو بظاہر تو وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز کیا گیا لیکن عملاً اس کی حیثیت وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ایک سینئر رکن سے زیادہ نہیں تھی۔ پہلی کابینہ کے دوسرے ارکان آئی آئی چندریگر، غلام محمد، سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خان، جوگندر ناتھ منڈل، فضل الرحمن میں سے کوئی بھی بڑا جاگیردار نہیں تھا۔ لیاقت علی خان کا کسی پارلیمانی پارٹی نے انتخاب نہیں کیا تھا اور دوسرے سارے وزراء کی تقرری بھی گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے خود ہی کی تھی۔ ان تقرریوں میں لیاقت علی خان کا بطور وزیراعظم کوئی

ہاتھ نہیں تھا اور اس سے اس سلسلے میں کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی وزارت عظمیٰ محض نمائشی تھی جبکہ ہندوستان میں وزیراعظم جواہر لال نہرو کو کلی اختیارات حاصل تھے اور گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن محض آئینی سربراہ تھا۔ کابینہ کا سب سے بااثر رکن وزیر خزانہ غلام محمد تھا جو انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کا سابق رکن تھا اور اس کا کوئی سیاسی پس منظر نہیں تھا۔ گورنر جنرل کابینہ کے اجلاس کی خود صدارت کرتا تھا اور ساری پالیسیاں خود ہی وضع کرتا تھا۔ حکومت کا کوئی چھوٹا بڑا کام اس کی مرضی اور حکم کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا اور وہ ضروری امور کے بارے میں مشورے وزیراعظم لیاقت علی خان کی بجائے اعلیٰ سرکاری افسروں مثلاً غلام محمد، چودھری محمد علی، سر اکرام اللہ اور سر محمد ظفر اللہ خان وغیرہ سے کیا کرتا تھا۔ کابینہ کے ارکان کے محکموں کی تقسیم بھی قائداعظم نے خود ہی کی تھی اور جب جولائی 1948ء میں ریاستی امور کی دیکھ بھال کے لئے ایک نئی وزارت کی تشکیل کی گئی تھی تو انہوں نے یہ نیا قلمدان وزارت خود اپنے ہی پاس رکھا تھا۔ ان کی جاگیرداریت سے دشمنی کی حالت یہ تھی کہ انہوں نے پنجاب سے ملک سر فیروز خان نون جیسے جغادری اور تجربہ کار زمینداروں کو اپنی کابینہ میں کوئی جگہ نہیں دی تھی۔ نون کو خیر سگالی مشن پر مشرق وسطیٰ کے بعض ممالک میں بھیجا گیا تھا اور اس بنا پر بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا تھا کہ غالباً اسے وزیر خارجہ مقرر کیا جائے گا مگر دسمبر 1947ء میں یہ غلط فہمی دور ہوگئی جبکہ قائداعظم نے خود سر محمد ظفر اللہ خان کو وزارت خارجہ کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ وہ بھی جاگیردار نہیں تھا۔

گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کے اختیارات کی لامحدودیت اس سے بھی ظاہر تھی کہ ملک کی مرکزی اسمبلی میں بھی کوئی قانون سازی ان کے پیشگی مشورے اور منظوری کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ اسمبلی نے 11 راگست 1947ء کو اپنے اجلاس میں، جب کہ گورنر جنرل جناح نے ملک کی سیاست میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں کوئی امتیاز روا نہ رکھنے کی پالیسی کا تاریخی اعلان کیا تھا، ایک قرارداد کے ذریعے انہیں سرکاری طور پر قائداعظم کا خطاب دیا تھا اور یہ طے کیا تھا کہ آئندہ ان کو سرکاری طور پر ''قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل پاکستان'' کے نام سے خطاب کیا جائے گا اور پھر اسی اجلاس میں قائداعظم کو اسمبلی کا سپیکر بھی منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے چند دن بعد اسمبلی نے اس مضمون کی قرارداد بھی منظور کی تھی کہ وہ کوئی قانون قائداعظم کے پیشگی مشورے کے بغیر منظور نہیں کرے گی۔ اس قرارداد کا عملی طور پر مطلب یہ تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح گورنر جنرل

پاکستان کو نہ صرف کاروبار حکومت چلانے کے لئے کلی اختیارات حاصل ہوں گے بلکہ ہر قسم کی قانون سازی کے اختیارات بھی انہی کے پاس ہوں گے۔یعنی کابینہ کی طرح اسمبلی کی حیثیت بھی محض نمائشی ہوگی اور اسے از خود کوئی قانون منظور کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔اس حقیقت کا مظاہرہ 3/ مارچ 1948ء کو ہوا جبکہ پاکستان ٹائمز کی ایک رپورٹ کے مطابق قائداعظم جناح نے بطور سپیکر، دستور ساز اسمبلی کو حیرت میں ڈال دیا۔انہوں نے اسمبلی کے ضوابط کار میں کانگرسی حزب مخالف کی ایک ایسی ترمیم منظور کر لی جسے قبل ازیں مسلم لیگ پارٹی مسترد کر چکی تھی۔ جب قائداعظم نے یہ فیصلہ صادر کیا تو قائدایوان مسٹر لیاقت علی خان نے فوراً اٹھ کر کہا کہ سرکاری بینچوں کی طرف سے اس ترمیم کو پہلے ہی مسترد کیا جا چکا ہے لیکن قائداعظم نے کہا کہ ''یہ میری رولنگ ہے۔اگر تمہیں اس سے اختلاف ہے تو رائے شماری کرالو۔'' اس پر یہ معاملہ فوراً ختم ہو گیا اور بے چارا قائدایوان رائے شماری کرانے کی بجائے خاموشی سے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

ماؤنٹ بیٹن کے پریس سیکرٹری ایلن کیمبل جانسن کا رویہ جناح کے بارے میں ہمیشہ معاندانہ رہا تھا کیونکہ اس کے آقا و مولا ماؤنٹ بیٹن سے جناح کے تعلقات کبھی بھی خوشگوار نہیں ہوئے تھے۔لہٰذا اس نے پاکستان میں سارے سیاسی، انتظامی اور قانونی اختیارات جناح کی ذات میں مرتکز ہونے کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں عناد اور تعصب نمایاں ہے تاہم اس کی اس تحریر کا مفہوم صداقت سے خالی نہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اگر جناح کی شخصیت غیر جذباتی اور علیحدگی پسند ہے تو اس میں ایک مقناطیسی صفت بھی ہے۔ قیادت کا احساس و شعور تقریباً مغلوب کرنے والا ہے۔انہوں نے (گورنر جنرل کے عہدہ کے لئے) اپنا نام پیش کرنے کے بعد جو سب سے پہلا کام کیا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے حصہ دوئم کی بجائے 9 ویں شیڈول کے تحت اختیارات طلب کئے چنانچہ انہیں فوراً ہی ایسے آمرانہ اختیارات حاصل ہو گئے کہ بادشاہ کے نمائندہ کسی بھی گورنر جنرل کو کبھی بھی حاصل نہیں ہوئے تھے۔ یہاں فی الواقع طاقتور قائداعظم میں پاکستان کا شہنشاہ، آرچ بشپ آف کینٹر بری، سپیکر اور وزیراعظم مجتمع تھے۔''[3] ہیکٹر بولیتھو کے مطابق مرکزی حکومت کے سارے محکموں کے سیکرٹری مشورہ اور حکم کے لئے قائداعظم سے رجوع کرتے تھے اور سارے صوبائی گورنر اپنے صوبوں کے حالات کے بارے میں انہیں ہر پندرہویں دن خفیہ رپورٹیں بھیجتے تھے۔ قائداعظم نے 11/اگست

1947ء کو دستور ساز اسمبلی کے افتتاحی اجلاس میں جو تاریخی تقریر کی تھی اس کے لکھنے میں انہوں نے بہت سے گھنٹے صرف کئے تھے لیکن وزیراعظم لیاقت علی کو اس کے نفس مضمون کا آخری وقت تک کچھ پتہ نہیں تھا۔ پھر جب یکم جولائی 1948ء کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب کے لئے تقریر لکھی جا چکی تھی تو ''ان کے نیول اے۔ڈی۔سی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس کی ایک نقل وزیراعظم کو کراچی بھیج دی جائے تا کہ اے ڈی سی کی بجائے وہ اسے پڑھ لے۔ قائد نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا تھا انہوں نے صرف ہاتھ کے اشارے سے اس تجویز کو مسترد کر دیا تھا اور اے۔ڈی۔سی کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔''[4]

قائداعظم جناح کے بطور گورنر جنرل بے پناہ اختیارات اور لیاقت علی خان کی بطور وزیراعظم نمائشی حیثیت کا ذکر کراچی کے انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیئرز کے سابق ریسرچ آفیسر اور روزنامہ مارننگ نیوز کے سابق ایڈیٹر مشتاق احمد نے بھی کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ''چونکہ لیاقت کو اسمبلی کی قیادت قائداعظم کے طفیل ملی تھی اس لئے اسے اپنے رفقاء کے انتخاب میں کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ قائداعظم نے خود ہی ان کے ناموں، تقرریوں اور محکموں کا بیک وقت اعلان کیا تھا چنانچہ بعد میں ایک سے زیادہ وزراء نے کھلم کھلا یہ اعلان کیا کہ وہ قائداعظم کے نامزد کردہ ہیں۔ کابینہ میں صوبوں کے علاوہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین اور اقلیتوں کی بھی نمائندگی تھی۔ قائداعظم نے نہ صرف پہل کر کے کابینہ کی تشکیل کی تھی بلکہ وہ اپنی کابینہ کی باقاعدہ میٹنگوں کی صدارت کرتے تھے اور کابینہ کی ایمرجینسی کمیٹی کی، جس کے وہ چیئرمین تھے، میٹنگیں بھی انہی کی زیر صدارت ہوتی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ وزیراعظم کی عدم موجودگی میں بھی کابینہ کے اجلاس طلب کر کے فیصلے کرتے تھے۔ انہوں نے ریاستی امور و قبائلی علاقوں کی ایک وزارت اور مہاجرین کی بحالی کی ایک وزارت کی تشکیل کی تھی۔ اول الذکر وزارت ان کے اپنے مکمل کنٹرول میں تھی۔ بلوچستان کی انتظامیہ پر بھی انہی کا کنٹرول تھا۔ یہ انتظامیہ گورنر جنرل کے ایک ایجنٹ کی وساطت سے چلائی جاتی تھی اور یہ ایجنٹ کابینہ کی بجائے گورنر جنرل کے سامنے جوابدہ ہوتا تھا۔ کراچی کو ان ہی کی ہدایت کے مطابق سندھ سے الگ کیا گیا تھا اور نئے صوبے پر ایڈمنسٹریٹر کی وساطت سے انہی کا اختیار چلتا تھا۔ یہ ایڈمنسٹریٹر صرف قائداعظم کے سامنے جوابدہ تھا۔ سٹیٹ بنک اور فیڈرل کورٹ کا قیام بھی ان کے احکام کے تحت عمل میں آیا تھا اور ریاستوں کے الحاق کی

زیادہ تر ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی تھی۔ قائداعظم نے ہی سر آرچی بالڈ رولینڈ کو فنانشل ایڈوائزر مقرر کیا تھا اور ملک فیروز خان نون کو اپنے خصوصی نمائندہ کی حیثیت سے مشرق وسطیٰ میں بھیجا تھا۔ انہوں نے اپنے ایک ذاتی نمائندہ کو کابل بھیجا تھا جو بعدازاں افغانستان میں پاکستان کا سفیر بنا۔ انہوں نے فلسطینی عربوں کے مؤقف کی تائید وحمایت کے لئے ظفر اللہ خان کو اقوام متحدہ میں بھیجا تھا اور پھر بعد میں اس کو وزیر مقرر کیا تھا۔ وہ وزیراعظم، وزراء اور محکموں کے سیکرٹریوں کو اپنے مشوروں اور ہدایات سے مستفید کرتے تھے۔ قائداعظم کوئی نمائشی سربراہِ مملکت نہیں تھے۔ ایک لحاظ سے وہ خود اپنے وزیراعظم تھے جو اپنے آخری ایام تک ہدایات دیتے رہے اور فیصلے کرتے رہے......قائداعظم اپنے یہ وسیع اختیارات دستور ساز اسمبلی کی منظوری سے استعمال کرتے تھے۔ حکومت کا ان پر کس قدر انحصار تھا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگرچہ دستور ساز اسمبلی کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ ان غیر معمولی اختیارات کو واپس لے لے جو قانون آزادیٔ ہند کے تحت گورنر جنرل کو مارچ 1948ء تک دیئے گئے تھے لیکن اس نے ایسا نہ کیا بلکہ اس اسمبلی نے گورنر جنرل کے ان اختیارات میں مزید ایک سال کی توسیع کر دی تھی۔"[5]

چودھری محمد علی نے نوزائیدہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے لامحدود اختیارات کی تفصیل پر تو کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی البتہ وہ ان اختیارات کا جواز یہ پیش کرتا ہے کہ "قائداعظم کی اپنی حیثیت منفرد تھی۔ وہ قائداعظم اور بابائے قوم تھے۔ بقول لیاقت علی خان ہماری آزادی ایک شخص واحد کی خدمات اور مساعی کا ثمر تھا۔ وہ ہمارا محبوب ترین قائداعظم تھا۔ اگر وہ پاکستان میں کسی بھی سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتا تو بھی ارباب اختیار رہنمائی اور ہدایات کے لئے اس سے رجوع کرتے۔ عوام کو جتنا اعتماد ان پر تھا، اور کسی پر نہیں تھا۔ اشخاص اور معاملات کے بارے میں ان کا فیصلہ حرف آخر تھا۔ جس چیز کو وہ پاکستان کے لئے مفید سمجھتے تھے کوئی بھی شخص اسے مابہ النزاع نہیں بنا سکتا تھا۔ جب قیام پاکستان کے چند ماہ بعد کابینہ نے یہ فیصلہ کیا کہ قائداعظم کابینہ کی رائے کو مسترد کر سکتے تھے تو یہ فیصلہ اس لئے کیا گیا تھا کہ وہ قائداعظم تھے، اس لئے نہیں کہ وہ گورنر جنرل تھے۔ اس فیصلے سے آئین میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی تھی بلکہ کابینہ رضا کارانہ طور پر بابائے قوم کے حق میں اپنے اختیار سے دستبردار ہو گئی تھی۔ اگر قائداعظم چاہتے تو آئین ساز اسمبلی عبوری آئین میں اس کے مطابق ترمیم بھی کر دیتی۔ لیکن یہ حقیقت کہ ان خطوط

پر کارروائی کے لئے اشارہ تک نہ کیا گیا، اس امر کا ثبوت ہے کہ قائداعظم پارلیمانی نظام حکومت میں کسی اہم نوعیت کی تبدیلی کے خواہاں نہیں تھے۔''[6] لیکن چودھری محمد علی نے یہ نہیں بتایا کہ قائداعظم نے اپنی زندگی میں جن لامحدود اختیارات کا استعمال کیا ان کا مروجہ پارلیمانی نظام سے کیا تعلق تھا اور کیا یہ اختیارات مروجہ آئین کے منافی ایک شخصی حاکم کے اختیارات نہیں تھے؟ کیتھ کیلرڈ کے بقول اگرچہ ابتدائی مہینوں میں قائداعظم کی غالب پوزیشن پاکستان کے لئے طاقت کا منبع تھی لیکن یہ بات عیاں تھی کہ ان کی اپنی توانائی جواب دے رہی تھی۔ چنانچہ ستمبر 1948ء میں ان کے انتقال سے اتنا بڑا خلا پیدا ہوا کہ ان کا کوئی جانشین اسے پر نہ کر سکا۔ لیاقت علی خان پہلے ہی وزیراعظم تھا اور جناح کے نائب اول کی حیثیت سے اس کی وسیع پیمانے پر عزت کی جاتی تھی، لیکن وہ اختیارات کے معاملے میں اور عوام میں عزت کے معاملے میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جو قائداعظم کو حاصل تھا۔''[7]

قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خان کی حکومت نے بابائے قوم کی سوانح حیات لکھنے کے کام پر جس انگریز مؤرخ کو مامور کیا تھا اس نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ مخصوص انداز سے اشارے کئے ہیں کہ قائداعظم جناح 1936ء میں مسلم لیگ کے مستقل صدر بننے سے پہلے ہی بااختیار مرکزی شخصیت کو مثالی سمجھتے تھے۔ اس کی اطلاع کے مطابق جناح ترکی کی سیکولر ریاست کے بانی اور آمر مطلق کمال اتاترک سے بہت متاثر تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''یہ نومبر 1932ء کی بات ہے کہ جناح نے اپنے لندن میں قیام کے دوران ایچ۔ سی آرم سٹرونگ کی مصطفیٰ کمال اتاترک کی زندگی کے حالات پر مشتمل کتاب ''گرے وُلف این اِنٹی میٹ سٹڈی آف اے ڈکٹیٹر'' پڑھی تھی اور پھر انہوں نے یہ کتاب اپنی 13 سالہ بیٹی کو دے کر اسے کہا تھا کہ مائی ڈیئر اسے پڑھو یہ اچھی ہے۔ اس کے بعد وہ بہت دنوں تک کمال اتاترک کی باتیں کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی بیٹی نے انہیں مذاقاً ستانے کے لئے ان کا گھریلو نام ہی ''گرے وُلف'' رکھ دیا تھا۔''[8] جب جولائی 1947ء کے اوائل میں جناح نے یہ تجویز قطعی طور پر مسترد کر دی تھی کہ انتقال اقتدار کی کارروائی مکمل ہونے تک ماؤنٹ بیٹن ہندوستان اور پاکستان کی ڈومینینوں کا مشترکہ گورنر جنرل ہوگا تو برطانوی پریس نے بھی ان پر آمرانہ عزائم رکھنے کا الزام عائد کیا تھا، ہفت روزہ اکونومسٹ، نے لکھا تھا کہ ''یہ واقعہ بہت سنگین ہے کیونکہ جناح کی حکمرانی

ایک ایسی ڈکٹیٹرشپ ہوگی جس پر بہت ہی مہین پردہ ہوگا۔ان کی جانب سے اپنے لئے گورنر جنرل کا عہدہ طلب کرنے کا مقصد بلاشبہ وہ پوزیشن حاصل کرنا ہے جو ہندوستانی عوام کی نظروں میں اس عہدہ سے وابستہ ہے۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں وائسرائے بطور گورنر جنرل کسی حد تک محدود اختیارات کا استعمال کرتا ہے تاہم اب تک وہ ایگزیکٹوحکمران رہا ہے اوراس کے وزراءمحض اس کی ایگزیکٹوکونسل کے رکن رہے ہیں۔ایک عام آدمی ذہنی عادت کے زور پر یہی خیال کرے گا کہ گورنر جنرل اپنے وزیراعظم سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے''اورلندن ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ''جولوگ پاکستان پر حکومت کریں گے وہ اس خیال کے حامل ہو سکتے ہیں کہ چونکہ پاکستان کا علاقہ نسبتاً زیادہ پسماندہ ہے اس لئے اسے ایسے گورنر جنرل کی رہنمائی کی ضرورت ہوگی جس میں اعلیٰ سطح پر کنٹرول اورتال میل قائم رکھنے کی صلاحیت ہوجیسے کہ پہلے کیننگ اور کرزن میں تھی۔''[9]

قائداعظم جناح نے خودبھی اپنی 13 رجولائی 1947ء کی پریس کانفرنس میں اس مسئلہ پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے بھی ایسے ہی امکانات کا اشارہ ملا تھا۔انہوں نے کہا تھا ''چونکہ گورنرز جنرل کانگرس اورمسلم لیگ کے نامزدکردہ ہوں گے اس لئے وہ عوام کے منتخب ہوں گے۔وہ بادشاہ کے مقررکردہ نہیں ہوں گے جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔'' جب یہ پوچھا گیا کہ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ گورنر جنرل ہزمیجسٹی کی رضامندی سے اس عہدہ پر فائز رہتا ہےتو جناح نے کہا''یہ خالصتاً رسمی بات ہے،اس میں محض رسم کے سوا کچھ نہیں ہے۔گورنر جنرل عوام کے منتخب ہیں اوریہی وجہ ہے کہ میں نے یہ باعزت عہدہ قبول کیا ہے۔''اس پریس کانفرنس سے چند دن قبل مسلم لیگی لیڈروں نے اس اعلان کا پرجوش خیرمقدم کیا تھا کہ قائداعظم محمد علی جناح پاکستان کے گورنر جنرل ہوں گے۔سردارعبدالرب نشتر کا تبصرہ یہ تھا کہ''مسٹر جناح اس ریاست کے معمار ہیں اوراس کی دیکھ بھال کے لئے ان سے بہتر اورکوئی نہیں ہوسکتا۔اب سب کچھ ٹھیک ہوگا'' اور روزنامہ ڈان نے اپنے 13 رجولائی کے اداریے میں قائداعظم کوترکی کے ڈکٹیٹر کمال اتاترک کا مقام دیا تھا۔اداریہ میں لکھا تھا کہ''کمال نے بھی اپنے عوام کے لئے ایک جاندارریاست قائم کی تھی۔اگرچہ یہ ریاست ایک تباہ شدہ سلطنت کے کھنڈرات میں تشکیل کی گئی تھی اوراس مقصد کے لئے مختلف ذرائع اختیار کئے گئے تھے اوراسے بھی خود ہی اس کی تعمیر کا کام کرنا پڑا تھا۔قائداعظم کی منفرداور بے مثال حکمت عملی نے انہیں اس قابل بنایا کہ وہ اپنی قوم کے لئے پاکستان کی تشکیل

کریں اور آئندہ سربراہ ریاست کے طور پر ان کا کام بہت حد تک ایسا ہی ہوگا جیسا کہ اتاترک کا تھا۔ ڈومینین کے گورنر جنرل کے آئینی اختیارات برائے نام خواہ کچھ ہی ہوں جہاں تک قائداعظم کا تعلق ہے ان پر کوئی قانونی یا رسمی پابندیاں عائد نہیں ہوسکتیں۔ ان کے عوام اس امر سے مطمئن نہیں ہوں گے کہ وہ حکومت کے محض برائے نام سربراہ ہوں۔ ان کی خواہش یہ ہوگی کہ برطانوی کامن ویلتھ کی ڈومینین کے آئین کا کوئی لحاظ کئے بغیر وہ ان کے دوست، فلاسفر، رہنما اور حکمران ہوں'' اور پھر قیام پاکستان کے تین چار دن بعد اس مسئلہ پر روزنامہ ڈان کا اداریہ یہ تھا کہ ''چونکہ قائداعظم سول انتظامیہ کے سربراہ ہوں گے اور ذاتی طور پر اس کے ہدایت کار ہوں گے اس لئے اس بات کی ضمانت موجود ہے کہ محدود ذرائع سے بھی ایک ایسی عمارت کی تعمیر ہوگی جو ان عناصر کو شرمسار کرے گی جنہوں نے اس کی باسلیقہ اور پرامن تشکیل روکنے کی کوشش کی تھی۔''[10] روزنامہ ڈان نے جولائی 1947ء میں روزانہ کورٹ سرکلر بھی شائع کرنا شروع کر دیا تھا جس میں اکثر و بیشتر یہ اطلاع دی جاتی تھی کہ ''قائداعظم نے پاکستان کی عبوری کابینہ کی صدارت کی۔''

قیام پاکستان کے فوراً ہی بعد کراچی میں چند افراد کی طرف سے یہ تحریک شروع ہوئی کہ قائداعظم محمد علی جناح کا نام جمعہ کے خطبہ میں لینا چاہیے۔ اس تحریک کا سربراہ صوبہ سندھ کا وزیر تعلیم پیر الٰہی بخش تھا۔ نصب العین یہ تھا کہ پہلے پاکستان میں امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کے منصب کا، جس کا کمال اتاترک نے 1926ء میں سلطنت عثمانیہ کے زوال کے بعد خاتمہ کر دیا تھا، احیاء کیا جائے اور پھر دوسرے ممالک کو اس خلیفہ کی بیعت کرنے کی ترغیب دی جائے اور اس طرح عالم اسلام کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی اتحاد کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ اس تحریک کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بعض مفاد پرست لوگوں میں بابائے قوم کی خوشامد و چاپلوسی میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی دوڑ لگ گئی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر اپنی کم فہمی اور کم علمی کے باعث خلوص دل سے اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ پاکستان عالم اسلام کا لیڈر ہوگا۔ سارے مسلم ممالک اس نوزائیدہ مثالی اسلامی ریاست کی سربراہی میں متحد ہو جائیں گے اور اس طرح ساری دنیا میں ایک مرتبہ پھر اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ یہ عناصر اپنے آپ کو اسلامی عقائد، اقدار اور افکار کا سب سے بڑا علمبردار سمجھتے تھے اور اس بنا پر ان کا خیال تھا کہ اسلامی مملکت پاکستان خلافت عثمانیہ کی جانشینی کی جائز طور پر حقدار ہے۔ مصر کے شاہ فاروق کے

بقول ان پاکستانی عناصر کی تقریروں اور تحریروں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ''اسلام کا ظہور دراصل 14 راگست 1947ء کو ہوا تھا۔''

شمالی ہندوستان کے بعض مسلمان قائداعظم جناح کو بابر اور اورنگزیب جیسے عظیم مغل شہنشاہوں کا جانشین تصور کرتے تھے۔ جب 3 رجون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کا اعلان ہوا تھا تو نئی دہلی میں بعض مسلمانوں نے قائداعظم کو شہنشاہ پاکستان کہہ کر پکارا اور روزنامہ ڈان کے 11 راگست 1950ء کے شمارے کے مطابق ''اگر قائداعظم چاہتے تو 8 کروڑ ہاتھ برضاورغبت ان کے سر پر تاج شاہی رکھ کر مسرت وانبساط کا مظاہرہ کرتے'' تاہم قائداعظم ایسی باتوں کو پسند نہیں کرتے تھے اور جن لوگوں نے انہیں شہنشاہ کا خطاب دینے کی کوشش کی تھی انہیں قائد نے ڈانٹا تھا اور چونکہ پاکستان میں خلافت کے قیام کی تحریک کو بھی ان کی تائید وحمایت حاصل نہیں تھی اس لئے یہ تحریک بھی پنپ نہ سکی۔ قائداعظم جناح اس قسم کی مذہبی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ پاکستان کی جدید جمہوری ریاست میں سارے شہریوں کو بلالحاظ مذہب وملت ہر سطح پر مساوی حقوق دینے کے حق میں تھے۔ وہ اس امر کا کئی مرتبہ اعلان کر چکے تھے کہ پاکستان میں ملائیت کا غلبہ نہیں ہوگا۔ تاہم نوزائیدہ حکومت پر ان کی گرفت اتنی ہی مضبوط تھی جتنی کہ نیم تعلیم یافتہ قدامت پسند مسلمانوں کی رائے میں ایک امیرالمومنین یا خلیفۃ المسلمین یا مغل شہنشاہ کی ہونی چاہیے تھی۔ اس میں وزیراعظم کے بااختیار ہونے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ لیاقت علی خان کو اپنی اس کمزوری اور بے بسی کا پہلے دن ہی سے احساس وشعور تھا۔ چنانچہ اس نے 14 راگست 1948ء کو ایک پبلک جلسے میں اپنی تقریر کے دوران کہا تھا کہ ''اب جبکہ ہمیں پاکستان مل گیا ہے قائداعظم کی جانب سے قوم کی رہنمائی کرنے کا سلسلہ بند نہیں ہوا ہے۔ انہیں عوام کی فلاح وبہبود میں گہری دلچسپی ہے اور اسی بنا پر انہوں نے خود اتنا زیادہ کام سنبھال لیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ ہم ان کی بصیرت اور رہنمائی سے طویل عرصے تک مستفید ہوتے رہیں۔''[11] قبل ازیں لیاقت علی خاں نے 6 رمارچ 1948ء کو مرکزی اسمبلی میں خان عبدالغفار خان کے انگریز گورنروں کے تقرر پر اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ، ''ہمیں تجربہ کار افراد کی ضرورت تھی لہٰذا ہم نے چند انگریزوں کو عارضی طور پر مقرر کیا ہے لیکن موجودہ آئین کے تحت جس شخص کے پاس کلی اختیارات ہیں وہ گورنر جنرل ہے۔ وہ جو چاہے کرسکتا ہے۔''[12] لیکن لیاقت علی خان نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ

خودکون سے جمہوری اصول یا آئین کے تحت وزارت عظمٰی کے سارے اختیارات سے محروم ہو گیا تھا اور کلی اختیارات ایک فرد واحد میں مرتکز ہو گئے تھے۔ لیاقت علی خان کی اس قسم کی تقریریں سراسر مصلحت آمیز تھیں۔ وہ یہ سب کچھ محض اس لئے کہتا تھا کہ ان دنوں اس کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

پاکستان کے دونوں سربراہوں کے درمیان طبقاتی تضاد اور سیاسی و آئینی اختلافات کے اس پس منظر میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان اپنی نمائشی حیثیت سے کبھی مطمئن نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ہی اسے ہونا چاہیے تھا۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہندوستان میں جواہر لال نہرو، گاندی کی پس پردہ آمریت اور سردار پٹیل کی برملا مخاصمت کے باوجود مقابلتاً بااختیار وزیراعظم تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی چند مہینوں میں نوابزادہ کو یہ جرأت نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ اپنے اس عدم اطمینان کا کھلم کھلا اظہار کرے۔ بلاشبہ ان دنوں قائداعظم جناح کو پاکستان کے عوام الناس میں بے پناہ مقبولیت حاصل تھی۔

پاکستان میں نوابزادہ کی کوئی ٹھوس سیاسی بنیاد نہیں تھی۔ وہ اپنی جاگیر ہندوستان میں چھوڑ آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا سیاسی حلقۂ اثر بھی وہیں رہ گیا تھا۔ یہاں اس کے نمائشی اقتدار کا سرچشمہ صرف قائداعظم ہی تھے۔ اگر قائداعظم ناراض ہوجاتے تو پاکستان میں نوابزادہ کی سیاست آناً فاناً ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی۔ صوبہ سندھ میں محمد ایوب کھوڑو ایک بڑا خاندانی جاگیردار اور نہایت بااثر سیاسی لیڈر تھا۔ اس نے پاکستان کی تحریک میں نمایاں حصہ لیا ہوا تھا مگر جب اس نے پہلے اپنے صوبہ میں مہاجرین کو آباد کرنے اور پھر کراچی کو سندھ سے علیحدہ کرنے کے بارے میں قائداعظم سے مختلف مؤقف اختیار کیا تھا تو اسے فوراً برطرف کر کے اس پر مقدمہ قائم کر دیا گیا تھا حالانکہ اسمبلی اور صوبائی مسلم لیگ میں اسے اکثریت کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ ایوب کھوڑو اپنی جاگیردارانہ ہٹ دھرمی اور رعونت کے باوجود اپنے خلاف بظاہر اس غیر جمہوری اقدام کے خلاف کوئی مؤثر احتجاج نہیں کر سکا اور اس نے بے بس ہو کر وقتی طور پر سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ اگر کھوڑو جیسے جغادری سیاسی جاگیردار کی یہ حالت ہوسکتی تھی تو بے چارہ نواب زادہ لیاقت علی خان جس کے پاس ان دنوں پاکستان میں اپنا کوئی موروثی حلقۂ انتخاب بھی نہیں تھا، قائداعظم کے سامنے کیسے سر اٹھا کر بات کرسکتا تھا۔

تاہم لیاقت علی خان نے قیام پاکستان کے چند ماہ بعد، جب قائداعظم کی طبیعت ناساز رہنے لگی تو نجی محفلوں میں اپنی بے بسی اور بے وقعتی پر عدم اطمینان کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ اس کے اس عدم اطمینان یا خاموشی کا پس پردہ اظہار دسمبر 1947ء میں شروع ہوا جبکہ قائداعظم نے اس سے کوئی مشورہ کئے بغیر یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ سر محمد ظفر اللہ خان پاکستان کا وزیر خارجہ ہو گا۔ سر ظفر اللہ خان ستمبر 1947ء میں پاکستانی وفد کے قائد کی حیثیت سے اقوام متحدہ گیا تھا۔ اس وقت وہ نواب بھوپال کا قانونی مشیر تھا۔ اس نے اپنے مخصوص وکیلانہ انداز میں اس واقعہ کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے ان سے یہ حقیقت صاف نظر آتی ہے کہ وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کو اس کا بطور وزیر خارجہ تقرر پسند نہیں آیا تھا اور اس نے اپنی اس ناپسندیدگی یا ناخوشی کا اظہار ہیر پھیر کر کے کیا تھا۔

ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ جب وہ اقوام متحدہ میں فلسطینی مسئلہ پر بحث ختم ہونے کے بعد کراچی واپس پہنچا تو ''میں قائداعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور وفد کی سرگرمیوں کی مختصر رپورٹ ان کی خدمت میں زبانی عرض کر دی۔ فرمایا اب تمہارا پروگرام کیا ہے۔ میں نے عرض کی اب بھوپال جاؤں گا۔ ذرا تیز لہجے میں فرمایا تم کب ان مخمصوں سے فراغت حاصل کرو گے؟ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ہمیں تمہاری یہاں ضرورت ہے۔ میں نے عرض کی کہ اگر میں کسی خدمت کے قابل ہوں تو حاضر ہوں۔ پوچھا لاہور جاؤ گے؟ عرض کیا لاہور ہوتا ہوا بھوپال جاؤں گا۔ فرمایا لیاقت علی خان کی طبیعت علیل ہے۔ وہ لاہور میں ہیں تم وہاں ان سے ملنا۔ تعمیل ارشاد میں میں لاہور نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے دوران گفتگو دریافت فرمایا قائداعظم نے تمہارے ساتھ کوئی بات چیت کی ہے؟ میں نے کہا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارشاد فرمایا تھا۔

نوابزادہ صاحب: صورت یہ ہے کہ ہمیں پاکستان میں سپریم کورٹ قائم کرنا ہو گا۔ اس کے قواعد مرتب کرنے اور ججوں اور عملے کے انتخاب و تقرر کے لئے وقت درکار ہو گا لیکن چیف جسٹس کا تقرر جلد ہونا چاہیے تاکہ وہ ان تمام امور پر غور کرنا شروع کرے۔ ایک تجویز یہ ہے کہ تم پاکستان کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کا منصب سنبھالو اور ان امور کے متعلق غور کرنا شروع کرو۔ پھر تقسیم پنجاب کے نتیجے میں جو ہل چل مچی ہے اور

ابتری پیدا ہوئی ہے خصوصاً پناہ گزینوں کی بھر مار اور مختلف صیغہ جات کے افسران اور عملے میں جو خلا پیدا ہوا ہے ان سب امور نے مل جل کر اس صوبے میں انتظامی حالت خراب کر دی ہے۔ ممتاز دولتانہ سے جو کچھ ہوسکتا ہے وہ کر رہے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں یہ اکیلے ان کے بس کی بات نہیں۔ انہوں نے قائداعظم سے کہا کہ یہاں کسی بے لاگ اور صاحب عزم چیف منسٹر کی ضرورت ہے اور مشورہ دیا ہے کہ تمہیں یہاں بھیج دیں۔ تیسرے مرکز میں بھی آدمیوں کی ضرورت ہے، علاوہ وزارت عظمیٰ کے، دفاع اور امور خارجہ کے قلمدان بھی میرے سپرد ہیں۔ یہ بھی ایک شخص کا کام نہیں۔ تم چاہو تو مرکز میں آجاؤ۔ اِن سب باتوں پر غور کر کے تم اپنی منشا مجھے بتا دینا۔

ظفر اللہ: میں آپ کے ارشاد کے مطابق غور کرنے کے بعد حاضر خدمت ہو کر گذارش کر دوں گا۔

نوابزادہ صاحب: لیکن قائداعظم چاہتے ہیں کہ تم وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالو۔

ظفر اللہ: تو پھر میرے غور کرنے اور میری منشا کی کیا گنجائش باقی رہی؟

نوابزدہ صاحب: میں نے سارا قصہ تم سے کہہ دیا ہے۔ اب تمہارے غور و منشا کی بس اتنی گنجائش ہے کہ تم بھوپال سے ہو کر جتنی جلدی ہو سکے کراچی پہنچ جاؤ۔

ظفر اللہ: جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے خدمت میں کوئی عذر نہیں اور جو خدمت سپرد ہو اس کے لئے میں حاضر ہوں لیکن آخر ہز ہائی نس نواب صاحب سے استصواب اور ان کی اجازت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ وہ رضامند ہو جائیں لیکن شاید فوراً اجازت دینے میں وہ دقت محسوس کریں یا انہیں تامل ہو۔

نوابزادہ صاحب: قائداعظم کو اصرار ہے کہ تم جلد آجاؤ۔ تمہارا اپنا کیا اندازہ ہے کہ تم کب تک آسکو گے؟

ظفر اللہ: نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے میں کوئی پختہ اندازہ تو نہیں کر سکتا۔ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ نواب صاحب کو قائداعظم کی ہر خواہش کا بہت احترام ہے اور ان کی خواہش کا علم ہونے پر وہ جس قدر جلد ممکن ہوگا مجھے اجازت مرحمت فرما دیں گے۔''

وزیراعظم لیاقت علی خان سے اس دلچسپ بات چیت کے بعد ظفر اللہ خان بھوپال گیا۔ وہاں اس نے دو ایک دن قیام کیا اور پھر نواب کے خصوصی ہوائی جہاز میں 25 ردسمبر کو

کراچی پہنچا۔''وہ دن قائداعظم کا یوم پیدائش تھا۔ان کے اعزاز میں ایک استقبالیہ تقریب تھی میں وہاں حاضر ہو گیا لیکن مجھے ابھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ قائداعظم نے میرے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے البتہ نوابزادہ صاحب نے اتنا فرمایا کہ آج تمہیں حلف لینا ہوگا۔ قائداعظم کی آمد پر نوابزادہ صاحب نے مجھے اس نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا جو ان کے عین بائیں جانب تھی۔ قائداعظم نے بیٹھتے ہی فرمایا ظفر اللہ خان وزیر خارجہ کے منصب کا حلف لے گا اور میں نے تعمیل ارشاد میں حلف اُٹھایا۔''[13]

ظفر اللہ خان نے اس واقعہ کی جو تفصیل لکھی ہے اس سے بالکل واضح ہے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اُن دنوں اسے وزارت خارجہ کا منصب دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے بیان کے مطابق قائداعظم کی خواہش تھی کہ وہ وزیر خارجہ بنے۔نوابزادہ کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح ظفر اللہ خان سپریم کورٹ (Superme Court) کی چیف جسٹسی قبول کر لے یا نواب ممدوٹ کی جگہ پنجاب کا وزیر اعلیٰ بننے پر رضا مند ہو جائے لیکن اسے اپنی اس کوشش میں ناکامی ہوئی کیونکہ نہ صرف قائداعظم کا فیصلہ اٹل تھا اور وہ ان کے فیصلے کے سامنے بے بس تھا بلکہ خود ظفر اللہ خان بھی وزیر خارجہ بننے کا متمنی تھا۔ اگر نوابزادہ کا قائداعظم سے کوئی تضاد نہ ہوتا تو اسے ظفر اللہ خان کے سامنے ایک سے زیادہ تجویزیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ مختصراً یہ کہہ سکتا تھا کہ''قائداعظم تمہیں وزارت خارجہ کا قلمدان دینے کے خواہاں ہیں۔ اس لئے تم بھوپال سے جلدی واپس آجاؤ۔'' ان دنوں برطانیہ، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مسئلہ کشمیر کو اقوام متحدہ کے روبرو پیش کرنے کی بات چیت ہو رہی تھی۔ بظاہر قائداعظم نے فیصلہ اس بنا پر کیا تھا کہ چونکہ اقوام متحدہ میں مسئلہ فلسطین پر بحث کے دوران ظفر اللہ خان کی کارگزاری اچھی رہی تھی اس لئے وہاں مسئلہ کشمیر کی پیروی کے لئے بھی ظفر اللہ خان موزوں رہے گا۔ ملک سر فیروز خان نون کی رپورٹ کے مطابق اس کی اس کارگزاری سے مشرق وسطیٰ کے ممالک میں بہت اچھا اثر ہوا تھا۔ علاوہ بریں سر محمد ظفر اللہ خان کو وزیر خزانہ غلام محمد، حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی اور محکمہ خارجہ کے سیکرٹری سر اکرام اللہ خان کی تائید وحمایت حاصل تھی اور یہی لوگ قائداعظم کے قریبی صلاح کار تھے، بے چارے وزیر اعظم کو اپنے وزیر خارجہ کے انتخاب اور تقرر میں کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔

انہی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے پاکستان کے سابق اٹارنی جنرل، وزیر قانون و وزیر خارجہ شریف الدین پیرزادہ نے مس فاطمہ جناح کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مس جناح نے ایک مرتبہ ذکر کیا کہ دسمبر 1947ء کے لگ بھگ کا واقعہ ہوگا کہ ایک عشائیے میں بیگم لیاقت علی خان قائداعظم کے ساتھ والی نشست پر بیٹھی تھیں۔ جناح چونکہ صاف گو واقع ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے اس سے بعض کھری کھری باتیں کہہ ڈالیں۔ اس واقعہ کے بعد لیاقت علی خان نے قائداعظم کو ایک خط لکھا جس میں احتجاج کیا گیا تھا اور وزارت عظمیٰ کے عہدے سے استعفیٰ دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔''[14] جناح اور لیاقت کے اختلافات پر روشنی ڈالتے ہوئے پیرزادہ نے سندھ کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو کی خودنوشت سوانح کا ایک اقتباس بھی درج کیا ہے جس میں وہ لکھتا ہے کہ ''قائداعظم اور لیاقت علی خان کے یہ اختلافات بتدریج نمایاں ہو کر سامنے آتے جا رہے تھے یہی وجہ تھی کہ 14/اپریل 1948ء کو نواب بہاولپور ہاؤس میں ایک نجی اور خصوصی لنچ کے دوران قائداعظم نے لیاقت علی خان کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا اور مجھ سے سوالیہ انداز میں کہا کہ میرا وزیراعظم معمولی قابلیت کا حامل ہے۔ انہی دنوں کراچی میں یہ افواہ گشت کر رہی تھی کہ قائداعظم، لیاقت علی خان کو مشرقی بنگال کا گورنر بنا کر بھیج رہے ہیں کیوں کہ وہاں کا انگریز گورنر عنقریب ریٹائر ہونے والا ہے۔''[15]

جناح۔ لیاقت تضاد پنجاب کے مسلم لیگی جاگیرداروں کی کشمکش اقتدار میں بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ ملک سر فیروز خان نون کا بیان ہے کہ ''1946ء کے انتخابات کے بعد مسلم ارکان لاہور میں اپنا لیڈر مجھے منتخب کرنا چاہتے تھے لیکن بعض مسلم لیگیوں نے گھبراہٹ کے مارے قائداعظم کو تار پر تار بھیجنے شروع کر دیئے۔ اس وقت قائداعظم آسام میں تھے۔ کسی نے مجھے بتایا کہ قائداعظم ممدوٹ کو لیڈر منتخب کرانے کے خواہش مند ہیں لیکن قائداعظم ضابطہ پسند آدمی تھے۔ اس معاملے میں انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار مجھ پر کبھی نہیں کیا تھا۔ تاہم میں نے ان سے ٹیلی فون پر بات کی اور انہوں نے کہا کہ میری خواہش ہے کہ یہ موقع ممدوٹ کو ملے۔ چنانچہ ممدوٹ کے نام کی تحریک خود میں نے کی۔''[16] اس کا مطلب یہ ہے کہ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ 1946ء میں قائداعظم جناح کی خواہش کے مطابق پنجاب کی مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب ہوا تھا اور پھر اسی بنا پر وہ 17/اگست 1947ء میں مغربی پنجاب کا وزیر اعلیٰ بنا تھا۔ لیکن

وزیراعظم لیاقت علی خان کی سر محمد ظفراللہ خان سے متذکرہ بات چیت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے قیام پاکستان کے چار ماہ کے اندر ہی نواب ممدوٹ کے خلاف پس پردہ ممتاز دولتانہ کی پشت پناہی شروع کر دی تھی اور وہ سرظفراللہ کونواب ممدوٹ کی جگہ صوبائی وزیراعلیٰ بنانے کا خواہاں تھا۔ اس وقت تک اس امر کی کوئی علامت ظاہر نہیں ہوئی تھی کہ قائداعظم جناح کی بھی یہی خواہش تھی۔

قائداعظم کی جانب سے پنجاب کے سیاسی بحران میں عملی مداخلت کا اظہار 21/اپریل 1948ء کو ہوا تھا جبکہ انہوں نے پنجاب کے تین وزراء یعنی نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات خان کو بلا کر ان میں صلح صفائی کرانے کی کوشش کی مگر جب چند دن بعد معلوم ہوا کہ یہ تینوں اپنی صلح صفائی کا اخبارات میں اعلان کرنے کے باوجود کشمکش اقتدار میں مصروف ہیں تو انہوں نے گورنر سر فرانسس موڈی کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس بحران کو حل کرنے کے لئے موقع اور محل کے مطابق جو قدم مناسب سمجھے اٹھائے۔ ان دنوں نواب ممدوٹ اور اس کے حامی اخبارات ''نوائے وقت'' اور ''زمیندار'' میں الزام یہ تھا کہ اس صوبائی بحران میں وزیراعظم لیاقت علی خان کا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے کیونکہ وہ پنجاب میں پس پردہ جاگیردارانہ گٹھ جوڑ کر کے ملک میں اپنی سیاسی پوزیشن مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ لیاقت علی خان کی دسمبر 1947ء میں سر محمد ظفراللہ خان سے بات چیت اور 11/ستمبر 1948ء کو قائداعظم کے انتقال کے بعد پنجاب کے واقعات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ الزام بے بنیاد نہیں تھا۔

لیکن نوابزادہ لیاقت علی خان کے قائداعظم محمد علی جناح سے دیرینہ اور شدید اختلاف کا نمایاں ترین مظاہرہ اواخر مئی 1948ء کے بعد ہوا جبکہ بابائے قوم شدید علالت کے باعث صاحب فراش ہو گئے۔ اس وقت تک یہ اختلاف معاندانہ صورت اختیار کر چکا تھا کیونکہ بظاہر لیاقت علی خان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب 72 سالہ قائداعظم واقعی چند دن کا مہمان ہے۔ قائد بہت نحیف ونزار تھے۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق قائداعظم کی صحت دراصل اکتوبر 1947ء میں خراب ہو گئی تھی جبکہ ہندوستانی فوجیں سری نگر پہنچ گئی تھیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''کشمیر میں حالات کے اس تغیر نے قائداعظم کی صحت پر سخت ناموافق اثر ڈالا تھا۔'' قائداعظم چاہتے تھے کہ کشمیر پر ہندوستان کی فوجی یلغار کو پسپا کرنے کے لئے مناسب اور موثر اقدام کرنا چاہیے۔ جبکہ لیاقت علی خان ایسا کرنے کے حق میں نہیں تھا۔''[17] مئی کے اواخر میں جبکہ قائداعظم بھی کراچی میں ہی

تھے۔ پنجاب کا گورنر سر فرانسس موڈی ان کا آخری مہمان تھا۔ اس نے چند دن قائداعظم کے ساتھ گزارے تھے اور اس دوران یہ دیکھا تھا کہ ''وہ بہت بیمار تھے اور بیشتر وقت بستر پر گزارتے تھے۔'' جون میں حالت زیادہ خراب ہوئی تو بابائے قوم کوئٹہ سے تقریباً 70 میل کے فاصلے پر ایک دورافتادہ مقام زیارت کے ایک ریسٹ ہاؤس منتقل ہو گئے۔ ان کے ہمراہ صرف ان کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح اور ذاتی عملہ کے دو چار ارکان تھے جن میں اے۔ ڈی۔ سی لیفٹیننٹ مظہر احمد بھی شامل تھا۔ تاہم قائداعظم کی صحت کے بارے میں کوئی سرکاری اعلان نہ ہوا اور نہ ہی سرکاری طور پر ان کے علاج معالجے کا کوئی معقول انتظام کیا گیا۔ جون کا سارا مہینہ ساری ضروری فائلیں زیارت پہنچتی رہیں اور وہ بے انتہا نقاہت کے باوجود ان فائلوں پر اپنے فیصلے صادر کرتے رہے۔ یکم جولائی کو جبکہ ان کی طبیعت کسی قدر سنبھل گئی تھی تو وہ سٹیٹ بینک کی رسم افتتاح کے لئے کراچی آئے۔ اس سفر نے اُن کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا۔ چنانچہ جب وہ کراچی سے زیارت واپس پہنچے تو وہ بہت زیادہ نحیف وعلیل تھے۔ دو ایک دن کے بعد انہیں سردی لگ جانے کی وجہ سے بخار اور کھانسی کی شکایت ہوئی تو انہوں نے کوئٹہ کے سول سرجن کی تجویز کے مطابق پنسلین کی ٹکیاں کھانی شروع کر دیں۔ لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا۔ 21/جولائی کو حالت اتنی تشویش ناک ہو گئی کہ مس فاطمہ جناح نے خوفزدہ ہو کر چودھری محمد علی کی وساطت سے لاہور کے ایک ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو بلوا بھیجا۔ جس نے 25/جولائی کو یہ تشخیص کیا کہ قائداعظم پھیپھڑوں کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ ان کے خون کا دباؤ بہت کم ہے اور لاغری ونقاہت زیادہ ہے۔ 29/جولائی کو امریکہ میں پاکستانی سفیر ابوالحسن اصفہانی زیارت آیا اور قائداعظم سے مل کر بہت مغموم ہوا۔ اسی دن ایران میں نامزد پاکستانی سفیر راجہ غضنفر علی خان حاضر ہوا اور اس نے قائداعظم سے مناسب ہدایات حاصل کیں۔

30/جولائی کو وزیراعظم لیاقت علی خان اور چودھری محمد علی بغیر پیشگی اطلاع اچانک زیارت پہنچ گئے۔ اس واقعہ کی تفصیل مس فاطمہ جناح نے اپنی مختصر کتاب ''میرا بھائی'' میں بیان کی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''وزیراعظم نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے پوچھا کہ قائداعظم کی صحت کے متعلق اس کی تشخیص کیا ہے؟ ڈاکٹر نے کہا کہ اسے مس فاطمہ نے یہاں بلایا ہے اس لئے وہ اپنے مریض کے متعلق کوئی بات صرف انہی کو بتا سکتا ہے۔

''لیکن وزیراعظم کی حیثیت سے میں یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں۔'' ڈاکٹر نے ادب سے جواب دیا'' جی ہاں۔ بے شک۔ لیکن میں اپنے مریض کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''میں قائداعظم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ وزیراعظم اور سیکرٹری جنرل ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے اس کی اطلاع ان کو دی۔ وہ مسکرائے اور بولے ''فطی تم جانتی ہو وہ یہاں کیوں آیا ہے؟'' میں نے کہا کہ مجھے اس کی آمد کے سبب کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ وہ بولے'' وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ میری بیماری کتنی شدید ہے۔ میں کتنا عرصہ اور زندہ رہ سکتا ہوں۔''

''چند منٹ بعد انہوں نے مجھ سے کہا'' نیچے جاؤ۔ وزیراعظم سے کہو۔ میں اس سے ابھی ملوں گا۔''

''لیکن! بہت دیر ہو چکی ہے۔ وہ کل صبح آپ سے مل لیں گے''

''نہیں۔ اسے ابھی آنے دو۔ وہ خود آ کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے''

''لیاقت نے نصف گھنٹہ تک علیحدگی میں قائداعظم سے ملاقات کی۔ جونہی لیاقت علی خان واپس نیچے آیا تو میں اوپر اپنے بھائی کے پاس گئی۔ وہ بری طرح تھکے ہوئے تھے اور ان کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پھل کا جوس مانگا اور پھر انہوں نے چودھری محمد علی کو اندر بلا لیا۔ وہ پندرہ منٹ تک ان کے پاس رہا۔ پھر جب دوبارہ اکیلے ہوئے تو میں اندر ان کے پاس گئی۔ میں نے پوچھا کہ وہ جوس یا کافی پینا پسند کریں گے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا، اُن کا ذہن کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اتنے میں ڈنر کا وقت ہو گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا'' بہتر ہے کہ تم نیچے چلی جاؤ۔ اور ان کے ساتھ۔ کھانا کھاؤ۔''

''نہیں'' میں نے زور دے کر کہا'' میں آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی اور یہیں پر کھانا کھا لوں گی۔''

''نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔ وہ۔ یہاں ہمارے مہمان ہیں۔ جاؤ۔ اور اُن کے ساتھ کھانا کھاؤ۔''

''کھانے کی میز پر میں نے وزیراعظم کو بہت خوشگوار موڈ میں پایا۔ وہ لطیفے سنا رہا تھا اور ہنسی مذاق کر رہا تھا۔ جبکہ میں قائداعظم کی صحت کی طرف سے خوف کے مارے کانپ رہی تھی جو اوپر کی منزل میں تنہا بستر علالت پر پڑے ہوئے تھے۔ کھانے کے دوران چودھری محمد علی بھی چپ چاپ کسی سوچ میں گم رہا۔ کھانا ختم ہونے سے پہلے ہی میں اوپر کی منزل پر چلی گئی۔ جب میں کمرے میں داخل ہوئی تو قائداعظم مجھے دیکھ کر مسکرائے اور بولے ''فطی۔ تمہیں ہمت سے

کام لینا چاہیے'' میں نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی بڑی کوشش کی جو میری آنکھوں میں امڈ آئے تھے۔''[18] ☆

شریف الدین پیرزادہ نے اپنے ایک مضمون میں ایم۔اے رحمٰن کا ایک خط شائع کیا ہے جس میں ڈاکٹر الٰہی بخش کے بیٹے ہمایوں خان کی زبانی متذکرہ واقعہ کی وہ تفصیل بیان کی گئی ہے جو اس نے اپنے باپ سے سنی تھی۔اس کے مطابق'' قائداعظم پر دوا کا بڑا موافق اثر ہو رہا تھا اور وہ صحت یابی کی راہ پر گامزن تھے۔ایک روز لیاقت علی خان، قائداعظم سے ملنے کے لئے زیارت آیا۔وہ ان کے ساتھ تقریباً ایک گھنٹہ تک رہا۔ابھی ان کی ملاقات جاری تھی کہ دوا کھلانے کا وقت ہو گیا۔لیکن کرنل الٰہی بخش اندر جا کر دوا نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اندر جو ملاقات جاری تھی وہ رازدارانہ تھی۔چنانچہ وہ باہر انتظار کرتا رہا تاکہ جونہی ملاقات ختم ہو وہ دوا دے سکے۔

''جب لیاقت علی خان ملاقات کر کے کمرے سے باہر نکل آیا تو کرنل الٰہی بخش فوراً کمرے میں داخل ہوا اور قائداعظم کو دوا کھلانا چاہی۔اس نے دیکھا کہ قائداعظم پر سخت اضطرابی افسردگی طاری تھی۔انہوں نے دوا کھانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ اب میں مزید زندہ نہیں رہنا چاہتا۔اس کے بعد کرنل الٰہی بخش کی بھرپور کوشش اور اصرار کے باوجود قائد نے اپنے ڈاکٹر کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔

''...... قائد کے انتقال کے فوراً بعد میرے والد کو لیاقت علی خان نے بلوا بھیجا۔ لیاقت علی نے ان سے پوچھا کہ اس روز زیارت میں جب میں کمرے سے باہر نکل آیا اور آپ

☆ خط کشیدہ جملے مس فاطمہ جناح کے My Brother کے اصل مسودہ میں شامل ہیں جو ادارہ قومی دستاویزات پاکستان، اسلام آباد (National Archives Pakistan) میں محفوظ ہیں لیکن 1987ء میں قائداعظم اکیڈمی کراچی کی جانب سے شائع کردہ متن (ص 29-30) سے یہ جملے اس کے مرتب شریف المجاہد نے حذف کر دیئے ہیں اور اپنی اس علمی بددیانتی کا دیباچے میں اعتراف بھی کر لیا ہے۔تاہم محولہ بالا اصل متن قدرت اللہ شہاب نے ''شہاب نامہ'' کے صفحہ 39-438 پر من و عن شائع کر دیا ہے۔علاوہ ازیں شریف الدین پیرزادہ نے بھی یہ خط کشیدہ جملے اپنے مضمون ''The Last Days of the Quaid-I-Azam'' میں حرف بہ حرف Quote کئے ہیں۔ جو 17/اکتوبر 1979ء کو دی پاکستان ٹائمز لاہور میں شائع ہوا (مرتب)

اندر گئے تو قائد نے آپ سے کیا بات کی تھی۔ کرنل الٰہی بخش نے لیاقت علی خان کو بہتیرا یقین دلانے کی کوشش کی کہ قائد نے آپ دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو کے بارے میں مجھ سے قطعی کوئی بات نہیں کی تھی سوائے اس کے کہ اس کے بعد قائد نے دوا کھانا بند کر دی تھی لیکن الٰہی بخش کے جواب سے لیاقت علی خان کو تسلی نہ ہوئی......لیاقت علی خان کافی دیر تک کرنل الٰہی بخش کو زیر کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب ان کی ملاقات ختم ہوئی اور کرنل الٰہی بخش کمرے سے نکلنے لگا تو لیاقت علی خان نے اسے واپس بلایا اور اسے تنبیہ کی کہ اگر میں نے کسی اور ذریعے سے متذکرہ ملاقات کے بارے میں کچھ سنا تو تمہیں اس کے سنگین نتائج بھگتنا پڑیں گے۔''[19] اس کہانی کی صحت پر بحث کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ اگست کا آغاز ہوتے ہی قائداعظم کی صحت تیزی سے گرنا شروع ہوگئی تھی۔

چونکہ یکم جولائی کے بعد قائداعظم جناح کی سرگرمیاں یکا یک ختم ہوگئی تھیں اور یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ وہ 14 راگست 1948ء کو پاکستان کے پہلے یوم آزادی کی تقریب میں شرکت نہیں کریں گے اس لئے عوام الناس کو بابائے قوم کی صحت کے بارے میں بجا طور پر تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ بالخصوص اس نا قابل فہم صورت حال کے پیش نظر عوامی تشویش میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا کہ حکومت نے اس عرصے میں ان کی صحت کے بارے میں کوئی بھی بلیٹن جاری نہیں کیا تھا اور نہ ہی یہ بتایا تھا کہ قوم کے محسن اعظم کے علاج معالجے کے لئے سرکاری طور پر کیا انتظامات کئے گئے ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس بڑھتی ہوئی عوامی تشویش کا 11 راگست کو نوٹس لیا جبکہ ایک پریس نوٹ میں قائداعظم کی صحت کے بارے میں ''دشمن عناصر'' کی پھیلائی جانے والی ''بے بنیاد افواہوں'' کی تردید کی گئی اور یہ یقین دلایا گیا کہ ''قائداعظم کی صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور وہ محض آرام کی غرض سے اس ماہ کے آخر تک زیارت میں قیام کریں گے۔''[20] دراصل یہ پریس نوٹ گمراہ کن تھا اور سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔ اس وقت تک قائداعظم کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی حتیٰ کہ وہ بات بھی بڑی مشکل سے کرتے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر ڈاکٹر الٰہی بخش کے اصرار پر 13 راگست کو انہیں زیارت سے کوئٹہ منتقل کر دیا گیا۔ لیکن ان کی حالت نہ سنبھلی بلکہ خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔

14 راگست 1948ء کو قوم نے پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ منائی۔ قائداعظم

نے شدید علالت کے باوجود قوم کے نام ایک ولولہ انگیز پیغام جاری کیا۔ اس کے چند روز بعد وزیر خزانہ ملک غلام محمد قائداعظم سے ملنے کے لئے کوئٹہ آیا۔ مس فاطمہ جناح لکھتی ہیں کہ "لنچ پر میں اس کے ساتھ اکیلی تھی۔ وہ مجھ سے کہنے لگا "مس جناح، میں ایک بات آپ کو ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ یوم آزادی پر قائداعظم نے قوم کے نام جو پیغام جاری کیا تھا اسے خاطر خواہ اہمیت اور تشہیر نہیں دی گئی۔ اس کے برعکس وزیراعظم کے پیغام کے پوسٹر چھاپ کر انہیں شہر شہر دیواروں پر چسپاں کیا گیا ہے اور ہوائی جہازوں کے ذریعے بڑے شہروں میں پھینک کر منتشر بھی کیا گیا ہے۔" میں نے یہ بات خاموشی سے سن لی۔ ان باتوں سے پریشان ہونے کا کیا فائدہ تھا؟ میں اس وقت اپنے بھائی کی صحت کے بارے فکرمند تھی نہ کہ ان کی پبلسٹی کے لئے۔"[21] اس سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ لیاقت علی خان قائداعظم کو بستر علالت پر دیکھ لینے کے بعد اپنا قد اونچا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا وہاں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ کابینہ میں غلام محمد ٹولہ جو پنجابی وزیروں اور افسروں پر مشتمل تھا۔ لیاقت علی خان کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف ہو چکا تھا۔

29/اگست کو قائداعظم کی حالت اتنی دگرگوں ہو چکی تھی کہ وہ بطل عزیز، جس نے دس سال تک کانگرس کی سیاست کے بڑے بڑے جغادری پہلوانوں سے تن تنہا کامیابی سے لڑائی لڑی تھی، خود اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا۔ اس نے یاس انگیز لہجہ میں اپنے معالج سے کہا "آپ کو معلوم ہے کہ جب آپ پہلی بار زیارت پہنچے تو میں زندہ رہنا چاہتا تھا لیکن اب میرا مرنا جینا برابر ہے۔ یہ الفاظ زبان سے نکالتے وقت وہ آنکھوں میں آنسو بھر لائے۔"[22] مس جناح لکھتی ہیں کہ "اگست کے آخر میں قائداعظم بالکل دل چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے میری آنکھوں میں گھورتے ہوئے مجھے کہا "فطی۔ میں اب زندہ رہنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ میں جتنا جلد چلا جاؤں، بہتر ہے" مس جناح نے تسلی دینے کی کوشش کی تو وہ مردہ مسکراہٹ کے ساتھ مسکرائے اور بولے "نہیں۔ اب میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"[23] ستمبر کے دوسرے ہفتے میں اُن پر ہذیان کی کیفیت طاری ہو گئی اور "ایک مرتبہ وہ ایسی ہی حالت میں یہ کہتے سنے گئے کہ کشمیر کمیشن کو آج مجھ سے ملنا تھا وہ اب تک کیوں نہیں آئے؟ کہاں چلے گئے"[24] اور وہ یہ کہتے بھی سنے گئے "کشمیر۔ انہیں حق۔ دے دو۔ فیصلہ کا۔ آئین۔ میں مکمل کروں گا۔ جلد۔ مہاجرین۔ ان کو دو۔ ہر قسم کی امداد۔ پاکستان۔"[25]

جب ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے یہ حالت دیکھی تو اس نے مس جناح کو یہ مشورہ دیا کہ قائداعظم کو فوراً کراچی لے جایا جائے کیونکہ بجز اس کے کہ کوئی معجزہ رونما ہو قائداعظم کے چند دن سے زیادہ زندہ رہنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چنانچہ 11 ستمبر کو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کا خاص ہوائی جہاز چار بج کر پندرہ منٹ پر ماڑی پور کے ہوائی اڈہ پر پہنچا۔ وہاں گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کے سوا کوئی اور سرکاری عہدیدار موجود نہیں تھا البتہ ایک ایمبولینس تھی۔ مس جناح اور کوئٹہ والی نرس ایمبولینس میں بیٹھ گئیں۔ راستے میں ایمبولینس کے ساتھ جو افتاد بیتی اس کا احوال کرنل الٰہی بخش لکھتا ہے کہ ''بمشکل چار میل گئے ہوں گے کہ ایمبولینس یکا یک رک گئی۔ ہم حیران تھے کہ آخر یہ کیا ہوا۔ میں نے باہر نکل کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے۔ ڈرائیور نے کہا کہ ابھی ٹھیک کئے دیتا ہوں۔ وہ کوئی بیس منٹ تک مصروف رہا لیکن گاڑی پھر بھی نہ چلی۔ مس جناح نے ملٹری سیکرٹری کو ایک اور ایمبولینس لانے کے لئے بھیجا۔ ڈاکٹر مستری بھی اس کے ساتھ ہو لئے۔ ایمبولینس میں ہوا بالکل بند تھی۔ نرس اور نوکر انہیں پنکھا جھل رہے تھے۔ پھر بھی قائداعظم کو پسینہ آ رہا تھا۔ ہمیں خیال آیا کہ انہیں بڑی کار میں منتقل کر دیں لیکن اسٹریچر اس کے دروازے سے بڑا تھا۔ وہ خود بھی اتنے کمزور تھے کہ پچھلی سیٹ پر نہیں لیٹ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے کپڑے پسینہ سے شرابور تھے اور باہر انہیں ہوا لگ جانے کا خطرہ تھا۔ میں ان کی نبض دیکھ کر کچھ سہم سا گیا۔ کیونکہ وہ بڑی کمزور معلوم ہو رہی تھی ...... مجھے خیال آیا کہ خدانخواستہ قائداعظم نے ہوائی سفر بخیر و خوبی طے کرنے کے بعد سڑک کے کنارے جان دے دی تو یہ کتنا زبردست سانحہ ہوگا...... میں گھڑی گھڑی شہر کی طرف نظریں دوڑاتا تھا لیکن ایمبولینس کے کوئی آثار نہ تھے۔ ٹرک اور بسیں اِدھر اُدھر سے گزر رہی تھیں لیکن کوئی بس اس قابل نہ تھی کہ وہ استعمال میں لائی جا سکے۔ میں بہت ہراساں اور پریشان بیٹھا تھا۔ بڑے صبر آزما انتظار کے بعد خدا خدا کر کے ایمبولینس نمودار ہوئی۔ ہم نے فوراً قائداعظم کو اس میں منتقل کیا اور پھر روانہ ہوئے۔ ایمبولینس پر گورنر جنرل کا نشان نہ تھا۔ اس لئے کسی کو پتہ بھی نہ چلا کہ قائداعظم اس نازک حالت میں کراچی کے بازاروں سے گزر رہے ہیں۔ چھ بج کر دس منٹ پر ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر اترنے کے دو گھنٹے بعد کہیں جا کر ہمارا سفر ختم ہوا'' ......لیکن کئی گھنٹے تک تگ و دو کے باوجود رات کے لئے کسی نرس کا انتظام نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش اس مقصد کے لئے خود بھی دوڑ دھوپ کرتا تھا اور

وہ حیران تھا کہ ہوائی اڈے سے لے کر اب تک ہر بات مخالف ہو رہی ہے۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ پورے کراچی شہر میں نرس کا ملنا اتنا دشوار ہوگا۔ بالآخر ملٹری سیکرٹری کو رات کے آٹھ بجے کے قریب کہیں سے ایک نرس مل گئی لیکن اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد دس بج کر دس منٹ پر قائداعظم محمد علی جناح کی روح پرواز کر گئی۔اس موقع پر ان کے بستر مرگ کے نزدیک صرف تین ڈاکٹروں، ایک نرس اور مس فاطمہ جناح کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔''[26]

11 ستمبر کو قائداعظم کے انتقال کے بارے میں جو سرکاری بیان شائع کیا گیا اس میں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ''قائداعظم تقریباً دو ماہ قبل 6 جولائی کو زیارت گئے تھے۔ وہاں پانچ چھ دن کے بعد انہیں انفلوائنزا ہو گیا لیکن جلد ہی حالت بہتر ہو گئی لیکن پھر خناق کے باعث پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ 13 اگست کو وہ زیارت سے کوئٹہ آ گئے اور وہاں سے انہیں 11 ستمبر کو کراچی لایا گیا اور اسی رات کو دس بج کر پچیس منٹ پر گورنر جنرل ہاؤس میں ان کا انتقال ہو گیا۔''[27]

قدرتی طور پر اس بیان میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ جب قائداعظم کا ہوائی جہاز ساڑھے چار بجے سہ پہر ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر پہنچا تھا تو وہاں وزیراعظم لیاقت علی خان اور ان کی کابینہ کا کوئی رکن موجود نہیں تھا اور یہ کہ ایمبولینس کار دو گھنٹے تک سڑک پر خراب پڑی رہی تھی۔ اس اعلان میں یہ بھی نہیں بتایا گیا تھا کہ شام کو تقریباً چھ بجے قائداعظم کے گورنر جنرل ہاؤس میں پہنچنے کے بعد بھی وزیراعظم یا ان کی کابینہ کے کسی اور رکن نے وہاں پہنچنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ تاہم یہ تلخ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی تھی اور نہ چھپی رہی۔ دوسرے ہی دن ملک میں ہر باخبر شہری کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ان کا قائد نہایت کسمپرسی کی حالت میں جاں بحق ہوا ہے۔ حکومت نے اس کے علاج کے لئے سرکاری طور پر کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ مس فاطمہ جناح نے اس مقصد کے لئے پہلے لاہور کے ڈاکٹر الٰہی بخش اور پھر کراچی کے ڈاکٹر مستری کی خدمات نجی طور پر حاصل کی تھیں۔ انہوں نے امریکہ میں مقیم پاکستانی سفیر حسن اصفہانی، جو قائداعظم جناح کا دیرینہ ذاتی دوست تھا، کو بھی کسی امریکی ڈاکٹر کی خدمات حاصل کرنے کے لئے ایک نجی خط لکھا تھا۔ مگر یہ خط اسے اس وقت ملا تھا جب کہ قائداعظم کا انتقال ہو چکا تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح کی زندگی کے آخری ایام میں ان کے اور وزیراعظم لیاقت علی خان کے باہمی طبقاتی، سیاسی تضاد نے کھلم کھلا جو معاندانہ صورت اختیار کر لی تھی اس کا ملک کی

انتظامیہ پر کتنا برا اثر پڑا، اس کا کچھ اندازہ اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ قائداعظم کے انتقال کے فوراً ہی بعد مرکزی حکومت کے بعض اعلیٰ حکام نے وزیراعظم لیاقت علی خان کی جانب سے بابائے قوم کے علاج معالجے میں مجرمانہ غفلت کے خلاف بطور احتجاج مستعفی ہونے پر سنجیدگی سے غور کیا تھا۔ اس حقیقت کا انکشاف مشتاق احمد وجدی نے، جو اُن دنوں مرکزی محکمہ خزانہ میں ایک ذمہ دار عہدے پر فائز تھا، کیا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''قائداعظم کے انتقال کے دوسرے دن ان (ڈیفنس سیکرٹری اسکندر مرزا) کا ٹیلیفون آیا کہ میرے دفتر آؤ کچھ مشورے کرنے ہیں۔ میں پہنچا تو شعیب صاحب اور ابوطالب نقوی صاحب وہاں موجود تھے اور ایک مسودہ زیرغور تھا۔ یہ مسودہ استعفیٰ کا تھا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ موجودہ سرکار نے بابائے قوم کے علاج کا خاطرخواہ انتظام نہیں کیا۔ قوم کو ان کی نازک حالت سے بےخبر رکھا گیا۔ کوئی ان کی صحت کے لئے بارگاہِ ایزدی میں دعا بھی نہ کر سکا۔ لاپرواہی اور بےاعتنائی اس حد تک پہنچی کہ ان کے لئے ایک ٹوٹی پھوٹی ایمبولینس بھیجی گئی جو بندر روڈ پر آ کر رک گئی۔ وہیں کسمپرسی میں انہوں نے دم توڑا۔ گورنمنٹ کی شقی القلبی کے خلاف ہم احتجاجاً مستعفی ہوتے ہیں۔ مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے۔ دستخط کر دیئے لیکن نقوی صاحب نے کہا کہ ایسا استعفیٰ چھپا نہیں رہ سکتا۔ اس وقت قوم انتہائی غم اور مایوسی کے جذبے سے مغلوب ہے۔ اس خبر سے یہ جذبہ اضطراب اور غصے میں تبدیل ہو جائے گا جس کے نتائج نہایت سنگین ہو سکتے ہیں۔ اس پر کاغذات پھاڑ دیئے گئے۔''[28] یہ امر قابل ذکر ہے کہ ان چار افسروں میں تین یو۔پی کے ''اہل زبان'' تھے۔ اگر ان پر وزیراعظم لیاقت کی حکومت کی قائداعظم کے بارے میں شقی القلبی کا یہ اثر ہوا تھا تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ پنجابی افسروں پر اس کا کیا اثر ہوا ہوگا۔

پنجابی افسروں اور درمیانہ طبقہ کے دوسروں لوگوں کے اس بنا پر برانگیختہ جذبات کی شدت کا پتہ اس امر سے چلتا ہے کہ قائداعظم کے انتقال کے کچھ عرصہ بعد جب وزیراعظم لیاقت علی خان نے کھلم کھلا اپنے آپ کو پنجابی جاگیرداروں کے دولتانہ دھڑے کے ساتھ وابستہ کر لیا تو اس کے مخالف دھڑے کے سرغنہ نواب ممدوٹ اور حسین شہید سہروردی، قائداعظم جناح کے نام پر نہ صرف پنجاب میں بلکہ پورے ملک میں لیاقت علی خان کے خلاف ایک مضبوط سیاسی محاذ بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ پنجاب کے اخبارات میں سے نہ صرف نوائے وقت، زمیندار اور

احسان وغیرہ نے اس محاذ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا بلکہ پاکستان ٹائمز اور امروز بھی اس میں کسی حد تک ملوث ہو گئے۔ جب کچھ عرصہ بعد قائداعظم جناح کے پنجابی معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کی کتاب بعنوان ''قائداعظم کے آخری ایام'' شائع ہوئی تو پنجاب میں لیاقت علی خان کے مخالفین نے اس سے خوب فائدہ اُٹھایا۔ یہاں تک کہ پاکستان ٹائمز نے بھی اپنی 11 ستمبر 1949ء کی اشاعت میں اس کتاب کے وہ اقتباسات شائع کئے جن میں قائداعظم جناح کے بارے میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی حکومت کی شقی القلبی کا اظہار ہوتا تھا۔ بعدازاں مسلم لیگ کے ایک ممتاز پنجابی لیڈر شیخ کرامت علی نے مرکزی اسمبلی میں یہ سوالات اُٹھائے کہ ''قائداعظم کی مہلک علالت کے دوران بیرون پاکستان سے طبی امداد کا انتظام کیوں نہیں کیا گیا تھا؟ ان کی علالت کو عوام سے انتہائی راز میں کیوں رکھا گیا؟ ان کی طویل علالت کے دوران میں ان کی صحت کے متعلق اعلانات کیوں نہ شائع کئے گئے؟ جب وہ آخری دفعہ کراچی کے ہوائی اڈے پر پہنچے تو وزراء یا سرکاری افسروں میں سے کسی نے ان کا استقبال کیا؟ اور کیا کرنل الٰہی بخش کی کتاب وزیراعظم کی نظر سے گزری ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ جو ایمبولینس قائداعظم کو ہوائی اڈے سے گورنمنٹ ہاؤس لا رہی تھی راستے میں خراب ہوگئی تھی اور اس طرح جاں بلب قائداعظم کو کئی گھنٹے سڑک پر انتظار کرنا پڑا۔''[29]

پھر لیاقت علی خان کے خلاف پنجابی شاونسٹوں کے محاذ کے ترجمان اخبار ''نوائے وقت'' نے اپنے ایک اداریہ میں یہ الزام عائد کیا کہ لیاقت علی نے اپنے دورۂ امریکہ کے دوران قائداعظم کو خراج عقیدت پیش نہیں کیا تھا۔ اداریہ میں لکھا تھا کہ ''گستاخی نہ سمجھی جائے تو ہم اس مرحلہ پر ایک شکوہ بھی کر دیں۔ آنریبل وزیراعظم نے امریکن کانگرس کے سامنے اپنی تقریر میں کوزہ میں دریا بند کرنے کی کوشش فرمائی اور پاکستان کی غرض و غایت، اس کا مدعا، اس کے مقاصد، اس کے نصب العین، اس کی مشکلات، اس کے عزائم ہر چیز واضح کر دی۔ مگر پوری تقریر میں پاکستان کے بانی بابائے ملت، اپنے آقا اور قوم کے قائداعظم کا ایک مرتبہ بھی نام نہیں لیا۔ حالانکہ کسی دوسرے ملک میں (بلکہ اپنے ملک میں بھی) پاکستان کا تذکرہ بانیٔ پاکستان کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ پنڈت نہرو امریکہ گئے تھے تو وہ قدم قدم پر گاندھی جی کو خراج تحسین ادا کرتے رہے۔ حالانکہ گاندھی جی کا ہندوستان پر ہرگز وہ احسان نہیں جو قائداعظم کا پاکستان پر

ہے۔آزادیٔ ہند کی جدوجہد میں گاندھی کے ساتھ کم ازکم بیس صف اول کے ہندولیڈروں کا نام لیا جا سکتا ہے مگر پاکستان کی جدوجہد میں کامیابی تنہا ایک مردِمجاہد کی رہین محنت ہے اور وہ قائداعظم ہیں۔تعجب اس پر ہے کہ صدر ٹرومین نے تو احتیاط کی اور جام صحت تجویز کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ جام صحت نوش کرتے وقت ہمیں اس قوم کے بطل عظیم محمد علی جناح کو یاد رکھنا چاہیے۔مگر مسٹر لیاقت علی کو اس یاددہانی کے باوجود نہ صرف اس تقریب پر قائداعظم یاد نہ آئے (کیونکہ اس ٹوسٹ کے جواب میں بھی انہوں نے قائداعظم کا نام نہیں لیا) نہ امریکن کانگرس کو خطاب کرتے وقت۔ہمیں معاف فرمایا جائے۔قائداعظم کی یاد سے اس سلوک کو ہم مستحسن قرار نہیں دے سکتے۔''[30] اس کے چند دن بعد جب کراچی کے روزنامہ ''ڈان'' نے صفحہ اول پر چوکھٹے میں جلی حروف میں یہ رپورٹ اپنے نامہ نگار خصوصی کے حوالے سے شائع کی، ''مسٹر لیاقت علی خان نے اپنے سفر امریکہ کے دوران میں اپنی رسمی تقریروں میں اور غیر رسمی بات چیت میں بارہا قائداعظم کا ذکر کیا ہے۔خبر رساں ایجنسیوں نے جب ان تقریروں کا خلاصہ تار کے ذریعے باہر بھیجا تو نامعلوم وجوہ کی بنا پر قائداعظم کی طرف اشارات حذف کر دیئے۔معلوم ہوا ہے کہ خود وزیراعظم نے بھی یہ بات نوٹ کی ہے۔'' تو اس پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہمیں حیرت ہے کہ وزیراعظم کی تقریروں کو اخبارات، ریڈیو دونوں کے ذریعے مناسب اچھی پبلسٹی دی گئی اور ان کے جزیات تک کا بیان ہوا کہ وزیراعظم نے کس رنگ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔مگر پریس اور ریڈیو دونوں کے عام نامہ نگار بلااستثنٰی قائداعظم کے ذکر کو ہمیشہ حذف کرتے رہے۔یہ امر سخت افسوس ناک ہے۔ہم مردہ پرست نہیں ہیں۔مقصد صرف اس قدر ہے کہ پاکستان کا ذکر کہیں بھی ہو بانیٔ پاکستان اور بابائے ملت کے ذکر کے بغیر یہ ذکر نامکمل ہے۔''[31] ظاہر ہے کہ اس تبصرے کا مطلب یہ تھا کہ ڈان کی یہ رپورٹ غلط ہے، لیاقت علی خان نے دراصل اس وقت تک اپنی تقریروں میں قائداعظم کا ذکر کیا ہی نہیں تھا۔

قائداعظم محمد علی جناح اور وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی کے درمیان اس دیرینہ طبقاتی وسیاسی تضاد اور ملک کی انتظامیہ اور سیاست پر نہایت برے اثرات سے متعلقہ سارے حقائق کے باوجود لیاقت علی خان کا پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان اس بات کو شرانگیزوں کا من گھڑت قصہ قرار دیتا ہے کہ ''قائداعظم، قائد ملت سے ناراض تھے۔'' اس کی دلیل یہ ہے کہ ''اگر یہ بات صحیح ہوتی تو قائداعظم کے پاس اتنے اختیارات تھے کہ وہ انہیں کسی بھی وقت وزارت عظمٰی

سے ہٹا دیتے اور کس کی مجال تھی کہ ان سے باز پرس کرتا۔'' نواب صدیق علی خان کا مزید بیان صفائی یہ ہے کہ مس فاطمہ جناح نے قائداعظم کی علالت کو صیغۂ راز میں رکھا تھا اور انہوں نے کراچی میں آمد کی اطلاع کسی کو نہیں دی تھی اور نہ کسی مرحلہ پر وزیراعظم سے مشورہ کیا تھا یا انہیں اعتماد میں لیا تھا اور پھر آخر میں لکھتا ہے کہ ''فرض کر لیجئے کہ اگر آپ کی تحقیقات کا نتیجہ آپ کے خیال کے مطابق درست نکلا تو یاد رکھنا چاہیے کہ جو عظیم ہستیاں جواب دہ ہوسکتی ہیں وہ اپنی صفائی یا اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اگر آپ کی بات غلط نکلی تو آپ نے گناہ بے لذت کیا اور سزا کے مستوجب ہو گئے۔''[32] حیرت ہوتی ہے کہ جس شخص کے علم و دانش اور فہم و ادراک کی سطح یہ تھی وہ اپنے وزیراعظم کو کیا سیاسی مشورے دیتا ہوگا؟ اس نے اپنے اور اپنے ممدوح نوابزادہ لیاقت علی خان کے ''کارناموں'' پر مشتمل جو کتاب لکھی ہے وہ تاریخی لحاظ سے بہت مستند اور معلومات افزا ہونی چاہیے تھی لیکن تاریخ کے طالب علموں کی بدقسمتی ہے کہ اس کے بیشتر حصے کی حیثیت الف لیلیٰ کے قصے سے بہتر نہیں جس کی الفاظ آرائی اور انشا پردازی میں یو۔ پی کے رجعت پسند مسلمان جاگیرداروں وتعلقہ داروں کی تہذیب و ثقافت نمایاں ہے۔ اس نے جہاں کہیں کسی تاریخی واقعہ یا حقیقت کا بیان کیا ہے تو اس کو الفاظ کے ہیر پھیر اور مبالغہ آرائی میں کچھ اس طرح دبا دیا ہے کہ کسی کو کچھ پتہ نہ چل سکے۔

باب: 4

وزیراعظم لیاقت علی خان اور
مس فاطمہ جناح کے درمیان تضاد

جناح۔ لیاقت تضاد 12 ستمبر 1948ء کو اس وقت ختم نہیں ہو گیا تھا جبکہ قائداعظم کو کراچی میں لاکھوں سوگواروں کی موجودگی میں سپرد خاک کیا گیا تھا بلکہ اسی دن جناح۔ لیاقت تضاد نے فاطمہ۔ لیاقت تضاد کی صورت اختیار کر لی تھی اور پھر آئندہ تین سال میں یہ تضاد بڑھتے بڑھتے ایسا معاندانہ ہو گیا کہ قائداعظم کی ہمشیرہ مس فاطمہ جناح اور وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کے درمیان باقاعدہ سیاسی محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ 16 اکتوبر 1951ء کو جب لیاقت علی خان راولپنڈی کے ایک پبلک جلسے میں پنجابی شاونزم اور مذہبی عصبیت کی گولیوں کا شکار ہوا تھا تو اس کے پس منظر میں کسی حد تک اس سیاسی محاذ آرائی کی بھی کارفرمائی تھی۔ نواب صدیق علی خان نے پاکستان کی ان دونوں بڑی شخصیتوں میں تعاون کی بجائے محاذ آرائی کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مس فاطمہ جناح اپنے بھائی کی جگہ گورنر جنرل بننا چاہتی تھیں۔ چونکہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے ملکی مفاد میں ان کی اس خواہش کی تکمیل نہیں کی تھی اس لئے وہ لیاقت کے خلاف ہو گئی تھیں۔ لیاقت علی خان نے خود تو کبھی اعلانیہ طور پر مس فاطمہ پر اس قسم کا الزام عائد نہیں کیا تھا لیکن یہ عین ممکن ہے کہ وہ نجی محفلوں میں مس فاطمہ جناح کے مخالفانہ رویہ کی یہی وجہ بیان کرتا ہو گا اور شاید اس میں کچھ صداقت بھی ہو گی۔ نواب صدیق علی خان نے فاطمہ۔ لیاقت تضاد کی اس وجہ کا اپنے مخصوص ''مہذبانہ'' انداز میں اس طرح ذکر کیا ہے کہ ''قائداعظم سے بے پناہ عقیدت اور جذبات غم کی فراوانی میں بہنے والے چند لوگوں کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس عہدۂ جلیلہ (گورنر جنرل شپ)

کے لئے محترمہ فاطمہ جناح سے بڑھ کر کوئی دوسرا موزوں امیدوار نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ وہ قائداعظم کی چہیتی بہن ہیں۔ جنھوں نے اپنے بڑے بھائی کی خدمت اور اُن کی دیکھ بھال میں اپنی زندگی تمام کر دی اور بھائی کے فیض قربت سے ایک اعلیٰ سیاستدان، بہترین مدبر اور عمدہ منتظم بن گئی ہیں۔ اس زمانہ میں یہ افواہیں بھی گرم تھیں اور چند معتبر لوگوں نے بھی کہا کہ محترمہ کی بھی یہی خواہش تھی اور ہو سکتا ہے کہ جس کی تکمیل نہ ہونے پر بتقاضائے فطرت انسانی ان کے دل میں وزیراعظم کی طرف سے کچھ میل آ گیا ہو۔ لیکن وزیراعظم نے کبھی بھی ان کے ادب واحترام میں ذرا سا بھی فرق نہیں آنے دیا۔ قائداعظم ٹرسٹ کے سلسلے میں وزیراعظم کئی مرتبہ مشورے کے لئے محترمہ سے وقت طے کر کے ان کے دولت کدہ فلیگ سٹاف ہاؤس گئے۔ محترمہ کے شایان شان اسٹاف اور پولیس پہرہ وغیرہ کا بھی انتظام کیا گیا۔ قائداعظم کی زندگی تک جیسا کہ ہر شخص جانتا ہے وہ تنہا ملک رانی اور قیادت قوم کے ذمہ دار تھے لیکن ان کی رحلت کے بعد قیادت اور حکمرانی کا نقشہ ہی دگرگوں ہو گیا۔ لہٰذا اس بھاری بوجھ کو اٹھانے کے لئے مشرقی اور مغربی پاکستان کا عملی تعاون انتہائی ضروری تھا جتنا کہ زندگی کو قائم رکھنے کے لئے روح اور جسم کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے غیر جذباتی وزیراعظم نے اسلامی مساوات اور ملکی سالمیت کے پیش نظر خواجہ صاحب کو گورنر جنرل کے عہدے کے لئے نامزد کیا۔"[1]

اگر نواب صدیق علی خان کے اس بیان کے پہلے حصے میں کوئی صداقت ہے تو آخر میں اس کا کہنا بظاہر صحیح نہیں کہ "ہمارے غیر جذباتی وزیراعظم نے اسلامی مساوات اور ملکی سالمیت کے پیش نظر خواجہ صاحب کو گورنر جنرل کے عہدہ کے لئے نامزد کر دیا۔" وزیراعظم لیاقت علی کے اس فیصلے میں اسلامی مساوات اور ملکی سالمیت کو کوئی دخل نہیں تھا بلکہ اس کی بنیاد ذاتی سیاسی مصلحت پر تھی۔ بطور وزیراعظم اسے مس فاطمہ جناح کو گورنر جنرل کے عہدہ پر فائز نہیں ہونے دینا چاہیے تھا۔ اس کے اپنے سیاسی نقطۂ نگاہ سے اس کا فیصلہ بالکل صحیح تھا۔ اسے اپنے مفاد میں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ 11 رستمبر 1948ء کو یہ حقیقت اظہر من الشّمس تھی کہ مس فاطمہ جناح وزیراعظم لیاقت علی خان سے سخت خفا تھیں۔ ان کی اس خفگی میں یقیناً اُن کے مرحوم بھائی کی خفگی بھی شامل ہو گی۔ نواب صدیق علی خان کے بیان کے مطابق انہوں نے اپنے بھائی کے علاج کے سلسلے میں وزیراعظم سے کبھی مشورہ نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی اُسے اعتماد میں لیا تھا۔ اگر اس پس منظر میں وہ

گورنر جنرل بن جاتیں تو وہ یقیناً اپنے مرحوم بھائی کی طرح کلی اختیارات استعمال کرتیں اور ایسی حالت میں لیاقت علی خان کا وزارت عظمٰی کے عہدہ پر فائز ہونا ممکن نہ ہوتا۔ مس فاطمہ بطور گورنر جنرل جس نئ کابینہ کی تشکیل کرتیں۔ اس میں نوابزادہ لیاقت علی خان کا نام کبھی شامل نہ ہوتا۔ جو لوگ ان دنوں کے واقعات سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کرتے وہ تاریخ سے انصاف نہیں کرتے۔ وہ یا تو محض قصیدہ خوانی کرتے ہیں یا ہجوگوئی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ مس جناح کے دل میں لیاقت علی خان کے خلاف غم وغصہ کے جذبات ہمیشہ قائم رہے۔ کئی برس گزرنے کے بعد 1956ء میں قائداعظم کے سابق سیکرٹری کے۔ ایچ۔ خورشید کی اہلیہ بیگم ثریا خورشید کو مس جناح کے ہمراہ کچھ عرصہ کے لئے اکٹھے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اس کے قیام کے دوران کئی بار ایسا ہوتا کہ باتوں باتوں میں مس جناح پھٹ پڑتی تھیں اور لیاقت علی کے خلاف معاندانہ جذبات کا کھل کر اظہار کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے کہا ”یہ ساری قوم ہی احسان فراموش ہے۔ اس نے قائداعظم کے ساتھ وفاداری نہ کی۔ ان کی بیماری میں انہیں اچھی Medical Aid نہ پہنچا سکے اور مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ قائداعظم کو بھی اس بات کا علم تھا کہ ان کی بیماری کے دوران حکومت وقت کے علمبرداروں نے ان سے اچھا برتاؤ نہیں کیا...... ان کا صحیح طرح سے علاج بھی نہ ہوسکا۔ ان کے انتقال کے بعد ہوائی اڈے پر جو ایمبولینس آئی وہ بھی ٹھیک نہیں تھی...... یہ ٹھیک ہے کہ ایک عام شہری کے دل میں قائداعظم کے لئے بہت عزت اور احترام ہے بلکہ مجھے بھی وہ بہت احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں...... لیکن وقت کے حکمرانوں نے ان کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور اس کا مجھے بے حد قلق ہے؟ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔“[2]

بیگم ثریا خورشید کی ڈائری میں مس فاطمہ جناح اور ثریا کا ایک ایسا مکالمہ درج ہے جس میں مس جناح نے بیگم رعنا لیاقت علی خان کا نام لئے بغیر اس پر اور لیاقت علی خان پر کڑی تنقید کی ہے۔ اس کے مطابق مس جناح نے کہا کہ ”ایک بہت ہی اعلیٰ عہدے پر فائز قائداعظم کے خاص رفیق کی بیوی اتنی لالچی اور گھٹیا تھی کہ خود دوسروں سے مانگ مانگ کر تحفے تحائف لیتی تھی۔ جو قائداعظم کو بھی بہت برا لگتا تھا۔ اس شخص کی وقعت اس کی بیوی نے اس قدر کم کردی کہ اس آدمی سے بھی نفرت ہونے لگتی تھی۔ وہ شخص نہیں رہا لیکن اس کی بیوی کی حرکتوں میں کوئی فرق نہیں۔ اپنی ذاتی ضروریات کے لئے اس نے ہر بری عادت کا سہارا لیا اور ابھی تک باز نہیں آئی۔ عورت جب

اتنی گر جائے تو پھر اس کی گراوٹ کی کوئی حد نہیں رہتی۔ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔''

میں نے کہا: ''وہ آدمی اگر خود اتنا اچھا تھا تو اپنی بیوی کو راہ راست پر کیوں نہیں لایا؟ وہ کچھ تو اسے بدل سکتا تھا۔''

سگریٹ مسلتے ہوئے بولیں: ''وہ اسے کیا راہ راست پہ لاتا، وہ خود ہی گھٹیا ہو گیا۔ وہ روپے اور عیاشی کے لئے گھٹیا حرکتیں کرتی تھی۔ یہ اقتدار کی ہوس میں لالچی ہو گیا۔ قائداعظم کو معلوم ہو گیا تھا اور انہیں اس بات کا بہت رنج تھا کہ ان کا ایک خاص آدمی ان کے معیار پر قطعاً پورا نہیں اترا۔ اس شخص نے ایسی حرکتیں شروع کر دیں تھیں کہ قائداعظم کی زندگی ہی میں سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں آجائیں۔''[3]

یہاں مس جناح کے بعض تند و تیز جملوں سے رعنا لیاقت کی کردار کشی کا پہلو نکلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی ذاتی مخاصمت ہو لیکن آخر میں تان جس جملے پر ٹوٹی ہے اس سے فیصلہ ہو جاتا ہے کہ بیگم و مسٹر لیاقت کے ساتھ جناح بہن بھائی کا تنازعہ ذاتی نہیں بلکہ سیاسی تھا جس کا سبب اس کی ان کوششوں میں مضمر تھا کہ ''قائداعظم کی زندگی ہی میں سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں آجائیں'' چنانچہ یہ سیاسی کشمکش مزید بڑھی جب اس نے قائداعظم کی آنکھیں بند ہوتے ہی مس جناح کو ایسے الگ تھلگ کر دیا جیسے دودھ میں سے مکھی کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔ بعض پاکستانی ''مؤرخین'' ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ مادرِ ملت اور قائد ملت کے درمیان بدمزگی کی بنیاد بیگم رعنا لیاقت علی خان کی خاتون اول بننے کی خواہش نے رکھی تھی اور قائداعظم کی شدید علالت کے دوران لیاقت علی کے رویے نے بھی ان غلط فہمیوں کو مزید تقویت دی تھی۔ گویا کہ یہ تضاد بالکل ذاتی نوعیت کا تھا اور اس کا کوئی سیاسی پس منظر نہیں تھا۔

قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد مس فاطمہ جناح نے کئی ماہ تک گوشہ نشینی اور خاموشی اختیار کئے رکھی حالانکہ انہوں نے 28 ستمبر 1948ء کو اپنے ایک بیان میں تعزیت کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ یقین دلایا تھا کہ ''وہ قوم کی بالکل اسی طرح خدمت کرتی رہیں گی جیسے کہ وہ اپنے بھائی کی زندگی میں کیا کرتی تھیں اور یہ کہ وہ تعمیر پاکستان کے نصب العین، جو کہ اُن کے بھائی کو انتہائی عزیز تھا، کی تکمیل کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گی۔'' تاہم اس دوران انہوں نے کبھی نوابزادہ لیاقت علی خان کی نئی حکومت کی تائید و حمایت نہیں کی تھی اور نہ ہی انہوں نے کبھی

کسی ایسی تقریب میں شرکت کی تھی جس کا انتظام کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ کرتا تھا۔ اخبارات میں وزیراعظم لیاقت علی خان کو وہی اہمیت حاصل ہوگئی تھی جو 11رستمبر 1948ء سے قبل گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کو حاصل تھی اور بیگم رعنا لیاقت علی کو وہی پوزیشن مل گئی جو قائداعظم کے انتقال سے پہلے مس فاطمہ کو دی جاتی تھی۔ یہ کوئی غیر متوقع یا غیر قدرتی بات نہیں تھی کیونکہ 11رستمبر 1948ء کو ملک کے سیاسی اقتدار کے محور میں بنیادی تبدیلی آ گئی تھی۔ اب وزیراعظم لیاقت علی خان کوئی نمائشی وزیراعظم نہیں تھا بلکہ وہ پارلیمانی نظام کے تحت سارے روایتی اختیارات کا حامل ہو گیا تھا اور نیا گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین محض ایک آئینی اور نمائشی سربراہ مملکت تھا۔ یہ بھی کوئی غیر متوقع اور غیر قدرتی بات نہیں تھی کہ اب سیاسی وصحافتی خوشامدیوں اور موقع پرستوں کے لئے وزیراعظم کی ذات یکا یک نہایت دلکش، پروقار اور عظیم بن گئی تھی اور انہوں نے بڑی تحقیق کے بعد قائدملت کا شجرۂ نسب نوشیرواں عادل تک پہنچا دیا تھا اور یہ بھی کوئی غیر متوقع وغیر قدرتی بات نہیں تھی کہ اس بنا پر مادرملت اور قائدملت کے درمیان تضاد چند ہی مہینوں میں شدید سے شدید تر ہو گیا تھا۔ حالانکہ نواب صدیق علی خان کے بیان کے مطابق لیاقت علی خان نے بہت کوشش کی تھی کہ یہ تضاد شدت اختیار نہ کرے۔ اس نے اس کوشش میں فلیگ سٹاف ہاؤس میں ''محترمہ کے شایانِ شان سٹاف اور پولیس پہرہ کا بھی انتظام کیا تھا۔''

مس فاطمہ جناح کی طرف سے نوابزادہ لیاقت علی خان کی حکومت کی مخالفت کا خاموش مظاہرہ 1949ء کے اوائل میں ختم ہو گیا جبکہ 24رجنوری کو پنجاب میں نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی حکومت کو برطرف کر کے صوبائی اسمبلی کو توڑ دیا گیا۔ وزیراعظم کی جانب سے اس کارروائی کے بعد نواب ممدوٹ کی زیر قیادت پنجابی جاگیرداروں و سرمایہ داروں کے ایک دھڑے اور درمیانہ طبقہ کے پنجابی شاونسٹوں نے مرکزی حکومت کے خلاف قائداعظم جناح اور پنجاب کے نام پر محاذ آرائی شروع کر دی تو مس فاطمہ جناح اپریل میں یوم اقبال کی تقریبات میں شرکت کرنے کے لئے لاہور آئیں اور انہوں نے 23راپریل کو اپنی ایک تقریر میں ''پنجابی عوام کی مشکلات ومصائب'' سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے آپ کے مصائب کا اندازہ ہے۔ آپ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر نظم وضبط پیدا کریں۔ کامیابی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔''[4]

ان دنوں پنجابی شاونزم اپنے عروج پر تھا۔ نوائے وقت، زمیندار اور بعض دوسرے

صوبائی اخبارات کے علاوہ ممدوٹ دھڑے کے مسلم لیگی لیڈروں کا اعلانیہ مؤقف یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان دانستہ طور پر پنجاب کے سیاسی ومعاشی حقوق کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ایسے حالات میں مس جناح کی طرف سے پنجابی عوام سے اظہار ہمدردی کا صاف مطلب یہ سمجھا گیا کہ مادرِملت نے لیاقت حکومت کے خلاف پنجابی شاونسٹوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ان کی اس تقریر کے بڑے دور رس نتائج مرتب ہوئے اور پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹ عناصر میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف ایک طوفان آ گیا اور انہوں نے پورے صوبہ میں اس کے سیاسی وقار کو زک پہنچانے کے لئے ہر ناجائز حربہ استعمال کیا۔ان کا کہنا یہ تھا کہ لیاقت علی کی وزارت عظمٰی اسلام، پاکستان، کشمیر، قائداعظم اور پنجاب سب کے لئے نقصان دہ ہے۔وہ الزام عائد کرتے تھے کہ وزیراعظم لیاقت علی نے پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں اور صوبائی گورنر سر فرانسس موڈی کی وساطت سے پنجاب میں سیاسی خلفشار پیدا کیا ہے۔ان کا مطالبہ تھا کہ ان دونوں کو ان کے عہدوں سے الگ کیا جائے اور ان کے دعوے کے مطابق انہیں اپنے اس مطالبے میں مس فاطمہ جناح کی تائید وحمایت حاصل تھی۔چنانچہ نوائے وقت میں مس جناح سے یہ الفاظ منسوب کئے گئے کہ اگر سر فرانسس موڈی کو قائداعظم نے مقرر کیا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ''جناب موڈی صاحب کے لئے ہمیشہ اس کو بطور سند استعمال کیا جائے اور ان کے ہر جائز وناجائز اقدام کو صحیح تصور کیا جائے اگر صوبہ کے عوام کسی وقت بھی کسی گورنر کو اپنے لئے غیر مفید پائیں اور اس کی برطرفی کا مطالبہ کریں تو اس امر کا انہیں پورا حق حاصل ہے۔''[5] پھر تقریباً دو ہفتے بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ جب مس جناح کے دورۂ راولپنڈی کے دوران خواجہ احمد حسن صاحب صدر سٹی مسلم لیگ نے ان کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی کہ ''عوام میں اس قسم کا پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ حضرت قائداعظم کا مکمل اعتماد مسٹر موڈی کو حاصل تھا اور یہ کہ حضرت قائداعظم نے موڈی کو نامزد کیا تھا تو خاتونِ پاکستان نے غضبناک ہو کر فرمایا، کون شخص ہے جو اس قسم کا بہتان میرے بھائی کے ساتھ منسوب کر کے ان کی روح کو قبر میں پریشان کر رہا ہے۔یہ تمام پروپیگنڈہ گورنر موڈی خود کر رہے ہیں تاکہ عوام کو قائداعظم کا نام لے کر بے وقوف بنایا جائے۔قائداعظم کے تقرر کا مطلب یہ نہیں تھا کہ گورنر موڈی کو کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جو چاہیں کریں۔''[6] پنجابی شاونسٹوں کے لئے مس جناح کے ان بیانات کا مطلب بالکل واضح تھا یعنی یہ کہ وزیراعظم لیاقت

''پنجاب کے حقوق'' کو نقصان پہنچانے کے لئے سر فرانسس موڈی کو گورنر کے عہدہ پر برقرار رکھنے کے حق میں تھا لیکن مادرِ ملت پنجاب کے مفادات کے تحفظ کے لئے اس کی برطرفی کے مطالبے کی حامی تھیں۔

پھر جب ستمبر 1949ء میں قائداعظم کے معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کی کتاب بعنوان ''قائداعظم کے آخری ایام'' شائع ہوئی تو پنجابی شاونسٹوں نے اس کتاب کے اس مفہوم کے مندرجات کو خوب اچھالا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے بابائے ملت کے آخری ایام میں سنگدلی کا مظاہرہ کیا تھا اور ان کے علاج معالجے کے لئے سرکاری طور پر کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ 11 ستمبر کو مس جناح نے لیاقت حکومت کے خلاف اس نہایت مؤثر پروپیگنڈا کی بالواسطہ طور پر تائید کی جبکہ انہوں نے اپنے بھائی کی پہلی برسی کے موقعہ پر اپنے بیان میں لیاقت حکومت کا کوئی ذکر نہ کیا۔ اس کے برعکس بیگم رعنا لیاقت علی خان نے اسی دن جہانگیر پارک کراچی میں عورتوں کے اجتماع کو خطاب کر کے ان سے ایک سات نکاتی حلف لیا جس کا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ ''ہماری حکومت ملک کی بہتری کے لئے جو کام کر رہی ہے ہم اس میں اس کی امداد کریں گی۔''[7] 12 ستمبر کو اخبارات میں قائداعظم کے گھر پر جا کر مس جناح سے تعزیت کرنے والے معززین کے ناموں کی جو فہرست شائع ہوئی اس میں لیاقت علی خان اور اس کی بیگم کے نام شامل نہیں تھے۔

7 دسمبر کو مس فاطمہ جناح پہلی مرتبہ ماتمی لباس ترک کر کے منظر عام پر آئیں جبکہ انہوں نے پہلی انٹرنیشنل اکنامک کانفرنس کے مندوبین کو اپنے گھر میں مدعو کیا۔ انہوں نے اس روز سفید لباس پہن کر اشارۃً یہ اعلان کر دیا کہ اب وہ وزیراعظم لیاقت کے خلاف سیاسی میدان میں آئیں گی۔ 2 مارچ 1950ء کو شاہِ ایران محمد رضا شاہ پہلوی اظہارِ عقیدت کے لئے مس جناح کے گھر گیا تو ''خاتون پاکستان نے اپنے معزز مہمان کی خدمت میں قائداعظم علیہ رحمۃ کا وہ طلائی سگریٹ لائٹر پیش کیا جو مدت سے بانئ پاکستان کے پاس رہا تھا۔ اس کے علاوہ شاہِ ایران کو قائداعظم اور مس فاطمہ جناح کا ایک فوٹو بھی پیش کیا گیا۔ اس موقع پر شاہِ ایران کے ساتھ ایران میں پاکستان کا سفیر راجہ غضنفر علی خان تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نہیں تھا۔ چنانچہ نوائے وقت نے اس خبر پر ایک ادارتی نوٹ لکھ کر فاطمہ۔ لیاقت تضاد کی نمایاں طور پر نشاندہی کی۔ ادارتی نوٹ یہ تھا کہ ''اعلیٰ حضرت (شاہ ایران) کے کراچی کے پروگرام میں قائداعظم کی عزیز بہن اور

ملت پاکستان کی سب سے واجب الاحترام خاتون محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات شامل نہ تھی۔ خدا جانے یہ فروگذاشت کیوں ہوئی؟ مگر اعلیٰ حضرت بہ نفس نفیس خاتون پاکستان کے مکان پر تشریف لے گئے اور گھنٹہ بھر وہاں تشریف فرما رہے...... یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اعلیٰ حضرت کے جس اقدام نے عام پاکستانی مسلمانوں کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ حضور والا کا مسلمانوں کے محبوب قائد کی محبوب بہن کے ہاں تشریف لے جانا ہی تھا۔ یہ لطیف جذبات اور پاک احساسات کی دنیا ہے اور امر واقعی ہے کہ اس دنیا میں اس وقت مسلمانانِ پاکستان کے نزدیک قائداعظم کی بہن سے زیادہ کسی کی ذات عزیز نہیں۔ اعلیٰ حضرت نے ان کے گھر جا کر عامۃ المسلمین کے دل میں گھر کر لیا ہے۔''[8] نوائے وقت کے اس ادارتی نوٹ کا مقصد دراصل خاتون پاکستان کے لئے جذبۂ احترام کا اظہار نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ وزیراعظم لیاقت کو مس فاطمہ جناح سے مخاصمت ہے اور اس بنا پر اس نے شاہِ ایران کے پروگرام میں قائداعظم کی عزیز بہن اور ملت پاکستان کی سب سے واجب الاحترام خاتون محترمہ فاطمہ جناح سے ملاقات شامل نہیں کی تھی اور یہ کہ شاہِ ایران ازخود وہاں گیا تھا۔ ایک اور مقصد یہ تھا کہ مس فاطمہ جناح کو پنجاب میں اینٹی لیاقت محاذ کی قائد ظاہر کر کے یہاں کے درمیانہ طبقہ کی قائداعظم اور اس کی بہن سے جذباتی وابستگی سے سیاسی فائدہ اٹھایا جائے۔

مس فاطمہ جناح پنجابی شاونسٹوں کی اس کوشش وخواہش کی عملاً تکمیل کرنے پر پہلے ہی آمادہ تھیں۔ چنانچہ جب وہ 18؍مارچ کو پنجاب کے دورے کے لئے لاہور پہنچیں تو ریلوے اسٹیشن پر ان کا پرجوش خیرمقدم کیا گیا۔ 20؍مارچ کو نوائے وقت نے ایک اداریے میں پھر یاددہانی کرائی کہ شاہِ ایران کے کراچی کے پروگرام میں اس کی خاتون پاکستان سے ملاقات شامل نہیں تھی۔ تاہم شاہ ایران نے ازخود ان کے گھر جا کر قائداعظم کی بہن سے دلی عقیدت واحترام کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر ایرانی سفارت خانہ نے جوڑ نردیا تھا وہ ''پہلی بڑی تقریب تھی جس میں خاتون پاکستان نے قائداعظم کی وفات کے بعد شرکت کی...... اور اعلیٰ حضرت شاہ ایران نے محترمہ کو سب سے معزز جگہ دی یعنی اپنے دائیں ہاتھ بٹھایا۔ مسلمانانِ پاکستان شاہِ ایران کے اس حسن عمل کی تعریف کرتے ہیں۔''[9] چنانچہ اگلے دن مس جناح ایک کالج کی سالانہ تقریب میں شرکت کے لئے گجرات پہنچیں تو نوائے وقت کی رپورٹ کے مطابق ان کا ''شاہانہ استقبال'' کیا گیا اور پھر

جب وہ واپس کراچی روانہ ہوئیں تو اوکاڑہ، منٹگمری اور ملتان کے علاوہ کئی دوسرے ریلوے اسٹیشنوں پر ان کا پرجوش خیرمقدم کیا گیا جس کے دوران مادر ملت زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ اگرچہ اس دورے میں مس جناح نے بظاہر ناسازیٔ طبع کے باعث لیکن دراصل کراچی میں ڈان ٹرسٹ کا تنازعہ پیدا ہونے کے باعث سیالکوٹ، گوجرانوالہ اور بعض دوسرے شہروں میں جانے کا پروگرام منسوخ کر دیا تھا تاہم ان کے اس مختصر دورے سے بھی ہر ایک کو یہ پتہ چل گیا تھا کہ ان کی عملی ہمدردی اینٹی لیاقت محاذ کے ساتھ ہے اور اس طرح فاطمہ۔لیاقت تضاد شدید سے شدید تر ہو گیا تھا۔

ڈان ٹرسٹ کے تنازعہ کا پس منظر یہ تھا کہ قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل جب روزنامہ ڈان دہلی میں جاری تھا تو قائداعظم محمد علی جناح اس کے واحد متولی تھے۔ اگست 1947ء میں جب یہ اخبار دہلی سے کراچی منتقل ہوا تو قائداعظم نے اس کی اشاعت کا انتظام ایک مقامی سرمایہ دار سر عبداللہ ہارون کے سپرد کر دیا تھا اگرچہ قانونی طور پر ڈان ٹرسٹ کو قائم رکھا گیا تھا۔ 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم جناح کا انتقال ہوا تو انہوں نے اپنی وصیت میں اس ٹرسٹ کے لئے اپنا کوئی جانشین نامزد نہیں کیا تھا۔ چنانچہ اس بااثر اخبار پر کنٹرول کے لئے مس فاطمہ جناح اور وزیراعظم لیاقت علی کے درمیان پس پردہ رسہ کشی شروع ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند ماہ بعد یہ تنازعہ ایک مقامی تاجر محمود الٰہی کی درخواست پر برائے فیصلہ سندھ چیف کورٹ کے سپرد ہو گیا۔ تقریباً ایک سال بعد 13 مارچ 1950ء کو جسٹس ویلانی نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ موجودہ ڈان ٹرسٹ دہلی ڈان ٹرسٹ کا جانشین ہے اور مس جناح اور وزیراعظم لیاقت علی اس کے متولی بننے کے مجاز ہیں۔ چونکہ چیف کورٹ کے اس فیصلے سے مس جناح کو ایک ایسے وقت ڈان کے معاملات میں دخل دینے کا قانونی حق حاصل ہو گیا تھا جبکہ وہ اپنے آپ کو اینٹی لیاقت سیاسی محاذ سے عملی طور پر وابستہ کر رہی تھیں اس لئے انہیں اس حق سے محروم کرنے کے لئے عجیب وغریب طریقہ اختیار کیا گیا۔ عدالت عالیہ کے اس فیصلے کے چند دن بعد پہلے تو ملک فیروز خان نون نے مرکزی اسمبلی میں ایک پرائیویٹ بل پیش کیا۔ جس میں یہ تجویز کیا گیا کہ ڈان ٹرسٹ کے لئے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی میں سے متولی مقرر کئے جائیں اور ایک ٹریبونل مقرر کیا جائے جو نہ صرف ڈان ٹرسٹ بلکہ ڈان اخبار کے بارے میں بھی سارے معاملات کا فیصلہ کرے اور پھر روزنامہ ڈان میں یہ اعلان کر دیا

گیا کہ ''ڈان ٹرسٹ'' کو کراچی کے ڈان میں کبھی بھی کوئی ملکیتی حقوق حاصل نہیں رہے ہیں۔ بعد ازاں یکم اپریل کو روزنامہ ڈان یکا یک بند ہو گیا اور اس کی جگہ ایک نیا اخبار ''ہیرلڈ'' شائع ہونا شروع ہو گیا جبکہ اس کا ایڈیٹر اور دوسرا عملہ وہی رہا جو ڈان میں کام کرتا تھا۔ اس وقت تک اسمبلی میں فیروز خان نون کے پرائیویٹ بل پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی کارروائی ہونے کی توقع تھی کیونکہ اس کے دو دن بعد یعنی 3/اپریل کو نون کی مشرقی بنگال کی گورنری کے عہدے پر نامزدگی کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ مس جناح نے اسی روز یکم اپریل کو ہی ایک بیان میں اس سارے ڈرامے کی سخت مذمت کی اور یقین ظاہر کیا کہ قوم ڈان ٹرسٹ اور ڈان کا تحفظ کرے گی۔ ان کا الزام یہ تھا کہ جس نیت اور جس طریقے سے ڈان کی اشاعت کو دفعتاً بند کر دیا گیا وہ ان لوگوں کو زیب نہیں دیتا جو خود کو بابائے قوم کا پیروکار کہتے ہیں۔ مس جناح کے اس بیان پر نئے روزنامہ ''ہیرلڈ'' اور اس کے مالکان کے خلاف اس قدر عوامی احتجاج ہوا کہ 4/اپریل کو ''ہیرلڈ'' بند کر کے دوبارہ ڈان شائع کرنا پڑا۔ لیکن پرنٹ لائن میں یہی لکھا تھا کہ یہ اخبار ہیرلڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ کی جانب سے شائع کیا گیا ہے لہٰذا اس اخبار کے خلاف عوامی احتجاج جاری رہا اور اخبار فروشوں نے نہ صرف ڈان بیچنے سے انکار کر دیا بلکہ انہوں نے قائداعظم کی تصویر اٹھا کر اس اخبار کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا۔ کراچی شہر میں پوسٹر بھی لگائے گئے جن میں ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین کو ہدف ملامت بنایا گیا۔

دراصل عوامی اسٹیج پر روزنامہ ڈان کے اس ڈرامے کے پس پردہ فاطمہ۔ لیاقت تضاد کی کارفرمائی تھی۔ یہ اخبار 11/ستمبر 1948ء کو قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد ایک سال تک وزیراعظم لیاقت علی خان کی داخلی اور خارجی پالیسیوں پر نکتہ چینی کرتا رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس اخبار کا مالک سر عبداللہ ہارون کراچی کا ایک کاروباری سرمایہ دار تھا جو امریکہ سے درآمدی اور برآمدی تجارت کرتا تھا اور اس بنا پر اس کا خاندانی جاگیردار نوابزادہ لیاقت علی خان سے طبقاتی تضاد تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ مس جناح کے نہ صرف آغا خانی فرقہ کے کاروباری سرمایہ داروں سے بلکہ دوسرے فرقوں کے نوزائیدہ سرمایہ داروں سے بھی گہرے روابط تھے اور اس وجہ سے یہ اخبار ان کے زیر اثر تھا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ اس اخبار کا ایڈیٹر الطاف حسین اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتا تھا اور ہمہ وقت لیاقت حکومت کو متاثر و مرعوب کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ وہ حکومت میں شامل ہوئے بغیر ہی حکومت کرنے کا خواہاں تھا اور اس کی تمنا ہوتی تھی کہ ہر

معاملے میں اس سے مشورہ کیا جائے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے تقریباً ایک سال تک اس صورت حال کو برداشت کیا لیکن جب وہ اندرونِ ملک مختلف طریقوں سے اپنے اقتدار کو کسی حد تک مستحکم کر چکا اور امریکہ کے صدر ٹرومین سے بھی اسے دعوت نامہ موصول ہو گیا تو اس نے اس اخبار کی طرف توجہ کی اور وہ پہلی ہی کوشش میں اسے اپنے زیراثر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اس مقصد کے لئے جو مؤثر حربہ استعمال کیا وہ یہ تھا کہ اس نے نومبر 1949ء میں سر عبداللہ ہارون کے بیٹے یوسف ہارون کو سندھ کا وزیراعلیٰ بنا دیا تھا۔ چونکہ ہارون وزارت کو سندھ کے جغادری اور بااثر جاگیردار محمد ایوب کھوڑو سے خطرہ لاحق تھا اس لئے وہ مجبوراً وزیراعظم لیاقت کا تابع فرمان بن گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اخبار ڈان کا ''راہ راست'' پر آنا لازمی تھا۔ لیکن جب مارچ 1950ء میں سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے بعد مس جناح کو ڈان کے معاملات میں دخل اندازی کا حق مل گیا تو لیاقت علی خان اس بااثر اخبار کے بارے میں پھر فکرمند ہو گیا۔ ان دنوں وہ امریکہ جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا اور قدرتی طور پر اس کی خواہش تھی کہ یہ اخبار اس کے دورۂ امریکہ کی پوری طرح تشہیر کرے۔ لہٰذا پہلے مرکزی اسمبلی میں فیروز خان نون کا متذکرہ پرائیویٹ بل پیش ہوا اور پھر ڈان کی جگہ ہیرلڈ کی اشاعت شروع ہو گئی۔ مس جناح کو اس ساری کارروائی کے اصل مقاصد کا علم تھا لہٰذا انہوں نے قائداعظم کی ہمشیرہ ہونے کی بنا پر اپنے عوامی اثر و رسوخ سے فائدہ اٹھایا اور عوامی دباؤ کے تحت ڈان کی دوبارہ اشاعت شروع کروادی۔ لیکن وہ اس اخبار کی لیاقت نواز پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ لاسکیں۔ اس کے مالکان کا لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ بدستور قائم رہا۔

جب مس جناح اپنے اس مطالبے پر مصر رہیں کہ روزنامہ ڈان کو سندھ چیف کورٹ کے فیصلے کے مطابق ڈان ٹرسٹ کے حوالے کیا جائے اور اخبار فروشوں کی طرف سے اس مطالبے کی تائید و حمایت ہوتی رہی تو 9 راپریل کو کراچی کے ایک کاروباری سرمایہ دار ابوبکر قاسم پٹیل کی طرف سے وزیراعظم لیاقت کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی گئی جس میں کراچی کے شہریوں کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ڈان مس فاطمہ کی خواہش کے مطابق ڈان ٹرسٹ کے حوالے کر دیا جائے۔ لیاقت علی خان اپنے اُبھرتے ہوئے طاقتور سیاسی حریف کے اس مطالبہ کی تکمیل نہ کرسکتا تھا اور نہ ہی اس نے کی...... اگلے دن یعنی 10 راپریل کو پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ

کا اجلاس ہوا جس میں صدر مسلم لیگ چودھری خلیق الزماں نے عاملہ کے ارکان کو روزنامہ ڈان کے تنازعے کی تفصیلات سے آگاہ کیا اور یہ بتایا کہ قائداعظم نے کس طرح یہ اخبار مسلم لیگ کی پالیسی و پروگرام کی تشہیر کے لئے جاری کیا تھا۔ اس پر مجلس عاملہ نے صدر مسلم لیگ کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ''ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ضروری کاروائی کرے جن کے تحت روزنامہ ڈان جاری کیا گیا تھا۔'' مجلس عاملہ کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ اخبار ڈان مس جناح کی موروثی جائیداد نہیں ہے بلکہ یہ اس مسلم لیگ کی ملکیت ہے جو اب وزیراعظم لیاقت علی خان کی جیب میں تھی۔ مئی کے اوائل میں وزیراعظم لیاقت علی خان صدر ٹرومین کی دعوت پر امریکہ گیا تو اس کے تقریباً دو ہفتے بعد نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''چودھری خلیق الزماں صدر کل پاکستان مسلم لیگ روزنامہ ڈان پر قبضہ کے لئے بہت جلد فیڈرل کورٹ آف پاکستان میں مقدمہ چلانے والے ہیں کیونکہ اخبار مذکور قومی ملکیت ہے اور اس پر مسلم لیگ کے علاوہ کسی دوسرے کا حق نہیں۔ چودھری خلیق الزماں سے قریبی تعلق رکھنے والے حلقوں کا کہنا ہے کہ حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ نے صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے ڈان ٹرسٹ کو اپنی تولیت میں لیا تھا۔ اب قائداعظم کے انتقال کے بعد صدر مسلم لیگ ہی کو اس کا متولی ہونا چاہیے کیونکہ وہی دراصل قومی جماعت کے صدر کی حیثیت سے قائداعظم کے جانشین ہیں۔''[10]

جولائی 1950ء میں وزیراعظم لیاقت علی خان امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کرنے کے بعد براستہ لندن واپس کراچی آیا تو پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں اور اسسٹنٹ سیکرٹری سید شمس الحسن نے 2 راگست کو سندھ چیف کورٹ میں ایک مقدمہ دائر کر دیا جس میں یہ التجا کی گئی تھی کہ چونکہ روزنامہ ڈان مسلم لیگ کی پالیسی و پروگرام کی تشہیر کے لئے جاری کیا گیا تھا اس لئے ڈان ٹرسٹ کی از سر نو تشکیل کر کے چودھری خلیق الزماں کو بلحاظ صدر مسلم لیگ اس کا واحد متولی مقرر کیا جائے یا اس کے موجودہ متولیوں میں اس کے نام کا اضافہ کیا جائے۔ اس مقدمے کا مقصد صاف ظاہر تھا کہ یا تو مس جناح کو ڈان سے بے تعلق کر دیا جائے یا پھر ایسی صورت پیدا کی جائے کہ متولیوں کا بورڈ کثرت رائے سے اُن کے خلاف فیصلے کر سکے۔ سندھ چیف کورٹ میں اس دیوانی دعویٰ کا عوامی عدالت میں سیاسی جواب دعویٰ یہ تھا کہ 4 راگست کو کراچی میں بعض مہاجرین نے وزیر بحالیات خواجہ شہاب الدین کی رہائش گاہ کے سامنے بھوک ہڑتال شروع کر دی کیونکہ

ان کی آبادکاری کے لئے مناسب اور مؤثر کاروائی نہیں ہورہی تھی۔ 8راگست کوان مہاجرین نے مسلم لیگ کے خزانچی اے۔ایم قریشی کی اس یقین دہانی پر بھوک ہڑتال ختم کردی کہ جب تک ان کی رہائش کے لئے کوئی مستقل بندوبست نہیں ہوگا انہیں ان کی عارضی جھگیوں سے بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ 9راگست کوحکومت پاکستان نے پورے پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری کے منصوبوں کی تکمیل کے لئے مہاجر ٹیکس عائد کردیا اور 10راگست کوصدر مسلم لیگ چودھری خلیق الزماں نے ایک طویل بیان میں مہاجرین کے مظاہروں کی سخت مذمت کی اور الزام عائد کیا کہ وہ ان عناصر کا آلۂ کار بن رہے ہیں جو مہاجرین اور مقامی باشندوں میں تفرقہ پیدا کرکے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ خانماں برباد مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ 13راگست کوکراچی میں عوامی مسلم لیگ کا پہلا جلسہ ہوا تو اس میں بہت دنگا فساد ہوا کیونکہ عوامی مسلم لیگ جو بعد ازاں صرف عوامی لیگ کہلائی، کے سیکرٹری عبدالستار نیازی نے اپنی تقریر میں مبینہ طور پر حکومت اور مسلم لیگ کے خلاف توہین آمیز الفاظ استعمال کئے تھے۔ 14راگست کو چودھری خلیق الزماں کے مکان کے سامنے مہاجرین نے زبردست مظاہرہ کیا تو اس نے اس پر برہم ہوکر مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کردیا اور اس طرح عوامی عدالت کا فیصلہ مس فاطمہ جناح کے حق میں ہو گیا۔ چودھری خلیق الزماں نے ڈان ٹرسٹ کا واحد ٹرسٹی بننے کا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر نہ ہوسکی اور وزیراعظم لیاقت علی خان کومس جناح اور دوسرے سیاسی حریفوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانا پڑی۔ 15راگست کو پنجاب میں اینٹی لیاقت محاذ کے ترجمان اخبار ''نوائے وقت'' کا اس واقعہ پر ادارتی تبصرہ یہ تھا کہ ''چودھری خلیق الزماں کا استعفیٰ قیام پاکستان کے بعد اس ملک کے عوام کی پہلی فتح ہے۔'' چنانچہ ١١رستمبر کومس فاطمہ جناح نے اپنے بھائی کی دوسری برسی کے موقع پر ایک بیان میں مزید واضح کردیا کہ ان کا وزیراعظم لیاقت کے ساتھ تضاد نہ حل ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے بیان میں پاکستان کے عوام کومخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''جب بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان تیزی سے ترقی کررہا ہے تو ان کی یہ باتیں بہت اچھی لگتی ہیں لیکن میں تمہیں متنبہ کرتی ہوں کہ تم حقیقت اور فرض سے آنکھیں بند مت کرو۔ یادرکھو کہ تمہیں بڑا کام درپیش ہے اور تمہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ تمہیں اپنے آپ میں خود فیصلہ کرنے کا شعور پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ تم حق و باطل میں تمیز کرسکو۔''[11] ان دنوں کوریا کی جنگ کے باعث پاکستان کی

معیشت کو عارضی طور پر بہت بڑھا واملا تھا مگر مس جناح اس کے باوجود لیاقت حکومت کی کارگزاری سے مطمئن نہیں تھیں۔اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت حکومت پاکستان ہیرلڈلمیٹڈ کو ساڑھے بارہ لاکھ کا قرضہ دے کرروز نامہ ڈان پر عملی طور پر مکمل کنٹرول حاصل کر چکی تھی۔اس امر کا انکشاف 2/اکتوبر کو مرکزی اسمبلی میں ہوا جبکہ اسمبلی کے بعض ارکان نے حکومت کے اس فیصلہ پر سخت نکتہ چینی کی۔جس کے جواب میں نائب وزیر خزانہ ڈاکٹر محمود حسین نے کہا یہ قرضہ انڈسٹریل فنانس کارپوریشن نے دیا ہے۔''چونکہ یہ کارپوریشن ایک تجارتی ادارہ ہے اس لئے وہ جس بنیاد پر کوئی لین دین کرتی ہے وہ خفیہ ہوتی ہے۔''[12]

8/اکتوبر 1950ء کو کراچی میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو سب سے پہلے مسلم لیگ کے آئین میں فروری 1948ء میں شامل کردہ وہ شق منسوخ کر دی گئی کہ مرکزی اور صوبائی وزارتوں کے ارکان مسلم لیگ کے عہدیدار نہیں ہو سکتے اور پھر وزیر اعظم لیاقت علی خان کو سندھ کے محمد ایوب کھوڑو، پنجاب کے ممتاز دولتانہ، سرحد کے عبدالقیوم خان اور مشرقی بنگال کے نورالامین کی تائید وحمایت سے مسلم لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا۔''نوائے وقت'' کی اطلاع کے مطابق پنجاب مسلم لیگ کے صدر میاں عبدالباری نے اس ساری کاروائی کی مخالفت کی مگر اس کی کوئی شنوائی نہ ہوئی۔اس انتخاب کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی نے ایک ایسی عجیب وغریب تقریر کی جس کا پارلیمانی نظام حکومت یا ملک کے عبوری آئین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔تقریر یہ تھی کہ ''جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ابتدا ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا اور آج میں اس کی پھر تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو لیگ کا وزیر اعظم تصور کیا ہے۔میں نے کبھی بھی نہیں سمجھا کہ میں دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا منتخب کردہ وزیر اعظم ہوں۔''[13] اگر چہ لیاقت علی خان کے یہ الفاظ غیر جمہوری وغیر آئینی تھے لیکن یہ اس لحاظ سے حقیقت پر مبنی تھے کہ اگست 1947ء میں اسے مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے وزیر اعظم منتخب نہیں کیا تھا بلکہ وزیر اعظم اور اس کی کابینہ کے دوسرے سارے ارکان کا تقرر گورنر جنرل و مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح نے کیا تھا اور مس جناح کو اس حقیقت کا اچھی طرح احساس تھا۔لیاقت علی خان نے ستمبر 1948ء میں انہیں گورنر جنرلی سے محروم رکھا تھا بلکہ اب اُس نے مسلم لیگ کی صدارت پر بھی خود ہی قبضہ کر لیا تھا۔12/اکتوبر کو نوائے وقت نے ''جمہوریت یا ڈکٹیٹر شپ'' کے زیر عنوان ایک اداریے میں یہ رائے ظاہر کی کہ

''رائے عامہ کو کچلے جانے سے بچاؤ کے لئے، ارکان حکومت کے احتساب کے لئے، ملک میں جمہوریت کی نشوونما کے لئے اور ملک کو ڈکٹیٹر شپ اور تباہی سے بچانے کے لئے مسٹر لیاقت علی خان کے انتخاب صدارت کے بعد ملک میں حزب اختلاف کے قیام کی ضرورت ناگزیر ہوگئی ہے''
اور اسی اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ ''خاتون پاکستان محترمہ فاطمہ جناح کے متعلق بعض حلقوں میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی تھی کہ ان کو پاکستان مسلم لیگ کی صدارت قبول کرنے کی دعوت دی گئی مگر انہوں نے قبول نہیں فرمائی اور بالواسطہ مسٹر لیاقت علی خان کے نام ہی کی تائید کی اور یہ کہ لیاقت علی مس جناح ہی کی تجویز پر پاکستان مسلم لیگ کے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں مس جناح کا بیان یہ ہے کہ ''میری توجہ راولپنڈی کے ایک اُردو روزنامہ میں شائع شدہ اس اطلاع کی جانب مبذول کرائی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض اشخاص نے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں پاکستان مسلم لیگ کی صدارت قبول کرلوں اور میں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس مسئلہ پر ایک اداریہ بھی میری نظر سے گزرا ہے ان ہر دو سے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس بارے میں جو کچھ کیا گیا وہ میری تجویز کی بنا پر کیا گیا۔ یہ اطلاع قطعی بے بنیاد ہے اور ایک غیر ذمہ دار مراسلہ نگار کی ذہنی پیداوار ہے۔ میں یہ بالکل واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ اس اطلاع میں ذرّہ بھر صداقت نہیں۔ میں نے کسی عہدہ کے لئے کسی شخص کے نام کی تجویز یا تائید نہیں کی۔''[14] گویا مس جناح نے اعلانیہ طور پر کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر یہ واضح کر دیا تھا کہ لیاقت علی خان نے ان کی مرضی کے خلاف مسلم لیگ پر قبضہ کرلیا ہے اس لئے اس کے خلاف سیاسی محاذ آرائی کو شدید تر کر دینا چاہیے۔

چنانچہ 25/اکتوبر کو پنجاب مسلم لیگ کے چار پرانے کارکن شیخ محمد رشید، ذکی الدین پال، شیر محمد اور خواجہ محمد افضل جماعت سے مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے اپنے طویل بیان میں الزام عائد کیا کہ لیاقت حکومت پنجاب میں ان یونینسٹ جاگیرداروں کو نواز رہی ہے جنہوں نے قائداعظم اور تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ 28/اکتوبر کو لیاقت علی خان نے لاہور کے یونیورسٹی گراؤنڈ میں ایک پبلک جلسے کو خطاب کرنے کی کوشش کی مگر وہ جلسے میں زبردست ہنگامے کے باعث تقریر نہ کرسکا۔ مظاہرین نے قائداعظم زندہ باد اور مسلم لیگ مردہ باد کے نعرے لگائے اور 31/اکتوبر کو پنجاب کے سابق مسلم لیگی وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین آف ممدوٹ نے، جس کی

مختلف الزامات سے بریت کا 10 ستمبر کو اعلان ہو چکا تھا، ایک نئی پارٹی جناح مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس جماعت کے نام سے ظاہر تھا کہ وہ مس جناح کے لیاقت علی خان سے روز افزوں اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے اس موقع پر جو بیان جاری کیا اس میں کہا گیا تھا کہ ''اب جبکہ مسٹر لیاقت علی خان پاکستان کے وزیر اعظم کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کے صدر بھی بن بیٹھے ہیں۔ اس طرح مسلم لیگ بالکل حکومت کی لونڈی بن گئی ہے اور عوام سے اس کا رابطہ بالکل منقطع ہو گیا ہے۔ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی مسٹر لیاقت علی خان کے نقش قدم پر چلیں گے اور اب ہر صوبہ میں مسلم لیگ کا یہی حشر ہو گا...... اس لئے ہم انتہائی رنج و تاسف کے ساتھ یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ مسلم لیگ سے باہر نکل آئیں اور پاکستان میں قائداعظم کے مقرر کردہ نصب العین کے مطابق آزاد اسلامی جمہوریت کے قیام کے لئے جناح مسلم لیگ کے نام سے ایک نئی پارٹی کی بنیاد رکھیں...... میں قائداعظم کے پرانے سپاہیوں اور مخلص مسلم لیگیوں کو بالخصوص اور تمام مسلمانوں کو جنہیں صحیح اسلامی اصولوں پر پاکستان کی ترقی مقصود ہے یہ دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس نیک و مبارک کام میں ہمارے ساتھ تعاون کریں۔''[15]

نواب ممدوٹ ایک نیم تعلیم یافتہ، دقیانوسی اور رجعت پسند جاگیردار تھا۔ اس کی جاگیر ضلع فیروز پور کے مسلم اکثریت کے علاقے میں تھی لیکن وائسرائے ماؤنٹ بیٹن نے محض سکھوں کی دلجوئی کے لئے بذریعہ ریڈکلف ایوارڈ یہ علاقہ ہندوستان کے حوالے کر دیا تھا اور اس نے قیام پاکستان کے بعد اپنی متروکہ جاگیر کے عوض ضلع منٹگمری میں ایک سکھ زمیندار کے ''اقبال نگر فارم'' کا وسیع رقبہ اپنے نام الاٹ کرالیا تھا۔ اس نے اپنی نئی پارٹی کا اس لئے اعلان کیا تھا کہ مرکزی حکومت کے فیصلے کے مطابق 1951ء کے اوائل میں نئے صوبائی انتخابات ہونے والے تھے اور ''نوائے وقت'' کی رائے میں مسٹر لیاقت علی خان کے پاکستان مسلم لیگ کے صدر بننے کے بعد حزب اختلاف کے قیام کی ضرورت ناگزیر ہو گئی تھی۔ نواب ممدوٹ کو پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں اور چنیوٹ کے بعض سرمایہ داروں کے علاوہ مس فاطمہ جناح کی تائید و حمایت حاصل تھی اور اس کے صوبائی حریف ممتاز دولتانہ کا بڑے صوبائی زمینداروں اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کے علاوہ مجلس احرار جیسی فرقہ پرست جماعت سے گٹھ جوڑ تھا۔ نواب ممدوٹ کا کوئی واضح سیاسی، معاشرتی اور معاشی پروگرام نہیں تھا۔ اس کا اور اس کے حامیوں کا تمام تر انحصار مس جناح، پنجابی

شاونزم اور اسلام پر تھا۔ ان کو اپنی صوبائی عصبیت اور اسلام میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا جبکہ مس جناح، وزیر اعظم لیاقت علی خان کا تختہ الٹنے کے لئے پنجابی شاونزم سے فائدہ اٹھانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی تھیں۔ چونکہ ان کا کراچی کے اسماعیلی شیعہ فرقہ کے کاروباری عناصر سے خاندانی رابطہ تھا اور بمبئی میں ان کی تعلیم وتربیت بھی کلی طور پر سرمایہ دارانہ ماحول میں ہوئی تھی اس لئے ان کا پنجاب کے بڑے جاگیرداروں سے قدرتی تضاد تھا۔ مس جناح کو پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی پرزور تائید وحمایت حاصل تھی کیونکہ نہ صرف یہ طبقہ صوبائی جاگیرداروں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی بوجھ تلے دبا ہوا تھا بلکہ اسے چنیوٹ کے بعض سرمایہ داروں کی طرح لیاقت علی خان کی مرکزی حکومت سے بھی حسب خواہش مراعات نہیں ملتی تھیں۔ چونکہ یہ درمیانہ طبقہ بہت حد تک نوزائیدہ وناتجربہ کار ہونے کے باعث ازخود سیاسی قیادت مہیا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا اس لئے اس نے نواب ممدوٹ جیسے دقیانوسی جاگیردار کی رہنمائی قبول کر لی تھی۔ چونکہ یہ طبقہ صوبائی شاونزم کے علاوہ اسلام کا بھی علمبردار تھا اس لئے نواب ممدوٹ نے 14 رنومبر کو ایک پبلک جلسے میں اپنی جناح لیگ کے جن چودہ نکاتی اغراض ومقاصد کا اعلان کیا ان میں اسلام پر بہت زور دیا گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام قائم کیا جائے گا۔ پاکستان کے آئین کی قرآن وسنت کی ہدایات کے مطابق تشکیل کی جائے گی۔ زکوٰۃ کی بنیاد پر بیت المال قائم کیا جائے گا اور پاکستان کے ہر شہری کے لئے قرآن پاک کی تعلیم کا انتظام ہوگا۔

ان دنوں حسین شہید سہروردی نے بھی پہلے کلکتہ میں آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تحریک کی ناکامی اور پھر مشرقی بنگال میں وزارت اعلیٰ سے محرومی کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خلاف پنجاب کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا رکھا تھا وہ ازسرتاپا بورژوا تھا اور اس بنا پر سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا اس لئے اسے پنجاب میں نواب ممدوٹ کی زیر قیادت درمیانہ طبقہ سے اتحاد وتعاون کرنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اسے اپنے سیاسی مقصد کی تکمیل کے لئے، فاطمہ۔ لیاقت تضاد سے بھی فائدہ اٹھانے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ حالانکہ اس کے اپنے 9رجولائی 1948ء کے بیان کے مطابق مس فاطمہ جناح کے مرحوم بھائی قائداعظم محمد علی جناح نے قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال پر بطور وزیر اعلیٰ خواجہ ناظم الدین کو مسلط کر دیا تھا۔ جبکہ وہ خود (یعنی سہروردی) ہر لحاظ سے اس گدی کا مستحق تھا۔ اس نے 19رنومبر 1950ء کو لائل پور کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے

یہ الزام عائد کیا کہ لیاقت علی خان کی حکومت نے ''مس جناح کی کوٹھی کے سامنے بھی سی۔آئی۔ڈی کا پہرہ بٹھا رکھا ہے اور یہ کہ ان کے ٹیلیفون بھی خفیہ طور پر سی۔آئی۔ڈی سنتی رہتی ہے۔'' ''نوائے وقت'' لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف اس الزام کو کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس اخبار نے اپنے اداریے میں اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہمیں معلوم ہے کہ خاتون پاکستان کی حریت پسندی اور غریب پروری ارباب اقتدار کو ناگوار گزرتی ہے۔ بعض ارباب اقتدار کا خاتون پاکستان سے جو سلوک ہے وہ کراچی میں کسی سے مخفی نہیں۔ مگر دل اب بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ قائد اعظم کے نام پر برسر اقتدار آنے والے لوگ اس قدر احسان ناشناس، شقی القلب اور بے غیرت ہوں گے کہ وہ یہ گوارا کریں کہ سی۔آئی۔ڈی قائد اعظم کی بہن اور تحریک پاکستان میں مرحوم کی دست راست محترمہ فاطمہ جناح کی نگرانی کرے اور ان کے ٹیلیفون کو بھی خفیہ طور پر سنے۔ یہ بات اس سے قبل بھی ہم نے سنی تھی کہ سی۔آئی۔ڈی خاتون پاکستان کی نگرانی کرتی ہے اور محترمہ کی ڈاک تک سنسر کرتی ہے...... اب مسٹر سہروردی نے پبلک جلسہ میں یہی الزام لگایا ہے۔''[16] مرکزی حکومت کی طرف سے اس الزام کی پرزور تردید کی گئی مگر سہروردی نے اس تردید کو صحیح ماننے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ مس جناح خود اس کی تردید کریں۔ لیکن مس جناح نے نہ اس کی تردید کرنا تھی اور نہ کی۔ اسی دن ''پاکستان ٹائمز'' کی ایک خبر کے مطابق خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ نے کراچی میں مس فاطمہ جناح سے ملاقات کرنے کے بعد یہ اعلان کیا تھا کہ ''پنجاب کے آئندہ عام انتخابات کے لئے حزب اختلاف کی ساری پارٹیوں کا مشترکہ پارلیمانی بورڈ بنایا جائے گا اور انتخابی لڑائی براہ راست مسلم لیگ اور حزب اختلاف کی ساری پارٹیوں کے متحدہ محاذ کے درمیان ہو گی۔''[17] اس خبر سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ مس جناح نے نواب ممدوٹ کو لیاقت علی کی مسلم لیگ کے خلاف تقریباً وہی انتخابی سٹریٹجی اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا جو ان کے بھائی نے 1936ء میں کانگرس کے خلاف اختیار کی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ لیاقت علی کی حکومت کے خلاف ہر نظریہ اور اصول بالائے طاق رکھ کر حزب اختلاف کی ساری پارٹیوں کا متحدہ محاذ بناؤ۔ اس مجوزہ محاذ کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے 22/نومبر کو جماعت اسلامی کے امیر مولوی مودودی کی زیر صدارت عوامی مسلم لیگ، جناح مسلم لیگ، آزاد پاکستان پارٹی، جمیعت العلمائے اسلام اور جماعت اہل حدیث کا ابتدائی اجلاس منعقد ہو چکا تھا۔

15 ردسمبر کونواب ممدوٹ نے سیالکوٹ کے ایک پبلک جلسے میں انکشاف کیا کہ ''ہم کوشش کررہے ہیں کہ لیاقت حکومت کے مخالف گروپوں کی قیادت مس جناح کے کاندھوں پرڈال دیں مگرانہوں نے ابھی تک منظوری نہیں دی۔''[18] اس انکشاف سے ظاہر ہوا کہ مس جناح اس وقت تک لیاقت علی خان کے خلاف کھلم کھلا سیاسی میدان میں آنے سے گریز کررہی تھیں۔ ان دنوں ملک کی معیشت اچھی تھی اورلیاقت علی خان کوملک کے بڑے بڑے جاگیرداروں کے علاوہ اینگلوامریکی سامراج کی بھی پشت پناہی حاصل تھی۔ مس جناح ایسے وقت میں سیاسی میدان میں کودنا نہیں چاہتی تھیں جبکہ انہیں اپنی فتح کا پورا یقین نہیں تھا۔ ان کی خواہش اورکوشش یہ تھی کہ جب تک مناسب وقت نہیں آتا وہ پس پردہ رہ کرحسین شہید سہروردی، نواب ممدوٹ اور پیر مانکی وغیرہ کی وساطت سے لیاقت علی خان کے لئے حالات مشکل سے مشکل تر بناتی رہیں اور حسین شہید سہروردی، نواب ممدوٹ اور پیر مانکی وغیرہ کی خواہش وکوشش یہ تھی کہ وہ بابائے ملت کی واجب الاحترام ہمشیرہ کے وقاراوران کی مقبولیت سے فائدہ اُٹھا کراپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کرتے رہیں۔ چنانچہ 25 ردسمبر کونواب ممدوٹ نے لاہور میں مخالف پارٹیوں کے ایک مشترکہ جلسۂ عام کوخطاب کرتے ہوئے کہا کہ'' آج لوگ قائداعظم کے نام کوبیچ رہے ہیں اورعوام کودھوکا دینے کے لئے ہرجگہ قائداعظم کا نام استعمال کرتے ہیں مگراسی قائداعظم کی عزیز ترین بہن کے ساتھ جوسلوک کیاجارہاہے وہ انتہائی قابل مذمت ہے۔ جوکوئی ان سے ملنا چاہتاہے اسے شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھا جاتاہےاورطرح طرح کی پابندیاں عائد کردی جاتی ہیں۔ جنہیں قائداعظم نے کبھی اپنے سے جدانہیں کیا تھا آج انہیں کوئی پوچھنے والانہیں۔ جس شخص کی بدولت آج آپ کرسیوں پر براجمان ہیں کیااس کی سگی بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہیے؟ کیا قائداعظم کی یہی قدروعزت افزائی ہےجس کاحکمران طبقہ ڈھنڈوراپیٹ رہاہے؟'' میاں افتخارالدین نے اسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ''موجودہ برسراقتدار طبقہ قائداعظم کا جانشین نہیں ہے۔ قائداعظم کے وارث وہ لوگ ہیں جوآزادی، جمہوریت اور قائداعظم کے اصولوں وروایات کے علمبردار ہیں۔''[19] مطلب یہ تھا کہ قائداعظم کے نام کوبیچنے کی سیاسی کاروبار کی اجارہ داری صرف ہمارے پاس ہے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان اوران کے سیاسی حلیف یہ کاروبار کرنے کے مجاز نہیں کیونکہ وہ قائداعظم کی عزیزترین ہمشیرہ سے بدسلوکی کرتے ہیں۔ مزید برآں مس جناح نے قائداعظم کا نام

بیچنے کے کاروبار کی ہول سیل ایجنسی لیاقت علی خان کے سیاسی حریفوں کو دے رکھی ہے۔ لیاقت اینڈ کمپنی کا اس کاروبار میں کوئی حصہ نہیں ہوسکتا۔ 26 / دسمبر کو نواب ممدوٹ نے لائل پور میں ایک جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اصرار کیا کہ اس کاروبار پر اس کی اجارہ داری ہے۔ اس نے کہا۔ ''جب سے جناح لیگ کا انعقاد ہوا ہے مسلم لیگیوں کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں مس جناح کا ہی اس میں ہاتھ نہ ہو اور پنجاب اسمبلی کے الیکشن تو انہیں اتنا پریشان کر رہے ہیں کہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان لوگوں کو یقین ہے کہ اگر کہیں مس جناح یہاں تشریف لے آئیں یا پبلک کو پتہ چل گیا کہ جناح مسلم لیگ کو مس جناح کی تائید حاصل ہے تو مسلم لیگ کا بیڑا ہی غرق ہو جائے گا''[20] اور پھر 29 / دسمبر کو نواب ممدوٹ نے سرگودھا کے ایک جلسۂ عام میں قائداعظم اور ان کی بہن کے نام کو بیچنے کا کاروبار کیا۔ اس نے کہا ''مجھے افسوس کے ساتھ اس امر کا اظہار کرنا پڑتا ہے کہ جب قائداعظم بیماری کی حالت میں کراچی سے زیارت تشریف لائے تو اس وقت مرکز کے ان ارباب بست وکشاد میں سے کسی نے ان کی خطرناک بیماری میں ان کی مدد نہ کی۔ مرحوم ہوائی اڈے سے ایک فرسودہ لاری میں سوار ہو کر عازم کراچی ہوئے جو تھوڑی دور جا کر خراب ہو گئی اور مرحوم کو چلچلاتی دھوپ میں پڑا رہنا پڑا۔''[21]

انہی دنوں لیاقت علی خان نے برطانیہ کے ایک پیشہ ور سوانح نگار ہیکٹر بولیتھو کی خدمات کو حاصل کیا اور یہ اعلان کیا گیا کہ وہ قائداعظم کی سوانح حیات تحریر کرے گا۔ جہاں اس کا مقصد حزب مخالف کی قائداعظم پر مکمل اجارہ داری کو توڑنا تھا وہاں اس کا زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ سرکاری طور پر مرتب ہونے والی اس سوانح عمری میں ان واقعات کو گول کر دیا جائے جن سے جناح۔ لیاقت تضاد کی نشاندہی ہوتی تھی۔ خاص طور پر قائداعظم کی علالت کے دوران اس کی سردمہری پر پردہ ڈال دیا جائے اور یہ اہتمام کیا جائے کہ تحریک پاکستان میں لیاقت کے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا جائے۔ لیاقت مخالف رائے عامہ نے اس پر یہ اعتراض وارد کیا کہ یہ کام کسی پاکستانی کے سپرد ہونا چاہیے تھا۔ مس فاطمہ جناح نے ہیکٹر بولیتھو سے ملنے اور اسے قائداعظم کے ذاتی کاغذات دکھانے سے انکار کر دیا۔''[22] اس کی وجہ مس جناح نے مختار مسعود کو یہ بتائی کہ ''ہیکٹر بولیتھو کو قائداعظم کی سوانح عمری لکھنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے تاکہ وہ لیاقت علی خان کے کام کو بڑھا کر پیش کرے۔''[23]

مس فاطمہ جناح نے کبھی بھی لیاقت علی خان کے سیاسی حریفوں کو قائداعظم کا نام بیچنے کا کاروبار کرنے سے منع نہیں کیا تھا بلکہ انہوں نے پس پردہ رہ کر حتی الامکان ان کی اس سیاسی دکانداری کو چمکانے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے 11رفروری 1951ء کو اپنے ایک بیان میں پنجاب کے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ لیاقت علی خان کے کاروبار حکومت کو بڑھاوا نہ دیں۔ ان کا ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان کی وساطت سے بیان یہ تھا کہ ''میری توجہ لاہور کے اُردو روزنامہ ''مغربی پاکستان'' کی 8رجنوری 1951ء کی ایک خبر کی طرف مبذول کرائی گئی ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ خاتون پاکستان چاہتی ہیں کہ دولتانہ کو پنجاب کی خدمت کا موقع دیا جائے۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے اور اس میں کوئی صداقت نہیں۔''[24] پھر انہوں نے روزنامہ نوائے وقت پر سنسر عائد ہونے کے بعد ۱۷ فروری کو ایک بیان میں حکومت کی اس کارروائی کی مذمت کی۔ ان کا بیان یہ تھا کہ ''پبلک سیفٹی ایکٹ کی ترویج ہمیشہ غیر پسندیدہ ہوتی ہے۔ اس کا اطلاق تو اس سے بھی زیادہ ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ ایسے قانون کا استعمال بالعموم انتہائی ہنگامی حالات میں ہوتا ہے۔ آج کل اس کے استعمال کا مطلب یہ ہوگا کہ جمہوری اداروں کی زبان بندی کی جا رہی ہے۔''[25] اور پھر 6رمارچ کو مس جناح نے پنجاب کے انتخابات کے بارے میں جو بیان دیا اس کا مفہوم یہ تھا کہ پنجابی رائے دہندگان کو لیاقت لیگ کے خلاف ووٹ دینے چاہئیں۔ بیان یہ تھا کہ ''حصول آزادی کے بعد انقلابی تبدیلیاں نئے نظام کا تقاضا کر رہی ہیں۔ عوام کا فرض ہے کہ وہ نہایت دانشمندی سے نئے حالات کا جائزہ لے کر ان تبدیلیوں کو اپنائیں۔ کئی اصحاب نے پنجاب کے ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں میرا مشورہ طلب کیا ہے۔ میں اہل پنجاب پر یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ انہیں ان انتخابات کے پیش نظر یہ احساس کرنا چاہیے کہ ان کے یہ عظیم ووٹ ہی اس عظیم المرتبت قوم کی قسمت پلٹنے میں نمایاں پارٹ ادا کریں گے۔ پاکستان میں جمہوری نظام رائج کیا جانا تھا اور جمہوری دستور کے بنیادی تقاضے یہ ہوا کرتے ہیں کہ عوام کو آزاد انتخاب کا حق دیا جائے۔ اہل پنجاب کے لئے میرا پیغام یہ ہے کہ وہ بلاخوف وخطر صحیح نمائندوں کو ووٹ دیں۔ انہیں دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہونا چاہیے نہ ہی دلفریب وعدوں سے متاثر ہونا چاہیے۔ ووٹ ایک مقدس امانت ہے اور یہ متاع خرید وفروخت نہیں۔ یاد رکھیئے کہ اگر آپ نے اپنے ضمیر کے خلاف ووٹ دیا تو یہ قوم سے غداری ہوگی قائداعظم

کے حقیقی اور وفادار پیروکاروں کی حیثیت سے آپ جرأت کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق اپنا فرض ادا کریں۔''[26] یہ بیان بالکل واضح تھا، اس میں غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس میں لیاقت لیگ کی مخالفت نمایاں تھی اس لئے ''نوائے وقت'' نے اسے شہ سرخی کے ساتھ شائع کیا۔

تاہم پنجاب میں مارچ کے اواخر میں جو عام انتخابات ہوئے ان میں وزیراعظم لیاقت علی کی مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی۔ ان انتخابات میں دھاندلیوں کے بہت الزامات لگائے گئے مگر انہیں نظر انداز کر دیا گیا اور بالآخر ممتاز دولتانہ کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور وہ پنجاب کا وزیراعلیٰ بن گیا۔ اس نے اور اس کی کابینہ نے حلف اٹھانے کے بعد جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نوائے وقت کی اشاعت بند کر دی۔ نوائے وقت کو دولتانہ حکومت کے ہاتھوں یہ سزا ملنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس اخبار نے مس جناح کے مشورے کے مطابق لیاقت حکومت کی بلاخوف و خطر مخالفت میں ہر جائز و ناجائز حربہ استعمال کیا تھا۔ مس جناح نے یہ مشورہ 2رسمبر 1950ء کو آل پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس کے کنونشن کے نام ایک پیغام کی صورت میں دیا تھا۔ پیغام یہ تھا کہ ''ایک طاقتور، چوکنا اور غیر جانبدار پریس ایک ایسی قوم کے لئے عظیم اثاثہ کی حیثیت رکھتا ہے جو پارلیمانی ادارے تعمیر کرنے کی خواہاں ہو۔ ایک جمہوری ملک میں جمہوری اداروں کی کامیابی کا انحصار چوکنے عوام اور اخبارات پر ہوتا ہے ایک فرمانبردار اور وظیفہ خور پریس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے پارلیمانی اداروں میں خرابی پیدا ہوتی ہے اور ریاست کے مفاد کو نقصان پہنچتا ہے۔''[27] اس پیغام کا صاف مطلب یہ تھا کہ روزنامہ ڈان کی طرح حکومت کا فرمانبردار اور وظیفہ خور نہ بنو بلکہ بلاخوف و خطر لیاقت علی خان کی مخالفت کرو۔ نوائے وقت نے ایسا ہی کیا۔ لہٰذا پہلے تو فروری میں اس پر سنسر شپ عائد کر دی گئی اور پھر مارچ میں پنجاب کے عام انتخابات کے بعد اس کی اشاعت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ لیاقت علی کی حکومت کا پنجاب میں مس جناح کے خلاف یہ پہلا مؤثر جوابی حملہ تھا۔

تاہم مس جناح بھی اپنے بھائی کی طرح شکست تسلیم کرنے والی نہیں تھیں۔ پنجاب کے انتخابات میں ان کے حامیوں کی شکست کے بعد ان کا وزیراعظم لیاقت علی خان کی حکومت سے تضاد اور بھی زیادہ شدید ہو گیا جبکہ ملک کی معیشت کو کوریا کی جنگ کی وجہ سے یکا یک جو فائدہ پہنچا تھا اس میں کمی آنا شروع ہو گئی تھی۔ مس جناح 21راپریل 1951ء کو یوم اقبال کی تقریبات

میں شرکت کرنے کے لئے لاہور ریلوے اسٹیشن پر پہنچیں تو وہاں لیاقت مسلم لیگ اور جناح مسلم لیگ دونوں ہی کے حامی بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ دونوں گروہوں نے اس تنازعہ کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف نعرے لگائے کہ خاتون پاکستان کس گروہ کے جلوس کے ساتھ اسٹیشن سے باہر نکلیں گی۔ بالآخر پولیس کی امداد سے اس صورت حال پر قابو پالیا گیا اور مس جناح صوبائی گورنر سردار عبدالراب نشتر کے ہمراہ گورنر ہاؤس چلی گئیں۔ لیکن مس جناح پر اس سرکاری مہمان نوازی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے 22/اپریل کو ایک ایسے پبلک جلسے میں شرکت کی جس کا اہتمام جناح مسلم لیگ کے حامیوں نے کیا تھا۔ اس جلسہ کے منتظمین میں دو سابق اعلیٰ سرکاری افسر خواجہ عبدالرحیم اور راجہ حسن اختر پیش پیش تھے جنہیں 1949ء میں گورنر سر فرانسس موڈی کے عہد اقتدار میں سنگین بدعنوانیوں کے الزام میں برطرف کر دیا گیا تھا اور اب یہ دونوں بیک وقت اسلام، پاکستان، قائداعظم، مادرِ ملت، جمہوریت، پنجابی حقوق اور اقبال کے نام پر لیاقت حکومت کے مخالفین کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ ایک سابق احراری ایجی ٹیٹر شورش کاشمیری نے اس جلسہ میں حاضرین سے ہاتھ اٹھوا کر ''نوائے وقت'' کی اشاعت کی بحالی کا مطالبہ کیا مگر اس مطالبہ کی تکمیل نہ ہوئی اور ''نوائے وقت'' ''جہاد'' کے نام سے شائع ہوتا رہا۔ یہ اخبار وزیراعظم لیاقت علی خان کو پنجابیوں کا دشمن قرار دیتا تھا اور پنجاب کے وزیراعلیٰ دولتانہ کو اس نے ''ابلیس سیاست'' کا خطاب دے رکھا تھا۔

جولائی 1951ء میں حکومت پاکستان نے آزاد کشمیر کے قصبہ پلندری میں بعض ''شورش پسندوں'' کو مرعوب کرنے کے لئے تقریباً ایک بریگیڈ فوج بھیجی تو حکومت ہندوستان نے اس پر سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ حکومت ہندوستان نے اپنی بیشتر فوج پنجاب کی سرحدوں پر اس طرح مجتمع کر دی کہ وہ حملہ کرنے ہی والی ہے۔ چنانچہ قدرتی طور پر دونوں ملکوں میں بہت کشیدگی پیدا ہوگئی اور حسب توقع عوام کے بہت سے حلقوں کی طرف سے ہندوستان کی مزاحمت کے لئے لیاقت حکومت کی حمایت کے اعلانات کئے گئے۔ مگر مس جناح کو لیاقت علی خان سے اس قدر نفرت تھی کہ انہوں نے 14/اگست کو یوم آزادی کے موقع پر جو بیان دیا اس میں لیاقت حکومت کی حمایت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا تھا۔ پھر ستمبر میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے ظاہر ہو گیا کہ آئندہ مس جناح وزیراعظم لیاقت علی کے خلاف سیاسی لڑائی پس پردہ رہ کر دوسروں کی وساطت سے

نہیں لڑیں گی بلکہ وہ اس مقصد کے لئے خود میدان میں آئیں گی۔ ان کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ تھی کہ مس جناح نے 11 ستمبر کو اپنے بھائی قائداعظم محمد علی جناح کی تیسری برسی کے موقعہ پر اُردو زبان میں ایک تقریر ریکارڈ کروائی جو اسی شام ریڈیو سے نشر ہونا تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے کشمیر اور دوسرے قومی مسائل کے بارے میں لیاقت علی خان کی حکومت پر سخت نکتہ چینی کرتے ہوئے عوام الناس کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ ایک ایسا انقلاب برپا کریں جس سے دنیا لرز اٹھے۔ ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر زیڈ۔ اے بخاری نے جب اس تقریر کا مسودہ دیکھا تو اس نے مس جناح سے درخواست کی کہ اس کے قابل اعتراض حصوں کو حذف کر دیا جائے مگر وہ نہ مانیں اور اصرار کیا کہ یا تو اس تقریر کو بلا ترمیم نشر کیا جائے یا یہ اعلان کر دیا جائے کہ مس جناح تقریر نہیں کر سکیں گی۔ اس پر بخاری اس وقت تو خاموش ہو گیا مگر جب تقریر نشر ہوئی تو لوگوں کو وہ حصے سنائی نہ دیئے جن کو اس نے قابل اعتراض قرار دیا تھا۔ ان قابل اعتراض حصوں میں ایک حصہ یہ تھا کہ "تین طویل سال گزرنے کے باوجود مسئلہ کشمیر ابھی تک حل نہیں ہوا ہے۔ اس کی اہمیت آج بھی وہی ہے اور اس کی نزاکت میں ذرہ برابر کمی نہیں بلکہ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کے قریبی حل کا یقین دلایا گیا ہے جسے آج بھی دہرایا جا رہا ہے مگر نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ مجلس اقوام متحدہ نے تجویز پر تجویز منظور کی ہے اور اپنے خاص نمائندے بھی روانہ کئے پھر بھی یہ مسئلہ اب تک جہاں تھا وہیں ہے۔ مجھے امید ہے کہ کشمیر کے عوام بہت ہوشیاری اور احتیاط سے کام لیں گے تاکہ یہاں اس صورت حال کو دہرایا نہ جائے جو فلسطین کے معاملے میں پیش آئی" اور دوسرا حصہ یہ تھا کہ "پاکستان کی آزادی و بقا کے نعرے لگانے والو! اپنی مملکت کی اس عظمت کو قائم رکھو جس کی خاطر تم نے دنیا سے اپنے حقوق منوائے۔ اپنے ملک کی بقا کے لئے اندرونی یا بیرونی کسی ایسے اثر کو قبول نہ کرنا جس سے تمہارے قومی وقار کو ٹھیس لگے۔ قوم کی قسمت کی کلید تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو پہچانو اور اپنی بے پناہ طاقت سے پاکستان کو ہر تباہی سے بچالو۔ دنیا تمہیں آزمائش میں مبتلا کرنا چاہتی ہے۔ اسے تمہاری طاقت کا امتحان مقصود ہے۔ ایسا نہ ہو تمہارے عزائم کو ٹھیس لگ جائے۔ قائداعظم کی صحیح یاد یہی ہے اور یہی ان کو خراج عقیدت ہے کہ بے باکی، صداقت، جوش عمل اور پرعزم اقدام کے ساتھ قائداعظم کی رفتار، گفتار اور کردار کو اپنالو اور اپنی مملکت اور قوم میں وہ انقلاب برپا کرو جس سے دنیا لرز اٹھے اور پھر کسی کو تمہارے مقابلے کی جرأت نہ ہو سکے۔"[28]

ظاہر ہے کہ مس جناح نے اپنی ''قابل اعتراض'' تقریر میں پاکستان کے عوام کو غیر مبہم الفاظ میں تلقین کی تھی کہ وہ لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حل نہ ہونے کی وجہ سے پنجاب کے عوام میں بے پناہ غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ اگر اس مسئلہ پر پنجابی عوام کے جذبات کو برانگیختہ کیا جائے تو وہ ایسا انقلاب برپا کریں گے کہ جس سے دنیا لرز اُٹھے گی اور لیاقت علی خان کی حکومت پر کاہ کی طرح اڑ جائے گی۔ لیکن جب مس جناح کو اپنے سیکرٹری سے یہ معلوم ہوا کہ ان کی ساری تقریر نشر نہیں ہوئی تو وہ بہت برہم ہوئیں اور ان کی اس برہمی کا ہی نتیجہ تھا کہ 12 ستمبر کو کراچی میں پنجابی شاونسٹوں کے ترجمان اخبار ''ایوننگ ٹائمز'' میں یہ خبر چھپی کہ مادر ملت کی تقریر کے ''قابل اعتراض'' حصوں کو دانستہ طور پر نشر نہیں کیا گیا تھا۔ اسی دن کنٹرولر براڈ کاسٹنگ زیڈ۔ اے بخاری نے ایک بیان میں اس خبر کی تردید کی اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ محض ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے تقریر کے بعض حصے ٹھیک سے سنائی نہیں دیئے۔ مگر مس جناح اس توضیحی بیان سے مطمئن نہ ہوئیں اور انہوں نے بخاری کے نام ایک خط میں اس الزام کا اعادہ کیا کہ ان کی پوری تقریر کو بالا رادہ نشر نہیں کیا گیا تھا۔ 23 ستمبر کو نواب مدوٹ نے مرکزی حکومت کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین کے نام ایک کھلے خط میں مطالبہ کیا کہ ریڈیو پر خاتون پاکستان کی تقریر نشر نہ ہونے کے واقعہ کی تحقیقات کرائی جائے۔ اس نے کہا کہ اگر بانئ پاکستان کی بہن کو اپنے خیالات عوام تک پہنچانے سے روکا جاسکتا ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان میں لوگوں کو تحریر وتقریر کی آزادی ہے۔ اس واقعہ کی فوراً تحقیقات کراؤ اور متعلقہ افسر کو برطرف کرو۔ بصورت دیگر عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اس ساری کاروائی کے پیچھے کسی اور کا ہاتھ کارفرما تھا۔ اسی دن پاکستان مسلم لیگ کے سابق صدر چودھری خلیق الزماں، آل پاکستان مسلم یوتھ آرگنائزیشن کے جنرل سیکرٹری ایس ایم کاظمی، پنجاب ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری منظور ملک، کراچی ڈیموکریٹک سٹوڈنٹس کے کنویز محمد سرور اور گوجرانوالہ سٹی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری منظور الحسن نے اپنے بیانات میں جمہوری روایات کو کچلنے کی اس کاروائی کی مذمت کی۔ روزنامہ ڈان نے اسی دن اپنے اداریہ میں کنٹرولر بخاری کو مشورہ دیا کہ وہ مس جناح کی تقریر کے مکمل متن کو دوبارہ نشر کردے۔ تاہم اخبار نے اس الزام کو غلط بتایا کہ اس تقریر کے نشر ہونے کے دوران جو گڑبڑ ہوئی تھی اس میں حکومت کا کوئی ہاتھ تھا۔''[29]

لیکن اسی دن یعنی 23 ستمبر کو ہی ''ایوننگ ٹائمز'' نے یہ خبر شائع کی کہ ''11 ستمبر کو جب خاتون پاکستان محترمہ فاطمہ جناح تقریر نشر کر رہی تھیں تو ٹرانسمیٹر بالکل ٹھیک تھے اور ریڈیو پاکستان کے کنٹرولر مسٹر بخاری نے، جو خود ایک پروگرام ایگزیکٹو اور ٹیکنیکل اسسٹنٹ کے ہمراہ بوتھ نمبر 4 میں موجود تھے تقریر کے خاص حصوں کو نشر نہیں ہونے دیا اور جب مانیٹر کنٹرول نے آ کر ان سے کہا کہ تقریر نشر نہیں ہو رہی تو انہوں نے اسے ڈانٹ کر واپس بھیج دیا چنانچہ مانیٹر کنٹرول نے ''لاگ بک'' میں درج کر دیا کہ ''کنٹرولر صاحب نے پروگرام خود کاٹا ہے......'' اس موقع پر لانڈھی کے ٹرانسمیٹر سے بھی ٹیلیفون آیا کہ تقریر یہاں نہیں پہنچ رہی ہے اور یہی ''لاگ بک'' میں بھی لکھا تھا لیکن تقریر نشر ہونے کے بعد کنٹرولر صاحب نے ''لاگ بک'' منگوائی اور وہ صفحات جن پر یہ بات لکھی تھی، پھاڑ دیئے اور ان کی جگہ نئے صفحے لگوا دیئے۔''[30] چنانچہ زیڈ۔اے بخاری نے اسی دن مس جناح کے نام ایک خط میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ اس نے اپنے 12 ستمبر کے خط میں ٹیکنیکل خرابی کے بارے میں جو وضاحت کی تھی اسے تسلیم نہیں کیا گیا ہے بلکہ میری نیت پر شک وشبہ کیا گیا ہے تاہم میں اس بحث وتمحیص کو مزید جاری نہیں رکھنا چاہتا اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں 24 ستمبر کو رات کے ساڑھے آٹھ بجے آپ کی تقریر کے مکمل متن کو نشر کروں گا۔ مس جناح نے اس خط کا جواب 26 ستمبر کو دیا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ میرے لئے تمہارا یہ توضیحی خط بھی قابل قبول نہیں ہے کیونکہ تم ٹیکنیکل خرابی پر اصرار کرتے ہو۔ بخاری نے اسی دن فوراً ہی اس خط کے جواب میں ایک معافی نامہ لکھ بھیجا اور اگلے دن یعنی 27 ستمبر کو حکومت پاکستان نے پاکستان کے خلاف بھارتی توسیع پسندوں کے عزائم کے بارے میں ایک قرطاس ابیض جاری کیا جس کا عنوان تھا۔ ''پاکستان کے خلاف ہندوستان کا جنگی پروپیگنڈا'' اس قرطاس ابیض میں دستاویزی شہادتوں کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے حکمران پاکستان کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اگرچہ حکومت پاکستان کی یہ سرکاری دستاویز مستند حقائق پر مبنی تھی اور ان دنوں حکومت ہندوستان نے پنجاب کی سرحدوں پر اپنی فوجیں بھی جارحانہ انداز میں جمع کر رکھی تھیں لیکن مس جناح پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور انہوں نے اپنے 27 ستمبر کے خط میں بخاری کا معافی نامہ یہ کہہ کر منظور کرنے سے انکار کر دیا کہ میری تقریر کے دوران گڑ بڑ کے بارے میں تمہارا توضیحی بیان اطمینان بخش نہیں ہے۔

قدرت اللہ شہاب جو ان دنوں وزارت اطلاعات میں ڈپٹی سیکرٹری تھا لکھتا ہے کہ ''وزیر داخلہ و اطلاعات کے کمرے میں یہ بات طے کرنے کے لئے میٹنگ ہوئی کہ اس قصے کے متعلق پبلک میں جو چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، ان پر کس طرح قابو پایا جائے۔ بے حد طویل اور بعید از کار بحث و تمحیص کے بعد آخر مسٹر جی۔ احمد نے تجویز پیش کی کہ کسی نامور شخصیت سے انکوائری کروا کے یہ ثابت کیا جائے کہ مس جناح کی براڈ کاسٹنگ کے دوران بجلی کی کرنٹ فیل ہو گئی تھی۔ اس انکوائری رپورٹ کی اشاعت کے بعد زبان خلق خود بخود بند ہو جائے گی۔ اس کے برعکس وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین کو اصرار تھا کہ انکوائری بے لاگ اور غیر جانب دار ہونی چاہیے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ بجلی فیل نہیں ہوئی تھی تو اس بات کا بھی برملا اعتراف کرنا ضروری ہے تا کہ پبلک کے ذہن میں مزید بدگمانیاں پیدا نہ ہوں۔ سیکرٹری اور وزیر کے درمیان اس بحث کی تلخ کلامی نے بڑا طول کھینچا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خواجہ صاحب بھی یہی سمجھتے تھے کہ بجلی فیل نہیں ہوئی اور اب وہ اس بات کو کھلم کھلا منظر عام پر لانے کے لئے بے تاب تھے۔''[31]

خواجہ شہاب الدین کی خواہش کے مطابق انکوائری تو نہ ہو سکی البتہ 28 ستمبر کو کراچی کے نو ایڈیٹروں کا ایک مشترکہ بیان شائع ہوا جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ مس جناح کی نشری تقریر کے بارے میں جو مباحثہ شروع کر دیا گیا ہے اس سے قومی اتحاد کو نقصان پہنچ رہا ہے اور دشمنان پاکستان فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

اس بیان پر روزنامہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین، سندھ آبزرور کے ایڈیٹر علی محمد راشدی، سول اینڈ ملٹری گزٹ (کراچی) کے ایڈیٹر فرید ایس۔ جعفری، جنگ کے مینیجنگ ایڈیٹر میر خلیل الرحمن، جنگ کے ایڈیٹر سید محمد تقی، انجام کے ایڈیٹر عمر فاروق، نوروز کے ایڈیٹر انعام نبی پردیسی، مسلمان کے ایڈیٹر سید عشرت علی اور المنتظر کے مینیجنگ ایڈیٹر سید ساجد حسن رضوی کے دستخط تھے۔ کراچی میں پنجابی مفادات کے ٹھیکیدار اخبار ایوننگ ٹائمز کے ایڈیٹر زیڈ۔ اے سلہری اور دوسرے پنجابی ایڈیٹروں کے نام اس بیان پر دستخط کنندگان میں شامل نہیں تھے اور نہ ہی لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے ایڈیٹروں نے اس قسم کا کوئی بیان شائع کیا بلکہ پاکستان ٹائمز اور بعض دوسرے پنجابی اخباروں نے 29 ستمبر کو اپنے اداریوں میں کراچی کے ایڈیٹروں کے اس بیان کی مذمت کر کے یہ الزام عائد کیا کہ یہ سب کچھ حکومت کے اشارے پر ہوا ہے۔

چونکہ روزنامہ ڈان نے اپنے 23ر ستمبر کے اداریے میں اس الزام کی تردید کی تھی کہ 11ر ستمبر کو خاتون پاکستان کی تقریر نشر ہونے کے دوران جو گڑبڑ ہوئی تھی اس میں حکومت کا کوئی ہاتھ تھا، چونکہ ڈان کے ایڈیٹر الطاف حسین نے 28ر ستمبر کے اس بیان پر دستخط کئے تھے جس میں اشارۃً مادرِملت پر قومی اتحاد کو نقصان پہنچانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اس لئے مس جناح کو اس اخبار اور اس کے ایڈیٹر پر بہت غصہ تھا۔ اس غصے میں 4ر اکتوبر کو اور بھی شدت پیدا ہوگئی جبکہ پاکستان ہیرلڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ نے سندھ چیف کورٹ میں مقدمہ دائر کر کے یہ استدعا کی کہ عدالت عالیہ نے 14ر مارچ 1949ء کو ڈان ٹرسٹ کی تشکیل نو کے بارے میں جو فیصلہ صادر کیا تھا اسے کالعدم قرار دیا جائے اور درخواست دہندہ محمود علی کو ہدایت کی جائے کہ وہ ڈان کراچی کے ملکیتی حقوق میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ پاکستان ہیرلڈ لمیٹڈ کی طرف سے اے۔ کے بروہی، محمد فضل الرحمن اور عبدالعزیز چیف کورٹ میں پیش ہوئے۔ اس پر مس جناح نے 7ر اکتوبر کو پاکستان ہیرلڈ لمیٹڈ اور پاکستان ہیرلڈ پبلی کیشنز لمیٹڈ کے نام ایک خط میں مطالبہ کیا کہ سندھ چیف کورٹ کے 14ر مارچ 1949ء کے فیصلے کے مطابق میں ڈان ٹرسٹ کی متولی ہوں اس لئے ڈان کا ڈیکلریشن، حساب کتاب کی کتابیں اور دوسرا سامان میرے نمائندہ عباس ایف شیخ کے حوالے کر دیا جائے مگر اس مطالبے کی اس دلیل کی بنا پر تکمیل نہ کی گئی کہ یہ معاملہ عدالت میں پیش ہو چکا ہے اس لئے اس کا فیصلہ وہیں ہوگا۔ اس پر مس جناح اور پاکستان ہیرلڈ لمیٹڈ کے درمیان خط و کتابت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ مس جناح کا مسلسل مطالبہ یہ تھا کہ روزنامہ ڈان میرے حوالے کرو اور پاکستان ہیرلڈ لمیٹڈ کا چیئرمین ایسا کرنے سے انکار کرتا رہا۔ ابھی یہ تلخ خط و کتابت جاری ہی تھی کہ 16ر اکتوبر 1951ء کو وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کو راولپنڈی کے ایک جلسہ عام میں گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

پاکستان مؤرخین ملک کے پہلے وزیراعظم کے اس المناک قتل کے پس منظر کا ذکر کرتے ہیں تو یہ نہیں بتاتے کہ پہلے جناح۔ لیاقت تضاد اور پھر فاطمہ۔ لیاقت تضاد نے ملک میں کس قدر شدید سیاسی پیچیدگیاں اور مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ جتنی دیر قائداعظم محمد علی جناح زندہ رہے وزیراعظم لیاقت علی خان کی حیثیت محض ایک نمائشی وزیراعظم کی تھی اور کلی اختیارات گورنر جنرل کی ذات میں مرتکز تھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے یہ نمائشی حیثیت پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی اور

نہ ہونی چاہیے تھی۔ تاہم اس نے یہ وقت بڑے صبر وتحمل اور خاموشی سے گزارا کیونکہ وہ بابائے قوم کی ذراسی بھی حکم عدولی کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش کرتا تو ایک دن بھی وزیراعظم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اس امید میں وہ مشکل وقت گزارا تھا کہ قائداعظم عمر رسیدہ اور علیل ہیں اس لئے زیادہ دیر زندہ نہیں رہیں گے۔ اس کے دل میں قائداعظم جناح کے خلاف کس قدر بغض وعناد تھا۔ اس کا اندازہ اس سنگدلی سے لگایا جاسکتا ہے جس کا مظاہرہ اس نے بابائے قوم کے آخری ایام میں کیا تھا۔ مس فاطمہ جناح کا بھی اپنے بھائی کی طرح نوابزادہ لیاقت علی خان سے طبقاتی تضاد تھا۔ چونکہ وہ 1928ء کے بعد اپنے بھائی کی واحد ساتھی رہی تھیں اس لئے انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے بھائی کی نوابزادہ کے بارے میں کیا رائے تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے قائداعظم کے علاج معالجے کا نجی طور پر انتظام کیا تھا اور اس سلسلے میں وزیراعظم سے کوئی امداد طلب نہیں کی تھی۔ اس دوران ان کے لئے لیاقت علی خان کے ساتھ تضاد میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس میں واضح طور پر شدت پیدا ہوگئی تھی اور پھر جب لیاقت علی خان نے انہیں گورنر جنرلی سے محروم رکھا تو اس تضاد نے نہایت معاندانہ صورت اختیار کرلی کیونکہ اگرچہ پاکستان کو درمیانہ طبقہ کے ایک جدیدیت پسند بورژوا لیڈر کی زیر قیادت حاصل کیا گیا تھا لیکن ستمبر 1948ء میں بابائے قوم کے انتقال کے بعد نوزائیدہ ملک کی مسند اقتدار پر دقیانوسی جاگیرداروں کا مکمل قبضہ ہوگیا تھا۔ وزیراعظم کا عہدہ پنجاب ویو۔ پی کے ایک پشتینی جاگیردار نوابزادہ لیاقت علی خان کے پاس تھا اور گورنر جنرل کے عہدے پر بنگال کا ایک خاندانی جاگیردار خواجہ ناظم الدین فائز تھا۔ مس جناح نے چند ماہ تو خاموشی سے گزارے مگر جب وزیراعظم لیاقت نے پنجاب میں جاگیرداروں کے دولتانہ دھڑے سے گٹھ جوڑ کر کے جنوری 1949ء میں نواب ممدوٹ کی وزارت کو برطرف کردیا تو انہیں لیاقت علی خان کی مخالفت کا وہ موقع مل گیا جس کی وہ بیتابی سے منتظر تھیں۔ اس وقت تک پنجاب کا درمیانہ طبقہ مختلف وجوہ کی بنا پر لیاقت حکومت سے بددل و مایوس ہو چکا تھا اور کشمیر میں جنگ بندی کے باعث پنجابی فوج میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی۔ چنانچہ مس جناح نے پہلے تو پس پردہ رہ کر لیاقت حکومت کے خلاف پنجابی شاونزم کی حوصلہ افزائی کی۔ جب 1950ء میں صوبائی انتخابات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے ذرا کھل کر یہ کوشش کی کہ ان انتخابات میں لیاقت علی کو شکست ہوجائے۔ جب مارچ 1951ء کے انتخابات

میں ایسا نہ ہوا تو مس جناح نے اپنی مخالفانہ سرگرمیاں ترک نہ کیں بلکہ لیاقت حکومت کے خلاف ان کی تحریر و تقریر میں پہلے سے زیادہ تلخی آ گئی اور پھر جب ستمبر 1951ء میں ریڈیو پر ان کی انقلابی تقریر میں گڑ بڑ کا واقعہ پیش آیا تو ان کے اور لیاقت علی خان کے درمیان شدید محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ لیاقت علی خان نے اس سے قبل مس جناح کی تلخ گوئی اور نکتہ چینی کا کبھی براہ راست کوئی جواب نہیں دیا تھا بلکہ اس نے بڑے صبر و تحمل سے اسے درگزر کیا تھا مگر 28 ستمبر کو کراچی کے غیر پنجابی ایڈیٹروں نے اپنے مشترکہ بیان میں مس جناح پر اشارۃً قومی اتحاد کو نقصان پہنچانے کا الزام عائد کیا تو ظاہر ہو گیا کہ اب لیاقت حکومت کی طرف سے بھی تلخی کا جواب تلخی سے دیا جائے گا۔ کیونکہ ایڈیٹروں کے اس بیان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ پاکستان کی کوئی سرکاری یا غیر سرکاری شخصیت تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ چونکہ مس جناح نے اس بیان کے مضمرات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا اس لئے انہوں نے اکتوبر میں روزنامہ ڈان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے خط و کتابت شروع کر دی جو روزانہ اخبارات میں چھپتی تھی اور اس طرح روزانہ مس فاطمہ جناح اور لیاقت علی خان کے درمیان جنگِ اقتدار کا بگل بجتا تھا۔ 16 اکتوبر 1951ء کو راولپنڈی میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کا المناک قتل اسی افسوسناک سیاسی جنگ کے ماحول میں ہوا۔

پاکستان میں جناح۔ لیاقت اور فاطمہ۔ لیاقت تضادات کے جو افسوس ناک سیاسی نتائج مرتب ہوئے وہ کوئی انوکھے یا منفرد نہیں تھے۔ ہندوستان میں بھی گاندھی۔ پٹیل اور نہرو۔ پٹیل تضادات نے اسی قسم کی سنگین سیاسی کشیدگی پیدا کر دی تھی۔ بلاشبہ یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مس جناح نے ستمبر، اکتوبر 1951ء میں لیاقت علی خان کے خلاف کھلم کھلا جو سیاسی محاذ آرائی شروع کر دی تھی، وزیر اعظم کا قتل صرف اسی کا نتیجہ تھا لیکن یہ کہنا یقیناً صحیح ہوگا کہ ان دنوں پنجاب میں لیاقت علی خان کے خلاف جو نہایت معاندانہ سیاسی فضا پائی جاتی تھی اس کی آبیاری اس پس پردہ اور کھلم کھلا محاذ آرائی نے بھی کی تھی۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ لیاقت علی خان کا قتل غلام محمد اور مشتاق احمد گرمانی وغیرہ کی سازش کا نتیجہ تھا، پھر یہ ماننا پڑے گا کہ یہ مبینہ سازش اس لئے کامیاب ہوئی کہ ان دنوں پنجاب کی سیاسی فضا وزیر اعظم لیاقت علی خان کے لئے انتہائی ناسازگار تھی۔ ہندوستان میں بھی بعض مؤرخین یہ کہتے ہیں کہ جنوری 1949ء میں گاندھی کا قتل سردار پٹیل اور اس کے ساتھیوں کی سازش یا مجرمانہ غفلت کا نتیجہ تھا۔ ابوالکلام آزاد نے بھی

اشاروں کنایوں میں یہی لکھا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ اس الزام میں کوئی صداقت ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ گاندھی نے نہرو اور پٹیل کے درمیان کشمکش اقتدار میں نہرو کی حمایت کرنے کے لئے مسلم اقلیت کے نام پر مرن برت کا جو ڈھونگ رچایا تھا اس کی بنا پر پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ پٹیل کی اس مبینہ سازش یا مجرمانہ غفلت کا مقصد پورا ہو گیا۔ پاکستان میں جو لوگ مادرِ ملت اور قائدِ ملت کے معاندانہ اختلافات کو دانستہ یا نادانستہ طور پر نظر انداز کر کے تاریخ نویسی کرتے ہیں وہ کسی سے بھی انصاف نہیں کرتے۔

جزو دوم

پنجابی۔مہاجر تضاد اور لیاقت علی خان کا قتل

باب: 5

مس فاطمہ جناح اور پنجابی شاونزم کی حوصلہ افزائی

مس فاطمہ جناح نے 24ر جنوری 1949ء کو پنجاب میں نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی وزارت کی برطرفی کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف پنجابی شاونزم کی جو حوصلہ افزائی کی تھی اس سے ملک کی سیاست پر بہت برے اثرات مرتب ہوئے۔ قیام پاکستان کے موقعہ پر سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے بعض سیاسی عناصر میں پنجابیوں کے غلبہ کے بارے میں جو خدشات پائے جاتے تھے وہ پنجابی شاونزم کے کھلم کھلا مظاہرہ کی بنا پر نہ صرف شدید ہو گئے بلکہ ان کا دائرہ وسیع ہو گیا اور اس بنا پر پنجاب کے ناعاقبت اندیش حکمران طبقوں اور ملک کی دوسری پسماندہ قومیتوں کے درمیان ایک ایسی خلیج حائل ہو گئی جو بعد میں پاٹی نہ جا سکی۔ پنجاب زرعی لحاظ سے خوشحال صوبہ تھا اور یہاں تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ بھی موجود تھا جس کی تعداد میں مشرقی پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مہاجرین کی آمد کی وجہ سے خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔ اگر اس صوبہ کے تعلیم یافتہ عناصر قدرے سیاسی بصیرت اور وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے تو ملک میں قومیتوں کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی تضادات کی وجہ سے تباہ کن صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ پنجابی شاونسٹوں کا وطن عزیز کی پسماندہ قومیتوں کے بارے میں رویہ بالکل ایسا ہی تنگدلانہ تھا جیسا کہ قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کے ترقی یافتہ سرمایہ دار اور درمیانہ طبقوں کا پسماندہ مسلم اقلیت کے بارے میں ہوتا تھا اور یہ پنجابی شاونسٹ ''پنجابی حقوق'' کے تحفظ کے لئے دلائل بھی تقریباً ویسے ہی دیتے تھے جیسے کہ ہندوؤں کے سیاسی لیڈر اور اخبارات

''ہندوؤں کے مفادات'' کے تحفظ کے لئے دیا کرتے تھے۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ مس جناح اس تباہ کن پنجابی شاونزم کی نشوونما کی واحد ذمہ دار تھیں۔لیکن یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ مس جناح نے بھی محض لیاقت دشمنی کی بنا پر اس زہریلے سانپ کو دودھ پلایا تھا اور لیاقت علی خان نے اپنی دقیانوسی جاگیردارانہ سیاست کی وجہ سے اسے خوب پھلنے پھولنے کا موقعہ مہیا کیا تھا۔

پنجابی شاونزم کی نمود دراصل قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی شروع ہوگئی تھی جبکہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے پنجاب میں قائداعظم محمد علی جناح کے نامزد کردہ وزیراعلیٰ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کے خلاف صوبائی وزیرخزانہ ممتاز دولتانہ کے دھڑے کے ساتھ خفیہ گٹھ جوڑ شروع کر دیا تھا۔ یہ دھڑا زیادہ تر ملتان، سرگودھا اور راولپنڈی ڈویژنوں کے بڑے بڑے جاگیرداروں پر مشتمل تھا۔ جبکہ نواب ممدوٹ کے ٹولے کو بہت حد تک درمیانہ طبقہ کی تائیدوحمایت حاصل تھی۔لیاقت علی خان کی جانب سے اس جاگیردارانہ گٹھ جوڑ کی وجہ یہ تھی کہ اس کی اپنی جاگیراور حلقۂ انتخاب ہندوستان ہی میں رہ گیا تھا اور اس بنا پر وہ کراچی کے علاوہ پنجاب میں اپنا حلقۂ اثر پیدا کر کے اپنی سیاسی پوزیشن مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ دولتانہ کی طرف سے اس گٹھ جوڑ پر آمادہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ ملتان ڈویژن کے ایک ''اعلیٰ تعلیم یافتہ'' جاگیردار کی حیثیت سے ''نیم تعلیم یافتہ'' نواب ممدوٹ کی زیر قیادت درمیانہ طبقہ کے چند دانشوروں کی پرائیویٹ کابینہ کا وجود برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ پرائیویٹ کابینہ ایک آئی۔سی۔ایس افسر خواجہ عبدالرحیم اور دو تین دوسرے افسروں کے علاوہ نوائے وقت کے ایڈیٹر حمید نظامی پر مشتمل تھی۔نواب ممدوٹ ایک مہاجر جاگیردار تھا اور اس کے مغربی پنجاب کے بڑے جاگیرداروں کے ساتھ تعلقات اتنے گہرے نہیں تھے جتنے کہ لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کے تھے۔ وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ کے گرد و پیش درمیانہ طبقہ کے جو افراد رہتے تھے ان میں بہت سے وہ افراد ہوتے تھے جو 1937-38ء میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر علامہ اقبال کی چارپائی کے اردگرد بیٹھا کرتے تھے جس کا نقشہ فقیر وحیدالدین، عبدالمجید سالک اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی تحریروں میں کھینچا ہے۔ وزیرخزانہ ممتاز دولتانہ کے دھڑے میں جو لوگ شامل تھے ان میں اکثریت ان جاگیرداروں کی تھی جو 1942ء سے قبل متحدہ پنجاب کے یونینسٹ وزیراعلیٰ سرسکندر حیات خان کے ساتھ ہوتے تھے۔نوابزادہ لیاقت علی خان کا بڑا بھائی نواب سجاد علی خان اور سرسکندر حیات کا

بیٹا شوکت حیات خان بھی ان میں شامل تھے۔ ممتاز دولتانہ ''ولایت'' سے جنوری 1940ء میں بڑی انگریزی سیکھ کر آیا ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ''فر فر'' انگریزی بولتا تھا بلکہ ''فصیح و بلیغ'' انگریزی میں اپنے بیانات بھی خود ہی لکھتا تھا۔ وہ 6 ر اگست 1940ء کو اپنے والد خان بہادر میاں احمد یار خان دولتانہ کے انتقال کے بعد صوبائی اسمبلی کا رکن بنا تھا۔ 26 ر دسمبر 1942ء تک یعنی جب تک وزیر اعظم سر سکندر حیات خان زندہ رہا تھا ممتاز دولتانہ نے صوبائی مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں کبھی حصہ نہیں لیا تھا اور نہ ہی اس نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں مطالبہ پاکستان کی تائید و حمایت کی تھی۔ اس نے 1943ء کے اوائل میں ملک سر خضر حیات خان کی وزارت کی تشکیل کے کچھ عرصہ بعد نواب افتخار حسین خان ممدوٹ کی سرکردگی میں صوبائی اسمبلی میں ایک باغی مسلم لیگی گروپ میں شرکت کی تھی اور پھر مئی 1944ء میں جب خضر حیات خان کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا تو یہ لیگ اسمبلی پارٹی میں شامل ہو کر مطالبہ پاکستان کا زبردست حامی بن گیا تھا۔ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ نے صرف لاہور کے چیفس کالج میں واجبی تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ 8 ر مارچ 1942ء کو اپنے والد سر شاہنواز خان آف ممدوٹ کے انتقال کے بعد صوبہ لیگ کا صدر اور صوبائی اسمبلی کا ممبر بنا تھا۔ وہ نہ تو ''فر فر'' انگریزی بولتا تھا اور نہ ہی انگریزی زبان میں اپنے بیانات خود لکھتا تھا۔ اس کے لئے یہ کام خواجہ عبدالرحیم یا پیر احسن الدین یا کوئی اور افسر کیا کرتا تھا۔ یہ صورت حال دولتانہ کے لئے ہرگز قابل قبول نہ تھی۔ اس کا ذہن ایک کمتر قابلیت کے وزیر اعلیٰ کی قیادت کو گوارا نہیں کرتا تھا۔

نواب ممدوٹ کی چار رکنی کابینہ نے 17 ر اگست کو حلف لیا تھا۔ اس میں وزیر اعلیٰ ممدوٹ کے پاس امن عامہ، جنرل ایڈمنسٹریشن اور جیل خانہ جات کے محکمے تھے۔ ممتاز محمد دولتانہ خزانہ، صنعت، سول سپلائز اور ٹرانسپورٹ کے محکموں کا انچارج تھا۔ شوکت حیات خان کو مال، بجلی، آبپاشی، حیوانات اور جنگلات کے محکمے دیئے گئے تھے اور شیخ کرامت علی کے پورٹ فولیو میں تعلیم، لوکل باڈیز، تعمیرات اور صحت کے محکمے شامل تھے۔ شیخ کرامت علی شیخوپورہ کے درمیانہ طبقہ کا وکیل تھا اور باقی تینوں وزراء خاندانی جاگیردار تھے۔ تقریباً ایک ماہ بعد یعنی 19 ر ستمبر کو افتخار الدین صوبائی کابینہ میں پانچویں رکن کی حیثیت سے شامل ہوا تھا اور اسے نئی وزارت بحالیات کا کام دیا گیا تھا۔ افتخار الدین بھی ضلع لاہور کا بڑا زمیندار تھا لیکن یہ 1945ء سے قبل طویل عرصہ

تک انڈین نیشنل کانگرس کے ''بائیں بازو'' کے عناصر کے زیر اثر رہا تھا اس لئے اس میں کچھ وسیع المشربی کے رجحانات پائے جاتے تھے اور اس بنا پر دقیانوسی جاگیر دار اسے ریڈیکل بلکہ کمیونسٹ قرار دیتے تھے۔ تاہم صوبہ میں افتخار الدین کی سیاسی قوت کا سرچشمہ اس کی اپنی جاگیرداریت کے علاوہ اس کا اپنا اخبار ''پاکستان ٹائمز'' بھی تھا۔ یہ اپنی ترقی پسندی اور روشن خیالی کے باعث نواب ممدوٹ کی کابینہ میں زیادہ دیر نہ رہ سکا اور تقریباً دو ماہ بعد یعنی 15 رنومبر کو صوبائی حکومت کی بحالیاتی پالیسی کے بارے میں اختلافات کی بنا پر مستعفی ہوگیا۔ یہ پاکستان میں پہلا اور آخری وزیر تھا جس نے پالیسی اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دے کر ملک میں ایک صحت مند جمہوری روایت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ افتخار الدین کے استعفیٰ سے ممدوٹ کابینہ کے عوامی وقار کو خاصا دھچکا لگا تو ممتاز دولتانہ نے یہ موقعہ غنیمت سمجھا۔ وہ قبل ازیں نجی محفلوں میں نواب ممدوٹ کی نااہلیت اور اس کی پرائیوٹ کابینہ کے بارے میں غم وغصہ کا اظہار کرتا رہتا تھا لیکن اب اس نے بھی وزیراعلیٰ کے روبرو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور اس طرح قیام پاکستان کے صرف دو ماہ بعد 19 رنومبر کو پنجاب میں جاگیردارانہ دھڑے بندی منظر عام پر آ گئی۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کی خبر یہ تھی کہ ''سابق وزیر مہاجرین میاں افتخار الدین کے مستعفی ہوجانے کے بعد وزیر خزانہ میاں ممتاز دولتانہ نے بھی وزیراعظم پنجاب خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ سے درخواست کی ہے کہ انہیں وزارت کی موجودہ ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ مسٹر دولتانہ کا مطالبہ یہ ہے کہ صوبہ کی انتظامی مشینری میں کوئی یورپین افسر باقی نہ رہے حتیٰ کہ صوبائی گورنر کو بھی جواب دے دیا جائے اور کسی پاکستانی گورنر کا تقرر عمل میں لایا جائے۔ معلوم ہوا ہے کہ ایسی ایک تجویز لیگ کونسل کے اجلاس میں بھی پیش کی گئی تھی لیکن صدر پنجاب مسلم لیگ میاں افتخار الدین کی رائے یہ تھی کہ مرکزی حکومت پاکستان ہی اس نوعیت کا کوئی فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔'' لیکن اسی دن اس اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ '' کافی رات گئے اے۔ پی۔ پی کو نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اب میاں ممتاز دولتانہ اپنے استعفیٰ پر زور نہ دینے پر رضا مند ہو گئے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ میاں صاحب نے اپنے استعفیٰ کی وجوہات کے متعلق اپنے رفقائے کار اور دیگر احباب سے طویل بحث وتمحیص کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔''[1]

ممتاز دولتانہ کو دراصل یورپین افسروں کی موجودگی پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس نے

اپنے استعفیٰ کی یہ ''ترقی پسندانہ'' وجہ محض عوام الناس میں تاثر پیدا کرنے کے لئے پیش کی تھی کہ وہ بھی افتخار الدین کی طرح ''اعلیٰ اصول'' کی بنا پر وزارت کے عہدۂ جلیلہ سے علیحدہ ہوا ہے لیکن اسی دن اس نے اپنے رفقائے کار اور ''دیگر احباب'' سے طویل بحث وتمحیص کے بعد یہ محسوس کر لیا کہ اس کے لئے نواب ممدوٹ سے کھلم کھلا محاذ آرائی کا یہ موقع مناسب نہیں۔ قائداعظم جناح کی صحت اچھی تھی اور نہ صرف نواب ممدوٹ اُن کا نامزد کردہ تھا بلکہ صوبائی گورنر سمیت دوسرے انگریز افسروں کی تقرری بھی انہی کے حکم سے ہوئی تھی۔ تاہم یکم دسمبر کو صوبائی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا جس کے بعد پاکستان کے وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان نے پہلی مرتبہ اپنے آپ کو پنجابی جاگیرداروں کی دھڑے بندی میں ملوث کیا۔ اس امر کا انکشاف اس خبر سے ہوا کہ ''وزرائے مغربی پنجاب نے وزیراعظم پاکستان مسٹر لیاقت علی خان سے طویل ملاقات کی۔ باخبر حلقوں میں یہ یقین ظاہر کیا جا رہا ہے کہ نئے تین وزراء بیگم شاہنواز، ملک فیروز خان نون، سردار جمال خان لغاری اور چودھری محمد حسن میں سے لئے جائیں گے۔''[2] ان چار افراد میں سے اول الذکر تینوں پنجاب کے بہت بڑے جاگیردار تھے اور اس حیثیت سے قبل یونینسٹ پارٹی کے بڑے ستونوں میں سے تھے۔ بظاہر وزیراعظم لیاقت علی خان کی کوشش یہ تھی کہ پنجاب کے سابق یونینسٹ جاگیرداروں کو عہدے ومراعات دے کر ان سے کوئی سیاسی گٹھ جوڑ کیا جائے۔ لیکن اس میں مشکل یہ تھی کہ ان جاگیرداروں کو بھی ممتاز دولتانہ کی طرح نواب ممدوٹ اور اس کی پرائیویٹ کابینہ کی بالادستی قبول نہیں تھی۔ چنانچہ 4 دسمبر کو ''ملک فیروز خان نون نے ان خبروں کی تردید کر دی کہ کابینہ مغربی پنجاب میں اس کے شامل ہونے کی توقع ہے۔ انہوں نے بتایا کہ تمام خبریں بے بنیاد ہیں۔ قائداعظم نے مشرق وسطیٰ میں مجھے جو کام سونپ رکھا ہے وہ ابھی پورا نہیں ہوا اور میں بہت جلد واپس جا رہا ہوں۔''[3] پنجاب کے جاگیرداروں نے سیاست میں جھوٹ اور فریب کی تعلیم وتربیت اپنے انگریز سامراجی آقاؤں سے حاصل کی ہوئی تھی۔ فیروز خان نون کا یہ بیان اسی تعلیم وتربیت کا مظہر تھا۔ اس نے اپنے تردیدی بیان میں صوبائی کابینہ میں شامل نہ ہونے کی جو وجہ بیان کی تھی وہ سراسر جھوٹ پر مبنی تھی۔ وہ مشرق وسطیٰ میں اپنا کام ختم کر کے قائداعظم کو اپنی رپورٹ پیش کر چکا تھا لہٰذا اس کے دوبارہ مشرق وسطیٰ میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس بیان کی بڑی وجہ یہ تھی کہ یہ شخص برطانوی راج میں ایک پشتینی وفادار جاگیردار ہونے کی بنا پر بڑے

بڑے عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ قیام پاکستان کے بعد اسے کم از کم مغربی پنجاب کی وزارت اعلیٰ کا عہدہ تو ملنا چاہیے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اسے مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی اکثریت کی تائیدوحمایت حاصل ہے مگر قائداعظم جناح نے اسے مرکز یا صوبہ میں کوئی بھی عہدہ دینا مناسب نہ سمجھا۔ لہٰذا یہ بابائے قوم کی زندگی میں بے نیل ومرام ہی رہا۔ جب قائداعظم نے اسے مشرق وسطیٰ بھیجا تھا تو اسے امید لگ گئی تھی کہ شاید اسے پاکستان کی وزارت خارجہ کا عہدہ پیش کیا جائے گا مگر جب 25 /دسمبر کو سر محمد ظفر اللہ خان نے اس عہدے کا حلف اٹھالیا تو اس کی یہ امید بھی خاک میں مل گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نواب ممدوٹ لیاقت علی خان کی تجویز کے مطابق بیگم شاہ نواز، جمال خان لغاری اور ملک فیروز خان نون کو صوبائی کابینہ میں شامل کر کے اپنی پوزیشن کو مزید کمزور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اس کی پرائیویٹ کابینہ کے ارکان نے اسے سمجھایا تھا کہ اس طرح اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی نہ مارنا۔

پنجاب میں یہ سیاسی جتھہ بندیاں اس زمانے میں ہو رہی تھیں جبکہ اکالی دل اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے ابلیسی منصوبے کے تحت مشرقی پنجاب، جموں اور دہلی میں تقریباً 5 لاکھ مسلمانوں کا منظم طریقے سے قتل عام کیا گیا تھا اور اس کے جواب میں مغربی پنجاب میں ہزاروں بے گناہ ہندوؤں اور سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اسی زمانے میں مشرقی اور مغربی پنجاب میں ہزاروں عورتوں کو اغوا کیا گیا تھا، سینکڑوں عورتوں کی برسر عام آبروریزی کی گئی تھی، لاکھوں خانماں برباد مسلمان مہاجرین پاکستان میں پناہ لے رہے تھے اور لاکھوں ہی ہندو سکھ شرنارتھی ہندوستان پہنچ گئے تھے۔ جبری تبادلۂ آبادی کی اتنی بڑی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی تھی۔ لیکن یہ ساری ہولناکیاں مغربی پنجاب کے جاگیرداروں میں کوئی جذبۂ انسان دوستی بیدار کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ جاگیردارانہ سیاست کی سنگدلی کا اس سے بدتر مظاہرہ اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ اس جاگیردارانہ دھڑے بندی کی سیاست کا مزید افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ ان دنوں ہندوستان کے توسیع پسندوں نے برطانوی سامراج کی رہنمائی میں فوجی غنڈہ گردی کے ذریعے ریاست جموں وکشمیر کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا لیکن پنجاب کے جاگیردار سیاسی لیڈروں اور ان کے حواریوں کے پاس قومی حمیت وغیرت کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہ محلاتی سازشوں اور جتھہ بندیوں میں مصروف ہونے کے علاوہ متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھے۔ وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ کے

حلیف وزیر مال شوکت حیات خان پر الزام یہ تھا کہ اس نے متروکہ پنجاب نیشنل بنک کی املاک کے علاوہ کئی ایک دوسری متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرلیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اس نے ضلع منٹگمری میں ایک سکھ زمیندار کی متروکہ اقبال نگر اسٹیٹ غلط طریقے سے اپنے نام الاٹ کرالی ہے جبکہ اس کے منظور نظر اعلیٰ حکام خواجہ عبدالرحیم اور راجہ حسن اختر پر آزاد کشمیر، راولپنڈی اور منٹگمری میں سنگین بدعنوانیوں کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔

کشمیری لیڈر سردار ابراہیم لکھتا ہے کہ جب ستمبر 1947ء میں ڈوگرہ فوجیں پونچھ کے علاقے میں مسلمانوں کی نسل کشی کر رہی تھیں تو ''میرے لئے لاہور کا شور وشغب اور گہما گہمی تکلیف دہ حد تک ناقابل برداشت ہوگئی تھی اور مجھے یہاں ہر شخص خودغرض نظر آتا تھا...... میں سوچتا تھا کہ یہ لوگ اس امر کا احساس کیوں نہیں کرتے کہ جموں وکشمیر میں ان کے مسلمان بھائیوں کی پوری قوم کو دنیا سے نیست ونابود کرنے کی فیصلہ کن جدوجہد جاری ہے اور ڈوگرہ فوج ان کے ہم مذہب ونسل کشمیری بھائیوں کو چن چن کر گولیوں کا نشانہ بنا رہی ہے۔ مگر یہ لوگ مال ودولت پیدا کرنے اور غیر مسلم تارکین وطن کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔''[4]

یکم اکتوبر 1947ء کو لاہور کے سات ایڈیٹروں کا ایک مشترکہ بیان اخبارات میں شائع ہوا جس میں الزام لگایا گیا تھا کہ مغربی پنجاب میں بعض بااثر دولت مند لوگ متروکہ زمینوں، فیکٹریوں اور دوکانوں پر قبضہ کرکے مشرقی پنجاب کے مہاجرین کو ان کے حقوق سے محروم کر رہے ہیں۔ ''ہم پاکستان کے عوام سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ مروجہ رشوت ستانی، بددیانتی اور اقربانوازی کے سدباب کے لئے ہم سے تعاون کریں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان برائیوں کا انسداد صرف قومی سطح پر مخلصانہ کوششوں سے ہی ہوسکتا ہے۔''[5] اس بیان پر نوائے وقت کے ایڈیٹر حمید نظامی اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض احمد فیضؔ کے بھی دستخط تھے اور پھر 27/نومبر کو نوائے وقت میں چک 243 تحصیل ٹوبہ ٹیک سنگھ ضلع لائل پور کے ایک شخص محمد غنی کے مکتوب کو بطور اداریہ شائع کیا گیا جس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ ''اس ضلع میں بعض مسلم لیگی حضرات متروکہ جائیدادوں پر قبضہ کرکے زراندوزی میں مصروف ہوگئے ہیں...... چند ایک ایم۔ ایل۔ اے (ممبر لیجسلیٹو اسمبلی) اسی قسم کی قبیح حرکات کے مرتکب ہوچکے ہیں اور اسی طرح میونسپل کمشنر صاحبان بھی۔''[6]

8/جنوری 1948ء کو سیالکوٹ سے صوبائی اسمبلی کے رکن نے اسمبلی میں مہاجرین کی

آبادکاری کے مسئلہ پر بحث کے دوران جاگیرداروں اور افسروں کی بے ضابطگیوں اور بدعنوانیوں کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ لاہور میں بھی برسراقتدار لوگ مہاجرین کا حق غصب کئے بیٹھے ہیں۔ یہاں کسی پریس پر نون اینڈ سنز کا بورڈ لگا ہوتا ہے اور کپور پرنٹنگ پریس پر کسی اور بزرگ کا۔ اس پر وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ نے "شرم کے ساتھ اعتراف کیا کہ بعض افسروں نے بڑی اخلاقی پستی دکھائی اور بڑی بددیانتی سے کام لیا ہے۔"[7] 12 رجنوری کو چودھری ناصرالدین نے اسمبلی میں یونینسٹ افسروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ یہ افسر تخریبی کاروائیوں میں مصروف تھے اور جب مہاجر مر رہے تھے یہ افسر مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ دیکھ لیا پاکستان؟ یہ پاکستان ہے یا قبرستان؟"[8] 18 رجنوری کو نوائے وقت نے اپنے ایک اداریے میں یونینسٹ افسروں کو ترقی دے کر انہیں کلیدی اسامیوں پر مقرر کرنے کے خلاف احتجاج کیا۔ اداریے میں کہا گیا تھا کہ "حال ہی میں ایک ایسے پی۔سی۔ایس افسر کو ایک نہایت اہم ضلع میں ایک اہم عہدہ پر مقرر کیا گیا ہے جس کے متعلق ہم ہتک عزت کے دعویٰ کو دعوت دیتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسر اپنی قابلیت، دیانت اور اخلاق کے اعتبار سے کسی معمولی اسامی پر فائز کئے جانے کا بھی اہل نہیں۔" اسی دن چودھری ناصرالدین نے اسمبلی میں شیخوپورہ کے یونینسٹ ڈپٹی کمشنر پر الزام عائد کیا کہ اس نے متروکہ جائیدادوں کی لوٹ مار میں حصہ لیا ہے۔ اس پر فیروز خان نون نے جب یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھایا کہ کسی ممبر کو اجازت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کسی سرکاری افسر کا نام لے کر اس پر حملہ کرے تو افتخارالدین نے کہا کہ وزراء نے بعض برے اور رشوت خور افسروں کو اس لئے نہیں نکالا کہ کچھ ارکان اسمبلی ان کی پشت پر ہیں اور وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ نے تسلیم کیا کہ "یہ افسر واقعی بڑا بدنام ہے۔ اتنا بدنام کہ میں نے اسے کسی ضلع کا چارج دینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اس افسر سے پہلے یہ کہا کہ وہ سرکاری دورہ پر سب اضلاع میں جائے اور مجھے بتائے کہ کونسا ضلع اسے قبول کرتا ہے۔ پھر میں نے اس کو چھٹی پر بھیج دیا۔ اب وہ واپس آیا تو مجبوراً اسے مرکز میں لگایا گیا ہے۔ گھر بٹھا کر تو ہم اسے تنخواہ دینے سے رہے۔ اس افسر کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہے۔"[9] تاہم اسمبلی سے باہر اور اس کے اندر ان احتجاجات وشکایات کا کوئی اثر نہ ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ جاگیردارانہ اور بے قید سرمایہ دارانہ معیشت میں بے غرضی، ایثار اور انصاف کی عملاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے عناصر کی جانب سے یونینسٹ افسروں کی بدعنوانیوں اور ترقیوں کے خلاف احتجاجات کی بڑی وجہ اس حقیقت میں مضمر تھی کہ پنجاب میں روایتی طور پر بیوروکریسی کا بڑا اثر ورسوخ تھا۔ جن سیاسی عناصر کی پشت پر بیوروکریسی ہوتی تھی ان کی فتح کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا تھا۔ چونکہ صوبے کے بیشتر افسروں کی تقرریاں قیام پاکستان کے قبل یونینسٹ جاگیرداروں کے عہد اقتدار میں ہوئی تھیں اور چونکہ قیام پاکستان کے بعد بھی سیاسی لحاظ سے بظاہر انہی جاگیرداروں کی بالادستی تھی۔ اس لئے ان افسروں کی وفاداریاں جاگیرداروں کے ساتھ ہی وابستہ تھیں حالانکہ یہ خود درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ افتخارالدین کے بقول ان بدعنوان افسروں کے خلاف کوئی کاروائی اس لئے نہیں ہوتی تھی کہ بعض ارکان اسمبلی ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ نوائے وقت نے چند دن کے بعد افتخارالدین کے اس الزام کی تائید کی۔ اس نے اپنے اداریے میں لکھا کہ ''ہمیں علم ہے وزیروں سے کئی ممبروں نے رشوت اور لوٹ مار کے الزام میں ماخوذ افراد کی سفارش کی۔ وزیراعلیٰ (ممدوٹ) نے یونینسٹ افسروں کی برطرفی کے احکام صادر کئے۔ بعض ایم، ایل، اے حضرات ان کی بچت کے لئے وزیروں کے پاس پہنچ گئے...... اس صورت میں وزارت کو چاہیے کہ وہ گورنر کو مشورہ دے کہ موجودہ اسمبلی کو توڑ دیا جائے اور نئے انتخابات کا حکم صادر کیا جائے۔ عوام مجوزہ تبدیلیوں سے کہیں زیادہ دوررس تبدیلیاں چاہتے ہیں اور نئے انتخابات میں وہ صرف انہی لوگوں کو ووٹ دیں گے جو عوام کے مجموعی مفاد کو بڑے زمینداروں کے مٹھی بھر گروہ کے مفاد پر ترجیح دینے کی جرأت رکھتے ہوں۔''[10]

اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت تک اگرچہ وزیراعظم لیاقت علی خان کا پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ مستحکم نہیں ہوا تھا اور جاگیرداروں کے طبقاتی دشمن قائداعظم جناح کی صحت بھی ابھی زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی لیکن درمیانہ طبقہ کا سیاسی گھوڑا نواب ممدوٹ اس کے باوجود بہت کمزور تھا۔ وہ پنجاب میں اس ترقی پذیر طبقے اور اُبھرتے ہوئے سرمایہ داروں کے مفادات وحقوق کو فروغ نہیں دے سکتا تھا۔ درمیانہ طبقہ کو امید تھی کہ اگر ان دنوں نئے انتخابات ہوجائیں تو صوبائی اسمبلی میں اس کو قطعی طور پر بالادستی حاصل ہوجائے گی۔ وہ اپنے اس مقصد کی تکمیل صوبہ میں جاگیرداری نظام کو ختم کئے بغیر ہی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ جاگیردار طبقے کو آئینی وجمہوری طریقوں سے سیاسی اسٹیج سے باہر نکالا جاسکتا

ہے۔ چونکہ اس کی امید و خوش فہمی کی بنیاد خود فریبی اور کم فہمی پر تھی اس لئے اس کی سیاسی شکست ناگزیر تھی اور بالآخر ایسا ہی ہوا۔

جنوری اور فروری 1948ء میں جاگیرداروں اور شہری درمیانہ طبقہ کے درمیان کشمکش اقتدار پس پردہ ممدوٹ، دولتانہ اور نون کی سہ طرفہ رسہ کشی کی صورت میں جاری رہی۔ جاگیرداروں کی کوشش یہ تھی کہ اگر قائداعظم کی زندگی میں ممدوٹ کو برطرف کرانا ممکن نہیں تو کم از کم اتنا تو ہو کہ صوبائی کابینہ میں اس طرح توسیع کی جائے کہ سارے فیصلے ان کی مرضی کے مطابق ہوں۔ وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان کی بھی یہی خواہش تھی جس کا اظہار وہ 3/دسمبر 1947ء کو وزرائے مغربی پنجاب سے طویل ملاقات کے دوران کر چکا تھا مگر نواب ممدوٹ اپنے ''دانشور مشیروں'' کے مشورے کے مطابق اپنی کابینہ میں اس قسم کی مجوزہ توسیع پر رضامند نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ 6/جنوری کو نوائے وقت کے سیاسی نامہ نگار کو موثق ذرائع سے معلوم ہوا کہ ''کابینہ پنجاب میں توسیع کا سردست کوئی امکان نہیں۔ اس سلسلے میں بعض حلقوں میں جو قیاس آرائیاں کی گئیں ایک ذمہ دار ترجمان حکومت نے نمائندہ نوائے وقت سے انٹرویو کے دوران میں انہیں بے بنیاد قرار دیا ہے۔''[11] یہ صورت حال دو ماہ تک جاری رہی تا آنکہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن سے دو تین دن قبل یعنی 12/مارچ 1948ء کو ایک ایسا حکم صادر کر دیا جس سے صوبہ کے درمیانہ طبقہ اور نواب ممدوٹ کی سیاسی پوزیشن وقتی طور پر خاصی مضبوط ہو گئی۔ حکم یہ تھا کہ مشرقی پنجاب کے مسلمان ارکان اسمبلی آئندہ مغربی پنجاب اسمبلی کے رکن ہوں گے اور وہ اس حیثیت سے 15/مارچ کو شروع ہونے والے بجٹ سیشن میں شریک ہو سکیں گے۔ چونکہ مشرقی پنجاب کے مسلمان ارکان اسمبلی کی بھاری اکثریت درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتی تھی اس لئے گورنر جنرل کے اس حکم سے قدرتی طور پر پنجاب کے درمیانہ طبقہ اور نواب ممدوٹ کو بہت سیاسی تقویت ملی۔ چنانچہ اسی شام لاہور کے سیاسی حلقوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ''مشرقی پنجاب کے مسلمان ارکان اسمبلی کے مغربی پنجاب اسمبلی کے ارکان نامزد ہونے کے بعد مغربی پنجاب کی کابینہ میں توسیع کر دی جائے گی'' اور اسی دن یہ خبر بھی شائع ہو گئی کہ ''کالونی ایسوسی ایشن سرگودھا کا یہ اجلاس نواب سر اللہ بخش ٹوانہ (مشہور یونینسٹ جاگیردار) کے پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ کا خیر مقدم کرتا ہے کیونکہ اس سے سرگودھا تحصیل کے ووٹروں کو اپنا صحیح اور نیا

نمائندہ منتخب کرنے کا موقع مل گیا ہے۔"[12]

15 / مارچ 1948ء کو صوبائی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا۔ مشرقی پنجاب کے 21 مسلمان ارکان مغربی پنجاب اسمبلی کے رکن بنا دیئے گئے۔ ان میں 17 نے اسی دن حلف اٹھالیا جبکہ تین جغادری یونینسٹ جاگیردار ملک خضر حیات ٹوانہ، ملک فیروز خان نون، اور سر محمد نواز خان غیر حاضر تھے۔ نوائے وقت نے اپنی رپورٹ میں ان تینوں کی غیر حاضری کا خاص طور پر ذکر کیا (کیونکہ) "بعض حلقوں کی طرف سے مشرقی پنجاب اسمبلی کے مسلمان ارکان کو مغربی پنجاب اسمبلی کا رکن بنا دیئے جانے کی بڑی سخت مخالفت کی گئی تھی۔"[13] 18 / مارچ کو نوائے وقت نے صوبائی وزارت میں توسیع کے مسئلے پر ایک اداریہ لکھا جس میں اشارۃً یہ الزام عائد کیا گیا کہ نوابزادہ لیاقت علی خان کا صوبائی حلیف ممتاز دولتانہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ انبالہ ڈویژن کے ارکان اسمبلی میں سے دو ایک کو صوبائی کابینہ میں شامل کر کے اپنی پارٹی پوزیشن کو مضبوط کیا جائے۔ انبالہ ڈویژن میں ضلع کرنال بھی تھا جہاں لیاقت علی خان کی خاندانی جاگیر تھی اور اس کے خاندان کے تقریباً سارے اعزہ واقربا، جن میں اس کا بڑا بھائی اور پہلی بیوی سے بڑا بیٹا بھی شامل تھا، لاہور میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ "کسی شخص کو محض اس لئے وزیر بنانا غلط ہو گا کہ وہ صاحب مشرقی پنجاب یا انبالہ ڈویژن سے تعلق رکھتے ہیں...... ہمیں افسوس کے ساتھ یہ لکھنا پڑتا ہے کہ انبالہ ڈویژن سے آئے ہوئے اکثر مہاجرین باقی مسلمانوں کے متعلق اب بھی "پنجابی" کا لفظ اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا وہ خود پنجابی نہیں ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ جغرافیائی تقسیم کی بنا پر وزارت میں توسیع یا اضافہ سے تفریق اور بڑھے گی اور ممکن ہے مستقل بن جائے۔ اس میں بالآخر مشرقی پنجاب اور انبالہ ڈویژن کے مہاجر مسلمانوں کا ہی نقصان ہو گا۔"[14] مطلب یہ تھا کہ اگر نوابزادہ لیاقت علی خان نے اپنے حلیف ممتاز دولتانہ کی وساطت سے انبالہ ڈویژن کے دو ایک "اہل زبان" ارکان اسمبلی کو صوبائی کابینہ میں شامل کرنے پر اصرار کیا تو پھر پنجابی شاونزم کے جن کو بوتل سے نکال لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں دوسری تنبیہ وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ نے 20 / مارچ کو صوبائی اسمبلی میں کی۔ اس نے بجٹ پر نکتہ چینی کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "ہم مرکز سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سارا بوجھ پنجاب پر نہ ڈالے۔ ہم پر صرف اتنا بوجھ ڈالے جتنا ہم اٹھا سکیں۔ دوسرے صوبوں کو بھی اس سلسلے میں اپنا فرض ادا کرنے پر آمادہ کیجئے۔"[15]

نواب ممدوٹ نے اپنی اس تقریر میں یہ بھی اعلان کیا کہ اگر پنجاب کے بحالیاتی کام میں مرکز کی ناجائز مداخلت جاری رہی تو وہ مشترکہ مہاجرین کونسل سے علیحدہ ہو جائے گا۔ یہ کونسل مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان کی زیر صدارت قائم تھی اور اس کا مقصد پورے پاکستان میں مہاجرین کی آبادکاری کے کام کی نگرانی کرنا تھا۔ راجہ غضنفر علی خان ضلع جہلم کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ 1937ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوا تھا لیکن اپنی اس کامیابی کے فوراً ہی بعد وہ مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر سر سکندر حیات خان کی یونینسٹ وزارت میں پارلیمانی سیکرٹری بن گیا تھا۔ جب 46-1945ء کے عام انتخابات نزدیک آئے تو وہ بعض دوسرے یونینسٹوں کی طرح قلابازی کھا کر پھر مسلم لیگ میں شامل ہو گیا اور لیگ کے ٹکٹ پر مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ 1946ء میں جب مرکز میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل نو ہوئی تو قائداعظم نے اس عبوری حکومت کے لئے جن پانچ افراد کو نامزد کیا تھا ان میں یہ بھی شامل تھا۔ پھر 17/اگست 1947ء کو قائداعظم نے پاکستان کی جو پہلی وزارت نامزد کی اس میں بھی اسے خوراک، زراعت اور صحت کے وزیر کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا اور پھر جب ستمبر، نومبر میں نوزائیدہ پاکستان میں مشرقی پنجاب کے لاکھوں خانماں برباد مہاجرین کا سیلاب آ گیا تو قائداعظم نے پہلے تو حسین شہید سہروردی سے یہ کہا کہ وہ ان مہاجرین کی ازسرنو آبادکاری کا کام سنبھالے مگر جب اس نے بوجوہ معذرت کر دی تو اس نئی وزارت بحالیات کا قلمدان بھی راجہ غضنفر علی خان کے سپرد کر دیا گیا چونکہ راجہ غضنفر علی خان کے یونینسٹ جاگیرداروں سے دیرینہ تعلقات تھے اس لئے وہ بھی مرکزی وزیر بحالیات کی حیثیت سے نوابزادہ لیاقت علی خان کی خواہش کے مطابق ممدوٹ حکومت کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ نواب ممدوٹ نے اس کی اسی ''ناجائز مداخلت'' کی بنا پر مشترکہ مہاجرین کونسل سے مستعفی ہونے کی اعلانیہ دھمکی دی تھی اور اشارةً متنبہ کر دیا تھا کہ اگر وہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تو پھر پنجابی اور غیر پنجابی کا سوال اٹھایا جائے گا۔ پنجاب کا کوتاہ اندیش درمیانہ و سرمایہ دار طبقہ اس خطرناک نعرے پر لبیک کہنے پر پہلے ہی آمادہ ہو چکا تھا۔

نواب ممدوٹ کی یہ دھمکی بظاہر وقتی طور پر کارگر ثابت ہوئی۔ صوبائی وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ نے 30/مارچ 1948ء کو سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس خبر کی پرزور تردید کی کہ وہ صوبائی کابینہ سے مستعفی ہو رہا ہے۔ اس نے کہا کہ ''یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے......اور یہ خبر بھی حقیقت سے

تہی ہے کہ میں نے سیاست سے دستبردار ہو کر کسی دوسرے ملک میں سفارتی خدمات سرانجام دینے کی خواہش ظاہر کی ہے...... اگر میں آئندہ کبھی کابینہ پنجاب سے مستعفی ہوا تو میں مسلم لیگ آرگنائزیشن کا معمولی کارکن بن کر قومی خدمت سرانجام دینے کو ترجیح دوں گا۔ میرے خلاف یہ جھوٹ شائع کیا گیا ہے کہ میں افتخار الدین جیسے بڑے لیڈر کے مقابلے میں مغربی پنجاب مسلم لیگ کی صدارت کا انتخاب لڑنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔"[16] دولتانہ کا یہ بیان اس حد تک صحیح تھا کہ اس نے 30/مارچ تک استعفیٰ نہیں دیا تھا لیکن اس نے آئندہ مناسب وقت تک مستعفی ہونے کو خارج از مکان بھی قرار نہیں دیا تھا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ تھا کہ فی الحال اقتدار کی رسہ کشی بند کمروں میں ہی جاری رہے گی۔ کیونکہ قائداعظم جناح اس وقت تک صاحب فراش نہیں ہوئے تھے اور مشرقی پنجاب کے ارکان کے مغربی اسمبلی کے رکن بننے سے نواب ممدوٹ کی پوزیشن پہلے سے زیادہ مستحکم ہوگئی تھی۔ غالباً اسی وجہ سے نواب ممدوٹ اور مرکزی حکومت کے درمیان پنجاب میں مہاجرین کی آبادکاری کے بارے میں جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے وہ بھی رفع ہو گئے۔ 15/اپریل کو لاہور میں وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی زیر صدارت مہاجرین کونسل کا اجلاس ہوا تو اس کے بعد یہ خبر شائع ہوئی کہ "صوبائی وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ اور مرکزی وزیر بحالیات راجہ غضنفر علی خان کے درمیان مہاجرین کونسل کی کارکردگی کے بارے میں پیدا شدہ اختلافات دور ہو گئے ہیں اور نواب ممدوٹ نے کونسل سے مستعفی ہونے کی دھمکی واپس لے لی ہے"[17] اور اگلے دن راجہ غضنفر علی خان کا یہ بیان شائع ہوا کہ "مجھے امید ہے کہ صوبائی امور میں مداخلت کرنے کے متعلق خان ممدوٹ کے دل میں جو غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی وہ دور ہوگئی ہے۔" تاہم نواب ممدوٹ کے ترجمان اخبار کی غلط فہمی دور نہ ہوئی اور اس کا اصرار تھا کہ اس کے ممدوح کے خلاف محلاتی سازشوں کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اخبار کا اداریہ یہ تھا کہ "اندرخانے سازشیں کرنے والے لیڈروں اور وزیروں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان عوام ان کی ہر سرگرمی اور ہر چال کو بڑے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ لیڈراور وزیر صاحبان کوئی نیا اور مخصوص پروگرام پیش کر کے عوام کو اپنی طرف چلائیں تو کوئی بات بھی ہوئی۔ عوام جس کے پروگرام کو اچھا سمجھیں گے اس کی آواز پر لبیک کہیں گے۔ لیکن جب کسی کے پاس نیا پروگرام ہی نہیں بلکہ بعض کے پاس تو سرے سے کوئی پروگرام ہی نہیں تو محض ذاتی سربلندی کی خاطر کبھی مہاجرین کے جذبات کو برانگیختہ کرنا اور کبھی عوام

کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنا قوم کے نام پر قوم سے ایسی دھوکہ بازی ہے جسے کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا۔"[18]

وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ کے خلاف محلاتی سازشوں کے بارے میں نوائے وقت کا یہ انتباہ بے بنیاد نہیں تھا۔ اس کی تائید اگلے دن پاکستان ٹائمز کی اس خبر سے ہوگئی کہ "وزیراعظم لیاقت علی خان کی مداخلت کی وجہ سے صوبائی کابینہ کے اس بحران کا سدباب ہوگیا ہے جو وزیرخزانہ ممتاز دولتانہ اور وزیر مال شوکت حیات خان کے استعفوں کی دھمکی کی وجہ سے پیدا ہورہا تھا۔ اب یہ دونوں وزراء بدستور ممدوٹ کابینہ میں کام کرتے رہیں گے۔ ایک بااختیار ذریعے نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو بتایا کہ ان دونوں نے کابینہ سے علیحدہ ہونے کے بارے میں جس خواہش کا اظہار کیا تھا اس کی وجوہ ذاتی نوعیت کی تھیں۔"[19] دراصل پاکستان ٹائمز کی یہ اطلاع صحیح نہیں تھی کہ لیاقت علی خان کی مداخلت کے باعث صوبائی کابینہ کے بحران کا سدباب ہوگیا ہے۔ صحیح بات یہ تھی کہ وزیراعظم پاکستان کے لاہور میں کئی دن تک قیام کے دوران صوبائی کابینہ کا بحران شدید سے شدید تر ہوگیا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح نے پنجاب کی کابینہ کے چار ارکان میں سے تین یعنی نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات خان کو کراچی طلب کیا۔ انہوں نے کراچی میں اپنے چھ روزہ قیام کے دوران قائداعظم جناح اور وزیراعظم سے متعدد مرتبہ ملاقاتیں کیں اور پھر 30/اپریل کو لاہور واپس پہنچ کر یہ مشترکہ بیان جاری کیا کہ "پاکستان کے عوام اس وقت ایک زبردست آزمائش سے گزر رہے ہیں جس کا مقابلہ مکمل یکجہتی، بلند حوصلگی اور عزم صمیم سے کرنا اشد ضروری ہے۔ ہم، کابینہ مغربی پنجاب کے ارکان، نے ایک ٹیم کی حیثیت میں اس آزمائش کا مقابلہ کرنے کا عزم راسخ کیا ہے۔ کراچی میں بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح نے بھی ہمارے ساتھ مذاکرات کے دوران ہمیں یہی ہدایت صادر فرمائی ہے۔"[20] پاکستان ٹائمز نے اس مشترکہ بیان کا مضحکہ اڑایا اور یہ تبصرہ کیا کہ ان وزراء کو کئی ماہ کے بعد اب پتہ چلا ہے کہ پاکستان کے عوام اس وقت ایک زبردست آزمائش سے گزر رہے ہیں...... اِن وزراء نے گزشتہ چند ماہ میں جو رویہ اختیار کئے رکھا ہے اس سے مغربی پنجاب کی حکومت کے وقار کو اور عوام کے حوصلہ کو بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ وزراء قائداعظم کی ہدایت کے مطابق ایک ٹیم کے طور پر کام کرتے بھی ہیں یا نہیں۔"[21]

پاکستان ٹائمز کا یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا۔ جاگیردارانہ سیاست میں وزراء کے ایک ٹیم کے طور پر کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس مشترکہ بیان کی ابھی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ پھر وزراء کے درمیان محلاتی سازشوں اور خفیہ جوڑ توڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان پنجاب میں اس کشمکش کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا جبکہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مسئلہ کشمیر کو ایک بےضرر سی قرارداد کے ذریعے کھٹائی میں ڈال دیا تھا اور کشمیر کے میدان جنگ میں ہندوستانی فوجیں ایک بہت بڑے حملے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ممتاز دولتانہ کو اپریل کے اواخر میں قائداعظم سے ملاقات کے دوران یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب بابائے قوم چند دنوں کے ہی مہمان ہیں۔ تاہم بابائے قوم نے اپنی شدید علالت کی حالت میں بھی 9 مئی کو پنجاب کے گورنر سر فرانسس موڈی اور تینوں وزراء کو پھر کراچی بلایا جبکہ کراچی کے ''باخبر حلقوں'' سے منسوب کردہ اس مضمون کی خبریں چھپ رہی تھیں کہ چونکہ راجہ غضنفر علی خان کو ایران میں سفیر مقرر کر دیا گیا ہے اس لئے اس کی جگہ نواب ممدوٹ کو مرکز میں وزیر بحالیات مقرر کیا جائے گا۔ صوبہ میں ممتاز دولتانہ وزیر اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہو گا۔ 11 مئی کو کراچی میں تینوں وزراء کی قائداعظم سے ملاقات ہوئی۔ بعض اخباری اطلاعات کے مطابق جب ان میں کوئی صلح صفائی نہ ہو سکی تو گورنر جنرل نے حکم دیا کہ پنجاب کے تمام وزراء اپنا استعفیٰ صوبائی گورنر کو پیش کر دیں اور صوبائی وزارت کو از سر نو مرتب کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی گورنر جنرل نے دولتانہ سے کہا کہ وہ وزیر اعلیٰ کے عہدے کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے تیار ہو جائیں مگر دولتانہ کے لئے یہ تجویز قابل قبول نہیں تھی کیونکہ اسے اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی لہٰذا اس ملاقات کے دوسرے دن گورنر جنرل ہاؤس سے ایک اعلان جاری ہوا جس میں کہا گیا کہ ''گورنر مغربی پنجاب، وزیر اعظم اور ان کے دیگر رفقاء سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد گورنر جنرل پاکستان اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ انہیں فی الحال گورنر پنجاب کے لئے کوئی خاص ہدایت جاری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں لہٰذا گورنر عام ضابطہ کے مطابق وزراء کا قضیہ خود نپٹائیں گے۔ وہ اپنے وزیروں کو مدعو کرنے اور ان کے انتخاب کے معاملہ میں ضروری قدم اٹھائیں گے۔''

اس اعلان کا بظاہر مطلب یہ تھا کہ ممدوٹ اور دولتانہ میں سے جس کسی کو پارلیمانی پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گی اسے از سر نو وزارت تشکیل کرنے کی دعوت دی جائے گی۔

لیکن گورنر جنرل ہاؤس کے اس اعلان کے اگلے دن 13 رمئی کو وزیر اعلیٰ خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ نے نوائے وقت کو جو انٹرویو دیا اس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ صوبائی وزارت کی از سر نو تشکیل کا معاملہ گورنر موڈی کی صوابدید پر چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھا بلکہ وہ خود وزارتِ اعلیٰ کے عہدہ پر بدستور قائم رہنے پر مصر تھا۔ ممدوٹ کا انٹرویو یہ تھا کہ ''ہم کسی جھگڑے کے فیصلے کے لئے کراچی نہیں گئے تھے بلکہ قائداعظم کے بلاوے پر گئے تھے۔ ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں۔ جب ان کی توجہ گورنر جنرل کے اعلان کی طرف کرائی گئی اور ان سے پوچھا گیا کہ اس میں ''وزارتی جھگڑے'' کا ذکر ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ گورنر اس جھگڑے کو چکائے گا تو وزیر اعلیٰ پنجاب نے کہا میں نہیں جانتا کہ اس اعلان میں ''وزارتی جھگڑے'' سے کیا مراد ہے۔ میں اپنی طرف سے اور اپنے رفقاء کی طرف سے کہہ سکتا ہوں کہ پنجاب میں کوئی ''وزارتی جھگڑا'' نہیں۔ اگر کوئی جھگڑا ہے اور گورنر کو اُسے چکانا ہے تو ہمیں اس کا کوئی علم نہیں۔''[22] ممدوٹ کے اس انٹرویو سے سیاسی مبصرین نے ایک تو یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چونکہ ممتاز دولتانہ گورنر جنرل کے سامنے یہ تسلیم کر چکا ہے کہ اسے اسمبلی پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں، اس لئے ممدوٹ کی رائے میں صوبائی وزارت کی از سر نو تشکیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ وزیر اعلیٰ ہے اور وزیر اعلیٰ رہے گا۔ دوسرا نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ نواب ممدوٹ نے دولتانہ اور شوکت کے ساتھ جو استعفیٰ دیا تھا اب وہ اس سے مکر رہا ہے اور اسے گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کا یہ فیصلہ قبول نہیں کہ گورنر موڈی عام ضابطہ کے مطابق وزارتی قضیہ سے خود نپٹے گا۔ اس نے قائداعظم کے خلاف اپنے اس باغیانہ رجحان کا اظہار غالباً اپنی ''پرائیوٹ کابینہ'' کے مشورے کے تحت کیا تھا۔ اگر خود اس میں ایسی جرأت اور عقل ہوتی تو وہ قائداعظم کے سامنے ہی یہ مؤقف پیش کر سکتا تھا۔ وہاں تو وہ حسب معمول گونگا بنا رہا لیکن جب کراچی سے 13 رمئی کو لاہور پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ تمہیں وہاں یہ کہنا چاہیے تھا جو نوائے وقت سے متذکرہ انٹرویو میں اس کے نام سے منسوب کیا گیا۔

چونکہ نواب ممدوٹ کے اس ''انٹرویو'' کے بعد گورنر موڈی کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ صوبائی وزارت کی از سر نو تشکیل اپنی حسب منشا نہیں کر سکے گا اس لئے اس نے 16 رمئی کو وزراء کے استعفے واپس کر دیئے اور اس طرح پنجاب کے وزارتی قضیے نے پھر ایک بحران کی صورت اختیار کر لی۔ اس پر ممدوٹ نے 20 رمئی کو اسمبلی پارٹی کا اجلاس بلایا تا کہ اس سے اپنے حق میں

اعتماد کا ووٹ حاصل کر لے مگر اس اجلاس سے دو دن قبل وزیر اعظم لیاقت علی نے اسے پھر کراچی طلب کر لیا تا کہ اسے راجہ غضنفر علی خان کی جگہ مرکزی وزیر بحالیات کا عہدہ قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے چنانچہ اسمبلی پارٹی کا یہ اجلاس 25 رمئی تک ملتوی کر دیا گیا۔ پاکستان ٹائمز نے اس سلسلے میں جو خبر شائع کی اس میں یہ الزام عائد کیا گیا کہ صوبہ کی وزارتی سیاسیات میں مرکز کی طرف سے ناجائز طور پر مداخلت کی جا رہی ہے۔ اگرچہ صوبہ کی رائے عامہ بدستور قائداعظم کی وفادار اور عقیدت مند ہے لیکن مرکز کی طرف سے صوبہ کے بعض افراد کے حق میں تاریں ہلانے کی خلاف غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ ایک با اثر اور آزاد اخبار ''زمیندار'' نے اس سلسلے میں ایک اداریے میں لکھا ہے کہ ''اس امر کا امکان ہے کہ وزراء میں مقامی طور پر کوئی معمولی اختلافات ہوں لیکن اب یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ کابینہ میں بنیادی اختلافات ہیں۔ یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ نواب ممدوٹ کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہو جانا چاہیے کیونکہ اسے اسمبلی کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔ یہ مطالبہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر دلعزیز وزیر اعلیٰ (ممدوٹ) کو علیحدہ ہونے پر کیوں مجبور کیا جا رہا ہے۔ ممدوٹ کی مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب دولتانہ سے یہ کہا گیا تھا کہ تم پنجاب کے وزیر اعلیٰ بن جاؤ تو اس نے بجا طور پر اصرار کیا تھا کہ وہ اس وقت تک ہاں نہیں کہہ سکتا جب تک کہ اسمبلی کی لیگ پارٹی بھاری اکثریت سے اسے لیڈر منتخب نہ کر لے۔ اگر دولتانہ کو یہ معلوم ہوتا کہ پارٹی ممدوٹ کو پسند نہیں کرتی تو وہ قائداعظم کی خواہشات کی مزاحمت کرنے کی کبھی جرأت نہ کرتا۔''[23] سیدھے سادے الفاظ میں اس الزام کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان، ممتاز دولتانہ یا فیروز خان نون کو وزیر اعلیٰ بنانے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ ان میں سے کسی کو بھی اسمبلی پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے۔

20 رمئی کو نوائے وقت میں ''وزارت پنجاب کا قضیہ'' کے عنوان سے ایک اداریہ شائع ہوا جس میں اس اخبار کے ایڈیٹر حمید نظامی نے پہلے تو اعتراف کیا کہ اسے ممدوٹ کے ایوان اقتدار میں اخبار نویس کے علاوہ کوئی اور حیثیت بھی حاصل ہے اور پھر گورنر موڈی پر جانبداری کا الزام عائد کیا۔ اداریہ یہ تھا کہ ''اس قضیہ کا پس منظر پریشان کن ہونے کے باوجود نہایت دلچسپ ہے۔ خوش قسمتی سے ہم اس کی ساری جزئیات سے آگاہ ہیں۔ اگر ہمیں یہ کوائف ایک اخبار نویس

کی حیثیت سے ہی معلوم ہوتے تو ہم اپنی صوابدید کے مطابق جس حد تک انہیں عوام کے سامنے رکھنا بہتر سمجھتے رکھ دیتے مگر موجودہ صورت میں کسی کے اعتماد سے ناجائز فائدہ اٹھانا ایک ناروا فعل ہوگا، لیکن ہم اعتماد کو زائل کئے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی اور موجودہ وزیراعلیٰ خان افتخار حسین کے تعلقات ناقابل رشک ہیں۔ یہ کوئی راز سربستہ نہیں کہ اگر خان افتخار حسین کی جگہ کوئی ایسے صاحب وزارت اعلیٰ پر فائز ہوجائیں جو موجودہ وزیراعلیٰ کے مقابلہ پر گورنر کے زیادہ نیاز مند اور اسی نسبت سے زیادہ آمادۂ تعاون ہوں تو گورنر پنجاب اس وزارتی تغیر و تبدل کو پسند ہی نہیں فرمائیں گے بلکہ شاید اس کی حوصلہ افزائی بھی کریں گے......
جب 13 رمئی کی رات کو وزیر صاحبان (استعفیٰ دے کر) کراچی سے لاہور پہنچے، اس شب پوزیشن یہ تھی کہ شاید گورنر میاں ممتاز دولتانہ کو تشکیل وزارت کی دعوت دیں اور ان کے انکار کی صورت میں قرعۂ فال ملک فیروز خان نون کے نام نکل آئے...... اگر وزارت میں تغیر و تبدل ضروری ہے تو اس میں زیادہ دیر نہ کی جائے جو صاحب اپنے آپ کو اس ذمہ داری کے اہل سمجھتے ہیں وہ آگے بڑھیں اور یہ ذمہ داری قبول کریں۔ اس معاملہ میں گورنر جنرل یا گورنر کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔ لیگ اسمبلی پارٹی کو ساری پوزیشن سمجھا دی جائے...... اور اس کے فیصلے پر عمل کیا جائے۔''[24] نواب ممدوٹ کے ضمیر بردار اور اس کی پرائیویٹ کابینہ کے ممتاز رکن کے اس اداریے کا مطلب یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان اور گورنر موڈی کی جانبداری کے باوجود اس امر کا فیصلہ اسمبلی پارٹی کو ہی کرنا چاہیے کہ صوبہ کا وزیراعلیٰ کون ہوگا۔ چونکہ پارٹی کی اکثریت ممدوٹ کی حامی تھی اس لئے دولتانہ یا نون کے وزیراعلیٰ بننے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نواب ممدوٹ کو مرکز میں وزیر بحالیات بنا کر پنجاب سے نکالنا چاہتا تھا تاکہ یہاں دولتانہ یا نون وزارت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز ہو اور اس طرح ملک میں اس کی سیاسی پوزیشن مستحکم ہو جائے۔ گورنر موڈی کی جانب سے اس سلسلے میں لیاقت علی خان کی خواہش کی تکمیل کرانے کی کوشش کرنے کی دو تین وجوہ تھیں۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ نواب ممدوٹ واقعی کم تعلیم یافتہ، نااہل اور سہل پسند تھا۔ اس کی کوئی بات بھی گورنر موڈی کو متاثر نہیں کرتی تھی اور اس نے درمیانہ طبقہ کے ''دانشوروں'' اور افسروں کی جو ''پرائیویٹ کابینہ'' بنائی ہوئی تھی وہ بھی دولتانہ کی طرح گورنر کے لئے بالکل پسندیدہ نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گورنر موڈی کے نوابزادہ لیاقت علی خان سے اس

زمانے سے تعلقات تھے جبکہ وہ یو۔ پی میں چیف سیکرٹری تھا اور اب وہ پاکستانی پنجاب میں بطور گورنر لیاقت علی خان کے مفاد میں کوئی مؤثر کردار ادا کر کے ان تعلقات کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ تیسری اور غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جب وہ پنجاب کے وزارتی جھگڑے کے بارے میں تبادلۂ خیالات کے لئے گورنر جنرل سے ملا تھا تو ہیکٹر بولیتھو کے بیان کے مطابق۔ ''قائداعظم بہت بیمار تھا'' اور اس بنا پر گورنر موڈی کا اپنا مفاد یہ تھا کہ وہ اپنی وفاداری عملی طور پر لیاقت علی خان سے وابستہ کرے جو مستقبل قریب میں کلی اختیارات کا حامل بننے والا تھا۔

تاہم 21 رمئی کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے ایک بیان میں پاکستان ٹائمز کی 19 رمئی کی اس خبر کی تردید کی کہ اس نے وزیراعلیٰ پنجاب خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ کو مغربی پنجاب کے وزارتی قضیے کے سلسلے میں تبادلۂ خیالات کی غرض سے کراچی بلایا ہے۔ لیاقت علی خان کے بیان میں کہا گیا تھا کہ ''یہ اطلاع بالکل غلط ہے۔ نہ میں نے وزیراعلیٰ کو کراچی بلایا ہے نہ مرکزی حکومت صوبہ کی وزارتی سیاست میں دخل دینے کی خواہش رکھتی ہے۔'' ظاہر ہے کہ لیاقت علی خان کا یہ بیان صحیح نہیں تھا۔ پاکستان ٹائمز کی رائے میں اس کے اس غلط بیان کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے بیشتر اخبارات اور عوام کی رائے نواب ممدوٹ کے حق میں تھی۔ بالخصوص شہروں کا درمیانہ طبقہ دولتانہ یا نون کے حق میں لیاقت اور موڈی کی جانبداری کو پسند نہیں کرتا تھا۔ افتخارالدین اور اس کے اخبارات ''پاکستان ٹائمز'' اور ''امروز'' نے بھی اسی بنا پر ممدوٹ کی مخالفت بہت حد تک کم کر دی تھی۔ یہ اخبارات لیاقت علی خان کے پنجاب کے یونینسٹ جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کو ترقی پسند حلقوں کے لئے خطرناک تصور کرنے لگے تھے۔ افتخارالدین نے نومبر 1947ء میں صوبہ کی وزارت بحالیات سے مستعفی ہونے کے بعد صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے وزیراعلیٰ نواب ممدوٹ کی رجعت پسندانہ بحالیاتی پالیسی کے خلاف جو صوبہ گیر پروپیگنڈا مہم شروع کی تھی وہ اب تقریباً ترک کی جا چکی تھی۔ اب اس کے اور اس کے اخبارات کے مخالفانہ پروپیگنڈا کا رخ لیاقت، دولتانہ، نون اور موڈی کی طرف تھا۔ افتخارالدین کی جانب سے یونینسٹ جاگیرداروں کی مخالفت کوئی نئی نہیں تھی۔ اس نے 1946ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے کے بعد 28 رمارچ 1946ء کو پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں جو پہلی تقریر کی تھی اس میں اس نے مسلم لیگ کے خلاف کانگرس اور یونینسٹ

پارٹی کے گٹھ جوڑ پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ یہ گٹھ جوڑ ابوالکلام آزاد نے کروایا تھا اور اس کا مقصد محض یہ تھا کہ برصغیر میں انتقالِ اقتدار کے موقع پر پنجاب میں مسلم لیگ کو بہر قیمت اقتدار سے محروم رکھا جائے حالانکہ اسمبلی میں لیگ پارٹی سب سے بڑی تھی اور سامراج کے پٹھو مسلمان یونینسٹ جاگیرداروں کی تعداد نو یا دس سے زیادہ نہیں تھی۔ افتخار الدین کا 1946ء میں الزام یہ تھا کہ کانگرس نے اپنی اصول پرستی کے بلند بانگ دعوؤں کے برعکس محض مسلمانوں کو حق خودارادیت سے محروم رکھنے کے لئے ملک کے غداروں سے ناپاک اتحاد کیا ہے اور اب 1948ء میں بھی اس کا مؤقف یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان نے یونینسٹ جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر کے تقریباً ویسی ہی حرکت کی ہے جیسی کہ ابوالکلام آزاد نے 1946ء میں کی تھی۔

29 رمئی 1948ء کو وزیراعظم لیاقت علی خان نے ایک اور بیان میں اس خبر کی تردید کی کہ ''میں نے مغربی پنجاب کے وزیراعلیٰ کی اس روش کی حمایت کی ہے کہ جب تک مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی اکثریت ان کے ساتھ ہے انہیں اپنے عہدہ سے دستبردار ہونے کی ضرورت نہیں اور میں انہیں یقین دلا چکا ہوں کہ مرکزی حکومت کو وزارتی الجھن سے کوئی دلچسپی نہیں۔'' لیاقت علی خان نے اپنے اس بیان میں اس خبر سے پیدا شدہ غلط فہمی کا ازالہ کرنے کے لئے اس امر کی وضاحت کی کہ آئین کی رو سے ''صوبائی گورنر وزراء کے انتخاب، نامزدگی اور موقوفی کے متعلق اپنے فرائض گورنر جنرل کے احکام کے تحت ادا کرے گا اور وقتاً فوقتاً اس ضمن میں گورنر جنرل کی طرف سے جاری شدہ ہدایات کی پابندی کرتا رہے گا۔'' لیاقت علی نے اپنے اس بیان میں ایک تیر سے دو شکار مارنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا ایک مقصد تو یہ ظاہر کرنا تھا کہ اگرچہ ممدوٹ کو اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل ہے تاہم وہ قائداعظم کی طرح اب اس کے وزیراعلی کے عہدہ پر قائم رہنے کے حق میں نہیں ہے۔ دوسرا مقصد یہ یقین دلانا تھا کہ وہ قائداعظم سے بالا بالا پنجاب کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کر رہا تھا۔ اگرچہ قائداعظم ان دنوں بہت بیمار تھے لیکن ان کا ایک اشارۂ ابرو لیاقت علی خان کے سیاسی مستقبل کو ہمیشہ کے لئے برباد کر سکتا تھا۔ نواب ممدوٹ نے لیاقت علی خان کے اس ذومعنی بیان کا اسی دن یہ جواب دیا کہ اس نے صوبائی گورنر کو یہ سفارش کی کہ ممتاز دولتانہ اور شوکت حیات خان کے استعفے منظور کر لئے جائیں اور اُدھر نوائے وقت کے نامہ نگار کو یہ معلوم ہوا کہ ''نئے وزیر متوسط طبقے سے لئے جائیں گے کیونکہ وزیراعلیٰ (ممدوٹ) کا

یہ خیال ہے کہ اگر ان کی وزارت ایسے ارکان پر مشتمل ہوئی جو عوام سے تعلق رکھتے ہوں تو انہیں عوام کی مشکلات و مسائل کا بہتر احساس ہوگا۔''[25] نوائے وقت کے 2 / جون کے اداریے میں لیاقت علی کے متذکرہ بیان کے خلاف یہ کہا گیا تھا کہ ''یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس مرحلے پر اس بیان کی اشاعت کی کیا ضرورت تھی۔''

ممتاز دولتانہ نے بھی اسی دن یعنی 29 / مئی کو ہی ایک بیان میں اپنے استعفیٰ کی وجوہ پر روشنی ڈالی۔ اس کے الزامات یہ تھے کہ وزارت کے سامنے نہ کوئی واضح پالیسی ہے نہ پروگرام۔ مختلف وزراء اپنے محکموں میں آزاد و خود مختار ہیں۔ وزیر اعلیٰ (ممدوٹ) مختلف محکموں کی نگرانی نہیں کرتا۔ رشوت ستانی بڑھ گئی ہے۔ کنبہ پروری زوروں پر ہے۔ افسروں کے تبادلے افراد کی سفارشوں پر ہوتے ہیں۔ مستقل سروسز میں ڈسپلن مفقود ہو رہا ہے۔ عوام سے وزارت کا کوئی رابطہ نہیں۔ لیگ اور وزارت کا تعلق منقطع ہو گیا ہے۔ بلاشبہ دولتانہ کے یہ سارے الزامات بے بنیاد نہیں تھے تاہم اس نے اپنے اس ''افسانے'' میں ''اصلی بات'' کا ذکر نہیں کیا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ وہ خود وزیر اعلیٰ بننے کا عزم رکھتا تھا اور اس عزم کی تکمیل کے لئے اس نے وزیر اعظم لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ کر لیا ہوا تھا۔ یہ ایک طبقاتی سوال تھا۔ وہ درمیانہ طبقہ کے افراد کو عملاً اپنے برابر کا درجہ دینے پر آمادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے ان کی بالادستی قبول کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نواب ممدوٹ نے اسی دن اپنے ایک طویل بیان میں دولتانہ کے الزامات کی تردید کی۔ اس کا جواب یہ تھا کہ موجودہ حالات میں کسی انقلابی پالیسی یا پروگرام کا تصور ممکن نہیں۔ انقلابی پالیسی یا پروگرام اس وقت ہندوستان اور پاکستان میں کسی وزارت کے سامنے نہیں کیونکہ موجودہ حالات کسی انقلابی پروگرام کے لئے سازگار نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا تھا کہ وزارت صوبہ کی ترقی کے لئے تدبیریں سوچے اور پلان بنائے۔ صوبے کی ترقی سے متعلق سب محکمے شوکت حیات خان اور ممتاز دولتانہ کے ماتحت رہے ہیں۔ وہ پروگرام اور پالیسی کے فقدان کا الزام مجھ پر عائد نہیں کر سکتے۔ نواب ممدوٹ کے اس بیان میں بھی صاف گوئی نہیں تھی۔ اگر اس میں اخلاقی جرأت ہوتی تو اسے یہ کہنا چاہیے تھا کہ تم نے استعفیٰ محض اس لئے دیا ہے کہ تمہارے خیال میں اس طرح صوبہ میں سیاسی بحران پیدا ہو جائے گا اور پھر تم وزیر اعظم لیاقت علی خان اور گورنر موڈی کی امداد سے وزیر اعلیٰ بن سکو گے۔

یکم جون 1948ء کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا اجلاس ہوا تو پارٹی واضح طور پر دو دھڑوں میں

تقسیم ہوگئی۔ ایک ممدوٹ کا دھڑا تھا اور دوسرا دولتانہ کا۔ اس طرح صوبہ میں جاگیردارانہ کشمکش اقتدار جو قبل ازیں پس پردہ محلات میں ہوتی رہی تھی اب کھلم کھلا اسمبلی چیمبر میں شروع ہوگئی۔ اس اجلاس میں دولتانہ گروپ نے یہ قرارداد پیش کرنے کی کوشش کی کہ پارٹی قیادت کے مسئلہ کا فیصلہ قائداعظم پر چھوڑ دیا جائے۔ اس قرارداد کے پس پردہ یہ اُمید کارفرما تھی کہ چونکہ قائداعظم نے 12رمئی کو ممتاز دولتانہ کو وزارتِ اعلیٰ کا عہدہ سنبھالنے کو کہا تھا اس لئے وہ اب بھی یہی کہیں گے۔ اس طرح لیگ پارٹی کو طوعاً و کرہاً اسے اپنا قائد منتخب کرنا ہی پڑے گا اور اس کے وزیراعلیٰ بننے کے خواب کی تعبیر فوراً ہی ہوجائے گی۔

وزیراعظم لیاقت علی خان کے 29رمئی کے بیان میں بھی اشارۃً یہی بات کہی گئی تھی۔ لیکن دولتانہ کی یہ چال کامیاب نہ ہوئی اور اس کے گروپ کو اپنی یہ قرارداد واپس لینا پڑی۔ پارٹی کے ارکان کی غالب اکثریت پہلے سے زیادہ ممدوٹ کے حق میں تھی اس لئے کہ اب تو اس کی جیب میں وزارتوں کی پیش کشیں بھی تھیں۔ اس کے ترجمان اخبار نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ ''نئے وزراء متوسط طبقوں سے لئے جائیں گے اور پنجاب میں پہلی مرتبہ وزارت مخصوص ''خاندانوں'' سے باہر جائے گی...... تین دن سے بڑی سرگرم کنویسنگ جاری رہی اور جارج پنجم کے زمانے کے بعض سیاسی شاطر بھی خان افتخار حسین کو شکست دینے کے لئے رات کے دو دو بجے تک مختلف سڑکوں پر موٹریں دوڑاتے رہے مگر یہ امر دلچسپ ہے کہ بعض ممبروں نے ان حضرات کی اس سرگرمی سے خبردار ہوکر بھی خان افتخار حسین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''[26] اس رپورٹ کا مطلب یہ تھا کہ ممدوٹ اور دولتانہ کے درمیان اس سیاسی دنگل کے دوران فیروز خان نون بھی اپنا ''چلچ تلنے'' کی کوشش کررہا تھا۔

4رجون کو نوائے وقت میں ''وزارت، وزراء اور عوام'' کے عنوان کے تحت ایک اداریہ شائع ہوا جس میں پہلے تو نواب ممدوٹ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ اپنے نئے وزراء کا انتخاب متوسط طبقے میں سے کرے اور پھر وزیراعظم لیاقت علی خان اور اس کے حلیف پنجابی جاگیرداروں کے خلاف اعلان جنگ کردیا گیا جبکہ قائداعظم جناح کی صحت نازک مرحلے میں داخل ہوچکی تھی۔ اداریہ میں کہا گیا تھا کہ خان افتخار حسین خان کو اپنے وزراء کے انتخاب کے لئے ''بڑے ناموں'' اور ''بڑے خاندانوں'' کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ پنجاب کے مسلمانوں کی قیادت چند خاندانوں کی اجارہ داری نہیں ہے...... نئے آدمیوں کو آگے آنے کا موقع دیجئے اور غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو آگے بڑھایئے کیونکہ یہ لوگ عوام کے دکھ درد کو جاگیرداروں اور

نوابزادوں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں...... اس سلسلے میں ایک تلخ اور نا گوار مگر مؤدبانہ گذارش آنریبل لیاقت علی خان کی خدمت میں بھی ناگزیر ہے۔ پنجاب کے وزارتی قضیہ میں انہوں نے جو پارٹ ادا کیا ہے وہ وزیراعظم پاکستان کے شایان شان نہیں۔ یہ باتیں کسی ایسے پارٹی باز پالیٹیشن کو ہی زیب دیتی ہیں جسے سازش سے بھی عار نہ ہو...... یہ بات وزیراعظم پاکستان کے پایہ سے گری ہوئی اور ان کے بلند عہدہ ومنصب کے وقار کے منافی ہے کہ وہ پارٹی بازی میں حصہ لیں۔ ایک گروپ کے مقابلے میں دوسرے گروپ کو ابھاریں اور صوبائی رقابتوں اور جھگڑوں کو ختم کرنے کی بجائے ان کی حوصلہ افزائی کا باعث بنیں۔ زمانہ بڑی تیزی سے بدل رہا ہے وہ اس کے ساتھ بدلنے کی کوشش کریں ورنہ زمانہ انہیں بہت پیچھے چھوڑ جائے گا۔"[27] بلاشبہ یہ اداریہ ترقی پسندانہ اور قابل تعریف تھا لیکن بدقسمتی سے اداریہ نویس اس شعور سے عاری تھا کہ صوبہ کا ناتجربہ کار اور نوزائیدہ درمیانہ طبقہ ایک دقیانوسی جاگیردار کی زیر کمان بڑے بڑے جغادری جاگیرداروں کو سیاسی شکست نہیں دے سکتا تھا۔ نواب ممدوٹ خود انتہا درجے کا رجعت پسند اور جاگیرداری نظام کے عظیم ترین ستونوں میں سے تھا۔ اس کے لئے افتخار الدین کی یہ بے ضرر سی تجویز بھی قابل قبول نہیں تھی کہ بڑے زمینداروں کو اپنی فالتو زمین برائے کاشت بے زمین مہاجرین کو دینی چاہیے۔ ایسے شخص سے یہ توقع کہ وہ غریبوں اور متوسط طبقہ کو ابھارے گا اور جاگیرداروں اور نوابزادوں کو نیچا دکھائے گا محض خام خیالی تھی۔ یہ شخص جاگیرداری نظام کو ختم کرنے کے حق میں نہیں تھا اور جاگیرداری نظام کو ختم کئے بغیر جاگیرداروں اور نوابزادوں کے سیاسی غلبہ کو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

5رجون کو نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ مغربی پنجاب کے تین نئے وزراء میجر مبارک علی شاہ، میاں نوراللہ اور سردار عبدالحمید دستی نے حلف اُٹھالیا ہے اور انہوں نے رشوت ستانی کے خاتمے، زمینوں کی غلط تقسیم، دفتری بدانتظامی اور نوکر شاہی کے خاتمے کی یقین دہانیاں کرائی ہیں۔ ان تینوں وزراء میں اول الذکر نہ صرف ضلع جھنگ کا بڑا زمیندار تھا بلکہ "پیر" بھی تھا۔ گویا وہ نہ صرف کریلا تھا بلکہ نیم چڑھا بھی تھا۔ البتہ باقی دونوں وزراء لائل پور اور مظفر گڑھ کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن خوشحال مالکان اراضی ہونے کی وجہ سے اتنے ہی رجعت پسند تھے جتنا کہ کوئی بڑا جاگیردار ہو سکتا تھا۔ عبدالحمید دستی تو مدیر نوائے وقت کے دیرینہ محسن نواب مشتاق احمد گرمانی کا طفیلی تھا۔ بایں ہمہ 7رجون کو نوائے وقت نے اپنے اداریے میں اس امر پر حیرت اور خوشی کا اظہار کیا کہ پنجاب کے عوام کا سیاسی شعور بڑی تیزی سے ساتھ بیدار ہو رہا ہے اور عوامی ذہنیتیں بڑی سرعت کے ساتھ

بدل رہی ہیں۔ اداریے میں اس حقیقت کی نشاندہی کی گئی تھی کہ ''پنجاب کے مسلمانوں کی قیادت پورے پچیس برس تقریروں کے ذریعے کھرڑوں، نونوں، ٹوانوں اور دولتانوں کے درمیان فٹ بال کی طرح اِدھر سے اُدھر ٹھوکریں کھاتی رہی۔ پنجاب میں کوئی منصب ہو، سرکاری یا غیر سرکاری، پھر کر نظر انہی چند خاندانوں پر پڑتی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ اب وہ طلسم ٹوٹ رہا ہے۔'' یہ بات ٹھیک تھی لیکن اس حد تک نامکمل تھی کہ اس میں ممدوٹوں، لغاریوں، نوابزادوں، گرمانیوں، قریشیوں اور گیلانیوں کا ذکر نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں پنجاب کے جاگیرداروں کے یہ خاندان نوابزادہ لیاقت علی خان اور دولتانہ کے حق میں نہیں تھے۔ مزید برآں اس میں اس خواہش کا بھی ذکر نہیں تھا کہ اب عنانِ اقتدار پنجاب کے شیخ محمد امین، نصیر اے شیخ، سید مراتب علی اور سعید سہگل وغیرہ کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ یہ خواہش کوئی بری نہیں تھی کیونکہ دقیانوسی جاگیرداروں کے مقابلے میں یہ نوزائیدہ سرمایہ دار بہرصورت بہتر تھے۔

لیکن جب 15 رجون کو صوبہ سرحد کے جابر سلطان خان عبدالقیوم خان نے قائداعظم کی اجازت و منظوری حاصل کئے بغیر سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو غداری کے الزام میں گرفتار کیا اور اسے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشنز کے تحت فوراً ہی سزا دلوا کر پنجاب کی ایک جیل میں نظر بند کرا دیا تو نوائے وقت نے ''جمہوریت اور انصاف'' کا لبادہ یکا یک اتار دیا۔ خان عبدالغفار خان کو اس سنگین الزام کے بارے میں کسی کھلی عدالت کے روبرو صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا تھا اور نہ ہی اسے اپیل کا حق دیا گیا تھا۔ تاہم اس اخبار کا 18 رجون کو تبصرہ یہ تھا کہ ''خان عبدالغفار خان کی گرفتاری ہمارے لئے باعث حیرت نہیں۔ تعجب اس پر ہے کہ گرفتاری اتنا عرصہ بعد کیوں عمل میں آئی۔'' پھر 18 راگست کو اس کا اداریہ یہ تھا کہ ''اگر آزادی کا تحفظ مقصود ہے تو غداروں کے خلاف کارروائی ضروری ہے۔ ہم اس معاملہ میں خان عبدالقیوم خان کی مذمت و مخالفت سے انکار ہی نہیں کرتے بلکہ پنجاب کے وزیراعلیٰ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ وزیراعلیٰ سرحد سے سبق سیکھیں۔ شرافت اچھی چیز ہے مگر اسی حد تک جب اس کا دوسرا نام کمزوری نہ ہو جائے۔ قوم اور ملک کا مفاد مقتضی ہے کہ وہ غداروں کے متعلق اپنی نرم پالیسی کو بدلیں اور ملک و ملت کی حفاظت کے لئے غداروں کی سرگرمیوں کا استیصال کرنے کے لئے مؤثر تدابیر اختیار کریں۔'' اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ نواب ممدوٹ کو بھی عبدالقیوم خان کی پیروی کرتے ہوئے اپنے سیاسی مخالفین کو

باقاعدہ مقدمہ چلائے بغیر جیلوں میں بند کر دینا چاہیے۔ گویا درمیانہ طبقہ کی فسطائیت کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ لیکن مدیر نوائے وقت اپنی طاقت اور یونینسٹ جاگیرداروں کی کمزوری کے بارے میں غلط فہمی کا شکار تھا۔ پنجاب کے نون، ٹوانے اور دولتانے خان عبدالغفار خان اور اس کے ساتھیوں کی طرح اندرون ملک بے یارومددگار نہیں تھے۔ ان کا وزیراعظم پاکستان نوابزادہ لیاقت علی خان کے ساتھ گٹھ جوڑ تھا۔ چونکہ قائداعظم جناح بستر مرگ پر تھے اس لئے انہیں یقین تھا کہ وہ مستقبل قریب میں پھر برسر اقتدار آ جائیں گے۔ لیکن قائداعظم کے ذاتی معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کے بیان کے مطابق اس وقت بابائے قوم اپنی زندگی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے اور اس امر کی ساری علامتیں ظاہر ہو گئی تھیں کہ اب وہ چند دن سے زیادہ بقید حیات نہیں رہیں گے۔ امور حکومت میں ان کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ یہ وہ اہم موڑ تھا جہاں سے لیاقت علی خان نے زمامِ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کرنا شروع کر دی تھی۔ مدیر نوائے وقت کا نشۂ طاقت بالکل عارضی تھا۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ اور نوزائیدہ سرمایہ دار طبقہ میں ابھی اتنی اہلیت وقوت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ پشتینی جاگیرداروں کو کان سے پکڑ کر سیاسی میدان سے باہر نکال دے۔

ابھی اس فسطائیانہ اداریے کو لکھے ہوئے چند دن ہی گزرے تھے کہ مرکزی حکومت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے ہنگامی صورت حال کا اعلان کر کے یہ اختیار حاصل کر لیا کہ وہ صوبائی حکومتوں کے نام ہدایات و احکام جاری کر سکے گی۔ نوائے وقت نے 30/اگست کو اس مرکزی اعلان پر جو ادارتی تبصرہ تحریر کیا اس کا عنوان تھا ''مرکزی کنٹرول کی طرف پہلا قدم۔'' 31/اگست کو لاہور کے ایک انگریزی اخبار میں کراچی کی یہ رپورٹ شائع ہوئی کہ ''مغربی پنجاب کابینہ میں پھر اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ صوبہ میں دفعہ 92 نافذ کر دی جائے گی۔''[28] جب ممدوٹ حکومت کے ایک ترجمان کی توجہ اس خبر کی طرف مبذول کرائی گئی تو اس نے کہا کہ جس نامہ نگار نے یہ خبر بھیجی ہے وہ بالکل بے وقوف ہے۔ اسے نہ پنجاب کے حالات سے واقفیت ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ مرکزی حکومت کی پنجاب کی موجودہ وزارت کے متعلق کیا رائے ہے؟ لیکن بعد کے حالات سے یہ ثابت ہوا کہ نامہ نگار بے وقوف نہیں تھا بلکہ یہ سرکاری ترجمان بے وقوف تھا جس نے خوامخواہ جھوٹ بول کر اپنی عاقبت کو خراب کر لیا تھا۔

باب: 6

وزیراعظم لیاقت علی خان اور پنجابی شاونزم کے درمیان محاذ آرائی

11 رستمبر 1948ء کو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناح کا انتقال ہو گیا تو اس کے ایک ماہ بعد یعنی 11 راکتوبر کو وزیراعلیٰ پنجاب نواب ممدوٹ نے ایسوسی ایٹڈ پریس کو ایک بیان دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کابینہ پنجاب میں دو نئے وزراء کے اضافے کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہا ہے۔ مطلب یہ تھا کہ قائداعظم کے انتقال اور اس کے سیاسی حریفوں کے جوڑ توڑ کے باعث اسمبلی پارٹی میں اس کی سیاسی پوزیشن کمزور ہو گئی تھی اور وہ اسے مستحکم کرنے کے لئے مزید وزارتیں بانٹنے پر آمادہ تھا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کا دباؤ روز بروز بڑھ رہا تھا جبکہ ''وزارت کی شرافت اور رواداری نے جو کمزوری کی حد تک پہنچ چکی ہوئی تھی، ماتحت افسروں میں ڈسپلن کا خاتمہ کر رکھا تھا۔''[1] نوائے وقت نے اپنے ممدوح کے اس بیان پر 13 راکتوبر کو ادارتی تبصرہ کیا جس میں اسے یاد دلایا کہ ''عوام نوابوں اور بڑے بڑے زمینداروں سے بیزار ہیں۔ پنجاب کی قیادت و وزارت چند مخصوص خاندانوں کا اجارہ نہیں کہ ہر دور میں یہی خاندان مختلف ناموں سے اور مختلف لبادوں میں اس صوبہ کی قسمت کے مالک بنے رہیں۔ یہ دور سلطانیٔ جمہور کا دور ہے اور عوام ایسے ہی لوگوں کو قیادت و وزارت کی مسند پر بٹھانا چاہتے ہیں جو صالح ہوں۔ لائق ہوں، دیانت دار ہوں، محنتی ہوں، عوام میں سے ہوں یا کم از کم اپنے آپ کو عوام سے بالاتر مخلوق نہ سمجھتے ہوں اور انہیں عوام کے دکھ درد کا احساس ہو۔''[2] اس صحافتی مشورہ کے الفاظ بڑے دلکش اور خوشنما تھے لیکن ان میں وزیروں کے لئے ایسی صفات گنوائی گئی تھیں جیسی کہ عام طور پر درمیانہ طبقہ کے

شریف خاندان اپنے داماد میں دیکھنا چاہتے ہیں۔اس اخبار کو شاید ہی کبھی یہ احساس ہوا تھا کہ اس ملک یا صوبہ کے معاشرتی نظام میں کوئی خرابی ہے اور جب تک اس خرابی کا انسداد نہیں ہوگا اس وقت تک کوئی سیاسی نظام تسلی بخش طریقے سے زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گا۔محلاتی سازشیں، سیاسی جوڑ توڑ اور کرسیوں کی جنگ جاری رہے گی۔ 28/اکتوبر کو وزیراعلیٰ مغربی پنجاب نواب ممدوٹ توسیع وزارت کے سلسلے میں مشورہ کے لئے کراچی روانہ ہوا تو نوائے وقت نے اسی دن اس مسئلہ پر ایک طویل اداریہ لکھا جس کے آخر میں یہ کہا گیا تھا کہ ''اگر توسیع سے وزیراعلیٰ (ممدوٹ) کی مراد محض اسمبلی میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنا ہے اور اہلیت و قابلیت اور دیانت و اعتماد کی بجائے نئے وزیر کے لئے معیار انتخاب صرف اس کی یہی استعداد ہے کہ وہ کتنے ممبروں کو اپنے ساتھ رکھ سکتا ہے تو قطع نظر اس کے کہ وزیراعلیٰ زید ہیں یا بکر یہ مقصد قطعاً مبارک نہیں اور پبلک ہرگز اس تجویز کی تائید نہیں کرے گی۔''[3] بظاہر یہ نصیحت بہت اچھی تھی لیکن بدقسمتی سے بورژوا سیاست میں اس پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔حقیقت یہ تھی کہ قائداعظم کے انتقال کے بعد نواب ممدوٹ پر وزیراعظم لیاقت علی اور دولتانہ گروپ کا سیاسی دباؤ بہت بڑھ گیا تھا اور اس بنا پر اسمبلی پارٹی کے متعدد ارکان اپنی وفاداریاں تبدیل کرنے کے لئے پر تول رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ ممدوٹ وزارت صبح گئی یا شام گئی۔نواب ممدوٹ کراچی پہنچا تو اسے یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کو بھی اپنی وزارت میں شامل کرے۔اس نے وہاں اس مشورے پر عمل کرنے کی حامی بھر لی کیونکہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون نے گورنر جنرل پاکستان اور وزیراعظم پاکستان کو یقین دلایا تھا کہ وہ نئی وزارت میں پارٹی بازی سے بالاتر ہو کر کام کریں گے۔جب نواب ممدوٹ واپس لاہور پہنچا تو 7/نومبر کے نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''پنجاب میں نئی وزارت کی تشکیل میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا ہے۔وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ میاں ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خان نون یہ چاہتے ہیں کہ نئی وزارت میں اُن کے حامی ارکان کا غلبہ ہو...... یہ دونوں چودھری محمد حسن کے وزیر بنائے جانے کے خلاف ہیں اور میجر مبارک علی کو بھی نئی وزارت میں شامل کرنے کے حق میں نہیں ہیں......اس ڈیڈلاک کی وجہ سے عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے اور خان افتخار حسین گورنر جنرل سے مشورہ کرنے کے لئے کل صبح کراچی جا رہے ہیں۔''[4] اس خبر میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ نواب ممدوٹ کراچی میں وزیراعظم

لیاقت علی خان سے بھی ملاقات کرے گا۔ حالانکہ قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد کلی اختیارات اس کی ذات میں منتقل ہو چکے تھے اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین تو محض ایک نمائشی و آئینی سربراہِ مملکت تھا۔ بظاہر اس خبر میں وزیراعظم لیاقت علی خان سے متوقع ملاقات کا ذکر نہ ہونے کا مطلب یہ تھا کہ نواب ممدوٹ اور اس کے سیاسی حلیف لیاقت علی خان کے خلاف خواجہ ناظم الدین سے گٹھ جوڑ کر کے اسے مشورہ دینا چاہتے تھے کہ وہ بھی قائداعظم مرحوم کی طرح اختیارات کا استعمال کرے اور لیاقت علی خان بدستور نمائشی وزیراعظم رہے۔ مگر ان کی یہ خواہش اور کوشش بے سود تھی کیونکہ 11 ستمبر کے بعد مرکز کی سیاسی بساط پر پانسہ بالکل پلٹ چکا تھا۔ بے چارے مرنجاں مرنج خواجہ ناظم الدین میں اتنی قابلیت، ہمت اور جرأت نہیں تھی کہ وہ قائداعظم کے اختیارات کو بروئے کار لاتا۔

نوائے وقت نے اسی دن اس مسئلہ پر جو اداریہ لکھا اس میں خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی کارگزاری سے مایوسی جھلکتی تھی کیونکہ اس نے اس اخبار کے مشوروں کے مطابق اپنے سیاسی حریفوں کے خلاف ایسے ''مؤثر اقدامات'' نہیں کئے تھے جیسے کہ عبدالقیوم خان نے صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خان وغیرہ کے خلاف کئے تھے۔ اداریے میں یہ بھی اشارہ ملتا تھا کہ آئندہ یہ اخبار وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف پنجابی شاونزم کو ہوا دے کر ملک وقوم کو تباہی وبربادی کی طرف دھکیل دے گا۔ اس سلسلے میں یہ لکھا گیا تھا کہ ''بدقسمتی سے پنجاب میں اس وقت ایک بھی ایسی شخصیت نہیں جس سے عوام کو اس کی ذات کی وجہ سے محبت، عقیدت یا تعلق خاطر ہو۔ مسلمانانِ پنجاب ابھی تک کوئی قائد پیدا نہیں کر سکے اور اس وقت کسی شخص کو اس صوبے میں وہ حیثیت بھی حاصل نہیں جو کسی زمانے میں لالہ لاجپت رائے آنجہانی کو اس صوبے میں حاصل تھی۔''[5] اس اداریے میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان میں دوسرا کون سا صوبہ تھا جس میں ایسی شخصیت تھی جس سے عوام کو اس کی ذات کی وجہ سے محبت، عقیدت یا تعلق خاطر تھا۔ صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کی برطرفی کے بعد خان عبدالقیوم خان نے ایسی سکھا شاہی نافذ کر رکھی تھی کہ پیر مانکی جیسے ممتاز مسلم لیگی زعما بھی بلبلا اُٹھے تھے۔ صوبہ سندھ میں ایوب کھوڑو کی وزارت کی برطرفی کے بعد ایسی سیاسی ابتری پھیل گئی تھی کہ قبل ازیں اس کی مثال نہیں ملتی تھی۔ بلوچستان کو ''موزوں قیادت'' کے ''فقدان'' کی وجہ سے صوبہ کا درجہ دینے کے قابل ہی نہیں سمجھا

گیا تھا اور مشرقی بنگال میں وزیر اعلیٰ نور الامین کی شخصیت اپنی ''کمزوری اور موقع پرستی'' کی وجہ سے نوائے وقت کی سخت تنقید کا ہدف بنی ہوئی تھی۔ دراصل یہ اداریہ درمیانہ طبقہ کے بعض کم علم، کم فہم اور رجعت پسند عناصر کے اس نظریہ کا آئینہ دار تھا کہ افراد کا کردار تاریخی عمل میں فیصلہ کن ہوتا ہے۔ یہ عناصر کسی ملک میں عوام الناس، ان کی اجتماعی فکر، ان کی تنظیم اور ان کے معاشرتی و معاشی تقاضوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور جو لوگ ان باتوں کو کچھ اہم سمجھتے ہیں انہیں وہ ''مادہ پرست'' اور ''ملحد'' قرار دے کر واجب القتل تصوّر کرتے ہیں۔ ان عناصر کا بالاصرار موٗقف یہ ہوتا ہے کہ اگر حکمران صالح، دیانتدار، لائق اور محنتی ہو تو سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ان کی ساری عمر ایسے ''مثالی'' حکمران کے انتظار میں گزر جاتی ہے لیکن جب اس دوران جو آتا ہے وہ پہلے سے برا ہی نکلتا ہے تو یہ اتنا مایوس ہو جاتے ہیں کہ پوری قوم کو برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آتی کہ کسی قوم میں صالح، دیانت دار، لائق اور محنتی قیادت مروجہ ظالمانہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کے خلاف اجتماعی جدوجہد کے دوران پیدا ہوتی ہے۔ ایسی قیادت کسی کافی ہاؤس یا ڈرائنگ روم میں بحث و تمحیص یا اداریہ نویسی سے پیدا نہیں ہوتی اور جب یہ مطلوبہ قیادت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر بھی تاریخی عمل میں اس کا کردار بہت اہم ہونے کے باوجود فیصلہ کن نہیں ہوتا۔ فیصلہ کن کردار بالآخر صحیح نظریے کے تحت منظم شدہ عوام الناس کا ہی ہوتا ہے۔ کوئی اچھی یا بری قیادت تاریخی عمل کو تیز یا سست تو کر سکتی ہے لیکن اسے روک نہیں سکتی اور نہ ہی اس کا رخ بنیادی طور پر تبدیل کر سکتی ہے۔

مدیر نوائے وقت یہ اداریہ لکھنے کے بعد لاہور کے چار دوسرے مدیران جرائد کے ہمراہ سیاسی مشن پر کراچی گیا۔ وہاں انہوں نے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین اور وزیر اعظم لیاقت علی خان سے پنجاب کے وزارتی ڈیڈ لاک کے بارے میں مفصل بات چیت کی۔ یہ عجیب و غریب وفد کراچی میں دو ایک دن قیام کرنے کے بعد اس یقین کے ساتھ واپس لاہور آیا کہ ''پنجاب میں نئی وزارت کی تشکیل کے سلسلے میں مرکزی حکومت خان افتخار حسین وزیر اعلیٰ پنجاب پر کوئی غیر آئینی دباؤ نہیں ڈالنا چاہتی۔ البتہ نظم و نسق حکومت کو بہتر اور وزارت کو مضبوط بنانے کے لئے انہیں وزارت میں توسیع اور ردوبدل کا مشورہ دیا گیا ہے مگر بحیثیت وزیر اعلیٰ پنجاب ان کے حق قیادت کو کمزور کرنا ہرگز مقصود نہ تھا، نہ ہے۔ یہ بات صاف صاف طور پر واضح کر دی گئی ہے کہ پوری کابینہ

کے بااختیار قائد خان افتخار حسین ہی ہوں گے اور نئے وزیروں کو کابینہ میں اسی مفاہمت پر شامل کیا جائے گا کہ وہ لیڈر کے پورے وفادار ہوں اور ان کے ماتحت کامل یکجہتی کے ساتھ کام کر سکیں۔"[6] ان مدیران جرائد کے اس غیر مدیرانہ مشن کا اہم پہلو یہ تھا کہ انہوں نے پنجاب کے وزارتی بحران کے بارے میں گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کے ساتھ دو گھنٹہ سے زائد عرصہ تک بات چیت کی اور ہز ایکسی لینسی نے ان کی گزارشات کو بڑی توجہ کے ساتھ سنا۔ ان کی اس بات چیت سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ "اخباروں والے" اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کے انتقال کے بعد حکومت کا کلی اختیار وزیراعظم لیاقت علی کی ذات میں منتقل ہو چکا تھا اور بے چارہ خواجہ ناظم الدین پنجاب کے وزارتی بحران کو نواب ممدوٹ کے حق میں حل کرنے کے لئے کوئی مؤثر کارروائی نہیں کر سکتا تھا۔ اگر یہ مدیران اس حقیقت سے بے خبر نہیں تھے تو بظاہر ان کی کوشش یہ تھی کہ گورنر جنرل اور وزیراعظم کے درمیان محاذ آرائی کرائی جائے اور پھر خواجہ ناظم الدین میں اتنی پھونک بھر دی جائے کہ وہ ایک بااختیار گورنر جنرل یا وزیراعظم بن جائے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان کا پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان لکھتا ہے کہ خواجہ ناظم الدین "اتنے میاں آدمی تھے کہ چند خودغرض اور بدخواہ انسان نوابزادہ صاحب کی ملک سے غیر حاضری کے موقع پر ان کے کانوں میں زہر گھولا کرتے تھے کہ گورنر جنرلی میں کیا رکھا ہے۔ آپ کو تو وزیراعظم بننا چاہیے تھا تاکہ آپ بااختیار حاکم ہوتے۔"[7] یقیناً وزیراعلیٰ ممدوٹ بھی ان زہر گھولنے والوں میں سے تھا کیونکہ اُس نے اپنے کراچی کے قیام کے دوران گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین سے تین مرتبہ ملاقات کی تھی۔ بظاہر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ وہ نوابزادہ صاحب کی ملک میں موجودگی میں ہی خواجہ صاحب کے کان میں زہر گھول کر صوبہ میں اپنے روبہ زوال اقتدار کو سنبھالا دے سکے گا۔ مگر جیسا کہ نوائے وقت نے اپنے 8 نومبر کے اداریے میں لکھا تھا۔ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔"

پنجاب میں نواب ممدوٹ کے اقتدار کا چراغ دراصل اسی دن ٹمٹمانے لگا تھا جس دن قائداعظم راہی ملکِ عدم ہوئے تھے۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے قائداعظم کی وفات کے بعد تقریباً ایک ماہ تک اس اہم ترین صوبے کے بارے میں صبر و تحمل سے کام لیا۔ وجہ یہ تھی کہ اس دوران پوری قوم رنج و غم سے مغلوب تھی اور وہ خود مرکز میں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے میں مصروف

رہا تھا۔ نومبر کے اوائل میں جب اس کے لئے سیاسی حالات سازگار ہو گئے تو اس نے نواب ممدوٹ پر یہ دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کو اپنی وزارت میں شامل کرو کیونکہ قائداعظم کے انتقال کے بعد ملک کے حالات مکمل اتحاد و یک جہتی کے متقاضی ہیں۔ ممدوٹ پہلے تو اس بات پر رضامند ہو گیا بعد ازاں جب اسے مدیر نوائے وقت جیسے مشیروں نے اس رضامندی کے نتائج سے خبردار کیا تو وہ اپنے وعدے سے مکر گیا۔ وزیراعظم لیاقت نے اسے سمجھانے کے لئے پھر کراچی بلایا تو متذکرہ مدیرانِ جرائد بھی سیاسی کمک کے طور پر وہاں پہنچ گئے اور اس بنا پر ''وزارتی ڈیڈ لاک'' حل نہ ہو سکا۔ نواب ممدوٹ نے کراچی سے واپسی پر 15 ر نومبر کو اپنی کابینہ کی از سر نو تشکیل کی اور اس میں شیخ کرامت علی کی جگہ گجرات کے درمیانہ طبقہ کے ایک وکیل چودھری فضل الٰہی کو شامل کر لیا گیا اور ساتھ ہی یہ تاثر بھی دے دیا کہ مستقبل قریب میں مزید دو ایک وزراء کا تقرر ہو گا۔ قدرتی طور پر وزیراعظم لیاقت علی کے لئے نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کی یہ کارروائی پسندیدہ نہیں تھی۔ وہ ممتاز دولتانہ کے علاوہ ملک فیروز خان نون کو اس لئے بھی صوبائی وزارت میں شامل کرانا چاہتا تھا کہ نون کے ضلع سرگودھا میں کرنال کے مہاجرین آباد کئے گئے تھے اور لیاقت کا خیال تھا کہ اگر ممکن ہوا تو وہ اس ضلع میں اپنا حلقۂ انتخاب بنائے گا۔ ویسے بھی یہ ضلع ان یونینسٹ جاگیرداروں کا گڑھ تھا جن سے لیاقت علی کے خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ لیاقت علی خان کی نواب ممدوٹ سے اس خفگی کا اظہار 16 ر نومبر کو ہوا جبکہ ممتاز دولتانہ نے ایک بیان میں بتایا کہ ''مجھے وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان نے صوبائی وزارت میں شامل ہونے کی ترغیب دی تھی۔ نواب ممدوٹ پہلے تو وزیراعظم کی اس ہدایت کے مطابق عمل کرنے پر آمادہ ہو گیا مگر بعد میں وہ اس وعدے سے منحرف ہو گیا۔ اس کی اس وعدہ خلافی کی وجہ یہ تھی کہ وہ نئی وزارت میں بعض ایسے خواہشمند افراد کو شامل کرنے پر آمادہ نہیں تھا جو صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے ان عہدوں کے لئے موزوں تھے۔'' ملک فیروز خان نون نے بھی اسی دن ایک بیان میں بتایا کہ اس نے وزیراعظم پاکستان کی تجویز پر صوبائی وزارت میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا اور موجودہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس نے یہ تجویز مان لی تھی۔'' اگلے دن نواب ممدوٹ نے اپنے ڈیڑھ ہزار الفاظ پر مشتمل جوابی بیان میں کہا کہ ''میں نے اس یقین دہانی کی بنا پر ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کو اپنی وزارت میں شامل کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ وہ

پوری ثابت قدمی اور وفاداری سے میرے ساتھ تعاون کریں گے۔ مگر فوراً ہی مجھے معلوم ہوا کہ وہ اپنے وعدوں سے پھر منحرف ہو گئے ہیں۔ اس پر میں نے مرکز کو ان حقائق سے آگاہ کیا تو مرکزی ارباب اقتدار نے مجھے وزارت میں توسیع کرنے کا جو مشورہ دیا تھا وہ انہوں نے واپس لے لیا۔"[8]

ممتاز دولتانہ نے اپنی اس ہزیمت وخفت کے بعد نئی سیاسی تدبیر یہ سوچی کہ صوبائی مسلم لیگ کی صدارت پر قبضہ کیا جائے اور پھر اس مورچہ سے وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ پر اتنی گولہ باری کی جائے کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے۔ ان دنوں چودھری خلیق الزماں پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر تھا اور افتخار الدین کے صوبائی لیگ کے صدر کے عہدہ کی معیاد ختم ہو گئی تھی۔ چونکہ افتخار الدین نے اسی حیثیت سے پورا سال ممدوٹ وزارت کو ہدف تنقید بنایا تھا اس لئے دولتانہ کا خیال تھا کہ وہ بطور صدر مسلم لیگ افتخار الدین سے زیادہ پر اثر حملوں کے ذریعے ممدوٹ کے اقتدار کا تختہ الٹنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کا خیال بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ اسے وزیر اعظم لیاقت کے ہمراہ چودھری خلیق الزماں کی بھی تائید وحمایت حاصل تھی۔ علاوہ بریں اس کے گروپ نے فروری 1948ء کے بعد مسلم لیگ کی نئی رکنیت سازی کے دوران اتنی زیادہ بوگس رکن سازی کی تھی کہ جون 1948ء میں پورے ملک میں مسلم لیگ کے تقریباً 25 لاکھ ممبروں میں سے تقریباً 11 لاکھ صرف پنجاب سے تھے۔ چنانچہ جب 16 رنومبر کو افتخار الدین کے عہدہ کی معیاد ختم ہوئی تو اس نے دو چار دن بعد یہ اعلان کر دیا کہ وہ صوبائی لیگ کی صدارت کا انتخاب لڑے گا۔ اس نے اس سلسلے میں جو گیارہ نکاتی منشور جاری کیا اس کے پہلے تین نکتے یہ تھے کہ

1۔ ہم نے اپنے صوبے کی انتظامیہ کو پاک صاف کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

2۔ ہمیں انتظامیہ کو عوام کے بنیادی اور اہم مطالبات پر توجہ کرنے پر مجبور کر دینا چاہیے۔ مسلم لیگ کو منظم ہونا چاہیے اور عوام کے دل کی دھڑکن بننا چاہیے۔

3۔ ہر عہدیدار کا انتخاب صرف اہلیت واستحقاق کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔"

ممدوٹ گروپ کی طرف سے ایک اسلام پسند دانشور علاؤالدین صدیقی اس عہدہ کا امیدوار تھا اور اس نے اپنے پروگرام میں داخلی اتحاد، دفاعِ وطن کے لئے مؤثر اقدامات اور قوم کی تشکیلِ نو پر زور دیا تھا۔ نوائے وقت کی رائے میں یہ انتخابی معرکہ دراصل "غریبوں اور امیروں کی ٹکر" کی حیثیت رکھتا تھا اور اس کی اطلاع یہ تھی کہ میاں ممتاز دولتانہ" پنجاب میں ایک "نئی اپوزیشن"

کی تشکیل کے لئے میدان میں نکلے ہیں اور صوبائی وزارت سے دو دو ہاتھ کریں گے۔''[9]

نوائے وقت نے اس سلسلے میں جو اداریہ لکھا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں پنجاب کے درمیانہ طبقہ اور جاگیردار طبقہ کے درمیان کس قدر شدید محاذ آرائی تھی۔ اداریے میں پہلے تو اس امر پر اظہار افسوس کیا گیا کہ ''پنجاب میں صحیح لیڈرشپ کا اس قابلِ رحم حد تک فقدان ہے کہ نہ تحریک پاکستان کے دنوں میں پنجاب کو کوئی خاص عزت حاصل تھی اور نہ اب تشکیلِ پاکستان کے بعد مرکز میں اسے کوئی قابل احترام مقام میسر ہے'' اور پھر یہ مژدہ سنایا گیا کہ ''پچھلے چند مہینوں میں پنجاب کی سیاست میں ایک خاموش انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ غریبوں اور عوام نے ابھی تک اس انقلاب کی اہمیت کو نہیں سمجھا مگر اُمراء اور ''حاکم خاندان'' اس سے گھبرا اُٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان سب نے متحدہ محاذ بنا لیا ہے اور اب وہ مسلم لیگ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُنہیں خدشہ ہے کہ اگر لیگ کی قیادت بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو ہم بالکل ختم ہو جائیں گے۔ اگلے انتخاب میں غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں کو ٹکٹ ملیں گے اور ہماری سیادت و قیادت ختم کر دی جائے گی۔ اس خطرے کے سدباب کے لئے اب یہ بزرگ لیگ کی قیادت کی طرف مائل ہوئے ہیں تاکہ آئندہ انتخاب میں لیگ ٹکٹ کی تقسیم ان کے ہاتھ میں ہی رہے...... انہیں ڈر ہے کہ وزارت کا دروازہ تو کھل ہی گیا ہے۔ اگر غریب کارکن لیگ کا صدر منتخب ہو گیا تو ہمارے لئے کوئی جائے پناہ نہ رہے گی...... پنجاب کے مسلمان کئی سال سے فقدانِ قیادت کے ہاتھوں ذلت و مصائب میں مبتلا ہیں۔ اب موقع ہے کہ وہ بری بھلی عوامی قیادت پیدا کریں۔ یہ قیادت متوسط طبقے کے لوگوں اور غریبوں میں ابھر رہی ہے۔ جاگیردار اور نوابزادے اسے کچلنے کے لئے ایک محاذ پر جمع ہو گئے ہیں۔ اگر عوام ایک ایسی نئی قیادت کی ضرورت محسوس کرتے ہیں جو ذاتی اور خاندانی مصلحتوں کی بجائے صالح اصولوں پر مبنی ہو تو انہیں متحدہ محاذ بنا کر جاگیرداروں کے بت پر ایک آخری ضرب کاری لگانی چاہیے۔ فوجاء الحق وذھق الباطل ان الباطل کان ذھوقا۔ اسی دن اس اخبار نے آخری صفحہ پر اپنی طرف سے یہ اشتہار بھی شائع کیا کہ ''دولت وخلوص کی جنگ میں عوام اپنی تنظیم، اپنے اتحاد اور اپنی آبرو کا خیال رکھیں۔ مسلم لیگ کے انتخاب میں ان لوگوں کو ووٹ دیں جو عوام میں سے ہیں اور اس طرح قومی عہدوں کو خواص کی خاندانی جاگیر بننے سے بچا کر عوام کی فلاح و بہبود کی راہ ہموار کریں۔ عوام کی ترقی خواص کے بتوں کی شکست پر منحصر ہے۔''[10] اس

اداریے اور اشتہار سے صاف ظاہر ہے کہ ان دنوں یہ اخبار کم از کم ممدوٹ دھڑے کے حق میں پروپیگنڈا کی حد تک نہ صرف طبقاتی جدوجہد کا قائل تھا بلکہ اسے حق و باطل کی جنگ قرار دیتا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک ضلع گجرات کے نوابزادے، ضلع جھنگ کے سیدزادے اور مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے بیشتر نواب، سردار اور جاگیردار نواب ممدوٹ کے حق میں تھے کیونکہ وہ دولتانہ کو ضرورت سے زیادہ چالاک اور ناقابلِ اعتبار سمجھتے تھے۔

تاہم جب 29ر نومبر کو صوبائی لیگ کی کونسل کے اجلاس میں صدر کا انتخاب ہوا تو ممتاز دولتانہ 22 ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔ صدیقی نے 176 ووٹ حاصل کئے اور دولتانہ نے 198۔ وزیر اعظم لیاقت علی کا بڑا بیٹا نوابزادہ ولایت علی خان جنرل سیکرٹری منتخب ہوا اور اس طرح پنجاب میں وزیر اعظم لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کے جاگیردارانہ گٹھ جوڑ نے اعلانیہ طور پر رسمی صورت اختیار کر لی۔ بالفاظِ دیگر ''باطل'' کی فتح ہوئی اور ''حق'' کی شکست ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پنجاب میں برطانوی سامراج کے تحت جاگیرداریت کے بت کا ڈھانچہ اس قدر پختگی سے تعمیر ہوا تھا کہ وہ شہروں کے نوزائیدہ درمیانہ کاروباری سرمایہ دار طبقوں کے اداریوں یا بددعاؤں کی ضرب سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے مزدوروں اور غریب کسانوں کے ہتھوڑوں اور کلہاڑوں کی ضرورت تھی۔ ممتاز دولتانہ نے صدر منتخب ہونے کے فوراً بعد ضلعی مسلم لیگ کے صدروں اور سیکرٹریوں کی ایک میٹنگ میں تقریر کرتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا کہ ''ممدوٹ وزارت مسلم لیگ کی وزارت ہے اور وہ اپنے تمام افعال و اقدامات کے لئے کونسل کے سامنے جوابدہ ہے۔ کونسل کو قومی پارلیمنٹ کی حیثیت حاصل ہے۔'' نوائے وقت کا اس انتخاب پر تبصرہ یہ تھا کہ ''وزارتی پارٹی کے رکن بعض ایم۔ ایل۔ اے اصحاب نے صدیقی صاحب کے خلاف ووٹ دیا...... کئی سرکاری افسروں کے خلاف یہ شکایت سننے میں آئی کہ وہ دولتانہ صاحب کے لئے کنویسنگ میں مصروف رہے اور حکومت کے ایک محکمہ کی پوری مشینری ایک آدھ استثنیٰ کے سوا صدیقی صاحب کے خلاف حرکت میں تھی...... بایں ہمہ اعداد و شمار کی روشنی میں ہم اس نتیجہ کو غریب مگر مخلص کارکنوں کی فتح سمجھتے ہیں...... صوبہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ غریب و مخلص کارکنوں نے اس کامیابی کے ساتھ ''حکمران خاندانوں'' کے متحدہ محاذ کو چیلنج کیا۔ یہ اعداد و شمار ظاہر کرتے ہیں کہ جاگیرداروں کا قصرِ رفیع اپنی ظاہری سطوت و استحکام کے باوجود اندر سے کھوکھلا

ہو چکا ہے اور جمہور بتدریج مگر یقینی طور پر بیدار ہو رہے ہیں۔"[11] اداریہ نویس کا یہ تجزیہ خودفریبی پر مبنی تھا۔ دراصل یہ انتخاب درمیانہ طبقہ کی جاگیردار طبقہ پر سیاسی فتح کی علامت نہیں تھا بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوا تھا کہ اب پنجاب میں خاندانی جاگیرداروں کے ہاتھوں ناتجربہ کار درمیانہ وسرمایہ دار طبقوں کی سیاسی شکست کا عمل آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔ ممدوٹ وزارت اب تھوڑے ہی عرصے کی مہمان تھی۔ کیونکہ اسمبلی پارٹی کے موقع پرست ارکان کو معلوم ہو گیا تھا کہ آئندہ ہوا کا رُخ کس طرف ہوگا۔

چنانچہ اس انتخاب کے ہفتہ عشرہ بعد پاکستان ٹائمز نے صفحہ اول پر جلی عنوان کے ساتھ یہ خبر شائع کی کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے 81 ارکان میں سے 41 نے پارٹی کے صدر اور سیکرٹری کے نام ایک خط بھیجا ہے جس میں ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ جلد از جلد پارٹی کا اجلاس بلائیں اور اس امر کا امکان ہے کہ اس اجلاس میں خان افتخار حسین ممدوٹ کی لیڈرشپ کو چیلنج کیا جائے گا۔ چونکہ یہ خبر سچی تھی اس لئے مدیر نوائے وقت اور ممدوٹ کی پرائیویٹ کابینہ کے دوسرے ارکان کو عدم اعتماد کی اس تحریک سے بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ انہیں بہت جلدی ہی پتہ چل گیا کہ جس انتخاب کے اعدادوشمار کو وہ اپنی فتح کی علامت کہتے تھے وہ دراصل ان کی فوری شکست کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ چنانچہ نوائے وقت میں اس خبر پر جو ادارتی تبصرہ شائع ہوا اس میں بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔ اداریے میں پہلے تو متذکرہ ارکان اسمبلی پر مؤدبانہ الفاظ میں بے اصولی، اقتدار پرستی اور سیاسی سودابازی کے الزامات عائد کئے گئے اور پھر انہیں کمیونزم کا بھوت دکھایا گیا۔ انہیں متنبہ کیا گیا کہ "ایک طرف صوبہ کے نظم ونسق کو کمزور کر کے اور دوسری طرف اپنے اس خودغرضانہ عمل سے عوام میں بددلی و مایوسی پھیلا کر وہ ایک نئی قوت کی نشوونما اور فروغ کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ یہ نئی قوت کمیونزم کی ہے۔ ہم کسی کو کمیونزم سے ڈرانا نہیں چاہتے۔ لیڈروں سے صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا وہ جان بوجھ کر اشتراکیت کے لئے یہ سازگار فضا پیدا کر رہے ہیں یا وہ......معاف فرمائیے گا......اتنے احمق ہیں کہ اُنہیں اس امر کی مطلق کوئی خبر نہیں کہ ان کی مساعی نامسعود قوم کی کشتی کو کس گرداب کی طرف دھکیل رہی ہیں۔"[12] یہ تبصرہ اسی شخص نے لکھا تھا جس نے مسلم لیگ کے صدارتی انتخاب سے ایک دن قبل اس انتخاب کو غریبوں اور امیروں کے درمیان طبقاتی جدوجہد کا آئینہ دار قرار دیا تھا اور غریبوں کو تلقین کی تھی کہ وہ متحدہ

محاذ بنا کر جاگیرداری کے بت پر ایک آخری ضرب لگائیں۔ اب اس تبصرے کا پس منظر یہ تھا کہ اگر چہ ممتاز دولتانہ پنجاب میں انتہائی رجعت پسند معاشی قوت یعنی جاگیرداریت کی سیاسی نمائندگی کرتا تھا لیکن وہ میکیاولی کے وضع کردہ ''اصولوں کے مطابق اپنے بیانات اور تقریروں میں ''ترقی پسندانہ'' اصطلاحات اور الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اس نے صدارتی انتخاب کے اُمیدوار کی حیثیت سے جو گیارہ نکاتی منشور شائع کیا تھا اس میں ایک نکتہ یہ تھا کہ ''انقلابات سے محفوظ رہنے کے لئے ہمیں خود انقلابی بننا چاہیے۔ ہمیں دیہات میں کاشت کاروں کے حالات زندگی بہتر بنانے چاہئیں۔ ہمیں اپنے صنعتی مزدوروں کو انتقامی کاروائی سے بچانے کے لئے جدوجہد میں پیش پیش ہونا چاہیے۔ گرانی، بے روزگاری اور ذخیرہ اندوزوں اور منافع خوروں کی سماج دشمن سرگرمیوں کی آئینہ دار موجودہ اقتصادی صورتِ حال ہماری زندگی کے سارے ڈھانچے کو مکمل طور پر تباہ و برباد کردے گی۔ اس حشر سے بچنے کے لئے ہمیں انصاف و معقولیت پر مبنی نظام قائم کرنے کے لئے جرأت سے کام لینا ہوگا''[13] اور اس پس منظر میں نوائے وقت کے اس تبصرے کا مقصد اسمبلی کے جاگیردار ارکان کو یہ بتانا تھا کہ دولتانہ کمیونزم کے فروغ کے لئے فضا سازگار کر رہا ہے اس لئے تمہارے مفادات کا تقاضا یہ ہے کہ تم نواب ممدوٹ کا ساتھ مت چھوڑو جو نظریاتی لحاظ سے نہایت رجعت پسند اور عوام دشمن تھا اور جس کے بیانات اور تقریروں میں اسلام فروشی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ میکیاولی کے صرف ان ''اصولوں'' پر عمل پیرا ہوتا تھا جن کے تحت مذہب کو محض عوام الناس کو فریب دینے کا ایک ذریعہ قرار دیا گیا تھا۔ نوائے وقت کا یہ تبصرہ درحقیقت درمیانہ طبقہ کی موقع پرستی اور بے اصولی کا آئینہ دار تھا۔ اب تبصرہ نگار کو جاگیرداریت کی بجائے کمیونزم سے زیادہ خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

نوائے وقت کے اس تبصرے میں کمیونزم کا جو ہوّا کھڑا کیا گیا تھا وہ بعض بڑے جاگیرداروں کو نجی محفلوں میں بھی دکھایا گیا تھا۔ چنانچہ اس کا کچھ اثر ہوا اور 24 ر دسمبر کو لیگ اسمبلی پارٹی کا جو اجلاس ہوا اس میں دو جغادری یونینسٹ جاگیرداروں سر محمد نواز خان اور سر مہر شاہ نے مسلم لیگ پارٹی میں شامل ہو کر اپنے آپ کو ممدوٹ دھڑے کے ساتھ وابستہ کرلیا۔ دولتانہ نے ان کی مخالفت کی تاہم ان کی شمولیت کی درخواستیں ''متفقہ طور پر'' منظور کر لی گئیں۔ جلسہ کے اختتام پر نواب ممدوٹ نے نوائے وقت کو انٹرویو میں بتایا کہ ''حکومت کے مخالفین کو یہ احساس ہو گیا ہے

کہ وزارت کو بھاری اکثریت کی حمایت حاصل ہے اس لئے غالباً وہ کسی مسئلہ پر رائے شماری کی جرأت نہیں کریں گے۔"[14] اب نوائے وقت کو ان یونینسٹ جاگیرداروں اور عہدیدار ارکان اسمبلی سے کوئی شکایت نہیں تھی اور نہ ہی اسے ان سے کوئی خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ اب جاگیرداریت کے بت پر کوئی ضرب لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب یکا یک باطل حق ہو گیا تھا اور حق نے باطل کی صورت اختیار کر لی تھی۔ 26 ر دسمبر کو صوبائی مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں متحارب دھڑے دست و گریباں ہوئے اور بہت دھینگا مشتی ہوئی۔ بایں ہمہ اس اجلاس میں یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ صوبہ مسلم لیگ کا صدر پنجاب مرکزی لیگ کونسل کے لئے 150 نمائندے نامزد کرے گا۔ ۲۷ دسمبر کو نواب ممدوٹ نے نوائے وقت کو ایک انٹرویو میں دعویٰ کیا کہ جن ارکان نے موصوف کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پر دستخط کئے تھے ان میں سے بعض ارکان نے موصوف کی لیڈر شپ پر دوبارہ اعتماد کا پکا عہد کیا ہے۔

یکم جنوری 1949ء کو نوائے وقت نے ایک مرتبہ پھر "پنجاب کی تذلیل" کی دہائی دی اور لکھا کہ "اس کی وجہ ہمارے وہ بے ایمان اور خود غرض لیڈر ہیں جو ذاتی اقتدار کے لئے بھوکے بھیڑیوں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے وقار کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ اب مرکز کی نظر میں پنجاب کی حکومت کی کوئی عزت ہے نہ اہل پنجاب کی کوئی قدر۔ ان ہوس کے بندوں کی ناپاک سرگرمیوں نے صرف صوبہ کے اندرونی نظم و نسق کو ہی تباہ نہیں کیا صوبہ کے باہر بھی اپنے وطن کی ساکھ برباد کر ڈالی ہے۔" اس اداریہ کی بنیاد اس حقیقت پر مبنی تھی کہ نومبر 1948ء کے اوائل میں وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کو ممدوٹ وزارت میں شامل کرانے کی جو کوشش کی تھی اور نواب ممدوٹ نے اس کوشش کو جس طریقے سے وقتی طور پر ناکام کیا تھا اس سے صوبہ کی انتظامیہ پر بہت برا اثر پڑا تھا اور پھر نومبر کے اواخر میں دولتانہ نے صوبائی لیگ کا صدر منتخب ہونے کے فوراً ہی بعد ممدوٹ وزارت کے خلاف در پردہ اور کھلے عام جو مہم شروع کی تھی اس سے صوبہ کی انتظامیہ میں افراتفری پھیل گئی تھی۔ اس سلسلے میں صوبائی محکمہ تعلقات عامہ کے ریٹائرڈ ڈائریکٹر سید نور احمد نے یونینسٹ جاگیرداروں سے اپنی دیرینہ وفاداری کے باوجود جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر غلط نہیں ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "دولتانہ۔ ممدوٹ جنگ کا پنجاب کو بہت بڑا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ایم، ایل، اے صاحبان کو یکا یک اپنی طاقت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ نواب

ممدوٹ کو آنکھیں دکھانے لگے۔ صبح کو دو تین ایم ایل اے جتھہ بنا کر نواب صاحب سے ملتے اور مطالبہ کرتے کہ ہمارے ضلع کا ڈپٹی کمشنر یا سپرنٹنڈنٹ پولیس ہمارا مخالف ہے اس کا تبادلہ کر دیا جائے ورنہ ہم آپ کے مخالف کیمپ میں جا رہے ہیں۔ چنانچہ تار کے ذریعے تبادلہ کا حکم جاری ہو جاتا۔ شام کو چار پانچ دوسرے ایم۔ ایل۔ اے نواب صاحب کو پکڑ لیتے اور مطالبہ کرتے کہ تبادلے کے احکام کو منسوخ کرو ورنہ ہم مخالف کیمپ میں جاتے ہیں پھر تبادلے کی منسوخی کے احکام جاری ہوتے۔ اس طرح حالات میں عجیب ابتری پیدا ہوگئی۔ اس پر چیف سیکرٹری حافظ عبدالمجید نے احتجاج کیا تو نواب صاحب کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ چیف سیکرٹری دولتانہ سے ملا ہوا ہے۔ سب سے پہلے اس کا تبادلہ کرو۔ سرکاری افسر بھاگے نواب ممدوٹ کے نجی دوستوں کے پاس سفارشیں کرانے آتے تھے اور ایم۔ ایل۔ اے صاحبان کو ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری اُٹھاتے تھے۔ پنجاب کے نظم و نسق کا معیار اور افسروں کا مورال اس سے پہلے کبھی اس حد تک تباہ نہ ہوا تھا جیسے نومبر اور دسمبر 1948ء کی شدید سیاسی تگ و دو کے زمانے میں ہوا۔"[15]

چونکہ نور احمد خود قیام پاکستان سے قبل سر سکندر حیات خان کی یونینسٹ پارٹی اور حکومت کا پروردہ تھا اور ظہورِ پاکستان سے قبل اور بعد میں صوبہ کی بیوروکریسی کا ایک متوسط درجہ کا رکن بھی رہا تھا اس لئے اس کی متذکرہ سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے خیال میں ان دو مہینوں میں بے چارے افسروں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ تو معصوم و مظلوم تھے حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ صوبہ کے انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان کے علاوہ دوسرے بہت سے اعلیٰ سرکاری حکام فی الحقیقت دولتانہ دھڑے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ اس کی وجہ نہ صرف یہ تھی کہ ان افسروں کے یونینسٹ جاگیرداروں سے دیرینہ تعلقات تھے بلکہ انہیں یہ پتہ چل گیا تھا کہ قائداعظم جناح کے انتقال کے بعد ممتاز دولتانہ کا ستارہ عروج پزیر ہے۔ نومبر، دسمبر 1948ء میں لیاقت...... دولتانہ گٹھ جوڑ کے بارے میں کسی کو کوئی شک وشبہ نہیں رہا تھا۔

جنوری 1949ء کے اوائل میں ممدوٹ اور دولتانہ دونوں ہی وزیراعظم لیاقت علی کی طلبی پر کراچی گئے۔ لیاقت علی نے دونوں سے الگ الگ ملاقاتیں کیں لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مسلم لیگ کے آئین میں فروری 1949ء میں قائداعظم جناح کی مرضی کے خلاف جو اس مضمون کی ترمیم کی گئی کہ کوئی وزیر مسلم لیگ کا عہدیدار نہیں ہوسکتا۔ اس کے تحت

دولتانہ بیک وقت صوبہ کا صدر اور وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتا تھا۔ وزیر اعلیٰ کے عہدہ کے دوسرے دو امیدوار فیروز خان نون اور راجہ غضنفر علی خان تھے۔

فیروز خان نون 1946ء سے اس عہدے کا متمنی تھا اور ہمہ وقت اپنی اس خواہش کی تکمیل میں مصروف رہتا تھا۔ راجہ غضنفر علی خان ان دنوں تہران میں پاکستان کا سفیر تھا لیکن وہ اس شرمناک کشمکش اقتدار میں حصہ لینے کے لئے خاص طور پر لاہور آ گیا تھا۔ مگر ان دونوں کو صوبائی اسمبلی پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی اور بظاہر وزیر اعظم لیاقت علی خان ان دونوں میں سے کسی کے بھی حق میں نہیں تھا۔ وہ دولتانہ کو ہی قابل اعتماد گھوڑا تصور کرتا تھا لیکن اس کی راہ میں نہ صرف لیگ کے آئین کی متذکرہ ترمیم حائل تھی بلکہ اُسے یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ مستحکم وزارت بنا سکے گا۔ اس کی ترغیب پر 81 ارکان اسمبلی میں سے صرف 41 ارکان نے ممدوٹ کے خلاف عدم اعتماد کی قرار داد پر دستخط کئے تھے۔ حالانکہ اسے شوکت حیات، فیروز خان نون، مظفر علی قزلباش اور شیخ کرامت علی کی پر زور حمایت حاصل تھی۔ اس نے اپنی اس کمزوری کی وجہ سے مئی 1948ء میں قائداعظم جناح کے کہنے کے باوجود ممدوٹ کی جگہ وزیر اعلیٰ بننے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ پہلے اسمبلی پارٹی کی بھاری اکثریت میری تائید وحمایت کا یقین دلائے تو میں وزیرِ اعلیٰ بن جاؤں گا۔ بصورت دیگر میں یہ ذمہ داری قبول کرنے سے قاصر ہوں۔ بالفاظ دیگر اس کی خواہش یہ تھی کہ قائداعظم اسمبلی پارٹی کو میری حمایت کرنے اور نواب ممدوٹ کو مرکز میں کسی وزارتی عہدہ پر فائز کرنے کی ہدایت کریں تو میں پنجاب کی عنان اقتدار سنبھال لوں گا مگر قائد نے اُس کی اس خواہش کی تکمیل نہیں کی تھی۔ انہوں نے تو محض پنجاب کے مسلسل وزارتی بحران سے دل برداشتہ ہو کر دولتانہ کو وزیرِ اعلیٰ بننے کی اجازت دی تھی۔ ویسے دل سے وہ اس کے حق میں نہیں تھے حالانکہ گورنر موڈی دولتانہ کی حمایت کرتا تھا اور لیاقت علی خان بھی پس پردہ دولتانہ کے حق میں ہی تاریں ہلاتا تھا۔

جب لیاقت علی خان جنوری 1949ء میں بھی نواب ممدوٹ کو اس تجویز سے متفق نہ کر سکا کہ وہ ممتاز دولتانہ اور فیروز خان نون کو غیر مشروط طور پر اپنی وزارت میں شامل کر لے یا وزارت اعلیٰ سے علیحدہ ہو کر کسی اور کو یہ ذمہ داری سنبھالنے کا موقع دے تو وزیر اعظم پاکستان نے پنجاب کی وزارت اور اسمبلی کو برطرف کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے اس سلسلے میں جو پہلا قدم اُٹھایا

وہ یہ تھا کہ اُس نے 3 رجنوری 1949ء کو مدیر نوائے وقت کے دیرینہ محسن اور ممتاز دولتانہ کے ایک بااثر حریف جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی کو وزیر بے محکمہ کے طور پر اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔ اس کا دوسرا قدم یہ تھا کہ اُس نے اِس کے چھ سات دن بعد پارلیمنٹ سے ایک بل منظور کرایا جس کا مقصد یہ تھا کہ اسمبلی کے ان ممبروں اور وزیروں کے خلاف کاروائی کی جا سکے جو بددیانتی، رشوت ستانی اور اقربا پروری کے مجرم ثابت ہوں۔ یہ Public and Representative Office Disqualification Act (پروڈا) دراصل ایک ایسی تلوار کی حیثیت رکھتا تھا جو لیاقت علی نے ان سارے صوبائی اور مرکزی ارکانِ اسمبلی اور وزراء کے سامنے لٹکا دی تھی جو کسی وقت بھی اس کی کسی بھی طرح مخالفت کرنے کی جرأت کر سکتے تھے اور بظاہر اس قانون کا پہلا ہدف سندھ میں ایوب کھوڑو ہونے والا تھا جسے اپریل 1948ء میں ہر قسم کے بہت سے الزامات کی بنا پر وزارت اعلیٰ کے عہدہ سے برطرف کر دیا گیا تھا لیکن اُس نے دسمبر 1948ء کے اوائل میں صوبائی مسلم لیگ کا صدر منتخب ہو کر یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ مرکزی حکومت کی اس تعزیری کاروائی کے باوجود صوبہ میں بدستور زبردست سیاسی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس قانونی تلوار کا دوسرا وار یقیناً نواب ممدوٹ پر پڑنے والا تھا جس کا باغیانہ رجحان روز بروز خطرناک صورت اختیار کر رہا تھا۔ تاہم نوائے وقت نے اس بل پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ سب سے پہلے تحقیقات پنجاب کے موجودہ اور سابق وزیروں کے متعلق کی جائے۔ ایک ٹربیونل مقرر کیا جائے جو ایک طرف خان افتخار حسین، سردار عبدالحمید دستی، میاں نوراللہ، میجر مبارک علی اور چودھری فضل الٰہی کے اعمالناموں کا جائزہ لے اور دوسری طرف میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات خان اور شیخ کرامت علی کے خلاف الزامات کی تحقیقات کرے...... گورنر جنرل اُن افراد کو جن کے متعلق یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہو کہ وہ رشوت ستانی، کنبہ پروری اور بدعنوانی کے مجرم ہیں، وزارت و ممبری کے حق سے محروم کر دیں تا کہ پنجاب کی سیاسی زندگی غلاظت سے پاک ہو جائے اور عوام کو آئے دن کے جھگڑوں سے نجات نصیب ہو۔"[16] مطلب یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت نے جو قانونی ہتھیار نواب ممدوٹ کے خلاف استعمال کرنے کے لئے بنایا ہے وہ دولتانہ کے خلاف استعمال کیا جائے تا کہ پنجاب کی سیاسی زندگی غلاظت سے پاک ہو جائے۔ لیکن کراچی میں تو کچھ اور ہی فیصلہ ہو گیا ہوا تھا جس پر آئندہ چند دنوں میں عمل ہونے والا تھا۔

وزیراعظم لیاقت علی خان اس مقصد کے لئے 20رجنوری کولاہور پہنچااوراسی دن ممتاز دولتانہ نے اس سے ملاقات کی۔ 21رجنوری کو پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر چودھری خلیق الزماں بھی لاہور پہنچ گیا اور پھر 24رجنوری کوممتاز دولتانہ کی تحریری تجویز کے مطابق نہ صرف ممدوٹ وزارت کو بلکہ صوبائی اسمبلی کوبھی برطرف کردیا گیا۔ فیروز خان نون کولیاقت علی کی اس کاروائی سے بہت صدمہ ہوا کیونکہ اس کا دعویٰ تھا کہ اسے اسمبلی پارٹی کی اکثریت کی حمایت حاصل ہوگئی تھی اس لئے وہ وزیراعلیٰ بننے کا مستحق تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جنوری1949ء میں ''تیسری بار مسلم لیگ ہائی کمان نے مجھے قیادت سے محروم کردیا۔ یہ آزادی کا تیسرا سال تھااور پنجاب اسمبلی کے ارکان اپنے پارٹی لیڈر کے انتخاب میں مرکزی ہائی کمان کی مداخلت کے خلاف سرکشی پر آمادہ تھے۔ خواجہ ناظم الدین اس وقت گورنر جنرل تھے۔ جس دن مجھے لیڈر منتخب کیا جانے والا تھا اس سے ایک روز پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان لاہور آئے۔ مسٹر دولتانہ کی کوٹھی پر ایک عشائیہ کا اہتمام تھا۔ یہیں ہمیں اطلاع ملی کہ مرکزی حکومت کے احکام کے تحت قانون ساز اسمبلی کوتوڑ دیا گیا ہےاور پرانے آئین کی دفعہ 92 کے تحت جواُس وقت نافذ تھا گورنر تمام اختیارات خودسنبھال لیں گے۔ میں نے نوابزادہ لیاقت علی خان سے پوچھا کہ آخراس کا سبب کیا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ مسٹر دولتانہ اورنواب ممدوٹ دونوں نے فرداًفرداًاس مضمون کی تحریر مجھےلکھ کردی ہے کہ صوبہ میں کوئی مستحکم وزارت قائم نہیں ہوسکتی لہٰذا میں نے قانون ساز اسمبلی کومعطل کردیا ہے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی کچھ نہیں پوچھا جسے پارٹی کی اکثر ارکان کی حمایت حاصل تھی اور نہ انہوں نے پارٹی یااس کے ارکان سے کوئی مشورہ کیا۔ صرف دواُمیدواروں کا مشورہ، جواپنی کامیابی کی طرف سے مایوس تھے ایک معقول عذرتسلیم کرلیا گیا۔''[17] فیروز خان نون کی اپنے بارے میں یہ خوش فہمی صحیح نہیں تھی۔ حقیقت بہت حد تک وہی تھی جونوائے وقت نے کئی دن پہلے اپنے 8رجنوری کے اداریے میں لکھی تھی۔ اس اخبار کا تجزیہ یہ تھا کہ ''فیروز خان نون کوصرف 14 ارکان کی حمایت حاصل تھی۔ ممتاز دولتانہ نون کو وزیراعلیٰ بنانے کے حق میں نہیں تھااور نہ ہی وہ راجہ غضنفر علی خان کے حق میں تھا بلکہ وہ خوداس عہدے کا امیدوار تھا'' اوراُس کی یہ امید 1946ء میں منتخبہ اسمبلی کے ارکان کی حمایت سے پوری نہیں ہوسکتی تھی۔

تاہم لیاقت علی خان کے اس فیصلے کی اصلی وجہ پر چودھری محمد علی نے روشنی ڈالی ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ لیاقت علی خان کا منصوبہ یہ تھا کہ ”آئینی مسائل کو طے کرنے سے پہلے باری باری ہر صوبے میں اور اس کے بعد مرکزی اسمبلی کے انتخابات کرائے جائیں۔ انہوں نے اپنے اس منصوبے سے مجھے اور بعض دوسرے اصحاب کو آگاہ کیا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ترمیم شدہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر مبنی عبوری آئین تسلی بخش طور پر کام کر رہا ہے۔ بالغ رائے دہی کی اساس پر عام انتخابات سے جمہوری اداروں کے قیام کی یقینی ضمانت مل جائے گی لیکن صوبائی اور مرکزی قانون ساز اداروں کے انتخابات بیک وقت کرانے سے انتظامیہ اور مسلم لیگ پارٹی کے وسائل پر بے حد بار پڑے گا۔ اس لئے یہ انتخابات مرحلہ بہ مرحلہ ہونے چاہئیں۔ اُن کا آغاز پنجاب سے کیا جائے اور علی الترتیب شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، مشرقی بنگال اور سب سے آخر میں مرکز کے لئے جب عوام سے تازہ سندِ اختیار لے کر نومنتخب حکومتیں باگ ڈور سنبھالیں گی تو پھر آئین سازی کا کام ہاتھ میں لے کر پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا سکے گا۔“[18] بظاہر لیاقت علی خان نے یہ منصوبہ اس امید کی بنا پر بنایا تھا کہ نئے انتخابات کے بعد جو صوبائی اور مرکزی اسمبلیاں وجود میں آئیں گی وہ بالکل اس کی فرمانبردار ہوں گی اور اس طرح وہ نہ صرف اپنے جاگیردارانہ انداز میں حسبِ مرضی حکومت کر سکے گا بلکہ وہ اس مقصد کے لئے حسبِ خواہش آئین بھی مرتب کرالے گا۔ لیکن اسے یہ احساس وشعور نہیں تھا کہ اس منصوبے کے تحت طویل انتخابی عمل میں پورے ملک میں ایسی مخالفانہ سیاسی قوتوں کی نشوونما ہوگی جن کو وہ کنٹرول نہیں کر سکے گا۔ اس نے اپنی اس کوتاہ اندیشی کے باعث پنجاب میں ایسے مقامی شاونزم کو فروغ دیا جو بعد میں نہ صرف اُس کی ذات کے لئے بلکہ پورے ملک کے وجود کے لئے نہایت خطرناک ثابت ہوا۔ اُس نے تقریباً ایک سال قبل پنجاب میں دولتانہ کے ساتھ جو جاگیردارانہ جوڑ توڑ شروع کیا تھا اس کی اسے اور ملک وقوم کو بڑی مہنگی قیمت ادا کرنا پڑی۔

لیاقت علی نے جب یہ غیر جمہوری کاروائی کی تھی اس وقت پنجاب میں کشمیر کی جنگ بندی کے باعث اس کے خلاف بڑی مخالفانہ رائے عامہ پیدا ہو چکی تھی۔ اس جنگ بندی سے پنجابی عوام بالعموم اور کشمیری مہاجرین بالخصوص سخت خفا تھے اور فوج میں بھی غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق پاکستان میں جنگ بندی کے فیصلے کو غیر دانشمندانہ قرار دے کر اس پر سخت تنقید کی جاتی تھی اور یہ دلیل دی جاتی تھی کہ ”کشمیر میں مقابلہ آرائی میں پاکستانی فوج

نے ہندوستانی فوج پر اپنی فوقیت ثابت کر دی تھی۔ پیشتر اس کے کہ ہندوستان، پاکستان کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا، پاکستانی فوج کشمیر کو لے سکتی تھی۔ پاکستان کو معلوم تھا کہ ہندوستان استصواب میں سدراہ بننے اور کشمیر پر اپنے فوجی قبضہ کو برقرار رکھنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔ پاکستان کا اقوام متحدہ پر یہ اعتماد کہ وہ استصواب کرا سکے گی، سراسر بے جواز اور عقل سلیم کے خلاف تھا۔''[19] میجر جنرل فضلِ مقیم لکھتا ہے کہ پاکستانی فوج نے بیری پتن کے پل پر حملہ کرنے کے لئے 6 ردسمبر کا دن مقرر کیا ہوا تھا...... لیکن مقررہ تاریخ پر اجازت نہیں دی گئی۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ 6 ردسمبر کو نئی دہلی میں پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ایک اہم بین المملکتی کانفرنس شروع ہو گئی اور دوسرے یہ کہ اس وقت پاکستان کے وزیر خارجہ چودھری ظفر اللہ خان اقوام متحدہ کی زیر نگرانی ہندوستانی نمائندے سے سیاسی گفت وشنید میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ اپنے نمائندے کو ہندوستانی حکومت اپنی کامیابیوں سے باخبر رکھ رہی تھی لہٰذا وہ جنگ بندی کے معاہدے میں تاخیر کر رہا تھا تا کہ ہندوستانی فوج کو اتنا وقت مل جائے کہ وہ کشمیر کو فتح کر سکے۔ ادھر حکومت پاکستان بدستور اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ ایک پر امن فیصلہ ہو جائے گا۔ چنانچہ مجوزہ حملہ برابر ملتوی ہوتا رہا۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا ہندوستانیوں کو اندازہ ہوتا گیا کہ پاکستانی فوجیں کہاں کہاں جمع ہیں۔ چنانچہ اس علاقے میں ان کی ہوائی فوج کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بالآخر حسب معمول وہ (ہندوستانی) خود ہی پاکستان کے آڑے آئے اور اُسے فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ کشمیر کی جنگ کے سب سے زبردست ہوائی حملے میں ہندوستانی ہوائی جہازوں نے کوٹلی کے قریب پالک کے مقام پر پاکستان کے ذخیروں پر کامیابی سے بم برسائے۔ ہندوستانیوں کی اس کاروائی سے یہ ثابت ہو گیا کہ پاکستان بدلہ لینے میں حق بجانب ہوگا۔ چنانچہ اس منصوبے پر عمل کرنے کی آخر کار اجازت مل ہی گئی۔ 14 ردسمبر کو سہ پہر کے وقت توپوں کی گونج میں ترمیم شدہ منصوبہ ''وینس'' عمل میں آیا۔ توپچیوں نے بہت محنت کی تھی اور فقط اندازے سے ہدفوں کا اندراج کیا تھا اس موقع پر گولہ باری کا بہترین مظاہرہ کیا گیا۔ کیپٹن (بعدہ لیفٹیننٹ کرنل) شیر دل خان نیازی کی نشاندہی پر بیری پتن کے علاقہ میں دشمن کی تلاش کے لئے میڈیم بیٹری فائرعین اس وقت انتہائی مارول میں شروع کیا گیا جبکہ روزمرّہ رسد کا ہندوستانی قافلہ شمال جانے کے لئے پل کے قریب پہنچ رہا تھا۔ بیری پتن پل کے چاروں طرف تقریباً دو میل تک ہندوستانی فوج کے

راشن، پٹرول، کپڑے اور گولہ بارود کے ذخیرے تھے۔ اس گولہ باری سے ان میں آگ لگ گئی جس کا دُھواں 20 میل سے نظر آتا تھا۔ خود پل کو بھی بہت نقصان پہنچا۔ نوشہرہ پر ہندوستانی ڈویژن کے ہیڈکوارٹرز میں اینٹی ائرکرافٹ توپوں کے گولوں سے دہشت اور ابتری پھیل گئی۔ پُل کے شمال میں جو ہندوستانی سپاہ تھی اور جس کا دارومدار اس سڑک پر تھا وہ عام رسد اور گاڑیوں وغیرہ سے محروم ہوگئی۔ ہندوستان سے نئی نئی آئی ہوئی ایک بٹالین کو کالی دھر سے پٹن کی طرف بڑھنے کے دوران 5/13 فرنٹیئر فورس رائفلز والوں سے بہت بُری طرح نقصان پہنچا۔ اس گولہ باری سے ہندوستانی بُری طرح کھلبلائے۔ انہیں یہ بالکل توقع نہ تھی کہ اس علاقے میں توپیں پہنچا کر فائر کیا جا سکتا ہے۔ ان کے لئے صورت حال بہت خطرناک ہوگئی۔ اس طرح جب پہلی دفعہ باقاعدہ منصوبہ بنا کر جوابی حملہ کیا گیا تو ہندوستان نے گھٹنے ٹیک دیئے اور بہت جلد جنگ بندی کا مطالبہ کر دیا۔ لیکن پاکستانی فوج ششدرہ گئی کہ عین اس وقت جب پاکستان کو کشمیر میں سب سے نمایاں کامیابی ہو رہی تھی وہ جنگ بندی منظور کرنے کے لئے فوراً آمادہ ہوگیا۔‘‘[20]

لیاقت علی خان نے جب یکم جنوری 1949ء کو نہرو کی تجویز کے مطابق اور برطانوی سامراج کے دباؤ کے تحت کشمیر میں جنگ بندی کا فیصلہ کیا تھا تو اس نے اس مسئلہ پر پنجاب کی رائے عامہ کی شدت کا بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ چنانچہ اس کی اس سنگین غلطی سے اس کے سیاسی مخالفین نے خوب فائدہ اُٹھایا۔ پہلے تو 14 رجنوری کو ممدوٹ دھڑے نے کشمیر مسلم کانفرنس کے صدر اور آزاد کشمیر کے سربراہ چودھری غلام عباس سے ایک بیان دلوایا جس میں مغربی پنجاب کے سیاسی زعماء کی جنگ اقتدار پر افسوس کرتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ’’اس وقت جبکہ کشمیری مسلمان موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں مغربی پنجاب کے لیڈروں کی باہمی رقابت حد درجہ قابل مذمت ہے۔ ان لیڈروں کو یہ احساس نہیں ہے کہ وہ اپنے ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے قومی وقار کو نیست و نابود کر رہے ہیں‘‘ اور پھر 17 رجنوری کو نوائے وقت نے چودھری غلام عباس کے اس بیان پر اداریے میں لکھا کہ ’’لیگ اور وزارت آپس میں اُلجھی ہوئی ہیں۔ لیگ کی مشینری کو کشمیر کی جنگ پر مرتکز کرنے کی بجائے اقتدار کی جنگ جیتنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے اور وزارت کشمیر کے تحفظ کی لڑائی لڑنے کی بجائے اپنے تحفظ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے نتیجہ یہ ہے کہ کشمیر کی طرف سے دونوں غافل ہیں۔‘‘[21] میجر جنرل فضل مقیم کہتا ہے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کو جنگ

بندی کی بنا پر فوج میں پیدا شدہ خفگی کا علم تھا۔ چنانچہ جب وہ 24/جنوری کو پنجاب میں وزارت اور اسمبلی کو برطرف کرنے کے بعد پہلی بار کشمیر گیا تو اس نے جوانوں سے بات چیت کے دوران متعدد بار اس سلسلے میں حکومت کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی۔ 27/جنوری کو چناری کے مقام پر جوانوں کو خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا کہ "اگر آپ کو جارحانہ اقدام سے نہ روکا جاتا تو ممکن ہے کہ آپ زیادہ علاقے پر قابض ہو جاتے لیکن پاکستان محض دفاعی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کشمیر کی قسمت کا فیصلہ توپوں کے ذریعے کیا جائے۔ ہماری خواہش ہے کہ کشمیری عوام اپنی قسمت کا فیصلہ ایک پُرامن اور آزاد استصواب رائے سے کر سکیں۔" وہیں ایک اور تقریر کے دوران اس نے ایسے ہی جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا۔" غالباً آپ میں سے کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کی سرگرمیوں کو نہ روکا جاتا تو شاید آج نقشہ کچھ اور ہوتا۔ لیکن ہمارا یہ طرز عمل اس لئے رہا ہے کہ ہم یہ منوانے کے لئے کوشاں ہیں کہ کشمیری اپنی قسمت اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود ہی کریں گے۔"[22] لیاقت علی کی ان تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے جب پنجاب میں گورنر راج نافذ کیا تھا تو اسے قطعاً یہ احساس و شعور نہیں تھا کہ کشمیر کے معاملے میں اس کی اس صلح بندی کے کس قدر خطرناک سیاسی نتائج مرتب ہوں گے۔ اس کے برعکس ہندوستان کے ارباب اقتدار کو لیاقت علی خان کی اس غلطی یا کمزوری کے نتائج کا صحیح اندازہ تھا۔ غالباً اسی بنا پر بمبئی کے اخبارات میں یہ خبریں شائع ہوئی تھیں کہ پاکستان کی کابینہ میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ وزیر خارجہ سر محمد ظفر اللہ خان نے استعفیٰ دے دیا ہے اور غلام محمد عنقریب لیاقت علی کی جگہ وزیر اعظم بنے گا۔ حکومت پاکستان نے ان خبروں کو شر انگیز اور بے بنیاد قرار دے کر ان کی تردید کی تھی۔"[23]

پنجاب میں شہروں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے خلاف جاگیرداریت کی بنیاد پر سیاسی جتھہ بندی کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ اس قسم کی سیاست کی ابتدا دراصل 1924ء میں ہوئی تھی جبکہ سر فضل حسین نے صوبائی گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن کی اجازت و منظوری سے پنجاب کے جاگیرداروں کی ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت نیشنل یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ اس پارٹی کا پہلا مقصد یہ تھا کہ شہروں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے خلاف جاگیرداروں کے سیاسی اور معاشی مفادات کا تحفظ کیا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ دیہات کے چھوٹے بڑے مالکان اراضی کو ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلائی جائے۔ 1936ء میں یو۔ پی میں بھی نواب چھتاری نے

صوبائی گورنر سر میلکم ہیلی اور سر فضل حسین کے کہنے پر اس قسم کی غیر فرقہ وارانہ نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی بنائی تھی اور نوابزادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد 1937ء میں اس پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا تھا۔ تاہم قیامِ پاکستان کے بعد مغربی پنجاب کے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی حالات میں بنیادی تبدیلی آ گئی تھی جس کا نوابزادہ لیاقت علی سمیت پنجاب کے بڑے جاگیرداروں کو احساس نہیں تھا اور ان کا خیال تھا کہ ان کی پرانی سیاست ہی کارآمد رہے گی۔ صوبہ میں اس بنیادی تبدیلی کی نوعیت یہ تھی کہ 14راگست 1947ء کے بعد یہاں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے عزائم یکا یک بہت اُونچے ہو گئے تھے۔ اس طبقہ کے بعض عناصر نوزائیدہ پاکستان میں نہ صرف راتوں رات کروڑ پتی بننا چاہتے تھے بلکہ وہ ملک کی سیاسی اور انتظامی مشینری پر بھی غلبہ حاصل کرنے کے متمنی تھے۔ لہٰذا ان کا نوابزادہ لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ سیاست سے تصادم ناگزیر تھا اور اس مقصد کے لئے انہوں نے نواب ممدوٹ اور حسین شہید سہروردی کے علاوہ مس جناح کا سہارا لیا۔ چونکہ یہ عناصر بنیادی طور پر کوتاہ اندیش اور رجعت پسند تھے اس لئے انہوں نے اپنے سیاسی و معاشی عزائم کی تکمیل کے لئے جاگیرداری نظام پر بھرپور وار کرنے کی بجائے بڑے زور وشور سے صوبائی شاونزم کا نعرہ لگانا شروع کر دیا اور اس طرح انہوں نے ملک کی مختلف قومیتوں کے درمیان ہر قسم کے اختلافات میں شدت کا سامان مہیا کر دیا۔

کشمیر کی جنگ بندی نے پنجابی شاونزم کے ساتھ مل کر لیاقت علی خان کے خلاف پنجاب کے شہروں میں سیاسی فضا اس قدر زہر آلود کر دی کہ اس کے لئے کسی پبلک جلسے کا انتظام کرنے میں بڑی مشکل پیش آنے لگی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 1949ء میں ملک کی معاشی حالت بھی 48۔1947ء کے مقابلے میں اچھی نہیں تھی۔ اس سال پارچہ بافی کے کارخانوں اور دوسرے صنعتی یونٹوں میں 72 ہڑتالیں ہوئیں جن میں 44582 مزدوروں نے حصہ لیا۔ لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری کے کام میں بڑی مشکلات پیش آ رہی تھیں جبکہ ضروریات زندگی کی قیمتوں اور بے روزگاری میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پنجاب کی وزارت اور اسمبلی کی برطرفی سے چار پانچ دن قبل لاہور میں محکمہ ریلوے اور دوسرے مرکزی محکموں کے ملازمین نے زبردست مظاہرہ کیا تھا جس کے دوران انہوں نے پُرجوش نعروں کے ذریعے یہ مطالبہ کیا تھا کہ ''تنخواہ کمیشن کی سفارشات پر عمل کیا جائے، انتظامیہ میں رشوت ستانی اور اقربا نوازی کا ازالہ کیا جائے،

سیفٹی ایکٹ منسوخ کیا جائے اور مزدور لیڈروں کو رہا کیا جائے۔ ہر مزدور نے اپنے سینے پر، ہم بھوکے ہیں، کا بیج لگایا ہوا تھا۔"[24]

نواب ممدوٹ نے 24/جنوری کو ایک اخبار نویس سے ملاقات کے دوران اپنی وزارت اور صوبائی اسمبلی کی برطرفی کے بارے میں گورنر جنرل کے اعلان پر کوئی تبصرہ کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم اگلے دن اس کے ترجمان اخبار نوائے وقت کی رپورٹ یہ تھی کہ صوبائی اسمبلی کے ٹوٹنے سے دولتانہ کی آرزوئے وزارت پر پانی پھر گیا ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ اپنے ساتھ اسمبلی کے ممبروں کو بھی لے ڈوبے ہیں۔ وزارت تو کیا ملتی اسمبلی کی ممبری بھی ہاتھ سے گئی۔ اس رپورٹ میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ چونکہ جب دولتانہ کا صوبائی مسلم لیگ کے صدر کے طور پر انتخاب ہوا تھا تو اس میں ارکان اسمبلی نے ووٹ دیئے تھے اس لئے اب دولتانہ آئینی طور پر صوبائی مسلم لیگ کا صدر بھی نہیں رہ سکتا۔ نوائے وقت کی اس رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت اس کا ایڈیٹر اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ یہ ساری کاروائی دولتانہ اور لیاقت کی ملی بھگت سے ہوئی ہے کیونکہ وزیراعظم پاکستان انتخابات کے بارے میں اپنے متذکرہ منصوبہ کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ 26/جنوری کو نوائے وقت نے اپنے اداریے میں الزام عائد کیا تھا کہ دولتانہ نے پنجاب کو گورنر راج کا تحفہ دیا ہے۔ وہ سال بھر سے جو چالیں چل رہا تھا اور سازشوں میں مصروف تھا ان کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا اور موجودہ حالات میں اس کے بغیر کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ نظم ونسق حکومت کو اس جنگ اقتدار میں فٹ بال بنانے کی بجائے سرکاری ملازموں کے حوالے کر دیا جائے۔ اس اداریہ کی بنیاد بھی اسی غلط فہمی پر تھی کہ صوبہ میں گورنر راج صرف دولتانہ کی سازش کا نتیجہ ہے اور اس کے پس پردہ لیاقت علی کی کسی خواہش یا منصوبے کی کارفرمائی نہیں ہے۔ اس سلسلے میں گورنر جنرل کی طرف سے جو اعلان جاری کیا گیا تھا اس میں نئے انتخابات کا ذکر تو کیا گیا تھا لیکن یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ وزیراعظم کے طویل المیعاد انتخابی منصوبے پر مبنی ہے۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ "بدعنوانی سے امور عامہ پر بددلی سایہ فگن ہوگئی ہے اور سازشوں کی وجہ سے سرکاری ملازمتوں میں نظم وضبط ختم ہو گیا ہے۔ اس صورت حال تک پہنچانے میں کئی عوامل اور اسباب نے حصہ لیا ہے لیکن گورنر جنرل کے خیال میں اس معاملے کی سب سے اہم وجہ ارکان اسمبلی کے اپنے فرائض ادا کرنے میں ناکامی ہی ہے۔ اسمبلی کالعدم قرار دینے کا فرمان اور نئے انتخاب کرانے کا فرمان اس وقت تک

نافذ رہے گا جب تک انتخابات کے بعد گورنر اپنے اطمینان کے مطابق اسمبلی کے اتحاد سے بہرہ ور وزیر مقرر نہیں کرتا۔''[25] چونکہ اس اعلان سے صوبائی مسلم لیگ کے کونسلروں اور ضلعی عہدیداروں کی چودھراہٹ ختم ہوگئی تھی اس لئے صوبہ کے چھوٹے بڑے شہروں میں بہت غیر موافق ردعمل ہوا۔ تاہم روزنامہ ڈان کی ایک خبر میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ وزیراعظم کو اس کارروائی پر لاتعداد تہنیتی تار موصول ہوئے ہیں۔''[26] وزیراعظم کا اپنا بڑا بیٹا نوابزادہ ولایت علی خان جو نومبر 1948ء میں دولتانہ کی حمایت سے صوبائی مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری منتخب ہوا تھا، گورنر جنرل کے اعلان کا خیر مقدم کرنے والوں میں شامل تھا اور لاہور کارپوریشن نے بھی ایک قرارداد میں ''بے اصول وزیروں اور متوقع وزیروں'' سے نجات ملنے پر خدا کا شکر ادا کیا تھا۔''[27] یکم فروری کو دولتانہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے گورنر راج کے نفاذ کو ایک غیر جمہوری اقدام قرار دیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی نشاندہی کی گئی کہ ''وزارت اس لئے ناکام ہوئی ہے کہ صوبہ میں مسلم لیگ کا وجود نابود ہوگیا تھا اور یہ کہ وزارت نے عام لوگوں سے قریبی رابطہ قائم رکھنے کی ضرورت کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔''[28] اس قرارداد سے ظاہر ہے کہ دولتانہ نے اپنی ورکنگ کمیٹی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ صوبہ میں گورنر راج نافذ کرنے کا فیصلہ دراصل جنوری کے اوائل ہی میں ہوگیا تھا۔ جبکہ وہ وزیراعظم پاکستان کے ساتھ صلاح مشورے کے لئے کراچی گیا تھا۔ دولتانہ کی سیاست اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ دوغلی اور منافقانہ ہوتی تھی۔ پنجاب کا کوئی سیاسی لیڈر یا کارکن اس کی کسی بات پر اعتبار نہیں کرتا تھا اور یہی بات تین چار سال کے بعد اس کی سیاسی موت کا باعث بنی۔

فروری کے پہلے دو ہفتوں میں ممدوٹ دھڑے سے منسلک متعدد ضلعی عہدیداروں اور کونسلروں نے دولتانہ کی اس دوغلی اور منافقانہ سیاست پر اس وجہ سے سخت نکتہ چینی کی کہ اس نے مرکزی لیگ کونسل کے لئے ان 150 ارکان کے ناموں کا اعلان نہیں کیا تھا جن کی نامزدگی کے بارے میں اس نے صوبائی کونسل کے 25 دسمبر 1948ء کے اجلاس میں اختیار حاصل کیا تھا حالانکہ مسلم لیگ کے آئین کے تحت ان کونسلروں کا صرف انتخاب ہوسکتا تھا، ان کی نامزدگی نہیں ہوسکتی تھی۔ چونکہ مرکزی مسلم لیگ کے عہدیداروں کا صرف انتخاب 20 فروری 1949ء کو ہونے والا تھا اس لئے ان نکتہ چینوں کو شبہ تھا کہ دولتانہ ان 198 صوبائی کونسلروں میں سے 150 مرکزی

کونسلروں کو نامزد کرے گا جنہوں نے نومبر 1948ء میں صوبائی صدر کے انتخاب کے موقعہ پر اس کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ اس پر ایک الزام یہ تھا کہ یہ شخص مرکزی کونسلروں کی نامزدگی کے معاملے کو بطور سیاسی حربہ استعمال کر کے پاکستان مسلم لیگ کی صدارت کے اُمیدوار چودھری خلیق الزماں سے یہ وعدہ لینا چاہتا ہے کہ صوبائی اسمبلی کے آئندہ انتخابات میں اس کی مرضی کے مطابق لیگ ٹکٹ دیئے جائیں گے۔''[29] جب دولتانہ نے فروری کے تیسرے ہفتے میں مرکزی کونسلروں کی نامزدگی کا اعلان کیا تو اس سے ممدوٹ دھڑے اور دولتانہ دھڑے کے درمیان تضاد کی خلیج اور بھی وسیع ہو گئی کیونکہ ان میں ممدوٹ دھڑے کو اس کی حسب خواہش نمائندگی نہیں ملی تھی۔ اس دھڑے کا ایک اور الزام یہ بھی تھا کہ چودھری خلیق الزماں نے ان غیر آئینی نامزدگیوں کو محض اس لئے ناجائز قرار نہیں دیا تھا کہ دولتانہ ووٹ اس کی جھولی میں ڈال دے گا۔ 20رفروری کو پاکستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کا پہلا انتخاب ہوا تو اس الزام کی بہت حد تک تصدیق ہوگئی جبکہ چودھری خلیق الزماں بلا مقابلہ پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ اعتراض نتیجہ یہ نکلا کہ مرکزی لیگ کے دوسرے عہدیداروں کے انتخابات میں کوئی عہدہ بھی پنجاب کو نہ ملا۔ جنرل سیکرٹری کے عہدے کے لئے صوبہ سرحد کے یوسف خٹک اور پنجاب کے عبدالباری کے درمیان مقابلہ ہوا جس میں یوسف خٹک 16 ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔ یوسف خٹک کو ایک سو باسٹھ اور عبدالباری کو 146 ووٹ ملے۔ نائب صدر کا عہدہ مشرقی بنگال کے عبدالباقی کو ملا۔ ایک جائنٹ سیکرٹری غیاث الدین سندھ سے اور دوسرا نبی بخش بلوچستان سے لے لیا گیا۔

باب: 7

وزیر اعظم لیاقت علی خان کے بالا حصار پر
پنجابی شاونزم کی شدید گولہ باری

پاکستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کے اس پہلے انتخاب سے پنجابی شاونزم کو بہت ہوا ملی۔ پاکستان ٹائمز کی اسی دن کی رپورٹ یہ تھی کہ مسلم لیگ کونسل کے پنجابی ارکان کو اس انتخاب سے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ اگرچہ مسلم لیگ کے کل 25 لاکھ ممبروں میں سے 11 لاکھ پنجاب میں ہیں لیکن اس کے باوجود پنجاب کے اُمیدواروں کو دانستہ طور پر کوئی عہدہ نہیں دیا گیا۔ کونسل کے اس اجلاس میں آٹھ رکنی مرکزی پارلیمانی بورڈ کا انتخاب بھی عمل میں آیا جس کے تین پنجابی ارکان عبدالکریم، سید خلیل الرحمان اور نصیر احمد ملہی دولتانہ دھڑے سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ ممدوٹ دھڑے کی طرف سے صوبہ بھر میں یہ پروپیگنڈا مہم شروع ہوگئی کہ لیاقت علی خان اور چودھری خلیق الزماں نے پنجاب کے خلاف مشرقی بنگال، بلوچستان اور سرحد کے مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ ناپاک گٹھ جوڑ کر لیا ہے اور دولتانہ نے محض ذاتی اقتدار کے حصول کے لئے پنجاب سے غداری کی ہے۔ اس مہم کا پہلا ہدف چودھری خلیق الزماں تھا کیونکہ صوبہ کے ہر باخبر شخص کو پتہ تھا کہ قائداعظم جناح نے اس شخص کو ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کا قائد نامزد کر کے ہدایت کی تھی کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کے حقوق ومفادات کی ترجمانی کرے۔ چنانچہ جب 15 راگست 1947ء کورات کے بارہ بج کر پانچ منٹ پر دہلی میں انتقالِ اقتدار کی رسم ادا ہوئی تو ہندوستان کے جھنڈے کو سلامی دینے والوں میں یہ بھی شامل تھا اور بعدازاں اس نے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں تقریر بھی کی تھی جس میں اس نے ہندوستان کے نئے ارباب اقتدار

کواپنی اوراپنی مسلم لیگ پارٹی کی وفاداری کا یقین دلایا تھالیکن اس واقعہ کے صرف ڈیڑھ ماہ بعد یعنی 2/اکتوبر 1947ءکو یہ یکا یک فرار ہوکر کراچی پہنچ گیا۔اس کے خاندان کے دوسرے افراد پہلے ہی یہاں آ چکے تھے۔جب اس نے 5/اکتوبر کو کراچی میں گورنر جنرل جناح سے ملاقات کی تو بابائے قوم نے ہندوستانی مسلمانوں سے اس کی غداری پر سخت خفگی کا اظہار کیا تھا اور پھر جب فروری 1948ءمیں پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے یہ شخص بلا مقابلہ ناظم اعلیٰ منتخب ہوا تھا تو قائداعظم نے لیگ کونسل کے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا تھا۔چنانچہ جب تک وہ زندہ رہے انہوں نے اس ناظم اعلیٰ کو کبھی ملاقات کا شرف نہیں بخشا تھا۔

2/مارچ کو نوائے وقت نے ''پنجاب کی تذلیل'' کے عنوان سے ایک نہایت زہریلا اداریہ لکھا جس کے شروع میں تو یہ دعویٰ کیا گیا کہ ''ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو صوبہ پرستی کے جذبے سے سرشار ہیں۔اس کے برعکس ہم نے سب سے پہلے ان کالموں میں یہ آواز بلند کی تھی کہ صوبوں کو توڑ کر پاکستان میں ایک مرکزی حکومت قائم کی جائے۔ہم نے اس تجویز کے حق میں لکھا ہے اور آج بھی ہماری رائے یہی ہے کہ پاکستان کی موجودہ صوبائی حدبندیاں غیر موزوں،نقصان دہ اور اسراف زر کا موجب ہیں اس لئے انہیں ختم کر دینا چاہیے۔''لیکن اس تمہید کے بعد جو کچھ لکھا گیا اس میں پنجابی عصبیت کا اظہار کیا گیا اور یہ الزام عائد کیا گیا کہ ''پنجاب کو جان بوجھ کر ذلیل اور کمزور کیا جارہا ہے۔''اس سلسلے میں کہا گیا کہ ''پنجاب میں گورنر راج نافذ کر کے اسے ذلیل کیا گیا ہے جبکہ سندھ میں ایسا نہیں کیا گیا حالانکہ اس صوبہ کے حالات پنجاب سے بدتر تھے۔''مزید یہ کہ ''قومی جماعت مسلم لیگ کے حلقہ میں پنجاب سے یہ سلوک کیا گیا کہ پاکستان مسلم لیگ کے آدھے ممبر پنجابی،مگر صدر یو۔پی کے مسلمانوں کو عین مصیبت کے وقت چھوڑ کر بھاگ آنے والے خلیق الزماں،نائب صدر بنگال کے مولانا باقی،جنرل سیکرٹری سرحد کے یوسف خٹک،جائنٹ سیکرٹری ایک بنگالی اور دوسرے بلوچستانی اور خزانچی کھوڑو کے خاص آدمی اور ایک مقدمہ میں ان کے ساتھ ملزم مسٹر قریشی......خدا گواہ ہے کہ ہمیں یہ کہتے ہوئے خوشی نہیں ہوتی کہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا جارہا ہے۔مگر خدارا ہمیں کوئی یہ سمجھائے کہ اگر پنجاب اور پنجابیوں کو ذلیل کرنے اور کمزور بنانے کی یہ کوششیں دانستہ نہیں تو کیا یہ محض حسن اتفاق ہے کہ پنجابی سرکاری اہل کاروں کو پنجاب میں ہراساں کیا جارہا ہے۔مرکزی حکومت میں 3 نائب وزراء مقرر کئے جاتے ہیں۔ان

میں سے ایک صاحب یو۔ پی کے ہیں۔ دوسرے بنگالی اور تیسرے سرحدی اور پنجابی کوئی نہیں۔ دائرہ حکومت میں پنجاب کی کوئی آواز نہیں اور مرکزی مسلم لیگ کو دیکھ کر شبہ ہوتا ہے کہ شاید پاکستان میں پنجاب نام کا کوئی صوبہ نہیں۔''[1] یہ اداریہ اس امر کی نشاندہی کرتا تھا کہ اب یہ اخبار پنجابی بیوروکریسی اور پنجاب کے درمیانہ اور نوزائیدہ سرمایہ دار طبقوں کے مفادات کی خاطر مقامی شاونزم کی ایک ایسی راہ پر چل نکلا تھا جو بالآخر پورے ملک کو تباہی کے کنارے پر پہنچا دے گی۔ اس اداریے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ پاکستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب میں سارے غیر پنجابی عناصر نے پنجابی امیدواروں کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیا تھا۔ اگر ادارہ نوائے وقت سیاسی دور اندیشی کی صلاحیت کا حامل ہوتا تو اسے یہ احساس وشعور ہوتا کہ پاکستان کے قیام سے پہلے ہی سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے بعض عناصر کو اس ملک میں پنجابی غلبہ کا خدشہ تھا۔ اس خدشے نے قیام پاکستان کے بعد ڈیڑھ پونے دوسال میں اس بنا پر بہت حد تک ایک حقیقت کی صورت اختیار کر لی تھی کہ پنجابی بیوروکریسی اور نوزائیدہ سرمایہ داروں نے ملک کے مختلف حصوں میں بدترین قسم کی فرعونیت بلکہ سامراجیت کا مظاہرہ کیا تھا۔ مشرقی بنگال میں چیف سیکرٹری عزیز احمد اور صوبائی فوجی کمانڈر میجر جنرل محمد ایوب خان کی فرعونیت کوئی عزت نفس رکھنے والا بنگالی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح سندھ، بلوچستان اور سرحد میں پنجابی افسروں بالخصوص چھوٹے بڑے پنجابی پولیس اہل کاروں کی رعونت انتہائی اشتعال انگیز تھی۔ جب نوائے وقت یہ لکھتا تھا کہ ''موجودہ صوبائی حد بندیاں غیر ضروری، نقصان دہ اور اسراف زر کا موجب ہیں اس لئے انہیں ختم کر دینا چاہیے تو اس طرح وہ پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کی لامحدود ہوس بالادستی کے تحت دراصل پنجابی شاونزم اور صوبہ پرستی کا بدترین مظاہرہ کرتا تھا اور اس بنا پر ملک کے دوسرے صوبوں کے لوگوں کو پنجابی غلبہ کا اور بھی خوف لاحق ہو جاتا تھا۔ انہیں یہ محسوس ہوتا تھا کہ پنجابی شاونسٹ انہیں سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی حقوق سے بالکل ہی محروم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ اخبار فروری 1949ء میں تین نائب وزراء ڈاکٹر محمود حسین، سردار بہادر خان اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی تقرری پر ناخوش تھا کیونکہ ان میں پنجابی کوئی نہیں تھا لیکن اس نے ایک ماہ قبل پنجابی جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی کی بطور وزیر تقرری پر کسی خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس کا مؤقف یہ تھا کہ ''بے شک مرکز میں

پنجابی وزیر موجود ہیں مگر ان کی پشت پر کوئی صوبائی حکومت نہیں اس لئے یہ بے بس ہیں۔'' گویا یہ ڈاکٹر محمود حسین کو بنگالی محض اس لئے قرار دیتا تھا کہ اسے مشرقی بنگال کی اسمبلی سے مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب کرایا گیا تھا۔

10 / مارچ کو نوائے وقت نے ''دوسرا شرق اردن'' کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا جس میں اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ صوبہ میں انگریز گورنر اور افسروں کا راج نافذ کر دیا گیا ہے۔ یہ کہا گیا تھا کہ ''ہندوستان انگریزوں سے ہر ممکن رعایت اور امداد حاصل کر رہا ہے مگر اس کے باوجود حکومتِ ہند نے اپنی فوج میں سے بھی انگریز افسروں کا نکال دیا ہے مگر پاکستان کو ہندوستان کے مقابلہ پر دسواں حصہ امداد بھی نہیں مل رہی بلکہ اسے کمزور بنانے کا کوئی موقعہ برطانیہ نے ہاتھ سے نہیں جانے دیا اس کے باوجود خدا جانے ہمیں انگریز کی کونسی ادا بھا گئی ہے کہ ہم اپنی حماقت سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کو دوسرا شرق اردن بنانے کے درپے ہیں۔''[2] بظاہر یہ اداریہ ترقی پسندانہ تھا لیکن اس کی بنیاد سامراج دشمنی پر نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد لیاقت دشمنی اور پنجابی شاونزم پر تھی۔ اس زمانے میں انگریز سول اور فوجی افسروں کی پورے پاکستان میں بہتات تھی لیکن مدیر نوائے وقت کو ملک کے شرق اردن بننے کا خطرہ پنجاب میں گورنر راج نافذ ہونے کے بعد ہی محسوس ہوا تھا۔ اس اداریے کی ایک وجہ یہ تھی کہ یکم جنوری 1949ء کو کشمیر میں جنگ بندی کے بعد پنجاب میں برطانوی سامراج اور لیاقت علی خان کی سامراج نواز خارجہ پالیسی کے خلاف سخت غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ جس کا اظہار جگہ جگہ اس مطالبے کی صورت میں ہونے لگا تھا کہ پاکستان کو برطانوی کامن ویلتھ سے اپنا تعلق منقطع کر لینا چاہیے۔ لہٰذا پنجاب کے عوام کے سامراج دشمن جذبات سے فائدہ اٹھا کر لیاقت حکومت کے وقار پر مؤثر ضرب لگائی جا سکتی تھی۔ مزید برآں اس طرح ضلعی مسلم لیگوں کے ان عہدیداروں اور کونسلروں کو صدر صوبہ مسلم لیگ ممتاز دولتانہ سے برگشتہ کیا جا سکتا تھا جن کا گورنر راج نافذ ہونے کے بعد مقامی انتظامیہ میں اثر ورسوخ یکا یک ختم ہو گیا تھا۔ اب کسی ضلع کی بیوروکریسی ان مسلم لیگیوں کو منہ نہیں لگاتی تھی اور نوائے وقت کے بیان کے مطابق ''اکثر (یونینسٹ) اب نوکر شاہی کی سرپرستی میں پبلک لائف میں واپس آنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گورنر راج میں وہی افسر اب واپس آ رہے تھے جو پکے یونینسٹ تھے یا یونینسٹ نواز یا ان سے مرعوب۔''[3]

اسی دن یعنی 10 / مارچ کو ہی پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے ایک بیان جاری کر دیا جس سے یہ محسوس ہوا کہ اس نے پنجابی شاونزم کی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ اس کا بیان یہ تھا کہ پنجاب میں ایک ایسا پارلیمانی بورڈ قائم کیا جائے جسے عوام کی مرضی کے لیڈروں اور پارٹی کا تعاون حاصل ہو۔ پاکستان ٹائمز کی 11 / مارچ کی ایک رپورٹ کے مطابق خلیق الزماں کے اس بیان سے پنجاب کے اخبارات میں اس کے خلاف ایک زبردست مہم شروع ہوگئی۔ روزنامہ زمیندار نے اپنے تبصرہ میں چودھری خلیق الزماں کو متنبہ کیا کہ ''اپنی سازشوں سے پنجاب کو مزید کمزور اور ذلیل نہ کرو۔'' روزنامہ سفینہ نے یہ لکھا کہ عیاری، جوڑتوڑ، سازش اور دغابازی کے دیوتا چودھری خلیق الزماں نے ایک اور گندی کوشش کی ہے کہ خود کو اور اپنے طفیلیوں کو عوام پر مسلط رکھے۔ اس اخبار کی مزید رائے یہ تھی کہ مسلم لیگ کو ختم کرنے کی ذمہ داری چودھری خلیق الزماں پر عائد ہوتی ہے اور نوائے وقت نے الزام عائد کیا کہ پنجاب کے ممبروں کو مرکزی لیگ میں ہر عہدے سے محروم رکھنے کے لئے پنجاب کے خلاف جو متحدہ محاذ بنایا گیا تھا اس کا ایک سرپرست چودھری خلیق الزماں بھی تھا۔ کیونکہ اس وقت وہ صدر منتخب ہو چکا تھا اور اس کو پنجاب کے ووٹوں کی ضرورت نہ رہی تھی۔ لیکن ''اب وہ ناصح مشفق بن کر بڑے معصومانہ انداز میں ہمیں یہ نصیحت کرتا ہے کہ حالات کی نزاکت کا احساس کرو...... یعنی بے ایمانیاں اور بے ضابطگیاں بھول جاؤ اور ان عہدیداروں کی شان میں قصیدے پڑھو جن کا انتخاب تک ناجائز ہے۔''[4]

چودھری خلیق الزماں کی بدقسمتی تھی کہ اس نے انہی دنوں میں لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا چنانچہ جب وہ 14 / مارچ کو لاہور پہنچا تو ریلوے سٹیشن پر اس کے خلاف کالی جھنڈیوں سے مظاہرہ کیا گیا۔ مظاہرین نے جو کتبے اُٹھا رکھے تھے ان پر ''بھارتی مسلمانوں کا قاتل، واپس جاؤ'' مسلم لیگ کو سازشیوں سے پاک کرو، نامزدگیاں ختم کرو اور اصلی مسلم لیگ بحال کرو، کے نعرے لکھے ہوئے تھے۔ اس مظاہرے کا فوری طور پر نتیجہ یہ نکلا کہ ممتاز دولتانہ نے 16 / مارچ کو صوبائی لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک بیان میں یہ بتایا کہ ''میں صوبہ لیگ کی تنظیم و یکجہتی پیدا کرنے کی غرض سے مستعفی ہوا ہوں۔'' دولتانہ کا یہ استعفیٰ پنجابی شاونزم کی پہلی ''فتح'' تھی اور اس ''فتح'' سے پنجابی شاونسٹوں کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی۔ بظاہر دولتانہ نے یہ استعفیٰ نواب ممدوٹ

کے ساتھ صلح صفائی کے نتیجہ میں دیا تھا اور اس طرح یہ بتایا گیا تھا کہ اتحاد و یک جہتی کی خاطر صوبہ لیگ کا صدر کسی ایسے شخص کو منتخب کیا جائے گا جو دونوں دھڑوں کے لئے قابل قبول ہو گا لیکن اس استعفیٰ کی اصل وجہ یہ تھی کہ جنوری میں اسمبلی کی برطرفی اور فروری میں پاکستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب میں پنجابی امیدواروں کی ناکامی کے باعث مسلم لیگ میں دولتانہ کی بڑی رسوائی اور بدنامی ہوئی تھی لہٰذا اس کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی سیاسی ساکھ کو بحال کرنے کے لئے صدارت سے علیحدہ ہو جائے۔ مزید برآں اُسے یہ اُمید تھی کہ چونکہ صوبائی مسلم لیگ کونسل میں اس کے حامیوں کی اکثریت ہے اس لئے جو شخص بھی صدر منتخب ہو گا وہ اسی کے زیر اثر ہو گا۔ مرکزی حکومت اور مرکزی مسلم لیگ کی پشت پناہی اسے پہلے ہی حاصل تھی۔

8 اپریل کو نوائے وقت میں ''پنجاب کی حق تلفی'' کے عنوان سے ایک اداریہ میں یہ الزام عائد کیا گیا کہ مرکزی محکموں میں اہم اسامیاں پر کرنے کے لئے جس قدر اشتہار دیئے جاتے ہیں ان کے جواب میں پنجاب سے کسی سرکاری ملازم یا اہل کار کی درخواست کراچی نہیں پہنچتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گورنر پنجاب نے کسی پنجابی اہل کار کو مرکزی حکومت یا پبلک سروس کمیشن کی اسامیوں کے لئے درخواست بھیجنے کی اجازت نہیں دی۔ اگر یہ شکایت درست ہے تو گورنر صاحب کا یہ اقدام پنجاب اور اہل پنجاب کے لئے بے حد نقصان دہ ہے۔ اس کا صرف یہی مطلب نہیں کہ کوئی پنجابی اہل کار محکمہ خارجہ یا کسی دوسرے مرکزی محکمہ میں ملازمت کا اہل نہیں بلکہ پنجاب کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا کہ مرکزی محکموں اور ملازمتوں میں اہل پنجاب کا حصہ بہت کم رہ جائے گا۔ خدا جانے پنجاب کو کس گناہ کی سزا دینا مقصود ہے جو اس صوبے کو ہر بہانے پسماندہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے اگر دوسرے صوبوں کے سرکاری اہل کار مرکز میں ملازمت کے اہل ہیں تو پنجاب کے اہلکار بھی قابلیت اور صلاحیت میں کسی سے کم نہیں۔''[5] اس اداریے کا پس منظر یہ تھا کہ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ میں ایک اعلیٰ افسر خواجہ عبدالرحیم، جو مدیر نوائے وقت حمید نظامی کے ساتھ ممدوٹ کی پرائیویٹ کابینہ کا سب سے بڑا رکن رہا تھا، کے خلاف سنگین بدعنوانیوں کے الزام میں مقدمہ چل رہا تھا۔ اس پر 13 الزامات عائد تھے کہ جن میں سے 5 الزامات یہ تھے۔

1۔ اس نے بددیانتی سے یہ کوشش کی کہ راجہ حسن اختر سابق ڈپٹی کمشنر منٹگمری اور پیر احسن الدین سابق سیکرٹری وزیر اعلیٰ مغربی پنجاب (ممدوٹ) کا اور اس کا اپنا

تقرر مرکزی حکومت میں ہوجائے۔

2۔ اگرچہ 8 مارچ 1948ء کو مرکزی حکومت نے بذریعہ تار یہ واضح کر دیا تھا کہ مرکزی حکومت میں تقرریوں کے لئے گورنر کی منظوری کے بغیر کوئی سفارش نہ کی جائے مگر اس نے گورنر کی اطلاع کے بغیر راجہ حسن اختر اور پیر احسن الدین کی سفارش کر دی تھی۔

3۔ اُسے بحیثیت قائم مقام چیف سیکرٹری صرف حکام کی فہرستیں بنانے کا اختیار تھا مگر اس نے بلا وجہ سفارشیں کیں۔

4۔ اُس نے اپنی پرسنل فائل میں سے مسٹر بھنوٹ سابق چیف سیکرٹری پنجاب اور گورنر کے مخالفانہ ریمارکس نکال کر یہ فائل مرکزی حکومت کو بھیج دی تا کہ وہاں اس کا تقرر ہوجائے۔

5۔ اُس نے اس مقصد کے لئے راجہ حسن اختر کی پرسنل فائل میں سے مسٹر ہادی حسن سابق کمشنر ملتان ڈویژن کے مخالفانہ ریمارکس بھی نکال لئے تھے۔

ہائی کورٹ نے ان الزامات کی کئی ماہ تک تحقیقات کرنے کے بعد جو رپورٹ پیش کی تھی اس میں اس افسر کو سنگین بدعنوانیوں کا مجرم قرار دیا گیا تھا اور اس بنا پر اس کی برطرفی عمل میں آ گئی تھی۔ راجہ حسن اختر کے خلاف بھی دس بارہ بدعنوانیوں کے الزامات تھے لیکن اس نے اپنے خلاف مقدمہ کی پیروی نہیں کی تھی اس لئے اس کی برطرفی پہلے ہی ہو چکی تھی۔ البتہ پیر احسن الدین ملازمت پر برقرار رہا تھا کیونکہ یہ نواب ممدوٹ اور خواجہ عبدالرحیم کے خلاف سلطانی گواہ بن گیا تھا۔ خواجہ عبدالرحیم اور راجہ حسن اختر نے اپنی برطرفی کے بعد بھی مدیر نوائے وقت سے اپنے گہرے روابط قائم رکھے تھے اور اس طرح وہ پنجابی شاونزم کو ہوا دینے میں اس کی فکری اور معلوماتی امداد کرتے تھے۔ انہوں نے مجلس اقبال کے پلیٹ فارم کو بھی وزیراعظم لیاقت علی خان اور گورنر موڈی کے خلاف پروپیگنڈا کے لئے استعمال کیا تھا۔

صوبائی لیگ کی صدارت سے دولتانہ کے استعفیٰ کے بعد اپریل کے پہلے ہفتہ میں کراچی میں وزیراعظم لیاقت کے زیر اثر دولتانہ اور ممدوٹ کے درمیان باقاعدہ صلح ہوگئی اور یہ طے پایا کہ میاں عبدالباری جو فروری میں پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کے عہدہ کے انتخاب میں یوسف خٹک کے مقابلے میں ہار گیا تھا، کو صوبہ لیگ کا متفقہ طور پر صدر منتخب کیا جائے گا۔ اس مفاہمت کی خبر لاہور کے اخبارات میں چھپی تو اس کے ساتھ ہی ایک اخبار میں یہ تنبیہ بھی

شائع ہوئی کہ ''مرکزی حکومت کو اس تخریبی تنقید سے تشویش ہو رہی ہے جو کہ بعض اخبارات اکثر کرتے رہتے ہیں۔ اگر صدر کے انتخاب کے بعد بھی ان اخبارات کا رویہ نہ بدلا اور انہوں نے اپنا یونینسٹوں اور کمیونسٹوں والا شغل جاری رکھا تو ممکن ہے کہ حکومت ان پر چند پابندیاں عائد کر دے اور ان کے نام بلیک لسٹ میں درج کر دے۔'' اس تنبیہ کا زیادہ تر رُخ نوائے وقت کی طرف تھا کیونکہ یہی ''یونینسٹوں اور کمیونسٹوں'' کی طرح علاقائی تعصب پھیلا رہا تھا۔ اس لئے اس اخبار نے اس کے جواب میں جو کچھ لکھا اس کا مطلب یہ تھا کہ پنجابی عصبیت کا زہریلا پروپیگنڈا جاری رہے گا تم جو کر سکتے ہو کر لو۔ یہ اداریہ اس طرح ختم کیا گیا تھا کہ...... ''تدبیر یہ نہیں کہ ممدوٹ دولتانہ سمجھوتہ ہو جائے اور دونوں گروپ مل کر ایک صاحب کو صدر منتخب کر لیں اور پھر اخبارات کو یہ نادر شاہی حکم جاری کر دیا جائے کہ سب مل کر اس نئے صدر کی حمایت کرو۔ بیماری بہت خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے اور یہ نسخہ کارگر نہ ہو گا۔ مسلم لیگ کو ایک جاندار پروگرام کی ضرورت ہے جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔'' گویا پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی عصبیت کے لئے دو جاگیرداروں کا سمجھوتہ قابل قبول نہیں تھا۔ دوسری طرف لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کا خیال یہ تھا کہ چونکہ میاں عبدالباری ان کے زیر اثر رہے گا اس لئے نہ صرف نوائے وقت جیسے زہریلے اخبارات کا گلا گھونٹنے میں آسانی ہو گی بلکہ آئندہ صوبائی انتخابات میں بھی مسلم لیگ کی شاندار کامیابی یقینی ہو گی۔ لیکن انہیں اس موقع پر اس حقیقت کا احساس نہیں ہوا تھا کہ عبدالباری خود ضلع لائل پور کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس وجہ سے اس کا پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونزم سے متاثر ہونا یقینی تھا۔

دولتانہ ممدوٹ سمجھوتے کے اعلان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد نوائے وقت میں ایک خبر شائع ہوئی جس سے یہ ظاہر ہوا کہ مرکزی حکومت کی متذکرہ تنبیہ کے جواب میں اب اس اخبار کے علاقائی تعصب کا رُخ صرف لیاقت علی خان کی طرف ہی نہیں ہو گا بلکہ اس کا رُخ یو۔ پی کے مہاجرین کی طرف بھی ہو گا۔ اس اشتعال انگیز خبر کی سرخی یہ تھی کہ کراچی کے محکمہ پولیس میں پنجابیوں کی حق تلفی...... تین سو پنجابیوں کو غنڈے قرار دے کر کراچی سے باہر نکال دیا گیا اور اس کا متن یہ تھا کہ ''کراچی کے محکمہ پولیس کے متعلق کچھ اعداد و شمار معلوم ہوئے ہیں۔ جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کراچی پولیس میں پنجاب کو کس قدر افسوس ناک حد تک نمائندگی سے محروم رکھا گیا ہے۔

پنجابی پولیس افسر ہر لحاظ سے بہترین تسلیم کیا جا چکا ہے مگر نہ معلوم کراچی کا محکمہ پولیس پنجابیوں کے لئے کیوں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ موجودہ اعداد و شمار ہیں:

	کل تعداد	پنجابی	یو۔ پی	دوسرے غیر پنجابی
آئی جی	1	0	1	0
سپرنٹنڈنٹ پولیس	3	0	0	3
ایس ڈی او کرائمز	2	0	1	1
ڈی۔ ایس۔ پی ٹریفک	1	0	0	1
انسپکٹرز	12	0	4	8
سب انسپکٹرز	55	0	24	31
اسسٹنٹ سب انسپکٹرز	37	0	22	15

سی۔ آئی۔ ڈی

	کل تعداد	پنجابی	یو۔ پی	دوسرے غیر پنجابی
سپرنٹنڈنٹ	1	0	1	0
ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ	2	0	2	0
انسپکٹرز	11	0	2	9
سب انسپکٹرز	33	0	30	3
اسسٹنٹ سب انسپکٹرز	21	0	21	0
ہیڈ کنسٹیبلز	112	0	98	14
کنسٹیبلز	155	0	140	15

نوائے وقت کی اطلاع کے مطابق یو۔ پی سے آمدہ پولیس افسروں سے ترجیحی سلوک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں یو۔ پی سے آنے والے کئی افسروں کو ترقی دی گئی ہے اور ملازمتوں پر مستقل کر دیا گیا ہے اس کے برعکس دوسرے سینئر افسروں کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔ یہ اطلاع موجب دلچسپی ہو گی کہ کراچی کے موجودہ ایڈمنسٹریٹر ہاشم رضا یو۔ پی کے رہنے والے ہیں۔ ان کے حقیقی بھائی مسٹر کاظم رضا آئی جی پولیس ہیں اور دوسرے بھائی مسٹر آل رضا اسسٹنٹ پبلک

پراسیکیوٹر ہیں۔ محکمہ پولیس میں پنجابیوں کی نمائندگی نہ ہونے کی وجہ سے کراچی میں مقیم پنجابی عوام سے ذلت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بیان کیا جاتا ہے کہ حال ہی میں 300 پنجابیوں کو بمبئی پولیس ایکٹ کے تحت غنڈے قرار دے کر کراچی سے باہر نکال دیا گیا ہے۔''[6]

20 اپریل کو نوائے وقت نے مرکزی وزیر بحالیات و اطلاعات خواجہ شہاب الدین کی لاہور آمد کے موقع پر اسی مسئلہ پر ایک زہریلا اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا۔''خواجہ راز بندہ پیغامے بگو۔'' اس اداریے میں اس الزام کا بڑے تلخ الفاظ میں اعادہ کیا گیا تھا کہ پنجاب کو، جو پاکستان کا سب سے جاندار صوبہ ہے ایک منصوبہ کے تحت بے جان کیا جا رہا ہے۔ پنجاب میں پنجابی افسر سہمے ہوئے ہیں انہیں نااہل اور بے ایمان سمجھا جاتا ہے۔ صوبہ میں ''یو۔ پی کے ایک سابق پی سی ایس افسر کو ہوم سیکرٹری کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا ہے۔ مرکزی حکومت میں پنجابی افسروں کے خلاف جو تعصب کارفرما ہے اس کی تفصیل اس قدر دردناک ہے کہ اس کا تذکرہ کرنا بھی ہمیں ناگوار ہے۔ کراچی میں تاجروں سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ بین المملکتی معاہدوں کی بات چیت میں پنجابیوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ مشترکہ مہاجرین کونسل میں بھی پنجاب کا کوئی نمائندہ نہیں۔ ہماری زندگی کے واحد اجارہ دار ہمارے انگریز گورنر صاحب ہیں۔ تازہ ترین کارنامہ کراچی سے پنجابی پولیس والوں کے اخراج کا ہے۔ پنجاب کے پولیس افسر کی چین اور ملایا تک میں مانگ اور عزت ہے مگر کراچی میں پنجابی تھانہ داری کا بھی اہل نہیں سمجھا جاتا۔''[7] یہ اداریہ سراسر علاقائی تعصب اور غلط بیانی پر مبنی تھا۔ ملک میں پنجابی بیوروکریسی کی حالت ایسی بری نہیں تھی جیسی کہ اس میں بیان کی گئی تھی۔ پنجابی سول اور فوجی افسروں کا بلوچستان، سندھ، سرحد اور مشرقی بنگال میں غلبہ تھا۔ ان صوبوں میں پنجابی پولیس افسروں کی بھی اکثریت تھی جن کی ہانگ کانگ اور ملایا میں برطانوی سامراج کی خدمت کے لئے ''مانگ اور عزت'' محض اس لئے ہوتی تھی کہ ان میں اکثر بھاڑے کے ٹٹو ہوتے تھے اور انہیں عوام الناس پر جبر وتشدد کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا تھا۔ برطانوی راج میں پنجابی پولیس افسر بدنام ترین اہل کار ہوتا تھا اور اس کی یہ روایت قیام پاکستان کے بعد بھی بدستور قائم رہی تھی۔ ملک کے دوسرے صوبوں میں پنجاب کے خلاف جو نفرت پیدا ہو رہی تھی اس کے محرکات میں ان پنجابی پولیس افسروں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ یہ عملاً غیر پنجابی کو گھٹیا اور بے وقعت سمجھتے تھے۔ مرکزی حکومت میں

یو۔ پی کے اہلکاروں کی اکثریت کی کئی وجوہ تھیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ دہلی سے مرکزی حکومت کے جو چھوٹے بڑے اہلکار کراچی پہنچے تھے ان میں اکثریت یو۔ پی والوں کی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یو۔ پی کے جن چھوٹے بڑے مسلمان سرکاری اہلکاروں نے اپنی خدمات پاکستان کے لئے پیش کی تھیں وہ زیادہ تر کراچی میں ہی پہنچے تھے۔ انہیں فوری طور پر مرکزی حکومت میں اس لئے کھپایا گیا تھا کہ اس وقت مرکزی حکومت کا کوئی انتظامی ڈھانچہ ہی نہیں تھا اور تیسری وجہ وزیراعظم لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ کوتاہ اندیشی میں مضمر تھی۔ اس نے مرکزی حکومت کے سارے محکموں میں یو۔ پی کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بھرتی کرنے کی پالیسی محض اس لئے اختیار کی تھی کہ یہ شہر اس کا ایک محفوظ حلقۂ انتخاب بن جائے۔ اس کا ''جدی'' حلقۂ انتخاب ہندوستان میں ہی رہ گیا تھا۔ اسے اپنی اس سیاسی کمزوری کا بڑی شدت سے احساس تھا۔ اس لئے اس نے اپنی اس پالیسی کے تحت یو۔ پی کے لوگوں کو تجارت اور صنعت کے میدان میں غیر معمولی مراعات دی تھیں۔ بلاشبہ لیاقت علی خان کی یہ پالیسی سیاسی دوراندیشی پر مبنی نہیں تھی لیکن پنجاب کے شاؤنسٹوں نے اس بنا پر اس کے خلاف جو معاندانہ مہم شروع کی تھی وہ بھی کسی سیاسی بصیرت اور فراست پر مبنی نہیں تھی۔ مرکزی حکومت میں پنجاب کی بیوروکریسی کی اچھی خاصی نمائندگی تھی اور پاکستان کی سامراج نواز بیوروکریسی کا ''باپ'' چودھری محمد علی مرکزی حکومت کا سیکرٹری جنرل ہونے کی حیثیت سے انتہائی بااثر اور بااختیار تھا۔ لیکن مدیر نوائے وقت کی نگاہ خواجہ عبدالرحیم اور راجہ حسن اختر جیسے بددیانتی کے الزام میں سزا یافتہ افسروں کی ''مظلومیت'' سے آگے نہیں جاتی تھی۔ اسے یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ مرکزی حکومت کی انتظامیہ میں مشرقی بنگال کی کوئی نمائندگی نہیں تھی اور سندھ، بلوچستان کی بھی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ یہ بیک وقت اسلامی مساوات واخوت کا بھی علمبردار تھا اور پنجاب کے مفادات وحقوق کا اجارہ دار بھی۔ اس نے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ مرکزی حکومت کی انتظامیہ میں سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی بنگال کے لوگوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی ملنی چاہیے۔

کراچی کی انتظامیہ نے 23/اپریل کو نوائے وقت کی اس رپورٹ اور اداریے کی تردید کی اور یہ بتایا کہ اس شہر کے 177 پولیس افسروں میں سے 53 پنجاب سے 34 یو۔ پی سے 28 سندھ سے اور 62 دوسرے علاقوں سے ہیں۔ تقسیم سے پہلے کراچی میں 1260 کنسٹیبل اور ہیڈ کنسٹیبل ہوا کرتے

تھے۔ تقسیم کے بعد جو بھرتی ہوئی اس میں 733 پنجاب کے اور 288 یو۔ پی کے ہیں۔"[8]

25 /اپریل کو ڈان کے ایک اداریہ میں لاہور کے ایک اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ کی اس رپورٹ کو شرانگیز قرار دیا گیا کہ مرکزی حکومت کے بعض طالع آزما سیاسی لیڈر پنجاب میں گورنر موڈی کے خلاف مہم کو ہوا دے رہے ہیں۔ ان دنوں سول اینڈ ملٹری گزٹ کا ایڈیٹر ایک انگریز تھا اور اس کے اخبار کی اس رپورٹ کا مطلب یہ تھا کہ مرکز میں وزیر بے محکمہ نواب مشتاق احمد گرمانی مدیر نوائے وقت کا سرپرست اور محسن تھا اور محلاتی سازشوں کا ماہر جاگیردار ہونے کی وجہ سے نہ صرف پنجاب کی سیاست میں بلکہ پورے ملک کی سیاست میں بہت اونچے عزائم کا حامل تھا اور غلام محمد پنجاب کے مفادات وحقوق کا ٹھیکیدار ہونے کی وجہ سے کم از کم ملک کا وزیر اعظم بننے کا متمنی تھا۔

نوائے وقت کا 20 /اپریل کا اداریہ پڑھ کر یو۔ پی کے ایک مہاجر نے اس اخبار کو ایک مختصر سا خط لکھا جس میں گلہ کیا گیا تھا کہ "نوائے وقت جو اتحاد اسلامی کا سب سے بڑا علمبردار تھا، اب صوبہ پرستی کا پروپیگنڈا کر رہا ہے اور اہلِ پنجاب کو پنجاب کے نام پر اُبھار رہا ہے۔" اس خط کا جواب 21 /اپریل کو ایک اداریے کی صورت میں دیا گیا۔ جس میں پہلے تو اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا گیا کہ نوائے وقت صوبہ پرست ہے، پھر اسلام اور پان اسلام ازم کے لئے پنجاب کی تاریخی خدمات گنوائی گئیں اور پھر آخر میں متنبہ کیا گیا کہ پنجاب کے "نقصان کے خلاف احتجاج صوبہ پرستی نہیں ملک وملت کی خدمت ہے۔ خاموشی کا مطلب یہ ہوگا کہ پنجابی مسلمانوں میں اس وقت بددلی، تلخی اور بعض صورتوں میں مایوسی کے جو جذبات پرورش پا رہے ہیں اس مواد کو پکنے دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ "جوابی صوبہ پرستی" کی شکل میں ظاہر ہوگا۔ ہمیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جوابی صوبہ پرستی بڑی خطرناک چیز ہے کہ صوبائیت کے جذبہ سے متاثر ہو کر نہیں، صوبائیت کو کچلنے کی خاطر ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ پنجاب سے انصاف کیجئے اور جلد انصاف کیجئے۔ پیشتر اس کے کہ یہ زہر قوم کے جسم میں سرایت کر جائے۔"[9] مطلب یہ تھا کہ اگر پنجاب کی بیوروکریسی اور یہاں کے درمیانہ وسرمایہ دار طبقوں کو قومی زندگی کے سارے شعبوں پر غلبہ قائم کرنے کی کھلی چھٹی نہ دی گئی تو یہ بات پنجاب سے بے انصافی کے مترادف ہوگی اور ایسی صورت میں پنجاب کی "جوابی صوبہ پرستی" کا زہر پوری قوم کے جسم میں سرایت کر جائے گا۔ یہ اداریہ دراصل پنجابی شاونسٹوں کی سیاسی تنگدلی، کوتاہ اندیشی اور کم ظرفی کا مظہر تھا۔ جب کبھی ملک کے

دوسرے پسماندہ صوبوں کے عوام اپنے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق کا مطالبہ کرتے تھے تو پنجاب میں اسلام اور حب الوطنی کے اجارہ دار انہیں صوبہ پرست قرار دیتے تھے۔ لیکن جب یہ خود پنجاب کی بالادستی کی راہ میں کسی رکاوٹ کی بنا پر پنجاب کے حقوق کی دہائی دیتے تھے تو کہتے تھے کہ...... ''صوبائیت کے جذبہ سے متاثر ہو کر نہیں صوبائیت کو کچلنے کی خاطر ہم یہ درخواست کرتے ہیں کہ پنجاب سے انصاف کیجئے اور جلد انصاف کیجئے پیشتر اس کے یہ زہر قوم کے جسم میں سرایت کر جائے۔'' ''صوبائیت کو کچلنے'' کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے پسماندہ صوبوں کے حقوق کو کچلا جائے اور ''پنجاب سے انصاف کیجئے'' کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی غلبہ کو بلا چون و چرا قبول کیجئے۔ یہی اسلام ہے اور اسی کا نام حب الوطنی ہے۔

24راپریل کے نوائے وقت میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پنجاب میں غیر جمہوری اور غیر ذمہ دارانہ گورے شاہی کے خلاف نفرت اور بیزاری کی جو چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں اب انہوں نے شعلوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی علامت یہ تھی کہ میاں عبدالباری کے 17راپریل کو صوبہ لیگ کے صدر منتخب ہونے کے صرف پانچ دن بعد یعنی 22راپریل کو اس کی مجلس عاملہ کا ایک وفد وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین سے ملا اور اس نے مطالبہ کیا کہ سر فرانسس موڈی کو پنجاب کی گورنری سے ہٹا دیا جائے۔ اس مطالبہ کا پس منظر یہ تھا کہ عبدالباری نے دولتانہ ممدوٹ سمجھوتہ کی بنا پر صدر منتخب ہونے کے فوراً ہی بعد یہ محسوس کر لیا تھا کہ مسلم لیگ میں ہر سطح پر گورنر راج کے نفاذ کے خلاف سخت غم و غصہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ گورنر راج میں بہت سے مسلم لیگی لیڈروں، کونسلروں اور دوسرے عہدیداروں کی ہوس اقتدار اور ہوس زر کی تکمیل نہیں ہوتی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ گورنر موڈی کا انداز حکومت واقعی سامراجی تھا۔ اس نے اسی طریقے سے حکومت کرنے کی تربیت حاصل کی ہوئی تھی اور وہ بڑے بڑے جاگیرداروں کے سوا عبدالباری جیسے چھوٹے طبقہ کے لوگوں کو منہ لگانے کا قائل نہیں تھا۔ دوسری طرف عبدالباری درمیانہ طبقہ کا پرانا خلافتی تھا اور اُس نے جوانی ہی میں برطانوی سامراج کے خلاف سیاسی بغاوت کا سبق پڑھا ہوا تھا لہٰذا اُن دونوں میں ٹکر ناگزیر تھی اور وہ فوراً ہی ہو گئی۔

لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ نے عبدالباری کی فرمانبرداری کے بارے میں غلط اندازہ لگایا تھا۔ صوبائی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس مطالبہ کے بعد گورنر موڈی کے خلاف بیانات

اور تقریروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ بیانات دینے والوں میں چودھری محمد احسن، راجہ سید اکبر، مولانا داؤد غزنوی اور خواجہ محمد صفدر کے علاوہ پاکستان مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا رکن قاضی محمد عیسیٰ بھی شامل تھا۔ قاضی عیسیٰ کوئٹہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے پنجابی شاونزم کی حوصلہ افزائی چودھری خلیق الزماں کے کہنے پر کی تھی کیونکہ اس وقت تک چودھری یہ قطعی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اُسے اپنا سیاسی رشتہ دولتانہ دھڑے سے جوڑنا چاہیے یا ممدوٹ دھڑے سے۔ بظاہر اُن دنوں ممدوٹ دھڑا زیادہ طاقتور تھا اور اس دھڑے کی جانب سے صدر پاکستان مسلم لیگ پر بہت زور ڈالا گیا تھا کہ وہ موڈی کی برطرفی کا بندوبست کرے۔ قاضی عیسیٰ نے 29 /اپریل کو پنجاب کے حقوق کے بارے میں جو بیان دیا اس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''صرف پنجاب کے مستقبل کی خاطر ہی نہیں پاکستان کے مستقبل کی خاطر پنجاب کے انگریز گورنر کی برطرفی ضروری ہے۔ انگریز گورنر کے راج میں پرانے پاکستان دشمن عناصر اُوپر آرہے ہیں۔ پنجاب پاکستان کا سب سے اہم صوبہ ہے اور بیرونی دنیا میں بھی سب سے زیادہ نام اسی صوبہ کا ہے۔ اس صوبہ میں انگریز گورنر کا تسلط پاکستان کے نام پر دھبہ ہے۔''

کراچی کی انتظامیہ نے نوائے وقت میں اس شہر کی پولیس میں پنجابیوں کی عدم نمائندگی کے بارے میں عائد کردہ الزامات کی تردید کے لئے 23 /اپریل کو جو بیان جاری کیا تھا اس پر اس اخبار نے 8 /مئی کو ایک اداریہ بعنوان ''قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم'' لکھا جو اس کے 20 /اپریل کے اداریے سے بھی زیادہ زہریلا اور اشتعال انگیز تھا۔ اس اداریے کا متن یہ تھا کہ ''کراچی کی پولیس کے متعلق کچھ اعداد و شمار (نوائے وقت 17 /اپریل) ہم نے شائع کئے تھے۔ اس رپورٹ میں ترجمہ کی ایک غلطی سے نئے افسروں کی بھرتی کی بجائے لفظ موجودہ افسر چھپ گیا اور اس سے غلط فہمی کا امکان پیدا ہو گیا جونہی یہ غلطی ہمارے نوٹس میں آئی ہم نے ازخود اس کی تصحیح کر دی مگر جو لوگ حقائق پر پردہ ڈالنے کے درپے ہیں انہوں نے ترجمہ کی اس غلطی کی آڑ لے کر پوری رپورٹ کو ہی جھٹلانے کی کوشش کی اور بڑے دھڑلے کے ساتھ یہ اعلان کر دیا کہ کراچی پولیس میں پنجابیوں کو پوری نمائندگی حاصل ہے۔ ہم اس بحث کو طول دینا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ مقصد صوبائی جذبات کو اُبھارنا نہیں تھا بلکہ ایک خرابی کی طرف توجہ مبذول کرانا تھا۔ ہم صوبائی عصبیت پر لعنت بھیجتے ہیں۔ مگر اس کو بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ ہمارے صوبے کے لوگوں کو محض اس لئے اُن کے جائز حقوق سے محروم کرنے کی کوشش کی جائے کہ وہ مشرقی پنجاب کے مہاجر

ہیں یا مغربی پنجاب کے باشندے ہیں۔ ہم اس کوشش کو سخت ناپاک سمجھتے ہیں......ہم نے اب تک پنجابیوں کی حق تلفی کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس جذبہ کے زیر اثر لکھا ہے اور اگر پنجابیوں کی بجائے صوبہ سرحد کے باشندوں کی اس طرح حق تلفی ہوتی تو ہم اس کے خلاف بھی احتجاج کرتے۔'' اداریے میں اس تمہید کے بعد کراچی کے ایڈمنسٹریٹر سے لے کر انسپکٹر انچارج پراسیکیوشن برانچ تک 24 افسروں کے ناموں اور عہدوں پر مشتمل فہرست چھاپی گئ جن کا قیام پاکستان کے بعد اس شہر میں تقرر ہوا تھا۔ چونکہ ان افسروں میں یو۔ پی کے افسروں کی بھاری اکثریت تھی اس لئے اس فہرست سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان یو۔ پی والوں کی پرورش کرتا ہے اور پنجابیوں کا دشمن ہے۔ اداریے کے آخر میں لکھا تھا کہ ''ہم پھر یہ گزارش کرنا چاہتے ہیں کہ خدارا ان ہندوؤں کی تقلید نہ کیجئے جو خود تو سرتا پا فرقہ پرست تھے اور مسلمانوں کو ہمیشہ فرقہ پرستی کا طعنہ دے کر خاموش کرانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ صوبائی تعصب کا مریض پنجابی نہیں جو رعایت نہیں مانگتا بلکہ جس کی استدعا صرف اس قدر ہے کہ میرے پنجابی ہونے کی وجہ سے مجھ سے برا سلوک نہ کیا جائے۔ صوبائی عصبیت کے مریض وہ لوگ ہیں جو اس کی درخواست کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہیں اور لائق اور مستحق پنجابی پر اپنے نالائق اور غیر مستحق ہم صوبہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد ایسے ہی مریضوں کی اصلاح ہے خواہ یہ مریض عام مریضوں کی طرح حقائق کی کڑوی دوا پینے سے انکار ہی کیوں نہ کرتے رہیں۔ ہم پوری توجہ کے ساتھ ان کا علاج کرنا فرض سمجھتے ہیں۔''[10]

اس اشتعال انگیز اداریے سے اس مؤقف کی پوری طرح تائید ہوتی ہے کہ بورژوا سیاست وصحافت میں دیانت اور انصاف کے نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ اس میں اپنے حریف کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر قسم کی منافقت کو عملاً جائز سمجھا جاتا ہے۔ مدیر نوائے وقت کو بڑی تکلیف تھی کہ یو۔ پی سے آنے والے ان ڈیڑھ دو درجن پولیس افسروں کا کراچی میں تقرر کیوں کیا گیا تھا اور ان نئی تقرریوں میں پنجابیوں کو ''پوری نمائندگی'' کیوں نہیں دی گئی تھی۔ لیکن اس کا ''جذبۂ انصاف'' اس تلخ حقیقت سے بیدار نہیں ہوتا تھا کہ کراچی پولیس تو کجا مرکزی حکومت کی پوری انتظامیہ میں بلوچیوں، سندھیوں اور بنگالیوں کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ پاکستان میں بنگالیوں کی اکثریت تھی لیکن نہ صرف انہیں مرکزی حکومت کی پوری انتظامیہ میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں

تھی بلکہ ان کے لئے اپنے صوبہ میں سامراجی ذہنیت کی حامل پنجابی بیوروکریسی کا غلبہ تھا۔ مشرقی بنگال کا پنجابی چیف سیکرٹری عزیز احمد ''پکا صاحب'' تھا۔ اس کی گردن اتنی اکڑی ہوئی ہوتی تھی کہ یوں لگتا تھا کہ اس کا کالر ''پلائی ووڈ'' کا ہے۔ وہ بنگالی عوام کے علاوہ ان کے صوبائی وزراء کو بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا اور ان کے خلاف مرکزی حکومت کو ہر پندرہویں دن خفیہ رپورٹیں بھیجتا تھا۔ مشرقی بنگال کا فوجی کمانڈر میجر جنرل محمد ایوب خان ضلع ہزارہ کا رہنے والا پنجابی تھا اور اس کے ماتحت فوجی افسر اور جوان تقریباً سو فیصد پنجابی تھے۔ یہ شخص اس قدر فرعون تھا کہ بنگالیوں کو نہ صرف گھٹیا مخلوق سمجھتا تھا بلکہ اس کا کھلم کھلا اظہار کرتا تھا۔ وہ بنگالیوں کو فوج میں بھرتی کے قابل ہی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں نسلی درجہ بندی کے سامراجی وفسطائی نظریے کا حامل تھا۔ وہ صوبائی وزراء اور ارکان اسمبلی کی توہین کرتا تھا اور انہیں دھمکیاں دیتا تھا۔ وہ اگرچہ خود نیم تعلیم یافتہ اور احمق تھا لیکن اس کے باوجود وہ وردی پہن کر اپنے احساس برتری کا کچھ اس طرح اظہار کرتا تھا کہ ہر خوددار بنگالی اس کی ''نصیحتیں'' سن کر تلملا اُٹھتا تھا......لیکن مدیر نوائے وقت کو ان تلخ حقائق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ صرف دوسروں کو اپنے خود ساختہ حقائق کی کڑوی دوا پینے پر مجبور کرتا تھا۔ اس کے ذاتی اور طبقاتی مفادات اس کے متقاضی تھے۔ وہ پنجاب کے ایسے طبقے کی ترجمانی کرتا تھا جو حب الوطنی کی آڑ میں بدترین وطن دشمنی کا مرتکب ہو رہا تھا۔ وہ ہندوؤں کے درمیانہ طبقہ کی طرح خود از سرتا پا فرقہ پرست تھا لیکن دوسروں کو ہمیشہ فرقہ پرستی کا طعنہ دے کر اپنے مفادات کو جبراً فروغ دینے کی کوشش کرتا تھا۔

13 رمئی کو حکومت پاکستان نے لاہور کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کو 3 ماہ کے لئے بند کر دیا۔ الزام یہ تھا کہ اس اخبار نے 5 رمئی کو اپنے دہلی کے نامہ نگار کی ایک خبر شائع کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ برطانیہ کی نصیحت کے مطابق مسٹر لیاقت علی خان اور پنڈت نہرو نے لندن میں یہ سمجھوتہ کر لیا تھا کہ متارکہ جنگ کی موجودہ لائنوں پر ریاست کو تقسیم کر کے اس کی مستقل حد بندی کر دی جائے۔ یہ اخبار ہندوؤں کی ملکیت تھا لیکن اس کا ایڈیٹر انگریز تھا۔ لہٰذا اس کی پالیسی عام طور پر ہندوستان کے بورژوا توسیع پسندوں اور برطانوی سامراج کے مفادات کے تابع ہوتی تھی۔ اس نے کشمیر کے بارے میں جو خبر چھاپی تھی وہ یکم جنوری 1949ء کی جنگ بندی کے بعد سراسر بے بنیاد معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وزیر اعظم لیاقت علی برطانوی سامراج کا تابعدار تھا اس لئے وہ

اپنے دیرینہ آقاؤں کے حکم کی تعمیل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا۔ تاہم حکومت پاکستان کے اس خبر کی اشاعت سے پریشان ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان دنوں پنجاب میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں لیاقت علی خان کی سامراج نواز پالیسی پر سخت نکتہ چینی ہو رہی تھی۔ چونکہ وہ دو مرتبہ برطانوی کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کر چکا تھا اور اس کے باوجود مسئلہ کشمیر کے منصفانہ حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس لئے مرکزی پنجاب کے متعدد اضلاع لاہور، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، شیخوپورہ، لائل پور اور راولپنڈی میں یہ عوامی مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ کامن ویلتھ سے قطع تعلق کر کے سوویت یونین سے ناطہ جوڑو۔ صدر صوبائی مسلم لیگ عبدالباری بھی اپنے دورے میں مسئلہ کشمیر کے حل پر بہت زور دیتا تھا اور یہ بھی مطالبہ کرتا تھا کہ پاکستان کی کلیدی اسامیاں غیر ملکیوں سے پاک کی جائیں۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ کی بندش سے پنجابی شاونسٹوں کی شاندار فتح ہوئی کیونکہ گورنر موڈی کے حامی اخبار کی اشاعت پر ایسے وقت میں پابندی عائد کر دی گئی تھی جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان لندن میں کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد مشرقِ وسطیٰ کے بعض ممالک کا دورہ کر رہا تھا۔ وہ 19 راپریل کو لندن گیا تھا اور ایک ماہ بعد 18 رمئی کو واپس کراچی پہنچا تھا۔ حکومت پاکستان نے وزیر اعظم کی واپسی سے صرف چار پنچ دن پہلے یہ کاروائی پنجاب میں ممتاز دولتانہ کے حریف اور مدیر نوائے وقت کے سرپرست و محسن نواب مشتاق احمد گرمانی کی تحریک پر کی تھی جو ان دنوں مرکزی وزیر بے محکمہ کی حیثیت سے وزارت امور کشمیر کا انچارج تھا۔ یہ تادیبی کاروائی اس حقیقت کے باوجود ہوئی تھی کہ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے 6 رمئی کو اپنی اس خبر کی خود ہی پرزور الفاظ میں تردید کر دی تھی اور پھر یہ اعلان بھی کیا تھا کہ وہ آئندہ کشمیر کے بارے میں غیر سرکاری ذرائع سے موصول شدہ کوئی خبر نہیں شائع کرے گا۔ تاہم اہم بات یہ نہیں تھی کہ اس اخبار کی اشاعت بند ہوگئی تھی بلکہ اہم بات یہ تھی کہ مرکزی حکومت کی اس کاروائی سے اولاً یہ واضح ہو گیا تھا کہ مرکز میں لیاقت علی خان کے خلاف ایک طاقتور گروپ سرگرم عمل تھا جو اس کے خلاف پنجاب کے شاونسٹوں کی حوصلہ افزائی کر رہا تھا اور ثانیاً یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ اب گورنر موڈی زیادہ دیر اپنے عہدہ پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ قدرتی طورر پر برطانوی سامراج حکومت پاکستان کی اس کاروائی سے بہت چیں بہ جبیں ہوا۔ لندن ٹائمز کا تبصرہ یہ تھا کہ ''پنجاب میں برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا دراصل لیاقت علی خان کے خلاف سازش کی ایک کڑی ہے۔'' ان دنوں

''اونچے مقام پر'' رقابتیں اور ابن الوقتی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ موجودہ حکومت کو چیلنج دیئے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس امر کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ موجودہ حکومت کی جگہ اقتدار پسندوں کی ایک اورٹولی مسندِ اقتدار پر قابض ہو جائے۔''[11]

اس رپورٹ میں کنایتہً یہ بتایا گیا تھا کہ لیاقت علی خان کے خلاف سازشوں میں بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد کے بعض عناصر شامل ہیں جبکہ لیاقت علی خان کامن ویلتھ کانفرنس کے سلسلے میں لندن میں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین، غلام محمد، نواب گرمانی، نواب ممدوٹ اور پیر مانکی، وزیراعظم لیاقت علی کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نوائے وقت کا اس رپورٹ پر اداریہ یہ تھا کہ گورنر موڈی اس شرانگیز رپورٹ کا ذمہ دار ہے۔ یہ لارنس آف پاکستان ہے۔ ''انگریز شاطر کا مقصد بے حد خوفناک ہے۔ وہ مرکزی حکومت میں پھوٹ ڈال کر اور انتشار پیدا کر کے اسے دو گروہوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے۔ انگریز شاطر نے وزارت پنجاب کو دو گروہوں میں تقسیم کیا۔ پنجاب کے لیڈروں کو آپس میں لڑایا اور اسمبلی کو دو کیمپوں میں منقسم کر دیا۔ اس خانہ جنگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وزارت، اسمبلی، لیڈر سب ختم ہو گئے۔ انگریز شاطر اب پنجاب کے اخبارات کو دو گروہوں میں تقسیم کر رہا ہے...... ہم صاف لفظوں میں کہہ دینا چاہتے ہیں کہ برطانوی اخبارات کا یہ پروپیگنڈا پاکستان کے خلاف ایک خطرناک سازش کے سلسلے میں پہلا قدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ

1۔ مرکزی حکومت پاکستان میں افتراق کے افسانے مشہور کر کے لوگوں کو بدظن و بددل کیا جائے۔

2۔ مشرقی پاکستان کے خودغرض عناصر کا ذکر کر کے مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کے لوگوں میں منافرت کا بیج بویا جائے۔

3۔ مسٹر لیاقت علی خان کو ان کے رفقائے کابینہ سے بدظن کرنے کی سعی کی جائے تاکہ مرکزی حکومت میں بدنظمی اور انتشار پیدا ہو۔ یہ بالکل وہی لائن ہے جو کرنل لارنس نے عرب میں اختیار کی تھی۔ عربوں نے اس سے دھوکا کھایا اور آج تک اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔''[12]

اگر انگریز شاطر کی وہی لائن تھی جو کرنل لارنس کی عرب میں تھی تو مدیر نوائے وقت کی وہی لائن تھی جو قیام پاکستان سے قبل انڈین نیشنل کانگرس کی تھی۔ جیسے انڈین نیشنل کانگرس ہندو مسلم تضاد کی ساری ذمہ داری انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عائد

کرتی تھی...... ویسے ہی نوائے وقت پاکستان کی سیاسی دھڑے بندیوں اور محلاتی سازشوں کی ساری ذمہ داری انگریز شاطر پر ڈالتا تھا۔ حالانکہ وزیراعظم لیاقت علی خان کا پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان لکھتا ہے کہ ''چند خودغرض اور بدخواانسان نوابزادہ صاحب کی ملک سے غیر حاضری کے موقع پر ان (خواجہ ناظم الدین) کے کانوں میں زہر گھولا کرتے تھے کہ گورنر جنرلی میں کیا رکھا ہے۔ آپ تو وزیراعظم بننا چاہتے تھے تاکہ آپ بااختیار حاکم ہوتے۔''[13] ان چند ''خودغرض اور بدخوانسانوں'' میں یقیناً نواب مشتاق احمد گرمانی اور غلام محمد بھی شامل تھے۔

جب سول اینڈ ملٹری گزٹ کی بندش سے یہ ظاہر ہو گیا کہ مرکزی حکومت کے بعض ''انسان'' وزیراعظم لیاقت علی کی عدم موجودگی میں اس قسم کا اقدام کر سکتے ہیں تو پنجابی شاونسٹوں نے ''سیاسی بھنگڑا'' ڈالنا شروع کر دیا۔ متعدد چھوٹے بڑے شہروں کی مسلم لیگوں نے گورنر موڈی کی برطرفی اور پنجاب کے ''مفادات'' کے تحفظ کے لئے قراردادیں منظور کرنا شروع کر دیں۔ لائل پور کی شہری مسلم لیگ نے ایک متفقہ طور پر منظور شدہ قرارداد میں کہا کہ ''سٹی مسلم لیگ کا یہ اجلاس صوبہ کے حالات کو بالعموم اور شہر کے حالات کو بالخصوص حد درجہ تشویش ناک دیکھتے ہوئے محسوس کرتا ہے کہ عوام کے اس اضطراب، پریشانی اور ہراس زدگی کی بنیاد وہ افسر شاہی ہے جو اس وقت صوبہ پر مسلط ہے اور جسے مرکز کی طرف سے بعض حالات میں دخل حاصل ہے۔ یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ بوجوہ پنجاب کی رائے عامہ کو کچلنے اور پنجابیوں کو سیاسی، اقتصادی اور مجلسی میدان میں بے سکت کرنے کی سازشیں ناکام ہو رہی ہیں...... اور پنجابی نہایت اندوہ کے ساتھ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ جس عظیم الشان وطن کو پنجاب کے بہادروں نے حضرت قائداعظم کی رہنمائی میں حاصل کیا تھا وہ بعض افراد کی ذاتی اغراض کی بھینٹ چڑھ رہا ہے اور مرکز میں ایک گروہ ایسا موجود ہے جو ذاتی مفاد کے لئے پنجاب کو تباہ کرنے کے درپے ہے۔ پاکستان کی مجموعی طاقت کے لئے پنجاب کا نہ صرف زندہ رہنا بلکہ طاقتور رہنا نہایت ہی ضروری ہے۔ مجلس عاملہ کا اجلاس گورنر راج، بحالیات کی موجودہ نقصان دہ پالیسی اور افسر شاہی کو اس سلسلے کی اہم کڑیاں سمجھتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ جب تک ایسی صورت حالات کی اصلاح نہ کی جائے صوبہ اور صوبے کے دو کروڑ افراد کا زندہ رہنا محال ہے۔''[14]

یہ قرارداد جن افراد نے منظور کی تھی اور جن اخبارات نے اس کا پورا متن شہ سرخیوں

کے ساتھ شائع کیا تھا، ان کے صوبائی تعصب اور سیاسی کوتاہ اندیشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ یہ افراد اس قدر تنگدل و تنگ نظر تھے کہ انہیں صوبہ پنجاب کی حدود سے باہر کوئی پاکستانی نظر نہیں آتے تھے اور اگر کوئی پاکستانی نظر آتے تھے تو یہ انہیں انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ ان بر خود غلط افراد کا فرعونی دعویٰ تھا کہ یہ عظیم الشان وطن پنجاب کے ''بہادروں'' نے حضرت قائداعظم کی رہنمائی میں حاصل کیا ہے۔ گویا اس وطن کی تشکیل میں اول تو غیر پنجابی ''بزدلوں'' کا حصہ ہی نہیں تھا اور اگر کوئی حصہ تھا، وہ ان کے نزدیک قابل ذکر اور قابل توجہ نہیں تھا۔ یہ صرف پنجاب کو ہی پاکستان سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر ان کے مفادات کی، ان کی حسب خواہش تکمیل نہ ہوئی تو ان کا زندہ رہنا محال ہو گا۔ اس قرارداد کی معاشرتی بنیاد یہ تھی کہ پنجاب میں ضلع لائل پور نہری آب پاشی کے باعث خوشحال ترین ضلع تھا۔ یہاں متوسط درجہ کے خوشحال مالکان اراضی کی بہتات تھی اور ان کھاتے پیتے آباد کار زمینداروں کی اولا دنے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی ہوئی تھی لہٰذا نہ صرف سول اور فوجی بیوروکریسی میں ان کا تناسب خاصا اونچا تھا بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد تجارت اور صنعت کے شعبوں میں بھی انہوں نے خاصی پیش قدمی کی تھی۔ چنیوٹ اور چکوال کے سرمایہ داروں نے لائل پور کے گردونواح میں یا تو پارچہ بافی کے چھوٹے بڑے کارخانے لگانے شروع کر دیئے تھے یا وہ اس مقصد کے لئے منصوبے بنا رہے تھے۔ بنا بریں ان سب عناصر کو ان کے مفادات نے بالکل اندھا کیا ہوا تھا۔ یہ راتوں رات کروڑ پتی بننا چاہتے تھے اور اگر ان کی اس خواہش کے راستے میں کوئی ذرا سی بھی رکاوٹ دکھائی دیتی تھی تو ان کی نظروں میں پورا پنجاب بلکہ پورا پاکستان خطرے میں پڑ جاتا تھا۔ نوائے وقت ایسے ہی خودغرض اور بداندیش پنجابی شاونسٹوں کا ترجمان تھا۔ ان عناصر کے لئے یہ اخبار ''روشنی کا مینار'' تھا جبکہ پاکستان کے دوسرے پسماندہ صوبوں کے عوام کے لئے یہ ''تاریکی کا منبع'' تھا۔ اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ یہ عناصر اور اُن کے صحافتی و سیاسی ترجمان اپنے بدنما شاونزم اور تعصب کو اسلام اور حب الوطنی کا خوشنما لبادہ پہنا کر فروغ دیتے تھے۔ چونکہ صوبہ لیگ کا صدر عبدالباری اس ضلع کا رہنے والا تھا اور وہ انہی عناصر سے معاشرتی تعلق رکھتا تھا اس لئے وہ بلا تامل ان کی تنگ و تاریک راہ پر چل نکلا۔ چنانچہ اُسے فوراً ہی ''قائدِ پنجاب'' کا خطاب مل گیا۔

23 رمئی کو پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے میاں عبدالباری کی زیر صدارت ایک

قرار داد منظور کی جس کے بعد صوبہ کی سیاسی دھڑے بندی میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی۔ اس قرارداد میں صوبائی گورنر موڈی پر یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ ''سوچی سمجھی سازش کے تحت دشمن قوم عناصر کو، جو سیاسی موت مر چکے تھے دوبارہ اہم جگہوں پر مسلط کیا جا رہا ہے...... مسلم لیگ میں پھوٹ ڈالنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے...... مسلم لیگ کی تذلیل کے لئے خفیہ کوششیں کی گئی ہیں۔ تخویف اور لالچ جیسے ہتھیاروں کو لیگ کے نظم اور اتحاد کو ختم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور لیگ کو مکمل طور سے کھوکھلا کر دینے کی کوشش کی گئی ہے۔'' لہٰذا مجلس عاملہ مطالبہ کرتی ہے کہ ''مغربی پنجاب کے غیر پاکستانی گورنر سر فرانسس موڈی کو فوراً ان کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا جائے۔ یہ مرکزی حکومت سے پرزور مطالبہ کرتی ہے کہ کسی پاکستانی کو گورنر مقرر کیا جائے جو نظام حکومت میں ایک نئی جان ڈال سکے اور صوبہ میں ایک ایسی حکومت قائم کرے...... جو دفتر شاہی نظام کو ایک ایسے ڈھانچے میں ڈھال دے جو مغربی پنجاب کے عوام کی آرزوؤں اور اُمیدوں سے اثر پذیر ہو۔'' قدرتی طور پر اس قرارداد سے پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے اقتدار پسند عناصر بہت خوش ہوئے۔ نوائے وقت تو خوشی سے بے حال ہو گیا اور اس کے تبصرے کی تان ان الفاظ پر ٹوٹی تھی کہ ''ہم یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ مادر پنجاب جس نے اقبال اور ظفر علی خان، شفیع اور فضل حسین ایسے فرزند پیدا کئے ہیں، اب بانجھ ہو گئی ہے۔''[15] یہ وہی نوائے وقت تھا جسے کچھ عرصہ قبل پنجاب کے مسلمانوں میں صحیح لیڈر شپ کا قابل رحم حد تک فقدان نظر آتا تھا اور جسے بہت دکھ کے ساتھ یہ احساس تھا کہ پنجابی مسلمانوں نے لالہ لاجپت رائے جیسا کوئی لیڈر پیدا نہیں کیا۔ نہ تشکیل پاکستان سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔ اب اس کی نظر میں برطانوی سامراج کے پٹھو جاگیردار سر محمد شفیع اور سر فضل حسین بھی پنجاب کے قابل فخر فرزندوں میں سے تھے۔ سر فضل حسین پنجاب کے جاگیرداروں کی اس غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کا بانی تھا جو نوائے وقت کی رائے میں ساری سیاسی بدعنوانیوں کا سرچشمہ تھی۔ اب اس اخبار کی قلابازی کی وجہ یہ تھی کہ بورژوا صحافت میں کسی مؤقف یا اصول پر ثابت قدم رہنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ ایسے اخباروں کی رائے یہ ہوتی ہے کہ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اس لئے صحافتی مصلحت کے تحت قلابازی کھانے میں کوئی ڈر نہیں ہوتا اور اگر کوئی اعتراض کرے بھی تو سو طرح کی تاویلیں کی جا سکتی ہیں۔

24 رمئی کو وزیر اعظم لیاقت علی خان نے ایسوسی ایٹڈ پریس سے ایک خاص انٹرویو میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا کہ مغربی پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے مغربی پنجاب کے گورنر

سر فرانسس موڈی کی برطرفی کا مطالبہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ صحیح طریق کار یہ تھا کہ مسلم لیگ کو صوبائی حکومت کے خلاف جو شکایات بھی ہوتیں وہ مرکزی حکومت کے روبرو پیش کی جاتیں۔ اس کی فرمائش کے باوجود صوبہ لیگ نے گورنر کی امداد کے لئے مشیروں کے نام تجویز نہیں کیے تھے۔ لیاقت علی خان نے انکشاف کیا کہ پنجاب میں گورنر راج سر فرانسس موڈی کی سفارش پر نافذ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی سفارش صوبائی لیگ کے اس وقت کے صدر دولتانہ نے تحریری طور پر کی تھی۔ دولتانہ نے لکھا تھا کہ ''میں اپنے صحیح نقطۂ نگاہ سے آپ کو مطلع کر چکا ہوں اور میرا خیال ہے کہ یہ صوبہ کے تمام تعلیم یافتہ افراد کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتا ہے لیکن قدرتی طور پر ارکان اسمبلی اس کے حامی نہیں......ارکان اسمبلی کو اپنے رسوخ و طاقت کا اتنا گھمنڈ ہو چکا ہے کہ موجودہ وزارت اور نہ ہی کوئی متبادل وزارت صوبہ کے حالات میں کوئی نمایاں اصلاح کر سکتی ہے۔ اگر فوری سخت گیر اقدامات اختیار نہ کئے گئے تو صوبہ میں حکومت اور سوسائٹی کا تمام شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ اس لئے میری رائے میں اس کا واحد علاج آئین کا تعطل، دفعہ 92 کا نفاذ اور عام انتخابات کا انعقاد ہے۔'' لیاقت علی خان نے مزید کہا کہ ''گورنر موڈی کو قائداعظم نے چنا تھا اُس نے وفاداری اور دیانتداری سے اپنے فرائض سرانجام دیئے۔ اس کے خلاف صوبہ مسلم لیگ کے الزامات بے بنیاد اور غیر ذمہ دارانہ ہیں۔'' 26 رمئی کو صوبہ لیگ کی مجلس عاملہ کا ہنگامی اجلاس ہوا جس میں وزیراعظم پاکستان کی طرف سے گورنر موڈی کی مدح سرائی پر سخت اظہار افسوس کیا گیا اور اس مطالبہ کا اعادہ کیا گیا کہ گورنر موڈی کو بلا تاخیر واپس بلا لیا جائے۔ اس قرارداد کا آخری پیراگراف یہ تھا کہ ''مجلس عاملہ تحفظ حقوق مسلم لیگ کے لئے یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ کسی وزارت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ صوبائی یا مرکزی لیگ کی زبان بندی کرے۔ کسی وزیراعظم کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مسلم لیگ سے یہ مطالبہ کرے کہ وہ کسی اہم قرارداد کو منظور کرنے سے قبل ان کی اجازت حاصل کرے۔ جماعت کسی وزارت کے ماتحت نہیں ہو سکتی۔'' اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ عبدالباری کی صوبہ مسلم لیگ مکمل طور پر ممدوٹ دھڑے کے زیر اثر آ چکی تھی اور اب اس کے اور دولتانہ دھڑے کے درمیان سیاسی جنگ ناگزیر تھی۔ چونکہ وزیراعظم لیاقت اور صدر پاکستان مسلم لیگ چودھری خلیق الزماں، دولتانہ کی پشت پناہی کرتے تھے اس لئے اس متوقع جنگ میں باری لیگ کی شکست بھی یقینی تھی۔

باب: 8

پنجابی شاونزم کی جانب سے فوجی دھمکیاں

31رمئی کو لاہور کی ایک تنظیم ''مرکزِ عالی ضربِ اسلام'' کے لیڈر عزیز ہندی نے ایک بیان جاری کیا جو محض اس لئے اہم نہیں تھا کہ اس میں بدترین قسم کی پنجابی عصبیت وسامراجیت کا اظہار کیا گیا تھا بلکہ اس کی اہمیت اس امر میں بھی مضمر تھی کہ یہ پنجاب کے شاونسٹوں کے سب سے بڑے ترجمان اخبار نوائے وقت میں مفصل اور نمایاں طور پر شائع کیا گیا تھا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ ''میں برملا اور ڈنکے کی چوٹ پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ صرف مغربی پنجاب کے نوجوان فرزندان کا خون ہی پاکستان کی حفاظت اور اس کی آزادی واستحکام کا ضامن ہے۔ پنجاب کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ پاکستان کے نشوو ارتقاء میں باقی سب وحدتوں سے زیادہ اہم اور تاریخی کردار ادا کرے گا۔ اس لئے اگر مرکزی اقتدار میں اسے نمایاں دخل اور حیثیت حاصل نہ ہوگی تو یہ پاکستان کے حال اور مستقبل دونوں کے لئے ضرر رساں ثابت ہوگی۔ پنجاب کو اگر پاکستان کا ''پرشیا'' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جو اہمیت جرمنی میں پرشیا کو حاصل ہے وہی مغربی پنجاب کو پاکستان میں ہے۔ اس بات کا اندازہ کرنا غلطی ہوگی کہ پنجاب کی رائے کے اثر کو محسوس وقبول کئے بغیر مرکز کے ارباب اقتدار حکومت کی مشینری کو صحت وآسانی کے ساتھ چلا سکیں گے...... اگر موڈی نزاع کسی طرح ختم ہو بھی جائے تو جلد یا بدیر مرکزی حکومت میں پنجاب کے اثر ودخل کا مسئلہ اپنی پوری شدت کے ساتھ سامنے آجائے گا۔ اس وقت یہاں کی صحافت کے لئے کوئی راہ گریز باقی نہ رہے گی اور مرکزی حکومت کو یہاں کی صحافت سے کوئی مدد نہ مل سکے گی...... وزیراعظم پاکستان کو

وقت گزرنے سے پہلے حالات کا پوری صحت کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے اور پنجاب، جو پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کا پیوند مرکزی اقتدار میں اس طرح لگانا چاہیے کہ پاکستان کا سارا جسم اپنے حقیقی محور پر قائم ہو سکے۔''[1] جس شخص نے یہ متکبرانہ بیان دیا تھا اور جس اخبار نے اُسے من وعن شائع کیا تھا ان کی ذہنیت سراسر اٹھارہویں صدی کے سامراجیوں کی سی تھی اور وہ عملی طور پر ملک کی سالمیت، یک جہتی اور اتحاد کے مخالف تھے۔ اس بیان میں جو زبان استعمال کی گئی تھی وہ کسی ایسے فاشسٹ کی زبان تھی جو ڈنکے کی چوٹ پر بندوق کی دھمکی دیتا تھا۔ وہ پاکستان کے دوسرے صوبوں کو پنجاب کے مساوی درجہ نہیں دیتا تھا اور کھلم کھلا یہ اعلان کرتا تھا کہ وہ پاکستان میں ''پرشین ایمپائر'' کی طرح پنجابی ایمپائر قائم کرنے کا عزم رکھتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ ''صرف مغربی پنجاب کے نوجوان فرزندان کا خون ہی پاکستان کی حفاظت اور آزادی و استحکام کا ضامن ہے۔'' گویا پاکستان کے دوسرے صوبوں کے عوام کی حیثیت بھیڑ بکریوں سے زیادہ نہیں تھی جن کی حفاظت صرف ''پنجابی بہادر'' ہی کر سکتے تھے اور لیاقت علی خان کو یہ بھی دھمکی دیتا تھا کہ پنجاب کی رائے کے اثر کو محسوس وقبول کئے بغیر مرکز کے ارباب اقتدار حکومت کی مشینری کو صحت وآسانی کے ساتھ نہیں چلا سکیں گے۔'' پنجاب پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے اس کا پیوند مرکزی اقتدار میں اس طرح لگانا چاہیے کہ پاکستان کا سارا جسم اپنے حقیقی محور پر قائم ہو سکے۔'' مختصر یہ کہ اس بیان میں نسلی وفوجی برتری کے غیر اسلامی اور وطن دشمن گھمنڈ کا بدترین مظاہرہ کیا گیا تھا۔ اس کے مطابق پاکستان میں پنجابیوں کی حیثیت برہمنوں اور کھشتریوں کی سی تھی اور دوسرے صوبوں کے سارے عوام نچلی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے اشخاص واخبارات اپنی ان غیر اسلامی وطن دشمن باتوں کے ساتھ ہی اسلامی مساوات واخوت کے دعویدار بھی تھے۔

تقریباً دو ہفتے تک وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جانب سے گورنر موڈی کے حق میں دیئے گئے 24رمئی کے بیان پر سخت نکتہ چینی کی گئی۔ متعدد چھوٹے بڑے مسلم لیگی لیڈروں اور عہدیداروں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں وزیر اعظم کے اس بیان کو عاجلانہ قرار دے کر یہ رائے ظاہر کی کہ وزیر اعظم کو ایک انگریز گورنر کی برطرفی کو اپنے وقار کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ یہ

موقع پنجاب کے پیشہ ور بیان باز لیڈروں اور کارکنوں کے لئے سنہری تھا۔ وہ لیاقت علی خان اور سرفرانسس موڈی کے خلاف جو بھی اوٹ پٹانگ بیان دیتے تھے اسے نوائے وقت اور بعض دوسرے اخباروں میں نمایاں طور پر شائع کیا جاتا تھا اور اس طرح ان کے ''سیاسی کاروبار'' کی بہت مشہوری ہوتی تھی۔ بعض وکلاء محض اپنی وکالت چمکانے کے لئے ہر متنازعہ سیاسی مسئلہ پر بیان دینا ضروری سمجھتے تھے اور بعض افراد ایسے بھی تھے جو ایک دن بیان چھپوا کر دوسرے دن کسی نہ کسی افسر کے پاس جاتے تھے اور اپنا ''کام'' کرواتے تھے۔ ان سارے بیانات، قراردادوں اور تقریروں کے پس پردہ یہ خواہش کارفرما تھی کہ صوبہ میں گورنر راج نافذ ہونے سے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کی جو چودھراہٹ ختم ہوگئی تھی اُسے بحال کیا جائے اور صوبہ کی انتظامیہ کا سربراہ کوئی ایسا شخص ہو جو آئندہ عام انتخابات میں ان کی پشت پناہی کرے۔ گویا ایک انتخابی مہم تھی جس میں ہر حربے کو جائز سمجھا جاتا تھا۔ نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''صوبہ لیگ اور وزیراعظم کے مابین انتشار و افتراق سے ہندوستان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے جو کشمیر کو ہڑپ کرنا چاہتا ہے یا انگریزوں کو جن کی پالیسی یہ ہے کہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ کمزور بنایا جائے۔ مسٹر لیاقت علی خان کو سنجیدگی سے اس سوال پر غور کرنا چاہیے کہ کشمیر زیادہ اہم ہے یا سرفرانسس موڈی۔''[2] اس تبصرے سے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اب مسئلہ کشمیر ایک ایسا سیاسی حربہ بن رہا تھا جسے بعض عناصر داخلی سیاست میں اپنے اچھے یا برے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے لگے تھے۔ 7 رجون کو پنجاب مسلم لیگ کونسل نے گورنر موڈی کی برطرفی کے متعلق مجلس عاملہ کی 23 رمئی کی قرارداد کی توثیق کر دی تو ان عناصر کی رائے یہ تھی کہ ''میاں عبدالباری اور ان کے غریب رفقاء نے ارادہ کی جس مضبوطی اور کریکٹر کی جس بلندی کا ثبوت دیا ہے اس نے عوام میں خوداعتمادی پیدا کر دی ہے کہ پنجاب کا غریب اور متوسط طبقہ بھی ایسے لیڈر پیدا کر سکتا ہے۔'' اگلے دن یعنی 8 رجون کو نوائے وقت نے پنجاب کی ان ''حق تلفیوں'' کی پھر دہائی دی جن کا وہ قبل ازیں بے شمار مرتبہ ذکر کر چکا تھا۔ یعنی یہ کہ ''گورنر راج کی وجہ سے اندرون صوبہ جو نقصان ہو رہا ہے وہ تو ہو ہی رہا ہے صوبہ کے باہر بالخصوص مرکز میں پنجاب کو بھاری نقصان ہو رہا ہے۔ صوبہ میں آئینی حکومت کے فقدان کی وجہ سے مرکزی امور و مسائل میں پنجاب کی کوئی نمائندگی نہیں ہو رہی۔ صوبہ میں آئینی حکومت کے فقدان کی وجہ سے مرکزی حکومت کے وہ وزراء جو پنجاب کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں،

بے دست و پا ہو گئے ہیں کیونکہ اپنے صوبہ میں کوئی حکومت ان کی پشت پر نہیں۔ مرکز میں پنجابی افسروں کا ذکر ہی فضول ہے۔ مرکزی پارلیمنٹ میں پنجاب کی نشستیں خالی پڑی ہیں اور مرکزی وزارت کے وزیروں اور نائب وزیروں میں پنجاب کا تناسب ناکافی ہے۔ یہ بڑی بڑی حق تلفیاں بے شمار ہیں۔ صرف یہی ایک مثال کافی ہوگی کہ پاکستان کی طرف سے جو وفود بین الاقوامی کانفرنسوں میں حصہ لینے کے لئے جاتے ہیں ان میں پنجاب کی نمائندگی بہت کم ہوتی ہے اس لئے کہ اس صوبہ میں کوئی نمائندہ ہی نہیں جس کے کسی رکن کو ایسے وفود کا ممبر بنایا جا سکے۔''

گورنر موڈی کے خلاف مزید تقریباً دو ہفتے کی پراپیگنڈا مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ 21 / جون کو وزیر اعظم لیاقت علی خان اور ''قائدِ پنجاب'' میاں عبدالباری کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا جس کے تحت یہ فیصلہ ہوا کہ صوبہ میں پانچ مشیروں کی کونسل مقرر کی جائے گی۔ مشیروں کے نام صدر صوبہ لیگ تجویز کرے گا لیکن ان کے تقرر کا حکم وزیر اعظم صادر کرے گا جسے ان ناموں میں ردوبدل کا اختیار ہوگا۔ مشیروں کو وہ تمام اختیارات حاصل ہوں گے جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے تحت وزیروں کو حاصل ہیں۔ یہ مشیر ایک کابینہ کی حیثیت میں کام کریں گے۔ اگر مشیروں اور گورنر کے درمیان کسی مسئلہ پر اختلاف رائے پیدا ہوا تو اسے آخری فیصلہ کے لئے مرکزی حکومت کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ صوبہ لیگ کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ کسی ایک یا ایک سے زیادہ مشیروں کو کونسل سے علیحدہ کرائے اور وہ ان کی جگہ نئے مشیروں کو مذکورہ بالا طریق کار کے مطابق فائز کرا سکے۔ لیکن اس سمجھوتہ کے اعلان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد گورنر موڈی نے ایک ایسی کاروائی کی جو پنجابی شاونزم کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی۔ کاروائی یہ تھی کہ اس نے 27 / جون کو متعلقہ حکام کو ہدایت کی کہ وہ سابق وزیر اعلیٰ پنجاب خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ کے خلاف ''پروڈا'' کے تحت ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کر دیں۔ بس پھر کیا تھا! نوائے وقت تڑپ اُٹھا۔ اُس نے اُسی دن ایک اداریہ لکھا جس میں ابتداً مرکزی حکومت کے سرکاری ترجمان کے اس بیان پر نکتہ چینی کی گئی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی نے صدر پنجاب مسلم لیگ عبدالباری سے مشیروں کے تقرر کے بارے میں سمجھوتہ کر کے مونچھ نیچی نہیں کی۔ لیکن اصل بات اس اداریے کے آخر میں تھی اور وہ یہ تھی کہ ''پنجاب زخمی ہے۔ اس کے زخموں کے لئے مرہم کی ضرورت ہے نہ کہ ان پر نمک چھڑکنے کی۔ صحت یاب تو یہ نمک پاشی کے باوجود بھی ہو

جائے گا لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ چارہ گری کے دعویدار اپنے قول وفعل دونوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ وہ مریض کے ہمدرد ہیں۔ پنجاب کے پڑھے لکھے اور سیاسی طور پر بہرہ ور لوگوں میں یہ عام خیال ہے کہ پنجاب کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اور...... جو کچھ ہو رہا ہے، جو کچھ کیا گیا اور جو کچھ کیا جا رہا ہے، جان بوجھ کر کیا جا رہا ہے اور مقصد پاکستان کے اس صوبے کو، جس کے لوگ جاندار اور صاحب عزم وعمل ہیں، کچلنا اور اپنے ''انگوٹھے تلے'' رکھنا ہے۔'' وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کا یہ مقصد تھا یا نہیں، اس کے بارے میں اختلاف رائے ہوسکتا ہے لیکن اس امر پر اختلاف رائے کی گنجائش نہیں کہ مدیر نوائے وقت کو اپنے ممدوح نواب ممدوٹ پر مقدمہ چلانے کے فیصلے کے اعلان سے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ جیسے کسی نے پورے پنجاب کے ''جاندار اور صاحب عزم وعمل'' لوگوں کے زخموں پر نمک چھڑک دیا ہے۔ حالانکہ یہ دقیانوسی جاگیردار افیون کا رسیا تھا اور اس میں جانداریت اور عزم وعمل کا نام ونشان نہیں تھا۔

یکم جولائی کو نوائے وقت میں اوکاڑہ کے ایک سابق رکن اسمبلی میاں عبدالحق کا ایک ''کھلا خط بخدمت میاں ممتاز دولتانہ'' شائع ہوا جس میں دولتانہ پر دھوکا بازی کے کئی ایک الزامات لگائے گئے تھے جن میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ دولتانہ نے تنہائی میں اپنے حامیوں کو یہ بتایا تھا کہ لیاقت علی خان سے میرے تعلقات اس قدر گہرے ہیں کہ اس نے مجھ سے ایک لاکھ روپیہ قرض بھی لے رکھا ہے۔ یہ الزام سنگین تھا۔ لیکن اس خط میں جو بات اس سے بھی زیادہ سنگین تھی وہ یہ تھی کہ ''میاں عبدالباری نے صوبہ مسلم لیگ کا صدر بننے کے بعد یہ محسوس کیا تھا کہ مسلمان عوام، بالخصوص فوجیوں کے اندر، بے اطمینانی کی ایک لہر چل رہی ہے کہ پاکستان کی اسلامی حکومت کی تمام کلیدی اسامیوں پر انگریز مسلط ہیں۔''[3] قبل ازیں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خلاف پنجابی شاونزم کی بنیاد پر پروپیگنڈا مہم کے دوران آئے دن اشاروں کنایوں میں پنجاب کی فوجی قوت کا ذکر ہوتا رہتا تھا اور یہ دعویٰ کیا جاتا تھا کہ پاکستان کی بقاء وسلامتی کا انحصار صرف پنجاب کے بہادروں اور نوجوان فرزندوں کے خون پر ہے اور عزیز ہندی کے 31 رمئی کے بیان میں ڈنکے کی چوٹ پر یہ دھمکی دی گئی تھی کہ پنجاب کے اثر کو محسوس وقبول کئے بغیر مرکز کے ارباب اقتدار حکومت کی مشینری کو صحت وآسانی سے نہیں چلا سکیں گے۔ لیکن اب عبدالحق کے خط میں ''فوجیوں کے اندر بے اطمینانی کی لہر'' کے ذکر سے ملک میں فوجی آمریت کی راہ کی نشاندہی ہوگئی

تھی۔اس کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب میں لیاقت علی خان کے سیاسی حریفوں کواس کا تختہ اُلٹنے کے لئےفوجی آمریت کوبھی دعوت دینے میں کوئی تامل نہیں تھا۔وزیراعظم لیاقت اورممتاز دولتانہ نے میاں عبدالحق کے خط میں عائد کردہ سارے الزامات کی تردید کی مگر دوسری جانب سے ان الزامات کے صحیح ہونے پر محض اس لئے اصرار ہوتا رہا کہ دولتانہ پانچ دن تک کیوں خاموش رہا۔ اس نے فوراًہی تردید کیوں نہیں کی تھی۔5رجولائی کوگورنرموڈی نے روزنامہ سفینہ پر پابندی عائد کی تونوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ''ہم دیانتداری کے ساتھ یقین کرتے ہیں کہ ہمارےصوبہ کو، جو پاکستان کا دل ہے، جان بوجھ کرکچلنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ اس صوبہ کوکمزور بنانا دراصل پاکستان کوکمزور بنانا ہےاورہم پاکستان کی بہتری کی خاطر پنجاب کے خلاف اس سازش کو ناکام بنانے کی جدوجہداس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک یہ سازش ختم نہیں ہوجاتی یا ہم ختم نہیں ہو جاتے۔'' یہ تبصرہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مفاد پرست اور فاشسٹ عناصر کے افکاروخیالات کی واقعی عکاسی کرتا تھا۔پنجاب کے یہ بدبخت عناصر جب یہ کہتے تھے کہ''پنجاب پاکستان کا دل ہے، پنجاب کےلوگ جاندار وصاحب عزم وعمل ہیں، پنجاب پاکستان کی ریڑھ کی ہڈی ہے، پنجاب پاکستان کی بقاوسلامتی کا ضامن ہے،'' توانہیں یہ کبھی احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کے احساس برتری کے اس طرح اظہار کا ملک کے دوسرےصوبوں کےعوام پرکیااثر پڑتا تھا۔وہ اپنی اس صوبائی عصبیت کی بنا پر وطن عزیز کوانتشار وافتراق کی طرف دھکیل رہے تھے۔ان میں اسلامی مساوات، اخوت، دریا دلی اور وسیع المشربی کی ذراسی بھی رمق نہیں تھی۔اگران میں ذراسی سیاسی دوراندیشی ہوتی توانہیں یہ احساس ہوتا کہ ملک کا ہرصوبہ اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ پنجاب تھااور ان کےعوام کےحقوق ومفادات اتنے ہی اہم تھے جتنے کہ پنجاب کےحقوق ومفادات اہم تھے۔ اگر پنجاب پاکستان کا''دل''اور''ریڑھ کی ہڈی'' تھاتو دوسرےصوبے اس کےکوئی فالتو اعضاء نہیں تھے۔ پاکستان مشرقی بنگال کےعوام کی طویل خونی جدوجہد کی پیداوار تھا۔پنجاب کے مفادات وحقوق کےعلمبردارمشرقی بنگال، سندھ، بلوچستان اورسرحد کے مقابلے میں اپنےصوبے کی برتری کا بار بار ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کر کے دراصل نوزائیدہ ملک کی سالمیت ویکجہتی کی بنیادوں پرکلہاڑے ماررہے تھے۔

7رجولائی کولندن کےاخبار ٹائمز میں یہ خبر شائع ہوئی کہ''پنجاب کے گورنرسرفرانسس

موڈی نے استعفیٰ دے دیا ہے۔ ٹائمز کے نامہ نگار نے ذمہ دار ذریعے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ سرفرانسس موڈی کے استعفیٰ کی وجہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت انہیں اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں امداد دینے میں ناکام رہی ہے۔ اس کا یہ استعفیٰ لیاقت علی خان کے مخالف جتھے کی کامیابی ہے۔ مسٹر لیاقت علی خان صوبہ مسلم لیگ اور سرفرانسس موڈی کے مخالفوں سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔'' قدرتی طور پر یہ خبر پنجاب کی ''حق تلفیوں'' پر واویلا کرنے والوں کے لئے بڑی خوشی کا باعث بنی۔ نوائے وقت نے اُسی دن اس اُمید کا اظہار کیا کہ ''اب پنجاب کے معاملہ میں یہ عذر پیش نہیں کیا جائے گا کہ کسی پنجابی کو پنجاب کا گورنر مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر سرکاری افسروں میں سے ہی کسی کو گورنر مقرر کرنا ہے تو ''مادرِ پنجاب'' نے کئی ایسے لائق فرزند پیدا کئے ہیں جو اس عہدے کو چار چاند لگا سکتے ہیں۔ مسٹر محمد علی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ میاں امین الدین بھی ہر طرح سے اس عہدے کے اہل ہیں۔ مسٹر این۔ ایم خان ایک ایسے سینئر افسر ہیں جو اپنی دیانت، خلوص، صلاحیت اور اپنے کردار کی پختگی کی وجہ سے سول سروس میں نہایت ممتاز مقام کے مالک ہیں...... گذارش صرف اس قدر ہے کہ اب جبکہ پنجاب کے لئے پاکستانی گورنر کے انتخاب کا مسئلہ حکومت کے زیر غور ہے اور جب صوبہ سرحد میں اسی صوبہ کے ایک باشندہ کو گورنر مقرر کر دیا گیا ہے، کسی قابل پنجابی کا نام محض اس لئے نظر انداز نہ ہونے پائے کہ وہ پنجاب کا رہنے والا ہے۔''[4]

اور پھر جب 11 رجولائی کو گورنر موڈی کے استعفیٰ کی منظوری کا رسمی طور پر اعلان ہو گیا تو نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اب اس امر کی اشد ضرورت ہے کہ ''مادرِ پنجاب'' کے محنتی اور ایماندار فرزند اپنے اختلافات کو بھلا کر اس اعلیٰ نصب العین کی خاطر ایک مرکز پر جمع ہو جائیں کہ ہمیں پنجاب کو بچانا اور پاکستان کو مضبوط کرنا ہے۔''[5] بظاہر اب اس اخبار کی رائے میں پنجاب کے مسلمانوں میں ''صحیح لیڈر شپ کا قابل رحم حد تک فقدان'' نہیں تھا اب اسے ''مادرِ پنجاب'' پر بہت فخر تھا جس نے ایسے ''لائق'' فرزند پیدا کر رکھے تھے جو گورنری کے عہدے کو چار چاند لگا سکتے تھے۔ اسے پنجاب میں کسی غیر پنجابی کا بطور گورنر تقرر پسند نہیں تھا تاہم 20 رجولائی کو جب مغربی پنجاب کے نئے گورنر کے تقرر کا اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ عہدہ پنجاب کے کسی ''لائق فرزند'' کو نہیں ملا بلکہ اس عہدہ پر صوبہ سرحد کے مسلم لیگی لیڈر سردار عبدالرب نشتر کا تقرر ہوا ہے۔ چونکہ سردار عبدالرب نشتر کی تحریک پاکستان میں خدمات سے سبھی لوگ آگاہ تھے اور وہ پشاور کے درمیانہ طبقہ کی اخلاقی

اقدار کا حامل تھا اس لئے نوائے وقت نے اس تقرر پر پنجاب کی ایک اور ''حق تلفی'' پر احتجاج نہ کیا لیکن ایک بیان باز وکیل چودھری نذیر احمد خان خاموش نہ رہا۔ اس کا بیان یہ تھا کہ ''چونکہ پنجاب میں نمائندہ حکومت نہیں ہے اس لئے مناسب ہوتا کہ گورنر کے عہدہ پر کسی پنجابی کا تقرر ہوتا۔ پنجاب میں لائق، آزاد اور تجربہ کار پنجابی سیاستدانوں کا فقدان نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت نے یہ نفسیاتی موقع گنوا دیا ہے۔ تاہم یہ تقرر اس لحاظ سے اچھا ہے کہ سردار عبدالرب نشتر مغربی پنجاب کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔''[6] چودھری نذیر احمد خان پیشہ کے لحاظ سے وکیل تھا اور اس کی وکالت اور سیاست دونوں ہی اخباری بیانوں کے زور پر چلتی تھیں۔ یہ اخباروں میں اسلام فروشی کے ذریعے بھی مشہوری کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا اور اس کے ساتھ ہی پنجاب کے ''حقوق و مفادات'' کا بھی علمبردار تھا کیونکہ اس مسئلہ پر نوائے وقت اور بعض دوسرے اخباروں میں بیانات بڑی آسانی سے نمایاں طور پر شائع ہو جاتے تھے۔ اس کے متذکرہ بیان کی شنوائی تقریباً دو ماہ بعد ہوئی جبکہ 11 ستمبر کو اسے مرکزی حکومت میں وزیر صنعت مقرر کر دیا گیا اور اس طرح نوائے وقت کی یہ شکایت بھی کسی حد تک دور ہوگئی کہ ''مرکزی کابینہ میں پنجاب کو مناسب نمائندگی حاصل نہیں اور اس صوبہ کی حق تلفی کا فوری ازالہ ضروری ہے۔ ہماری اس گذارش کا محرک صوبہ پرستی کا جذبہ نہیں بلکہ یہ احساس ہے کہ پنجاب کو پاکستان میں جو اہمیت حاصل ہے اس کا پورا اعتراف نہیں کیا جا رہا ہے۔''[7] چودھری نذیر احمد کے تقرر سے اس شکایت کا پوری طرح ازالہ نہیں ہوا تھا کیونکہ ''پنجاب کی نمائندگی کو مؤثر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ دو نئے وزیر اس صوبہ سے لئے جائیں۔ قحط الرجال کا عذر بالکل بے جا ہے۔ اگر تلاش کا دائرہ ایک خاص حلقہ تک بالکل محدود نہ کر دیا جائے تو پنجاب میں قابل آدمیوں کی کوئی کمی نہیں۔''

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے پنجاب کی گورنری کے لئے سردار عبدالرب نشتر کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ چونکہ سردار نشتر مرکزی حکومت میں غلام محمد۔ گرمانی گٹھ جوڑ کے خلاف تھا اس لئے لیاقت علی خان کو یقین تھا کہ وہ (نشتر) پنجاب کے آئندہ انتخابات کے موقع پر بطور صوبائی گورنر اس کے لئے موزوں رہے گا اور ایسا ہی ہوا۔ سردار نشتر 2 اگست کو لاہور پہنچا تو اس نے اسی شام جو نشری تقریر کی اس میں پنجابی شاونزم کی تسکین کے لئے کافی مواد موجود تھا۔ اس نے کہا کہ ''سرسید نے اس صوبہ کے عوام کو ''زندہ دلانِ پنجاب'' کا خطاب دیا تھا، عسکری زبان میں اسے

ہندو پاک کا بازوئے شمشیرزن بیان کیا جاتا تھا اور حضرت قائداعظم پنجاب کو پاکستان کا دل کہا کرتے تھے۔ جس طرح دل کی خرابی تمام جسم کو تباہ کر دیتی ہے اسی طرح پنجاب کی خرابی سے پاکستان کے تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔'' لیکن یہ سب شاعرانہ باتیں تھیں، ان باتوں کا اس وقت کی عملی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 3/اگست کو ممتاز دولتانہ نے نئے گورنر سے ملاقات کی۔ وہ اس مقصد کے لئے خاص طور پر مری سے آیا تھا جہاں وہ 16/ مارچ 1949ء کو صوبہ لیگ کی صدارت سے مستعفی ہونے کے بعد سے قیام پذیر تھا۔ اس کی یہ ملاقات صوبہ میں مشیروں کے تقرر کے بارے میں تھی۔ کیونکہ وہ عام انتخابات کے موقع پر صوبہ کی انتظامیہ میں اپنے کسی مخالف عنصر کا اثر و دخل نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کے سیاسی حریفوں کے ہاتھ میں پنجابی شاونزم کا جو اُسترا آ گیا تھا اس سے انہوں نے نہ صرف صوبہ کی سیاست کو بلکہ پورے ملک کی سیاست کو لہولہان کر رکھا تھا اور وہ گورنری کے عہدے پر سردار نشتر کے تقرر کے باوجود آئندہ بھی اس اُسترے کو بے دریغ استعمال کرنے کا عزم رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہیں ایک سنہری موقع چند دن کے بعد ہی میسر آ گیا۔ جبکہ حکومت پاکستان نے یہ اعلان کیا کہ آئندہ مرکزی ملازمتوں میں بھرتی مقررہ صوبائی تناسب کے مطابق ہوگی۔ اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل فارمولا وضع کیا گیا تھا:

مشرقی بنگال	=	43 فیصد
پنجاب	=	24 فیصد
سندھ، سرحد، بلوچستان اور بہاولپور	=	17 فیصد
کراچی	=	2 فیصد
عازمین ترک وطن	=	15 فیصد

بلاشبہ اس فارمولا میں ہندوستان سے متوقع مہاجرین کے لئے جو آخری 15 فیصد کوٹہ مقرر کیا گیا تھا اس سے اس الزام کی تائید ہوتی تھی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان یو۔ پی کے ''اہلِ زبان'' مہاجرین کو ناجائز طور پر مراعات دے رہا ہے۔ یہ اس کی سیاسی کوتاہ اندیشی تھی اور اس کی اس قسم کی پالیسی سے پنجابی عصبیت کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا تھا۔

نوائے وقت، زمیندار، انقلاب اور پنجاب کے دوسرے اخبارات نے فارمولا کے اس حصہ پر جو نکتہ چینی کی وہ صحیح تھی۔ اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ حکومت پاکستان ہندوستان سے

مسلمانوں کی ہجرت کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتی ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ چودھری خلیق الزماں جیسے چند افراد یا چند خاندانوں کا فائدہ ضرور تھا جو پاکستان کو ایک شکار گاہ سمجھتے تھے لیکن اس فیصلے سے بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کیونکہ اس بنا پر وہ ہندوستان میں اپنی حکومت کی نظروں میں مشتبہ اور مشکوک سمجھے جانے لگے تھے۔ نوائے وقت کا یہ مؤقف غلط نہیں تھا کہ ''جب تک پاکستان کی مرکزی ملازمتوں میں ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لئے 15 فیصد نشستیں مخصوص رہیں گی اس وقت تک ہندوستانی مسلمان اپنی حکومت کی نظروں میں مشکوک و مشتبہ رہیں گے۔ اسے ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت قرار نہیں دیا جا سکتا کہ چند افراد کو فائدہ پہنچانے کی خاطر پوری قوم کو ایک ناقابل رشک پوزیشن میں ڈال دیا جائے۔'' لیاقت علی خان کی اس سیاسی ناعاقبت اندیشی اور تنگ نظری کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ اکتوبر 1949ء میں ہندوستان میں تارکین وطن کی ایک نئی قسم، عازم ترک وطن، کا اضافہ کر دیا گیا۔ چودھری محمد علی کے بیان کے مطابق ''جن مسلمانوں کو عازم ترک وطن قرار دیا جاتا تھا انہیں نہ صرف اپنی املاک سے بلکہ ہندوستان میں روزگار کے تمام ذرائع سے بھی محروم کر دیا جاتا تھا کیونکہ انہیں سرکاری طور پر زبردستی غیر وفادار شہری قرار دے دیا جاتا تھا۔ جب اس طرح کسی مسلمان کو پاکستان میں پناہ لینے کے لئے اپنے گھر سے زبردستی نکال دیا جاتا تو ہندوستان کے حکام اس کے رخصت ہونے پر بڑے فخر سے یہ اعلان کر سکتے تھے کہ انہوں نے اسے عازم ترک وطن قرار دینے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ کس قدر درست تھا۔ ان اقدامات کے باعث ہندوستان سے مسلمانوں کا نئے سرے سے انخلا شروع ہو گیا۔ ہندوستان سے یہ زبردستی دھکیلے جانے والے غریب لوگ زیادہ تر صحرائے سندھ کو پیدل عبور کر کے سرحدی سٹیشن کھوکھرا پار کے راستے سے پاکستان میں داخل ہوتے تھے۔ 1950ء کے دوران میں اس راستے سے 264,899 مہاجرین پاکستان میں داخل ہوئے۔ بالآخر ان کی تعداد بڑھتے بڑھتے چھ لاکھ تک پہنچ گئی۔''[8] لیاقت علی خان نے یو۔ پی کے چند افراد یا خاندانوں کے افراد کے مفاد کے لئے جو فیصلہ کیا تھا اس سے ہندوستان کے ارباب اقتدار نے خوب فائدہ اٹھایا اور اس طرح پاکستان کو اور ہندوستان کے لاکھوں مسلمانوں کو اس کی بہت مہنگی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ایک قیمت یہ بھی تھی کہ پنجابی شاونزم کو اس احمقانہ پالیسی کی آڑ لے کر خوب کھل کھیلنے کا موقع ملا۔

نوائے وقت اور پنجاب کے بعض دوسرے اخبارات کے علاوہ یہاں کے درمیانہ طبقہ کے سیاسی نمائندوں کا یہ مؤقف سراسر صوبائی عصبیت پر مبنی تھا کہ ''مرکزی ملازمتوں کے لئے صوبائی کوٹہ سرے سے مقرر ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یہ فیصلہ صوبہ پرستی کے سانپ کو دودھ پلانے کے مترادف ہے...... ملازمتوں میں داخلہ کا واحد معیار قابلیت ہونا چاہیے۔''[9] جب ان عناصر سے یہ پوچھا گیا کہ اگر تم واقعی صوبائی عصبیت سے بالاتر ہو تو پھر مرکزی وزارت میں پنجابی وزیروں اور نائب وزیروں کی ''کمی'' پر واویلا کیوں کرتے ہو تو یہ عجیب وغریب جواب ملا کہ ''وزارت اور مستقل سرکاری ملازمت میں فرق ہے۔ وزارت کی تشکیل پارٹی کی بنیادوں پر ہوتی ہے اور برسر اقتدار پارٹی کی کابینہ میں ملک کے سارے علاقوں کو نمائندگی دی جاتی ہے۔''[10] لیکن جب ان عناصر سے یہ کہا جاتا تھا کہ اگر وزراء کے تقرر کے بارے میں اس مضحکہ خیز دلیل کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سوال کا کیا جواب ہے کہ تم اپریل 1949ء سے کراچی کی انتظامیہ میں پنجابی پولیس افسروں کی ناکافی نمائندگی اور مرکزی حکومت میں ہر قسم کے سول پنجابی افسروں کی ''کمی'' پر زور وشور سے احتجاج کیوں کرتے رہے ہو تو وہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتے تھے اور بحث کا رُخ کسی اور طرف موڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کی صوبائی عصبیت اور سامراجی رجحانات نے انہیں بالکل اندھا اور بہرہ کر رکھا تھا۔ انہیں اُمید تھی کہ اگر ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لئے 15 فیصد کوٹہ ختم کر دیا جائے اور ملازمتوں میں داخلے کا معیار صرف قابلیت رکھا جائے تو پھر مرکزی حکوت پر پنجابی بیوروکریسی کا پوری طرح غلبہ ہوگا اور ملک کے دوسرے صوبوں کی حیثیت پنجابی سلطنت کی نو آبادیات کی سی رہے گی۔ اسلامی مساوات واخوت کے یہ علمبردار دراصل برہمنی ذہنیت کے حامل تھے۔ انہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ اگست 1949ء تک مرکزی حکومت کی انتظامیہ میں سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مشرقی بنگال کا تو کوئی چپڑاسی بھی مرکزی حکومت کے کسی دفتر میں نظر نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب کے سوا ملک کے کسی دوسرے صوبے میں اس فارمولا کے خلاف احتجاج کی کوئی آواز بلند نہیں ہوئی تھی۔ یہ پنجابی مفادات کے ٹھیکیدار اس حقیقت کو فراموش کرتے تھے کہ متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلے 88-1887ء میں سر سید احمد خان نے اس تجویز کی ایک زبردست مہم کے ذریعہ مخالفت کی تھی کہ محض صلاحیت اور قابلیت کی بنیاد پر ہندوستان میں بھی مقابلہ کے امتحانات ہوں۔ اسے خدشہ تھا

کہ اس طرح صرف کلکتہ، مدراس اور بمبئی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو ساری چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں پر چھا جائیں گے اور برصغیر کے پسماندہ مسلمانوں اور بالائی ہندوستان کے اچھوتوں کی سرکاری ملازمتوں میں نمائندگی نہیں ہوگی۔ بنگالی اخبارات اور سیاسی لیڈروں نے اس مہم کی بنا پر اس کے خلاف طرح طرح کے الزامات عائد کئے تھے۔ جن میں سے سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ انگریزوں کا پٹھو ہے اور ان کے اشارے پر ہندوستان کی یک جہتی کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ تاہم جب وقتی طور پر سرسید کی یہ مہم کامیاب ہوئی تو انڈین کانگرس اس سے بہت برہم ہوئی تھی اور پھر اس کے بعد جب کبھی مسلمانوں کی جانب سے ملازمتوں کے لئے فرقہ وارانہ کوٹہ مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو ہندوؤں کی طرف سے یہی دلیل دی جاتی تھی کہ ''ملازمتوں میں داخلے کا واحد معیار قابلیت ہونا چاہیے۔ ملازمتوں میں کوٹہ سسٹم کی تجویز دراصل انگریزوں کی سازش کا نتیجہ ہے کیونکہ وہ اس طرح ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دے کر اپنے راج کو طول دینا چاہتے ہیں۔'' وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز کرتے تھے کہ مرکزی ملازمتوں کے لئے علاقاتی کوٹہ مقرر کرنے کی تجویز ''مادرِ پنجاب کے فرزندِ ارجمند'' چودھری محمد علی نے پیش کی تھی۔ لیاقت علی خان نے ہندوستان کے مسلمان شہریوں کے لئے 15 فیصد کوٹہ مقرر کرنے کا جو احمقانہ فیصلہ کیا تھا اس پر کچھ عرصہ بعد عمل درآمد روک دیا گیا کیونکہ لیاقت علی خان نے یو۔ پی کے جن افراد اور خاندانوں کو فائدہ پہنچانا تھا وہ ہوائی جہازوں کے ذریعے جلدی ہی کراچی پہنچ گئے تھے اور یہاں انہوں نے نہ صرف مرکزی ملازمتوں میں غیر معمولی مراعات حاصل کیں بلکہ انہوں نے تجارت وصنعت کے میدان میں بھی لائسنسوں اور پرمٹوں کے ذریعے خوب ہاتھ رنگے اور متروکہ جائیدادوں کی بندر بانٹ میں بھی بہت حصہ لیا۔

چودھری محمد علی مرکزی ملازمتوں میں علاقائی نمائندگی کی وکالت کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''صوبوں میں سے عملہ کی شدید ترین کمی مشرقی پاکستان میں تھی۔ تقسیم کے وقت انڈین سول سروس میں مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والا صرف ایک افسر تھا۔ انڈین پولیس میں چند افسر تھے اور اس سے بھی کم تر دوسری اعلیٰ سروسوں میں۔ باقی مسلمان افسر یا مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے یا مسلم اقلیتی صوبوں میں سے آئے تھے...... اس صورت حال کا ممکن العمل حد تک جلد از جلد مداوا ضروری تھا تا کہ ملک کے نظم ونسق میں مشرقی پاکستان بھی مساوی مؤثر حصہ لینے کے قابل بن سکے۔ اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کے لئے پاکستان پبلک سروس کمیشن نے مقابلہ کا جو پہلا امتحان

منعقد کیا اس میں مشرقی پاکستان سے چالیس سے کچھ زائد اُمیدوار پاس ہوئے۔ اگرچہ ہمیں ان سب کی ضرورت نہیں تھی میں نے وزیراعظم کو یہ سفارش کی کہ ان سب کا بمشکل پاس ہونے والوں کے سمیت تقرر عمل میں لایا جائے تاکہ حتی الوسع جلد از جلد توازن قائم کیا جا سکے۔ آئندہ بھرتی کے لئے کابینہ نے ایک منصوبہ منظور کیا جس کے تحت 20 فیصد امیدوار اہلیت کی بنا پر سارے پاکستان سے لئے جانے تھے اور مشرقی اور مغربی پاکستان میں سے ہر ایک سے 40 فیصد۔ مغربی پاکستان کا حصہ مختلف صوبوں میں مزید تقسیم کیا گیا تاکہ تعلیمی اعتبار سے پسماندہ صوبوں کو بھی عہدوں میں اپنا جائز حق مل سکے۔ اس طریق کار سے پنجاب کے اُمیدوار گھاٹے میں رہتے ہیں لیکن یہ بہترین قومی مفاد میں ہے۔''[11] لیکن پنجابی شاونسٹوں کو بہترین قومی مفاد سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کے نزدیک تعلیمی اعتبار سے پسماندہ صوبوں کو بھی عہدوں میں ان کا جائز حق دینا شرانگیز تھا۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کا 13 ؍اگست کا اداریہ یہ تھا کہ '' آج ہمیں ایک دلچسپ رپورٹ ملی ہے۔ سنا گیا ہے کہ پی۔اے۔ایس کے مقابلہ کے امتحان کا نتیجہ نکل گیا ہے اور اس وقت مرکزی حکومت کے سامنے ہے۔ پی۔اے۔ایس میں آٹھ اسامیاں ہیں اور کامیاب اُمیدواروں میں آٹھ سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والے سب کے سب پنجابی ہیں۔ مگر چونکہ ملازمتوں میں اہلیت کا معیار قابلیت نہیں صوبائیت ہے اس لئے دو پنجابی تو لئے جائیں گے مگر باقی چھ اسامیاں دوسرے صوبوں سے پُر کی جائیں گی۔''[12] گویا یہ اخبار پنجابیوں کے لئے سو فیصد اسامیوں کا کھلم کھلا متمنی تھا اور ملک کی انتظامیہ میں تعلیمی اعتبار سے پسماندہ صوبوں کو سرکاری عہدوں میں کوئی حق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ برطانوی راج کے ابتدائی دور میں ہندوستان کے '' کالے آدمیوں'' کے لئے انڈین سول سروس کے دروازے بالکل بند تھے۔

22 ؍اگست کو وزیراعظم لیاقت علی خان لاہور آیا۔ اس کا بظاہر مقصد یہ تھا کہ گورنر کے مشیروں کے تقرر کے بارے میں صدر صوبہ لیگ عبدالباری اور ممتاز دولتانہ کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہو گیا ہے اس کا کوئی تصفیہ کیا جائے۔ عبدالباری کا مطالبہ یہ تھا کہ 21 ؍جون کو اس کا وزیراعظم لیاقت سے مشیروں کے تقرر کے بارے میں جو سمجھوتہ ہوا تھا اس پر عمل کیا جائے مگر ممتاز دولتانہ کا مؤقف یہ تھا کہ اب جبکہ صوبہ میں مسلمان گورنر کا تقرر ہو گیا ہے مشیروں کے تقرر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں پاکستانی گورنر پر پورا اعتماد کرنا چاہیے۔ مسلم لیگ کو براہ راست اس معاملے میں دلچسپی

نہیں لینی چاہیے۔ اگر گورنر صاحب مشیروں کا تقرر ضروری سمجھتے ہیں تو انہیں یہ اجازت دینی چاہیے کہ وہ اپنی مرضی سے مشیروں کا تقرر کر سکیں۔ چونکہ اس قسم کے تنازعہ میں نوائے وقت کا ووٹ عبدالباری کے حق میں ہی ہوسکتا تھا اس لئے اس نے اسی دن اپنے ایک اداریے میں وزیراعظم سے وہ بات کہہ دی جو اس کے بقول صوبہ کے لوگوں کی اکثریت کے دل میں بھی تھی۔ وہ بات یہ تھی کہ ''پنجاب کے عوام کی اکثریت یہ سمجھتی ہے کہ پنجاب سے بے انصافی کرنے میں خود وزیراعظم کا بھی ہاتھ ہے۔ ممکن ہے یہ بات بالکل بے بنیاد ہو مگر یہ زہر اکثر دلوں میں سرایت کر چکا ہے اور اس کا تریاق ضروری ہے۔ ایک خاص گروپ نے اندر ہی اندر اس امر کا پروپیگنڈا کیا ہے کہ مسٹر لیاقت علی خان اس کی جیب میں ہیں اور صوبہ کا اقتدار اس کے حوالے کرنا چاہتے ہیں...... ایک سال سے یہ گروپ لوگوں کے دل میں یہ بات بٹھانے کی کوشش میں ہے کہ مسٹر لیاقت علی خان اس کے سرپرست ہیں۔''[13] اس اداریے کی حیثیت ایک انتباہ کی تھی کہ اگر تم نے مشیروں کے تقرر کے بارے میں دولتانہ دھڑے کے حق میں فیصلہ کیا تو تمہارے خلاف صوبائی عصبیت کا زہر مزید پھیلا دیا جائے گا۔ اس انتباہ کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ قبل ازیں 11 راگست کو جب اقبال چیمہ صوبہ مسلم لیگ کا متفقہ طور پر جنرل سیکرٹری منتخب ہوا تھا تو اس کی کامیابی کو دولتانہ کی فتح قرار دیا گیا تھا اور بعض اخبارات نے یہاں تک اعلان کر دیا تھا کہ لیگ کونسل میں عبدالباری کے خلاف دولتانہ کی اکثریت موجود ہے۔

وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنے لاہور میں قیام کے دوران اندر خانے دھڑے بندی کی سیاست کو خوب ہوا دی۔ چونکہ وہ خود ایک قدامت پسند جاگیردار کی حیثیت سے پنجاب میں عبدالباری کی زیر قیادت درمیانہ طبقہ کی سیاسی بالادستی برداشت نہیں کر سکتا تھا اور اس کا ممتاز دولتانہ کے ساتھ گٹھ جوڑ بدستور قائم تھا اس لئے اس کی کراچی واپسی سے پہلے ہی صوبہ کے مختلف دھڑوں کے درمیان کشمکش اقتدار پھر منظر عام پر آ گئی۔ دولتانہ نے پبلک جلسوں میں عبدالباری کے خلاف مظاہرے کرائے اور یہ افواہ پھیلائی کہ عبدالباری اب زیادہ دیر تک صوبہ لیگ کی صدارت پر فائز نہیں رہ سکتا اور ممدوٹ دھڑے کے ترجمان اخبار نوائے وقت نے پنجاب کی ''حق تلفیوں'' پر پہلے سے زیادہ شور مچانا شروع کر دیا۔ اس اخبار کا مؤقف یہ تھا کہ ''صوبہ پنجاب پاکستان کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ محنتی صوبہ تھا اور اسے ترقی کی

دوڑ میں سارے ملک کی رہنمائی کرنی چاہیے تھی۔ مگر آج یہ صوبہ پاکستان کے سب صوبوں سے پھڈی ہے اور اگر یہی لیل و نہار رہے تو دس سال بعد صنعتی اور اقتصادی ترقی کے اعتبار سے پاکستان میں پنجاب کی وہی پوزیشن ہوگی جو آج کل بلوچستان کی ہے۔''[14] نوائے وقت نے اس سے پہلے بھی دو تین مرتبہ پنجاب کے عوام کو یہ کہہ کر خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی کہ اگر وہ اس کی بتائی ہوئی عصبیت کی راہ پر گامزن نہ ہوئے تو ان کا ترقی یافتہ صوبہ پسماندگی کے لحاظ سے بلوچستان کی سی حیثیت اختیار کرلے گا۔ گویا بلوچستان کی پسماندگی کی مثال اتنی ڈراؤنی تھی کہ نوائے وقت بار بار اس کا ذکر کر کے پنجابی عوام کو ڈراتا تھا لیکن اسے کبھی یہ توفیق نہیں ہوئی تھی کہ یہ بلوچستان کی سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور معاشی ترقی کے لئے بھی اتنی ہی دلسوزی کا مظاہرہ کرے جتنی کہ یہ پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے ''مفادات و حقوق'' کے لئے کرتا تھا۔ اگر اس نے کبھی بلوچستان کی ترقی کا ذکر کیا بھی تو وہ محض برائے بیت تھا۔ اس نے کبھی زور شور سے یہ مہم نہیں چلائی تھی کہ اگر بلوچستان بدستور پسماندہ رہا تو پاکستان کی سالمیت و یک جہتی خطرے میں پڑ جائے گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے منشوروں اور مواعید کے برعکس اگست 1947ء میں بلوچستان کو صوبہ کا درجہ نہیں دیا گیا تھا۔ صرف مشاورتی کونسل کا اعلان کیا گیا تھا اور اس اعلان پر بھی ستمبر 1949ء تک تسلی بخش طریقے سے عملدرآمد ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کیونکہ بلوچستان کے پنجابی ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین اور قاضی عیسیٰ کے درمیان مشیروں کے اختیارات کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اگر پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے قلب و نظر میں ذرا سی وسعت ہوتی تو وہ صرف پنجاب کی ''حق تلفیوں'' کی دہائی نہ دیتے بلکہ پورے ملک میں متوازن ترقی کے لئے مہم چلاتے۔ اس طرح ملک کے دوسرے پسماندہ صوبوں کے عوام میں پنجابی غلبہ کے بارے میں جو خدشہ پایا جاتا تھا وہ خود بخود دور ہو جاتا اور اس طرح پنجاب و پنجابی عوام کے وقار میں اضافہ ہوتا۔ اگر پنجاب سے بلوچیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بنگالیوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق کے لئے مسلسل مخلصانہ آوازیں اُٹھتیں تو اسلامی مساوات و اخوت کا صحیح مظاہرہ ہوتا اور اس طرح ان صوبوں میں پنجاب و پنجابیوں کے خلاف نفرت کے جذبات کی کبھی نشوونما نہ ہوتی۔

دوسری طرف نوابزادہ لیاقت علی خان کی جاگیرداریت اس سے آئے دن ایسے کام

کرواتی تھی جس سے پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی خفگی میں بجا طور پر اضافہ ہوتا تھا۔ اس نے لاہور سے کراچی واپس پہنچ کر راولپنڈی ڈویژن کے ایک پرانے یونینسٹ جاگیردار سر محمد نواز خان کا نائب وزیر دفاع کی حیثیت سے تقرر کر دیا۔ قدرتی طور پر پنجاب کے درمیانہ طبقہ نے اس تقرر کو پسند نہ کیا اور اس سے یہ بات اور بھی واضح ہوگئی کہ وزیراعظم لیاقت پنجاب کے ان پرانے یونینسٹ جاگیرداروں کی سرپرستی کر رہا ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی۔ نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''سیاسی اعتبار سے یہ تقرر اس قدر غلط اور شرمناک ہے کہ ہم اس کی مذمت کئے بغیر نہیں رہ سکتے...... جو حکومتیں غداروں سے اغماض کرتی ہیں یا طوفان تھم جانے کے بعد طوفان کے وقت ساحل پر کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں تو وہ حکومتیں اپنی جڑوں پر آپ کلہاڑا چلاتی ہیں۔''[15]

18 ستمبر کو صوبہ لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو اس میں اس تقرر کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا گیا۔ چونکہ ممتاز دولتانہ مشیروں کے تقرر کے خلاف تھا اور اس نے سر محمد نواز خان جیسے یونینسٹ جاگیردار سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا اس لئے اس اجلاس میں ''دولتانہ مردہ باد'' غداروں کا حامی مردہ باد، پنجاب کو ذلیل کرنے والا مردہ باد اور لیگی صفوں میں انتشار پیدا کرنے والا مردہ باد کے نعرے لگائے گئے اور ان نعروں کے درمیان کثرت رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ صوبائی گورنر کے لئے مشیروں کا تقرر ہوگا۔ کونسل کا یہ اجلاس دولتانہ کے 180 حامی ارکان کی طرف سے 27 اگست کو یعنی وزیراعظم لیاقت علی کی لاہور سے واپسی کے فوراً بعد کئے گئے مطالبہ کی بنیاد پر بلایا گیا تھا۔ ایجنڈا یہ تھا کہ ''بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر گورنر مغربی پنجاب کے لئے مشیروں کے تقرر کے مسئلہ پر دوبارہ غور کیا جائے۔'' کونسل کے اس فیصلہ پر نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''اگر میاں عبدالباری کو شکست ہو جاتی تو پھر شاید مزید دس سال کے لئے قیادت طبقہ امراء کے ہاتھ میں چلی جاتی کیونکہ یہ امر یقینی ہے کہ میاں عبدالباری کے بعد متوسط طبقہ کا کوئی کارکن آگے بڑھنے کی جرأت نہ کرتا...... ایک سو کے لگ بھگ موٹریں پورے چودہ دن تک شب و روز پنجاب کی مختلف سڑکوں پر دوڑتی پھریں۔ ہزاروں گیلن پٹرول پھونکا گیا اور دولت پانی کی طرح بہائی گئی۔ برادری اور خاندانی تعلقات کے واسطے دیئے گئے، ضمیر و ایمان کے سودے چکائے گئے اور اپنی صوبائی وزارت اعلیٰ کو یقینی بتاتے ہوئے وزارتی گدیاں بھی تقسیم کر دی گئیں۔ یہ سارے پاپڑ اس

لئے بیلے گئے کہ ایک مردفقیر مگر فقیر غیور کو سبق سکھایا جائے اور اس کی گردن جھکائی جائے۔ ایک طرف موٹر کاروں کا کارواں تھا اور زر و سیم کا انبار دوسری طرف شکستہ و ریختہ مکان میں چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں اور چار پائیاں، مگر خلوص کو بالآخر فتح نصیب ہوئی اور خود غرضی، سازش اور نفاق کی قوتیں زر و مال کی اعانت اور نسلی عصبیت کی کمک کے باوجود ناکام رہیں۔"[16]

مسلم لیگ کونسل کے اس فیصلے کے بعد 4/نومبر کو صوبائی گورنر عبدالرب نشتر نے صوبہ کے روزمرہ کے نظم و نسق میں امداد حاصل کرنے کے لئے ملک محمد انور، شیخ نسیم حسن، شیخ صادق حسن، مسٹر محمد خاں لغاری اور سید میر احمد شاہ کو بطور مشیر مقرر کیا۔ یہ پانچوں مشیر میاں عبدالباری کے نامزد کردہ تھے۔ ان میں سے چار درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور دولتانہ دھڑے کے مخالف تھے۔ پانچواں مشیر محمد خان لغاری ڈیرہ غازی خان کا نہایت رجعت پسند جاگیردار تھا۔ اس کی مشیروں کی "کابینہ" میں شمولیت کی وجہ یہ تھی کہ مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی خان کے بیشتر جاگیردار اور سردار دولتانہ کے خلاف تھے۔ وہ دولتانہ کو ایک ایسا مکار و عیار سیاسی لیڈر سمجھتے تھے جو حصول اقتدار کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ اس کے مقابلہ میں وہ نواب ممدوٹ کو اپنے طبقہ کے لئے ایک شریف اور قابل اعتماد گھوڑا تصور کرتے تھے حالانکہ اس گھوڑے کی سیاسی قوت کا زیادہ تر انحصار صوبہ کے درمیانہ طبقہ کی حمایت پر تھا۔ مزید برآں نواب ممدوٹ کو بنگال کے ایک زیرک بورژوا لیڈر حسین شہید سہروردی کی حمایت بھی حاصل ہوگئی تھی جو ہائی کورٹ میں ممدوٹ کے مقدمہ میں وکیل صفائی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ سہروردی ایک جرأت مند لیڈر تھا اور اس کی انگریزی دانی اور حاضر جوابی کے سب لوگ قائل تھے۔ اس نے مشیروں کے تقرر سے ایک دن قبل عدالت میں یہ الزام عائد کیا تھا کہ نواب ممدوٹ کے خلاف دراصل سیاسی قتل کا مقدمہ چلایا جا رہا ہے کیونکہ وہ ممتاز دولتانہ کے حصول اقتدار کے راستے میں حائل ہے۔ سہروردی کا مؤقف یہ تھا کہ "وزیراعظم لیاقت علی خان، میاں ممتاز دولتانہ کی حمایت کرتا ہے۔ اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ خان آف ممدوٹ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے لیکن چونکہ میاں ممتاز دولتانہ یہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے ساتھ اسمبلی کے ارکان کی اکثریت نہیں ہے اس لئے اس نے وزیراعلیٰ بننے سے انکار کر دیا اور یہ مشورہ دیا تھا کہ مغربی پنجاب میں دفعہ 92 (الف) نافذ کر دی جائے۔ بعدازاں کراچی میں انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان، میاں ممتاز دولتانہ اور مسٹر لیاقت علی کے درمیان ایک

کانفرنس ہوئی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ خان ممدوٹ کے خلاف مقدمہ چلایا جائے تا کہ ان کی سیاسی زندگی ختم ہو جائے۔ یہ دراصل سیاسی قتل کا مقدمہ ہے۔"[17] اس کے اس مؤقف کی تائید 29 ر دسمبر کو ہوئی جبکہ اس مقدمہ میں وکیل استغاثہ منظور قادر نے اعتراف کیا کہ گورنر موڈی نے نواب ممدوٹ کے خلاف مقدمہ کے سلسلے میں راولپنڈی میں وزیر اعظم لیاقت علی سے ملاقات کی تھی اور میاں انور علی ڈی آئی جی نے کراچی جا کر اس مقصد کے لئے وزیر اعظم کی منظوری لی تھی۔

5 ر دسمبر کو نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ نے اپنے خلاف منٹگمری میں اقبال نگر اسٹیٹ کی غلط طریقے سے الاٹمنٹ کرانے اور بعض دوسری بدعنوانیوں کے الزامات کے جواب میں چیف جسٹس محمد منیر اور مسٹر جسٹس اے۔آر۔ کارنیلئس پر مشتمل سپیشل بنچ کے روبرو ایک طویل بیان دائر کیا جس میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا تھا کہ میرے خلاف یہ مقدمہ نوابزادہ لیاقت علی خان، سر فرانسس موڈی، میاں ممتاز دولتانہ اور انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان کی مشترکہ سازش کا نتیجہ ہے۔ بعض چھوٹے چھوٹے افسروں نے اس سلسلہ میں بڑی خوشی سے استغاثہ کی امداد کی لیکن بعض دوسرے افسروں کو اس مقصد کے لئے دھمکایا گیا اور ان پر ناجائز دباؤ ڈالا گیا۔ اس کے بیان کے اہم نکات یہ تھے کہ

1۔ نوابزادہ لیاقت علی خان، وزیر اعظم پاکستان کی میرے خلاف انتقام لینے کی ذاتی وجوہات تھیں۔ مہاجرین کے متعلق ان کی اختیار کردہ پالیسی کے نتیجہ میں پیدا شدہ بعض سیاسی و انتظامی اختلافات اور بعض ایسے امور میں مرکزی بے سود اور بے جا مداخلت سے قطع نظر جن کے متعلق ان کو بہت کم علم تھا، میری بدقسمتی تھی کہ مجھے بعض اور امور میں بھی وزیر اعظم پاکستان کی ناراضگی مول لینی پڑی۔

2۔ میاں ممتاز دولتانہ میری بجائے پنجاب کا وزیر اعلیٰ بننا چاہتے تھے مگر انہیں انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان کی امداد کے باوجود ارکان اسمبلی کی اکثریت کی حمایت حاصل نہ ہو سکی اس لئے انہوں نے صوبہ میں دفعہ 92 (الف) یعنی گورنر راج کے نفاذ کی سفارش کی۔

3۔ وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کی کوشش تھی کہ میرے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور ہو جائے چنانچہ وہ اس مقصد کے لئے خاص طور پر لاہور تشریف لائے تھے۔

4۔ مغربی پنجاب کے سابق گورنر سر فرانسس موڈی میرے سخت مخالف تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ میرے خلاف مقدمہ دائر کیا جائے۔ میرے اور ان کے درمیان متعدد دفعہ تیز کلامی ہوئی جس کے نتیجہ میں وہ میرے سخت دشمن ہو گئے۔ وہ ان تمام لوگوں سے نفرت کرتے تھے جو آزادیٔ کشمیر کے کام میں حصہ لیتے تھے۔ میری کوشش تھی کہ حکومت مغربی پنجاب کے عام عہدوں پر یورپین افسروں کی جگہ پاکستانیوں کو مقرر کیا جائے لیکن گورنر موڈی کی یہ خواہش تھی کہ یورپین افسروں کو بدستور رکھا جائے۔ میں نے یہ حکم دیا کہ غیر مسلم قافلوں کو اس وقت تک روک رکھا جائے جب تک مشرقی پنجاب کی حکومت مسلمان قافلوں کو مغربی پنجاب آنے کی اجازت نہ دے۔ لیکن سر فرانسس موڈی اس پر بگڑ بیٹھے اور گرم ہو گئے۔ گورنر موڈی نے ایک حکم جاری کیا تھا کہ غیر مسلم قافلوں کو تلاشی کے بغیر جانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے اس حکم کی تعمیل نہ ہونے دی۔ وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی نے اس سلسلے میں گورنر کی حمایت کی مگر بعد ازاں قائد اعظم نے میرے نقطۂ نظر کی تائید کی۔

5۔ سر فرانسس موڈی ہمیشہ مسلم لیگ اور لیگی کارکنوں کے مخالف رہے۔ انہیں ان تمام افراد سے نفرت تھی جو پاکستان کی خدمت کے لئے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر رہے تھے اور جو صحیح معنوں میں مسلم لیگی تھے۔ موڈی صاحب ہمیشہ یونینسٹ سیاسی لیڈروں اور یونینسٹ افسروں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان میاں ممتاز دولتانہ کے گہرے دوست تھے۔ ہر شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ جماعتی سیاست میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ انہوں نے دولتانہ صاحب کی حمایت کے لئے ارکان اسمبلی کو میرے خلاف ترغیب دی۔ خان قربان علی خان، میاں ممتاز دولتانہ اور ان کی پارٹی کے دیگر ارکان کے ساتھ کراچی گئے اور وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان کے ساتھ خفیہ بات چیت کی۔ حالانکہ انہیں ایسا کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ خان قربان علی خان کو یہ یقین تھا کہ میاں ممتاز دولتانہ اس وقت تک پنجاب کی سیاسی قیادت کا منصب حاصل نہ کر سکیں گے جب تک میرے وقار کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ انہوں نے میرے خلاف گواہیاں بنانے میں پنجاب پولیس

کے تمام مشہور ہتھکنڈے اختیار کئے۔"[18]

نواب ممدوٹ کے خلاف پروڈا کے تحت یہ مقدمہ کئی ماہ تک جاری رہا جس کے دوران ہائی کورٹ عملی طور پر اینٹی لیاقت پروپیگنڈا کے لئے ایک مؤثر پلیٹ فارم بن گیا تھا۔ ہائی کورٹ میں اور ہائی کورٹ سے باہر اس پروپیگنڈا کا خلاصہ یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کشمیر میں جنگ آزادی کا مخالف تھا۔ وہ پنجاب کی بہترین متروکہ جائیدادیں یو۔پی کے بااثر مہاجرین خاندانوں کو الاٹ کرنے کا متمنی تھا۔ حالانکہ ان میں سے بیشتر خاندان پنجاب میں آباد نہیں ہوئے تھے بلکہ انہوں نے کراچی اور حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ وزیراعظم لیاقت علی خان نے پنجاب میں ان یونینسٹ جاگیرداروں اور اعلیٰ افسروں سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی اور جو قائداعظم کے معتوب ومغضوب تھے اور صوبہ کا انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان وزیراعظم لیاقت کی شہ پر صوبہ کی جماعتی سیاست میں عملی طور پر حصہ لیتا تھا اور اس طرح وہ پنجاب میں وزارتی بحران پیدا کرنے کا موجب بنا تھا۔ یہ پروپیگنڈا سراسر بے بنیاد نہیں تھا، اس لئے صوبہ کی تعلیم یافتہ رائے عامہ اس سے بہت متاثر ہوئی اور جب 9ستمبر 1950ء کو نواب ممدوٹ کو بدعنوانیوں کے سارے الزامات سے بری قرار دے دیا گیا تو اس وقت کچھ شہروں میں وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف سیاسی فضا نہایت غیر موافق ہو چکی تھی۔ چونکہ اس مقدمہ میں متحدہ بنگال کے سابق وزیراعظم حسین شہید سہروردی نے بھی وکیل صفائی کے فرائض سرانجام دیئے تھے۔ اس لئے اسے بھی پنجاب کو لیاقت علی کے خلاف اپنا مستقل سیاسی مورچہ بنانے میں بڑی مدد ملی اور چونکہ اس بورژوا لیڈر کا سیاسی قد و قامت خاصا بلند تھا اور وہ ملک کی مرکزی حکومت کا سربراہ بننے کا عزم رکھتا تھا اس لئے پنجاب میں اس کی سیاسی سرگرمیاں لیاقت علی خان کے اقتدار کے لئے بہت خطرناک تھیں۔ یہاں کا تعلیم یافتہ طبقہ اس کی انگریزی دانی وشعلہ بیانی سے بہت متاثر تھا جبکہ خود اسے لیاقت کا تختہ الٹنے کے لئے کسی گٹھ جوڑ یا ساز باز سے عار نہیں تھا۔

باب: 9

پنجابی شاونسٹوں اور ''تلیئروں'' کے درمیان تضاد

وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف یہ پروپیگنڈا اس لحاظ سے وطن عزیز کے لئے بہت خطرناک تھا کہ اب اس کا رُخ وزیراعظم لیاقت علی خان کے علاوہ کھلم کھلا یو۔ پی کے مہاجرین کی طرف ہو گیا تھا۔ اس قسم کا زہر آلود پروپیگنڈا دراصل دبے الفاظ میں 1949ء کے اوائل میں ہی شروع ہو گیا تھا جبکہ کراچی کی انتظامیہ کے علاوہ مرکزی حکومت میں یو۔ پی کے مہاجرین کی بھرتی ان کی آبادی کے تناسب سے بہت زیادہ کی گئی تھی۔ بعض محکموں میں تو ان مہاجروں کی تقریباً اجارہ داری تھی اور ملک کے کسی دوسرے صوبے کے ''غیر اہلِ زبان'' امیدواروں کے لئے ان محکموں کے دروازے تقریباً بند تھے۔ پھر جب اگست 1949ء میں وزیراعظم لیاقت نے مرکزی ملازمتوں میں ان مسلمانوں کے لئے بھی پندرہ فیصد کوٹہ مقرر کر دیا جو کہ ابھی ہندوستان ہی میں تھے تو یو۔ پی کے خلاف پروپیگنڈے میں تندی و تلخی آ گئی تھی اور پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے خاصے لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ لیاقت علی خان فی الحقیقت یو۔ پی کے مہاجرین کو ہر قسم کی ناجائز مراعات دینے کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے اور وہ پاکستان کے سارے شہریوں کو ایک ہی نظر سے نہیں دیکھتا۔ لیاقت علی کی اس کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ پنجاب میں متروکہ جائیدادوں کی الاٹمنٹوں کے سلسلے میں بھی ہوا تھا جبکہ بہت سے ایسے ''اہلِ زبان'' کو یہاں زمینیں، فیکٹریاں، سینما گھر وغیرہ الاٹ کر دیئے گئے تھے جن کی مستقل رہائش کراچی یا حیدرآباد میں تھی۔ مزید برآں پنجاب میں متعین یو۔ پی کے سرکردہ افسروں نے غیر رسمی سطح پر اپنی ایک ایسوسی ایشن سی بنالی تھی۔ جس کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ

1۔ پنجاب میں یو۔ پی کے چھوٹے بڑے ملازمین کے مفادات و حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

2۔ یو۔ پی کے مہاجرین کو اچھی سے اچھی اور زیادہ سے زیادہ متروکہ جائیدادیں الاٹ کی جائیں اور

3۔ یو۔ پی کے مہاجرین اور مشرقی پنجاب کی انبالہ ڈویژن کے ''اہلِ زبان'' مہاجرین کو لاہور شہر کے علاوہ ملتان، منٹگمری، جھنگ، سرگودھا اور میانوالی کے اضلاع میں اس طرح آباد کیا جائے کہ ''اہلِ زبان'' سیاسی لیڈروں کے لئے پنجاب میں محفوظ حلقہ ہائے انتخاب بن جائیں۔

اس ایسوسی ایشن کی روح رواں یو۔ پی کا ایک ریٹائرڈ پی سی ایس افسر سید احمد علی تھا۔ جسے گورنر موڈی کے عہد میں ہوم سیکرٹری کے کلیدی عہدہ پر فائز کر دیا گیا تھا اور اس کے سرکردہ اور سرگرم ارکان میں اختر حسین، ظفر الاحسن، آئی۔ یو۔ خان اور سید سعید جعفری وغیرہ شامل تھے۔ نوائے وقت اور لاہور کے دوسرے اخبارات میں سید احمد علی کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈے کی بنیاد اس افسر کی اس قسم کی سرگرمیوں پر بھی تھی۔ صوبائی سیکرٹریٹ کے کئی چھوٹے بڑے پنجابی ملازمین اس کے خلاف اخبارات کو مواد مہیا کرتے رہتے تھے۔ بالخصوص خواجہ عبدالرحیم اور راجہ حسن اختر اس کے خلاف پروپیگنڈے کا مواد جمع کرتے رہتے تھے جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ احمد علی بطور ہوم سیکرٹری نواب ممدوٹ کے منظور نظر ان دونوں افسروں کے خلاف تحقیقات کا انچارج تھا۔

نوائے وقت نے پہلے تو اس افسر کے خلاف دبے الفاظ میں اور اشاروں اور کنایوں میں پروپیگنڈا کیا مگر گورنر موڈی کے استعفیٰ کے بعد یہ اخبار کھل کھیلا۔ اس نے ایک اداریہ بعنوان ''یہ پیرانِ فرتوت'' لکھا جس میں الزام عائد کیا گیا کہ ''گورنر موڈی نے صرف پنجاب کے پیرانِ فرتوت کو ہی مسند حکومت پر نہیں بٹھایا۔ ہندوستان کے ریٹائرڈ افسر منگائے اور انہیں پنجاب کے سر پر مسلط کر دیا۔ یہاں تک کہ ہوم سیکرٹری کی کلیدی اسامی کے لئے بھی یو۔ پی کے ایک ساٹھ سالہ افسر منگائے گئے اور اس بدقسمت صوبہ کی تقدیر ان کے حوالے کر دی گئی۔ گویا اس صوبہ میں متعین افسروں میں سے کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اُسے اس عہدے پر مقرر کیا جاتا۔ یہ صاحب قابلیت کے اعتبار سے اس منصب کے اہل تھے نہ ان کی صحت ہی انہیں اجازت دیتی ہے کہ وہ اس اہم عہدہ سے متعلقہ مشکل فرائض سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ گورنر موڈی کو اُن کی یہ ادا پسند آئی کہ جب آپ یو۔ پی میں تھے تو یہ صاحب ان کی مخصوص خدمات بجالانے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے

اوران کی دوسری خوبی یہ تھی کہ کراچی میں یہ پنجابی افسروں کے خلاف سازش اور فتنہ آرائی کے لئے ناقابل رشک شہرت کے مالک تھے۔"[1] اس اخبار نے 8/دسمبر کو پھر اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کی اور متذکرہ الزام کا مزید تلخ الفاظ میں ذکر کیا۔ اداریہ یہ تھا کہ "سیاسی پارٹی بازی اور ذاتی بغض اور عداوت کی بنا پر مقدموں کا سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیے۔ گورنر موڈی کی اس معاملہ میں نیت اب کسی سے مخفی نہیں رہی۔ وہ مسٹر احمد علی کو اس لئے ہوم سیکرٹری کی حیثیت سے لاہور لائے تھے کہ مسٹر احمد علی کراچی میں نیک نام اور نیک کردار پنجابی افسروں کو جھوٹے مقدموں میں پھنسانے، بلاوجہ معطل کرانے اور مہینوں ان کا معاملہ لٹکائے رکھنے کے لئے ناقابل رشک شہرت حاصل کر چکے تھے۔"[2] پھر اس اخبار نے 25/دسمبر کو ایک اداریے میں اعلان کیا کہ مسٹر احمد علی کے خلاف ابھی بہت سے "سخنہائے گفتنی" ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ پنجاب کو "نالائق، از کار رفتہ اور پارٹی باز" افسروں سے نجات حاصل ہو۔

نوائے وقت اور پنجاب کے بعض دوسرے اخبارات کی جانب سے وزیراعظم لیاقت علی خان، یو۔پی کے مہاجرین اور یو۔پی کے افسروں کے خلاف اس قسم کے جائز و ناجائز پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ملک میں پنجاب کے درمیانہ طبقہ اور "اہلِ زبان" کے درمیانہ طبقہ کے درمیان تضاد نے معاندانہ صورت اختیار کر لی۔ اس کی ایک وجہ یو۔پی کے بعض تعلیم یافتہ عناصر کے احساس برتری میں بھی مضمر تھی۔ یہ عناصر یو۔پی کو "اعلیٰ تہذیب و ثقافت" کا گہوارہ سمجھتے تھے اور سندھیوں اور پنجابیوں وغیرہ کو تہذیبی لحاظ سے کمتر درجہ دیتے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا دعویٰ یہ تھا کہ دہلی اور یو۔پی کے بیشتر مسلمانوں کی رگوں میں دیسی خون نہیں ہے۔ وہ کہتا تھا کہ "جن خاندانوں نے دہلی میں حکومت کی، وہ بیرونی اصل کے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ دیسی خون کی آمیزش بھی ہوئی تھی مگر بیرونی عنصر کو زندہ رکھا گیا تھا۔ عظیم تر مغل بادشاہوں میں صرف دو ایسے تھے جن کی مائیں ہندو نسل کی تھیں۔ ان سے پہلے جو دہلی کے حکمران تھے ان میں ایسی مثالیں اور بھی کم ہیں بالخصوص ان میں جو دوسرے ممالک سے آئے تھے۔ کفو کے اصول کا، جو عربوں سے لیا گیا تھا کافی رواج تھا۔ اس کی تشریح اس طرح کی جاتی تھی کہ مسلمان عموماً اپنے ہی کنبہ برادری میں شادیاں کیا کرتے تھے۔ مخصوص برادری سے باہر شادیاں کرنے کی بے شک کوئی مذہبی مخالفت نہیں تھی اور ایسی شادیوں سے جو اولاد ہوتی تھی اس کو بھی اتنی ہی مشکلات پیش

آتی تھیں جو ہر معاشرے میں اس جوڑے کی اولاد کو پیش آتی تھیں جس کا کوئی ایک فریق کم تر درجے کا ہوتا تھا۔ کفو کے رواج نے بعض مخصوص برادریوں میں بیرونی ممالک کی نسلی خصوصیات کو اب تک برقرار رکھا ہے۔ مسلم آبادی کے کافی بڑے طبقے، ان علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے اب بھی ایسی نسلی خصوصیات رکھتے ہیں اور ایسی رسوم کے پابند ہیں جن سے ان کی بیرونی اصل ظاہر ہوتی ہے۔ اس قسم کی انسانیاتی تحقیق وسیع پیمانے پر نہیں کی گئی ہے اور اس کے متعلق شہادت آسانی سے مہیا نہیں ہوسکتی، مگر بہت سے گروہوں میں، خاص کر ان خاندانوں کی شکل و شباہت میں، جو سابقہ صوبہ جاتِ متحدہ اور دہلی کے رہنے والے ہیں ایسی خصوصیات غالب ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خاندان اصلاً وسط ایشیا سے تعلق رکھتے ہیں۔''[3] اشتیاق حسین قریشی کی اس تحریر کو جتنی مرتبہ پڑھا جائے انسان کی حیرت میں اس بنا پر اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ شخص بہت بڑا مؤرخ ہونے اور اسلامی اخوت و مساوات کا عظیم علمبردار ہونے کا دعویدار ہے لیکن دراصل یہ گنگا جمنا کی وادی کے مسلمانوں کے ان برخود غلط اور بدبودار عناصر کی گھٹیا ذہنیت کا حامل ہے جو تاریخ کے ہاتھوں انتہائی ذلیل وخوار ہونے کے باوجود اپنی ''خاندانی اور نسلی برتری'' کی ڈینگیں مارتے تھے اور صبح و شام اور جگہ جگہ اپنی ''اعلیٰ تہذیب اور ثقافت و معاشرت'' کا نہایت اشتعال انگیز ڈھنڈورا پیٹتے تھے۔ یہ عناصر اپنے ہر قول اور فعل سے کسی نہ کسی طرح ظاہر کر دیتے تھے کہ نسلی، تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور لسانی لحاظ سے بلوچوں، سندھیوں، پنجابیوں، پٹھانوں اور بنگالیوں کو گھٹیا درجے کی مخلوق سمجھتے تھے۔ ان ہی فاشسٹ عناصر نے ''بڑی تحقیق'' کے بعد ''قائد ملت'' لیاقت علی خان کا شجرۂ نسب نوشیرواں عادل تک پہنچایا تھا۔ ان مفاد پرست و بدبخت عناصر میں ایسے افراد کی بھی کمی نہیں تھی جن کے خاندان کے ارکان ہندوستان اور پاکستان میں منقسم تھے اور وہ پاکستان کو فی الحقیقت ایک شکار گاہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے پاکستان میں ہر قسم کی بے شمار مراعات حاصل کی تھیں لیکن اس کے باوجود انہیں لکھنؤ، الٰہ آباد اور یو۔ پی کے دوسرے شہروں کی بدبودار گلیاں بہت یاد آتی تھیں۔ انہوں نے پاکستان کو کبھی اپنا وطن تصور نہیں کیا تھا۔ ان کی ہمہ وقت خواہش و کوشش یہ ہوتی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کی سرحدیں بہرصورت کھل جائیں تاکہ یہ دونوں جہانوں کے مزے لوٹ سکیں۔ ایسے ناشکرے لوگوں میں ایک شخص مشتاق احمد وجدی بھی تھا۔ یہ شخص قیام پاکستان سے کچھ ہی عرصہ قبل انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے

امتحان میں محض اس لئے کامیاب ہوگیا تھا کہ سر فضل حسین کی کوشش کی وجہ سے متحدہ ہندوستان کی مرکزی ملازمتوں میں مسلمانوں کے لئے 25 فیصد کوٹہ مقرر تھا۔ اس کی محکمہ ریلوے میں تقرری ایک پنجابی مسلمان افسر سید یعقوب شاہ ڈپٹی ڈائریکٹر ریلوے فنانس کی نظر عنایت سے ہوئی تھی۔ اگست 1947ء میں یہ بمبئی سے بطور اسسٹنٹ اکاؤنٹس آفیسر ریلوے پاکستان کی شکارگاہ میں پہنچ گیا حالانکہ نظریاتی طور پر قیام پاکستان کا مخالف تھا۔ یہاں اس کی خوشحالی کے لئے بے شمار دروازے کھل گئے اور اس نے اتنی ترقی کی کہ یہ حکومت پاکستان کے کمپٹرولر اینڈ آڈیٹر جنرل کے عہدہ سے ریٹائر ہوا۔ اس کی سروس میں اس سے بڑا کوئی عہدہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے پاکستان میں اپنی سروس کے اعلیٰ ترین عہدے سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے سوانح حیات پر مشتمل ایک کتاب بعنوان ''ہنگاموں میں زندگی''، لکھی جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص پاکستان کیوں آیا تھا۔ نظریاتی لحاظ سے کسی سیاسی تحریک کے خلاف ہونے میں کوئی برائی نہیں۔ اگست 1947ء سے قبل متحدہ ہندوستان میں بہت سے مسلمان مطالبۂ پاکستان کے خلاف تھے ان میں سے ابوالکلام آزاد جیسے لوگ جن کے ایمان وعقیدہ میں ذرا سی بھی پختگی تھی وہ ہندوستان میں ہی رہے اور انہیں ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ان کا یہ فیصلہ قابل تعریف تھا۔ لیکن مشتاق احمد وجدی جیسے بے غیرت لوگ محض مفاد پرستی کے تحت پاکستان آئے حالانکہ ان کے سیاسی نظریے کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان میں ہی رہتے اور وہاں وفاداری اور خلوص کے ساتھ اپنے وطن کی خدمت کرتے۔ لیکن یہ موقع پرست پاکستان آیا اور اس نے یہاں نہ صرف نہایت اعلیٰ عہدے حاصل کیے بلکہ پاکستان کے طفیل ساری دنیا کی سیر وسیاحت بھی کی اور پھر اس نے ریٹائر ہوکر جو کتاب لکھی ہے اس میں کئی جگہ اس قسم کے شعر لکھے:

از گریہ خاک راچو چمن می کنیم ما
در غربتیم و سیر وطن می کنیم ما

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

مشتاق احمد وجدی نے اپنی کتاب کی ابتدا ہی میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اگر چہ وہ پاکستان میں زندگی بھر ہر نعمت سے مستفیض ہوا لیکن اس نے اس ارض پاک کو کبھی بھی اپنا وطن نہیں سمجھا۔ لکھتا ہے کہ ''الٰہ آباد میری جائے پیدائش ہے۔ بہاولپور کا غیر معروف الٰہ آباد نہیں یو۔ پی کا مشہور و معروف الٰہ آباد جس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ جہاں گنگا جمنا ملتے ہیں۔ جہاں رام جی نے دریا پار کر کے بن باس شروع کیا تھا۔ جہاں ماگھ میں پانچ چھ لاکھ یاتری جمع ہوتے ہیں تا کہ دو متبرک دریاؤں کے سنگم پر اشنان کر کے نجات دائمی حاصل کریں۔ جو اس گرینڈ ٹرنک روڈ پر آباد ہے جسے شیر شاہ سوری نے بنگال سے پشاور کو ملانے کے لئے بنایا تھا۔ جہاں خسرو باغ ہے جس کو دیکھ کر اس مغل شہزادے کی دردناک کہانی یاد آتی ہے جو اندھا ہو کر یہاں قید رہا۔ جہاں جمنا برج ہے جس کی تعمیر کے سلسلے میں حضرت اکبر (شاعر اکبر الٰہ آبادی) آٹھ روپے ماہوار پر ملازم تھے۔ جہاں سنگِ سرخ کا قلعہ ہے جس میں شہنشاہ اشوک کی لاٹ نصب ہے اور جس نے سینکڑوں انقلاب دیکھے ہیں۔ کون ہے جس کو وہ گلی کوچے یاد نہ آتے ہوں۔ جہاں اس نے پرورش پائی جہاں اس کے جسم و جان کو توانائی حاصل ہوئی اور جہاں اس کی آرزوؤں، حوصلوں اور تمناؤں کی تشکیل ہوئی۔ سکون کے سراب، معاش کی تلاش اور ایام کی گردش نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ لیکن اب بھی میرے خوابوں کی دنیا میں الٰہ آباد ہی بسا ہے۔ آنکھ بند کرتا ہوں تو وہی چوک، وہی گھنٹہ گھر، وہی گدڑی بازار، وہی گلیاں وہی سڑکیں، وہ اژدھام، وہی میلے، وہی گرد و غبار نظر آتے ہیں۔ جن میں پہلے گودی میں، پھر باپ کی انگلیاں پکڑ کر اور پھر جوانی کی رعونت میں گھومتا پھرتا رہا۔ میرے لئے اب یہ ایک غیر حقیقی دنیا ہے۔ ملک و دین کے دشمنوں کا مسکن ہے۔ وہ جگہ جس کو اختیاری طور پر چھوڑ کر ذوق و شوق سے دنیا کی خاک چھاننے نکلا تھا۔ پھر بھی اس کی محبت میری جان اور میرے دل سے وابستہ ہے۔ لیکن اب اس کو دیکھنے کی اُمید باقی نہیں:

دریں کنج قفس دانم کہ آخر بایدم مردن

کہ گر ایں است صیادم نہ خواھد کرد آزادم۔''[4]

اس کی ساری کتاب اس قسم کی تحریروں سے بھری پڑی ہے۔ چونکہ یہ تحریریں محض ایک فرد واحد کے خیالات کی عکاس نہیں ہیں بلکہ مشتاق وجدی کی نوع پر مشتمل ایک خاص طبقے کی سوچ کی آئینہ دار ہیں اس لئے مزید اقتباسات کا حوالہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس ملک کی اسے

کوئی بھی چیز اچھی نہیں لگتی جبکہ ہندو قائدین اور ہندوستان کی ہر چیز میں اس کے لئے بے پناہ دل کشی ہے۔نہرو کے بارے میں لکھتا ہے۔"اُردو ایسی سلیس اور بامحاورہ بولتے کہ بات کرتے منہ سے پھول جھڑتے۔زبان میں وہ جادو اور شخصیت میں وہ مقناطیسی اثر کہ جب سامنا ہوتا منہ سے آواز نہ نکلتی۔باتیں سنا کرتا اور منہ دیکھا کرتا۔"[5] گاندھی کے بارے میں لکھتا ہے کہ "میں گاندھی جی کی زندگی اور موت پر غور کرتا رہا۔آزادی سے پہلے ان کے لئے دنیا کی تمام دولت اور ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔انہوں نے سب ٹھکرا دیا اور ساری عمر یا جیل میں کاٹی یا فقیری میں گزاری۔فقر و فاقہ کے زور سے انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا۔وہ اگر بادشاہ بننا چاہتے تو عوام ان کو سونے اور ہیرے سے لاد دیتے......انہوں نے دشمنوں کے ساتھ محبت کرنا سکھایا۔مسلمانوں نے ان پر کبھی اعتبار نہ کیا۔لیکن انہوں نے ان کی خاطر فاقے کئے۔شہر شہر کی خاک چھانی۔گالیاں کھائیں۔پتھروں کی بوچھاڑ برداشت کی اور آخر میں اس دھن میں کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں آرام اور چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملے،مارے گئے۔اس مرتبہ کے لوگ انسانی تاریخ میں صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور ایسے لوگ مرتے نہیں۔انسانوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔"[6] ایک اور مقام پر نہرو کے بارے میں لکھتا ہے کہ "دلّی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو جواہر لال نہرو پاگلوں کی طرح سڑکوں پر بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔پاکستان میں ذمیوں کے قتل عام میں میں نے کسی مسلم لیگی رہنما کو ان کی حفاظت کی کوشش میں انگلی ہلاتے نہ دیکھا۔"[7] گویا برصغیر کے مسلمانوں کے سچے خیر خواہ نہرو اور گاندھی تھے۔جبکہ یہ شخص سرسید احمد خاں سے لے کر علامہ اقبال تک تحریک پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے علمبردار کو مسلمانوں کا بدخواہ ظاہر کرتا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ پاکستان محض انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی کی پیداوار ہے۔وہ لکھتا ہے۔"ہندوؤں نے آزادی کے خواب دیکھنے شروع کئے۔اب مسلمانوں کو اُبھارنے اور ان میں اور ہندوؤں میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت ہوئی تاکہ کوئی مطالبہ قومی حیثیت حاصل نہ کر سکے۔کچھ لوگوں کو آمادہ کیا گیا کہ مسلمانوں میں علیحدہ تعلیمی ادارے قائم کرنے کی تحریک چلائی جائے۔علی گڑھ میں انگریزوں کی سرپرستی میں کالج قائم ہوا۔اس میں ایک انگریز پرنسپل رکھا گیا جو فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے میں ماہر تھا۔"

''انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنے کی اہمیت ظاہر ہے۔ البتہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ان کو علی گڑھ یونیورسٹی سے کیا حاصل ہوا۔ وہ ملے جلے کالجوں میں بھی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ یہ یونیورسٹی آکسفورڈ اور کیمبرج سے مقابلہ کرے گی۔ لیکن تجربہ یہ ثابت نہ کر سکا کہ اس ادارے کے تعلیم یافتہ لوگوں کا علمی یا ذہنی معیار ان لوگوں سے بلند رہا جو ملی جلی یونیورسٹیوں سے پڑھ کر نکلے۔ نہ اُن کی مذہبی معلومات یا اسلامی احکامات پر پابندی دوسروں سے زیادہ ثابت ہوئی۔ ہاں ہندوؤں سے علیحدہ رہنے کی خواہش نے ضرور تقویت پائی۔''[8] گویا اس کے نزدیک سرسید اور علی گڑھ تحریک نے برصغیر کے مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہیں کیا، البتہ نقصانات بہت کئے۔ اسی طرح کے خیالات اس کے مسلم لیگ کے بارے میں تھے۔ وہ لکھتا ہے'' کچھ مسلمان رئیسوں اور تعلقہ داروں کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنی علیحدہ سیاسی جماعت بنائیں۔ اس طرح 1906ء میں مسلم لیگ وجود میں آئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تعلیمی اور سیاسی علیحدگی کا سامان پورا ہو گیا۔ ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے شروع کرائے گئے اور اس آگ کی ابتدا ہوئی جس نے رفتہ رفتہ مسلمانان ہند کی تباہی کا انتظام کر دیا...... سیاسی اصلاحات کا سوال پیدا ہوا تو مسلمانوں کی طرف سے جداگانہ نیابت اور جداگانہ ووٹ کا مطالبہ پیش ہوا۔ ہندو اس کے بھی سخت مخالف رہے۔ لیکن انگریز کے لئے یہ بھی بڑا خوش آئند مطالبہ تھا اور شاید ان ہی کے اشارے سے کیا گیا تھا۔ کیونکہ یہ جھگڑے بڑھانے اور مسلمانوں کو تباہی کی طرف لے جانے کی ایک اور ترکیب تھی۔''[9] اور آگے چل کر لکھتا ہے کہ'' 1930ء میں مسلم لیگ کے الٰہ آباد کے اجلاس میں علامہ اقبال نے پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے صوبوں کو ملا کر الگ حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی۔ 1933ء میں چودھری رحمت علی نے انگلستان میں قیام پاکستان کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ دروغ برگردن راوی، سنا ہے کہ یہ سرکار برطانیہ کے اشارے پر تھا۔ یہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کے تحفظ کی ترکیب تھی۔ لیکن مسلمانان ہند اس خوش فہمی میں رہے کہ یہ ان کی نجات کا ذریعہ ہے۔ بہرصورت قائداعظم نے اس خیال کو اپنایا اور اس کے ذریعہ سے مسلمانان ہند کے دلوں میں نئی امیدیں جگا دیں۔ انہوں نے مطالبۂ پاکستان کی بنا اس نظریہ پر رکھی کہ ہندو اور مسلمان دو مختلف قومیں ہیں...... حصول پاکستان کے فوراً بعد قائداعظم نے دوقومی

نظریہ کو خیر باد کہا اور پاکستان اور ہندوستان کی جغرافیائی حدود میں بسنے والے تمام لوگوں کو خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ایک قوم قرار دے دیا۔ اس طرح پاکستان کا فلسفہ اپنے صحیح روپ میں ظاہر ہوا یعنی شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کا مفاد۔ لیکن ملت کو تباہ کر کے کوئی ایک طبقہ پنپ نہیں سکتا۔''[10] گویا اس شخص کے نزدیک بنگال کے پانچ کروڑ مسلمان ''ملت'' میں شامل نہیں تھے جنہوں نے اپنی تاریخ کے آٹھ سو سالہ ہندو مسلم تضاد کو علیحدگی کی صورت میں حل کرنے کی خاطر سب سے زیادہ دباؤ ڈالا تھا۔ دراصل اس کے نزدیک ''ملت'' سے مراد صرف یو۔ پی کے مسلمان تھے۔ جن کا قائد بعد ازاں ''قائدِ ملّت'' کہلایا۔ مشتاق وجدی کے متذکرہ اقتباسات پر یہاں کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت نہیں ہے۔ قیامِ پاکستان کے بارے میں اس قسم کے نظریات کی غیر معقولیت کا ''پاکستان کی سیاسی تاریخ'' کی جلد اوّل و دوم میں تفصیل کے ساتھ پردہ چاک کیا جا چکا ہے۔ اس شخص کی تنگ نظری کا عالم یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو کو جس قدر فروغ ہوا وہ اس سے مطمئن نہیں اور ہندوستان میں جہاں اُردو کا جنازہ نکالا جا چکا ہے، وہ اردو کو فروغ پاتے دیکھتا ہے۔ وہ پاکستان کی قومیتوں کو اُن کی زبان و ادب کے فروغ کا اختیار دینے پر بھی تیار نہیں ہے۔ بنگلہ زبان کو ایک قومی زبان کی حیثیت سے تسلیم کئے جانے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''اس طرح پاکستانی مسلمانوں نے برج بھاشا رسم الخط کو قومی رسم الخط بنا دیا۔ بولنے میں ہندی اور اُردو میں زیادہ فرق نہیں۔ یہ ہندی رسم الخط تھا جسے تسلیم کرنے پر انکار نے وہ شدت اختیار کی تھی کہ برصغیر تقسیم ہوا۔ ہندی بولی جاتی تو ہم کم سے کم سمجھ تو لیتے۔ اب ہمارے سر وہ قومی زبان تھوپی گئی جس کا ایک لفظ بھی کانوں کو مانوس نہیں۔ یا تو اُردو مشرقی پاکستان کے معزز گھرانوں کی مسلّمہ زبان تھی یا اب اس سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ اُردو میں اگر پانی مانگو تو اینٹ اور پتھر سے جواب ملتا۔ اب بھی اُردو بولنے والے چن چن کر قتل کئے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہندوستان میں اب تک اُردو بولنے والوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں ہوتا۔ وہاں تو اب بھی بہت سے ہندو اُردو پر عاشق ہیں۔ انجمن ترقیٔ اُردو کام کر رہی ہے۔ اُردو اکیڈمی قائم کی گئی ہے۔ اُردو میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں جن میں ہندو شعراء مسلمانوں کے شانہ بشانہ شریک رہتے ہیں۔ متعدد اُردو اخبار نکل رہے ہیں۔ ہندوستانیوں کا دعویٰ ہے کہ ان کے ملک میں پاکستان سے زیادہ اُردو کتابیں شائع ہوتی ہیں...... اُردو تحریک پاکستان کا اہم ترین ستون تھی۔ جس دن بنگلہ

قومی زبان بنی اور دوسری زبانوں کے مطالبے شروع ہوئے اسی دن نظریۂ پاکستان ختم ہوا۔''[11] اپنی حد درجہ تنگ دلی کا اظہار ایک مقام پر ان الفاظ میں کرتا ہے ''اگر مجھے معلوم ہوتا کہ پاکستان میں تعصب کا یہ عالم ہوگا تو ہندوستان میں ہندوؤں کے ہاتھوں تباہ ہونا زیادہ پسند کرتا۔''[12]

ایک جگہ ایوب خان کی استبدادیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''جب ایوب خان صدارت کے لئے منتخب ہونے کے امیدوار ہوئے تو مہاجرین نے ان کو ووٹ نہ دیا۔ اس گناہ کی پاداش میں پٹھانوں کو مسلح کر کے اُن پر چھوڑ دیا گیا۔ جو جھونپڑیاں مدّت کی تکلیف ومشقت کے بعد بنائی تھیں ان میں آگ لگا دی گئی اور ان کے بچوں اور عورتوں سے وہ سلوک کیا گیا جو ہندوؤں کو کرنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی تھی:

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے
چھٹتا نہیں گھر جان نکل جاتی ہے تن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر۔''[13]

ایوب خان کے خلاف صرف کراچی کے مہاجرین نے ہی ووٹ نہیں دیئے تھے بلکہ ملک کے دوسرے حصوں کے بہت سے ووٹروں نے بھی اس کی مخالفت کی تھی اور اس فوجی آمر کی استبدادیت صرف کراچی تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ پورا ملک اس کا شکار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب 1968ء میں اس کے خلاف تحریک شروع ہوئی تھی تو سارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک احتجاجی مظاہرے ہوئے تھے تا آنکہ اس کا تختہ اُلٹ گیا تھا۔ لیکن مشتاق احمد وجدی کو کراچی کے مہاجرین کے سوا اپنے دوسرے ہم وطنوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور لطف یہ ہے کہ اس شخص نے ایوب خان کے دور میں ہی سب سے زیادہ ترقی کی تھی اور یہ اس کی استبدادی انتظامی مشینری کا ایک اہم پرزہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اسے انعام واکرام سے نوازا تھا۔ لکھتا ہے کہ صدر ایوب خان کے عہد میں ''باوجود میری ہٹ دھرمی کے میری رائے ہمیشہ تسلیم کی گئی۔ مجھے ستارۂ پاکستان سے نوازا گیا۔ زمین عنایت ہوئی اور آڈیٹر جنرل کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ ہر چند

ان عنایتوں کے لئے میں شعیب صاحب وزیر خزانہ کا مرہون منت ہوں لیکن پریذیڈنٹ صاحب کی مرضی نہ ہوتی تو وہ کیا کر سکتے تھے۔"[14]

شاید وزیر اعظم لیاقت علی خان کو اپنے المناک قتل سے پہلے ایسے بداندیش اور ناشکرے عناصر پر کی گئی اپنی غلط بخشیوں کا احساس ہو گیا تھا اور شاید اسی لئے اس کے پولیٹیکل سیکرٹری نواب صدیق علی خان نے لکھا ہے کہ" کچھ لوگ چڑانے کی خاطر قسم دے کر پوچھتے ہیں، کیا پاکستان کا قیام درست تھا؟ اتفاق سے وہ لوگ پاکستان میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ انہیں جواب دیا گیا کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو حضور انڈر سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کے عہدہ تک مشکل سے پہنچتے اور ہندوؤں کے غلام بنے رہتے۔ ہمیں چونکہ یہاں سکھ میسر ہے، چین سے میٹھی نیند سوتے ہیں، افراط سے اشیائے خوردنی ملتی ہیں، تن پوشی کے لئے نفیس کپڑے پہنتے ہیں، زندگی کے تمام شعبہ جات میں کسی ہندو سے مقابلہ نہیں ہے، اس لئے ہم اپنے پڑوسی کلمہ گو بھائیوں کی زبوں حالی اور بے چارگی سے ناواقف ہیں۔ ان بے بسوں کی حالت زندہ لاشوں جیسی ہے اور یہاں ہم اپنے حال میں مست ہیں اور یاوہ گوئی سے دل بہلایا کرتے ہیں۔"[15] لیکن نواب صدیق علی خان نے یہ نہیں لکھا کہ یو۔ پی کے بدکردار نوابوں، جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کی بدبودار تہذیب وثقافت کے یہ علمبردار اپنی اس یاوہ گوئی کے باوجود اس ملک کا پیچھا بھی نہیں چھوڑتے۔ اسے جونکوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں اور اپنی اس بداندیشی اور بدکلامی کے باعث یو۔ پی کے ان لاکھوں ہنر مند محنت کشوں کو بھی بدنام کرتے ہیں جنہوں نے پاکستان کی تعمیر و ترقی میں گراں قدر حصہ لیا ہے۔ جو اپنا سب کچھ لٹا کر یہاں پہنچے تھے۔ جنہیں لکھنؤ، الٰہ آباد، دہلی اور کانپور وغیرہ کی وہ گلیاں بالکل یاد نہیں آتیں جہاں اُن کے اعزّہ واقربا کا قتل عام ہوا تھا۔ جہاں ان کی مستورات کو اغوا کیا گیا تھا۔ جن کے خاندانوں کے افراد منقسم نہیں ہیں اور جو دونوں جہانوں کی نعمتوں سے سرفراز ہونے کے متمنی نہیں ہیں۔ نواب صدیق علی نے یہ بھی نہیں لکھا کہ ان برخود غلط وسنگدل عناصر کو مشرقی پنجاب اور جموں و کشمیر کے ان 80 لاکھ مہاجرین کے جذبات کا بھی احساس نہیں ہوتا جنہوں نے آگ وخون کے دریا عبور کر کے پاکستان میں پناہ لی تھی۔

چونکہ قیام پاکستان کے ابتدائی تین چار سالوں میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ کوتاہ اندیشی کے باعث مشتاق احمد وجدی جیسے تنگ نظر موقع پرستوں کی بالادستی تھی اس

لئے اس دوران پنجابی شاونسٹوں نے یو۔ پی کے مہاجرین کے خلاف بڑا زہریلا پروپیگنڈا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف بیوروکریسی میں بلکہ قومی زندگی کے ہر شعبہ میں پنجابیوں اور ''اہلِ زبان'' میں سخت رقابت پیدا ہوگئی۔ لاہور، کراچی اور ڈھاکہ میں یو۔ پی اور پنجابی افسروں نے اپنی الگ الگ انجمنیں بنالیں اور وہ معاشرتی طور پر ایک دوسرے سے زیادہ روابط نہ رکھتے تھے۔ پنجابی حلقوں میں یو۔ پی کے مہاجرین کے لئے ''تلیئر'' کے خطاب کا استعمال شروع ہوگیا۔ ''تلیئر'' وہ چڑیا ہے جو بے انتہا چائیں چائیں کرتی ہے اور اس کا شکار بہت تفریح کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ 1949ء کے اواخر میں پنجابی۔ ''تلیئر'' تضاد اس قدر شدید ہوگیا تھا کہ پنجاب میں جب کوئی پنجابی ''تلیئروں'' کا شکار کرتا تھا تو وہ اپنے محلے اور گھر میں آکر بڑے فخریہ انداز میں کہتا تھا کہ آج میں نے اتنے ''بھیئے'' مارے ہیں۔ پنجاب کے بعض سکولوں میں بھی یو۔ پی کے مہاجرین کے بچوں کو بہت تنگ کیا جاتا تھا۔ تقریباً ایسے ہی جیسے کہ دوسری جنگ عظیم سے قبل جرمنی میں یہودیوں کے بچوں کو تنگ کیا جاتا تھا۔ جب کبھی کوئی یو۔ پی کا بچہ پنجابی بچوں کے گھیرے میں آجاتا تھا تو وہ مل کر ''بھئیوں'' کے خلاف فحش کورس گاتے تھے۔ صوبائی عصبیت کی بنیاد پر پنجاب کے سرکاری ملازموں، تاجروں اور صنعت کاروں کی طرف سے ''تلیئروں'' کے علاوہ دوسری قومیتوں کے خلاف جذبات کا اظہار پنجاب سے باہر سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال میں بھی ہوتا تھا۔ سندھ کے ایک ممتاز مسلم لیگی لیڈر ہاشم گزدر کے بیان کے مطابق ''پنجابی کردار میں ایک برائی یہ ہے کہ جہاں کہیں بھی پنجابی جاتا ہے وہ اپنی الگ پنجابی بستی قائم کر لیتا ہے۔ پنجابی ادارہ میں پنجابیوں کو ملازمتیں دیتا ہے وہ اپنے سارے رشتہ داروں کو بلالیتا ہے وہ اپنے سارے رشتہ داروں اور دوستوں کو ملازمتیں مہیا کرنے کے لئے اپنے سارے اختیارات استعمال کرتا ہے۔''[16] پنجابی افسروں، تاجروں اور صنعت کاروں کی طرف سے اس قسم کی شاونزم کا مظاہرہ مشرقی بنگال میں خاص طور پر بہت نمایاں اور اشتعال انگیز تھا۔ یہ پنجابی عناصر نہ صرف بنگالیوں کو گھٹیا اور حقیر سمجھتے تھے بلکہ ان کی ان ''تلیئروں'' سے بھی سخت رقابت تھی جو پنجابیوں کو تہذیب وثقافت سے عاری سمجھتے تھے۔

20 دسمبر کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے جب وزیر اعظم لیاقت علی خان کی جانب سے پیش کردہ ایک بل منظور کیا جس کے تحت دستور ساز اسمبلی کو مغربی پنجاب کی خالی نشستوں کو پر کرنے کا اختیار مل گیا تو پنجابی شاونزم کو آگ لگ گئی اور جب افتخار الدین، بیگم شاہنواز اور بعض

دوسرے پنجابی ارکان اسمبلی نے اس بل کی مخالفت کرتے ہوئے یہ رائے دی کہ مرکز کو مغربی پنجاب کے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے تو ایسوسی ایٹڈ پریس کی رپورٹ کے مطابق وزیراعظم کا چہرہ غصے سے تمتما اُٹھا۔ اس نے خشمگیں لہجہ میں پنجابی نمائندوں کے خلاف سخت سست الفاظ استعمال کئے اور کہا کہ ''اگر میں کہوں کہ میں ایوان کے پنجابی ارکان کی تقاریر سن کر حیرت زدہ ہو گیا ہوں تو میں اپنے جذبات کے اظہار کے لئے بے حد نرم طریقہ استعمال کروں گا۔'' پنجابی ارکان کی طرف سے اس بل کی مخالفت کی بنیاد اس خدشہ پر تھی کہ اگر دستور ساز اسمبلی کو مغربی پنجاب کی پانچ خالی نشستوں کو پر کرنے کا اختیار مل گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وزیراعظم لیاقت اپنے منظور نظر پنجابی اور غیر پنجابی افراد کو نامزد کرا لے گا۔ اگرچہ افتخار الدین خود صوبائی عصبیت سے بالاتر تھا لیکن اکتوبر میں مرکزی حکومت کی جانب سے سیفٹی ایکٹ کے نفاذ کے بعد اس نے پنجابی شاونسٹوں سے اتحاد کر لیا تھا اور اس بنا پر اس کے اخبارات میں بھی پنجاب کی ''حق تلفیوں'' کا پروپیگنڈا ہونے لگا تھا۔ دستور ساز اسمبلی کی اس کاروائی پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''غیظ و غضب کے اس مظاہرے پر احتجاج کی مجال کسے ہو سکتی ہے۔ اپنے ٹھنڈے دل و دماغ کے لئے مشہور ہمارے محبوب وزیراعظم کا چہرہ غصہ سے یونہی تو تمتما نہیں اُٹھا ہو گا۔ پھر ان لوگوں کو احتجاج کا کیا حق حاصل ہے جن کا صوبہ آدھا تقسیم ہو چکا ہے۔ جس کے پچاس لاکھ باشندے پاکستان کے لئے اپنا سب کچھ لٹا کر مہاجر بنے، جن کی ہزاروں بیٹیاں ابھی اغیار کے پنجہ میں ہیں۔ یہ صوبہ ہی اس قابل ہے کہ اس کے متعلق تقریر کرتے ہوئے ایسا ہی لب و لہجہ اختیار کیا جائے مگر اس کے باوجود اقبال کا یہ شعر زبان قلم پر آ ہی گیا ہے۔

فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں
خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے۔''[17]

یہ اداراتی تبصرہ کسی تبصرے کا محتاج نہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس اخبار نے پنجاب کی مظلومیت اور بے بسی کا رونا رو کر پنجابی رائے عامہ کو وزیراعظم کے خلاف مشتعل کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اخبار ایک طرف تو بنگالیوں، سندھیوں، پٹھانوں اور بلوچوں کو صوبائی خود مختاری دینے کے خلاف تھا لیکن دوسری طرف پنجاب کے معاملات میں مرکز کی مداخلت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے مؤقف کے مطابق اگر مشرقی بنگال سے غیر بنگالی دستور ساز اسمبلی کے ممبر بن جائیں تو

کوئی حرج نہیں تھا لیکن یہ پنجاب کے کوٹے میں سے کسی غیر پنجابی کو یہ رعایت دینے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ اس کا اسلامی مساوات و اخوت کا تصور صرف پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے مفادات تک ہی محدود تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ صوبہ لیگ کے صدر عبدالباری کو دستور ساز اسمبلی کے چھ ارکان کی نامزدگی کا اختیار بالکل اسی طرح دے دیا جائے جس طرح کہ اسے گورنر کے پانچ مشیر نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے ارکان مرکزی اسمبلی کے ارکان نہ بنیں۔ اگر ایسا ہوا تو پنجاب کی زبردست ''حق تلفی'' ہوگی۔ اس کے برعکس اگر ممدوٹ۔ باری دھڑے کے نامزد ارکان مرکزی اسمبلی میں چلے جائیں گے تو پنجاب کی کوئی ''حق تلفی'' نہیں ہوگی۔ دوسری طرف یہ بات بھی بالکل صحیح تھی کہ لیاقت علی خان نے یہ بل بدنیتی سے منظور کروایا تھا۔ اس کی سیاست کی واحد بنیاد جاگیردارانہ سازش تھی۔ اس کی جانب سے اس بل پر بحث کے دوران آگ بھبھوکا ہونے کی وجہ اس خطرے میں پنہاں تھی کہ اگر مرکزی اسمبلی میں پنجاب کی پانچ خالی نشستیں پر کرنے کے لئے کوئی اور طریقہ اختیار کیا گیا تو اس کا خطرناک ترین سیاسی حریف حسین شہید سہروردی ایوان اقتدار میں خم ٹھونک کر اس کے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ سہروردی ان دنوں پنجاب میں تھا اور اس نے نواب ممدوٹ کے مقدمے میں وکیل صفائی کے فرائض سرانجام دے کر یہاں اپنا سیاسی مقام پیدا کر لیا تھا۔ مرکزی اسمبلی میں اس بحث کے تین چار دن بعد یعنی 3 رجنوری 1950ء کو نوائے وقت نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں یہ خبر شائع کی تھی کہ ''متحدہ بنگال کے سابق وزیراعظم مسٹر حسین شہید سہروردی آئندہ مستقل طور پر لاہور میں قیام کریں گے۔ آپ نے کینال بنک پر ایک بنگلہ کرایہ پر لے لیا ہے۔'' اگر ممدوٹ۔ باری دھڑے کو موقعہ ملتا تو وہ ضرور سہروردی کو مرکزی اسمبلی کا ممبر بنوا دیتے اور اس طرح لیاقت علی خان کے اقتدار کی کشتی ڈانوں ڈول ہو جاتی۔

جب 12 رجنوری 1950ء کو مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ نے بھی مسلم لیگ کی پارلیمنٹری پارٹی سے یہ سفارش کر دی کہ دستور یہ میں پنجاب کی چھ خالی نشستوں کو پر کرنے کے لئے چھ نمائندے نامزد کر لئے جائیں تو نوائے وقت یعنی ممدوٹ۔ باری دھڑے کا مطالبہ یہ تھا کہ ''نامزدگی یا سفارش عملاً اور اصلاً صوبہ مسلم لیگ کرے۔ مرکزی لیگ کی تصدیق محض رسمی ہو۔ سارے نمائندے پنجاب کے باشندے اور پنجاب کے رہنے والے ہوں۔ مہاجرین کی نشستیں

اُنہیں دی جائیں اوران کے نمائندے ایسے لوگ ہوں جنہیں ان کا اعتماد حاصل ہو۔'' اس مطالبہ میں سارے نمائندوں کے پنجاب کے باشندے ہونے کی جو شرط عائد کی گئی تھی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ حسین شہید سہروردی نامزد نہیں ہوسکتا تھا۔ چونکہ اس نے جنوری کے اوائل میں ہی لاہور میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اس لئے وہ پنجاب کا باشندہ بن چکا تھا البتہ اس کا مطلب یہ تھا کہ چودھری خلیق الزماں کو پنجاب کی نمائندگی کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ کیونکہ پنجاب کو تباہ کرنے میں ان کی سازشوں کو بھی دخل حاصل ہے۔ انہوں نے پہلے ایک پارٹی کو تھپکی دی پھر دوسری پارٹی کو آگے بڑھایا اور اس کے بعد پھر پہلی پارٹی سے ساز باز کی کوشش کی۔''[18] روزنامہ زمیندار کا مؤقف یہ تھا کہ چودھری خلیق الزمان ایک بھیڑیا ہے اسے بھیڑوں کی نگرانی نہ سونپی جائے۔ ''چودھری صاحب نے پنجاب کی سیاسی زندگی ختم کرنے کے لئے جس عیاری سے کام لیا ہے اس کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ہم دستور ساز اسمبلی کو بتائے دیتے ہیں کہ چودھری خلیق الزماں کو پنجاب کی نمائندگی میں حصہ دار بنایا گیا تو ہر پنجابی اس فیصلہ کی مزاحمت کرنے پر مجبور ہوگا۔''[19]

10 رفروری کو صدر صوبہ مسلم لیگ میاں عبدالباری نے دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کی خالی نشستوں کے لئے ناموں کی دو فہرستیں مرکزی مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو بھیجیں۔ پہلی فہرست میں چار مہاجر داؤد غزنوی، صوفی عبدالحمید، چودھری محمد حسین اور شیخ محبوب الٰہی تھے اور مقامی اُمیدواروں کی فہرست میں علاؤالدین صدیقی، چودھری محمد اقبال چیمہ، عبدالحمید دستی، خواجہ محمد صفدر، کرنل سید عابد حسین، پیر قمر الدین، پیر فضل شاہ، پیر محی الدین بادشاہ، خلیفہ شجاع الدین، ڈاکٹر تصدیق حسین اور شیخ نصیر احمد کے نام شامل تھے۔ ان دونوں فہرستوں میں لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے صرف دو ایک نام تھے باقی سارے نام ممدوٹ۔ باری دھڑے کے تھے۔ روزنامہ امروز میں یہ خبر 12 رفروری کے شمارے میں شائع ہوئی۔ اس کے دو دن بعد امروز نے یہ خبر شائع کی کہ پنجاب اسمبلی کے انتخابات کے سلسلے میں دولتانہ گروپ نے تیاری شروع کر دی ہے۔ مختلف اضلاع سے اس کے 21 حامیوں کا اجلاس ہوا جس میں اسمبلی کے انتخابات کے علاوہ پنجاب مسلم لیگ کے انتخابات کا مسئلہ بھی زیر غور آیا اور پھر 27 رفروری کو امروز نے لائل پور سے یہ خبر دی کہ ''دولتانہ دھڑے کا خیال ہے کہ انہیں دیہاتیوں کی حمایت حاصل ہے۔'' ممدوٹ۔ باری دھڑا اس صورت حال کے پیش نظر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ 11 رمارچ کے نوائے وقت میں لائل پور

سے ہی ایک شخص آذر عسکری کا مکتوب شائع ہوا جس میں دولتانہ دھڑے کے سرپرست چودھری خلیق الزماں پر بھرپور حملہ کیا گیا تھا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ ''اعلیٰ حضرت شاہ ایران کی خدمت میں جو سپاسنامہ آل پاکستان مسلم لیگ کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس میں چودھری خلیق الزماں صاحب نے ایران اور پاکستان کے ثقافتی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے جہاں خسرو، بیدل اور غالب کا حوالہ دیا ہے وہاں مفکّرِ اعظم حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر نہ کر کے بدترین صوبائی تعصب کی مثال پیش کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خسرو، بیدل اور غالب اس قابل ہیں کہ ہم ان پر فخر کر سکیں لیکن یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ دورِ حاضر میں جس حسن وخوبی سے علامہ علیہ رحمۃ نے فارسی کو اپنایا اس کی مثال شاید ہی مل سکے۔ اس کا بین ثبوت حضرت علامہ کا وہ شعر ہے جو اعلیٰ حضرت شاہ ایران نے عزت مآب گورنر سندھ کے سپاس نامہ کا جواب دیتے ہوئے خاتمہ پر پڑھا۔ اگرچہ یہی ایک چپت چودھری صاحب کے لئے کافی ہے مگر اس حقیقت سے اغماض نہیں کیا جاسکتا کہ چودھری صاحب ابتدا ہی سے کچھ ایسے اصولوں پر کاربند رہے ہیں جن سے صوبائی تعصب ہمیشہ پیدا ہوتا رہا ہے۔ آپ رہتے تو پاکستان میں ہیں جس کی خشت اوّل علامہ علیہ الرحمۃ نے رکھی لیکن غم آپ کو خدا جانے کہاں کا کھائے جا رہا ہے۔ ممکن ہے کہ چودھری خلیق الزماں نے اپنے سپاسنامے میں سہواً علامہ اقبال کا ذکر نہ کیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے دانستہ طور پر علامہ اقبال کا ذکر ضروری نہ سمجھا ہو۔ یو۔ پی میں ایک ایسا مکتب فکر تھا جو اقبال کو شاعر سمجھتا ہی نہیں تھا کیونکہ انہوں نے شاعری کے جو عروض وقواعد بنائے ہوئے تھے اقبال کی شاعری ان پر پوری نہیں اُترتی تھی۔ تاہم وجہ خواہ کچھ ہی ہو چودھری خلیق الزماں کی اس حرکت سے پنجابی شاونسٹوں کو ''تلیئروں'' کے خلاف پروپیگنڈے کا مزید مواد مل گیا جو پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو بہت متاثر کرتا تھا۔

پھر جب 24 مارچ کو مرکزی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ نے دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کی چھ خالی نشستوں کے لئے نواب مشتاق احمد گرمانی اور پانچ مہاجر نمائندوں شیخ صادق حسن، صوفی عبدالحمید، غلام بھیک نیرنگ، چودھری علی اکبر اور مسٹر عبدالوحید خان کو نامزد کیا تو پنجاب کے تقریباً سارے اخبارات اور شہری مسلم لیگوں کے بیشتر لیڈروں نے کہرام مچا دیا۔ کیونکہ پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے 10 رفروری کو اس سلسلے میں ناموں کی جو فہرستیں بھیجی تھیں ان

میں سے صرف صوفی عبدالحمید کا نام کامیاب امیدواروں کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ نواب گرمانی کے سوا باقی سارے کامیاب اُمیدوار لیاقت ۔ دولتانہ دھڑے سے تعلق رکھتے تھے۔ نوائے وقت کی کراچی کی رپورٹ کے مطابق بورڈ کے پنجابی ارکان نے مسٹر گرمانی کی درخواست کی شدید مخالفت کی لیکن بالآخر بورڈ نے مناسب فارم پر پہلی درخواست نہ بھیجنے کے سلسلے میں مسٹر گرمانی کی درخواست منظور کرلی۔ اس اجلاس میں مسٹر لیاقت علی خان شریک نہ ہوئے۔ کل آٹھ ارکان شریک ہوئے اور 80 درخواستوں پر غور کیا گیا اور اسی دن اس اخبار کی لاہور کی رپورٹ میں کہا گیا کہ پنجاب مسلم لیگ کی توہین کی گئی ہے اور یہ توہین ناقابل برداشت ہے۔ قبل ازیں بھی مرکزی ارباب اقتدار نے سر محمد نواز جیسے یونینسٹ کو نائب وزیر دفاع کے عہدہ پر فائز کر کے صوبہ لیگ کے وقار کو شدید نقصان پہنچایا تھا مگر اب مرکزی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کے لئے پنجابی نمائندوں کی نامزدگی کے متعلق، صوبہ لیگ کی سفارش کو تسلیم کرنے سے صاف انکار کر کے جمہوریت کا منہ ''چڑایا ہے۔''

مرکزی مسلم لیگ کے اس فیصلہ پر لاہور کے اخبارات کے ادارتی تبصروں کی زبان بھی بڑی تندوتلخ تھی۔ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ رقم طراز تھا کہ ''صوبہ میں بجا یا بیجا طور پر یہ احساس بڑھتا جارہا ہے کہ پنجاب کے ساتھ مرکز کا برتاؤ منصفانہ نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ پنجاب کو ذلیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کے انتخاب میں صوبے کی سفارشوں کو ٹھکرادینے سے یہ احساس یقینی طور پر زیادہ گہرا ہوجائے گا۔'' روزنامہ زمیندار کا تبصرہ یہ تھا کہ ''ہم لگی لپٹی رکھے بغیر یہ لکھنے پر مجبور ہیں کہ چودھری خلیق الزماں پاکستان کے سینے کا رِستا ہوا ناسور ہے۔ اس شخص نے تنظیم ملت کا دامن پارہ پارہ کرنے کے لئے جو سازشیں اور شرارتیں کی ہیں ان کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہ وہی ذات شریف ہیں جنہوں نے حضرت قائداعظم مرحوم کے ارشاد و منشا کے خلاف ویول سکیم پر اظہار پسندیدگی کیا۔ اس کے بعد جب پاکستان قائم ہوا تو ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کو مصیبت میں چھوڑ کر کراچی بھاگ آئے...... چودھری صاحب لکھنؤ میں جو کچھ چھوڑ کر آئے تھے اس کی تلافی الاٹمنٹوں کے ذریعے کرلی۔ ہمیں الاٹمنٹوں سے بھی بحث نہیں لوٹ کھسوٹ کے زمانے میں ایسا ہی ہوا کرتا ہے لیکن انہوں نے اپنی قیادت کی گنجائش نکالنے کی غرض سے پاکستانی مسلمانوں کی جو بدتنظیمی کی اس سے چودھری صاحب کی ملت

فروشی پوری طرح آشکارا ہوتی ہے...... آخر میں ہم کہیں گے کہ چودھری خلیق الزماں نے پنجاب کو جو چیلنج دیا ہے اسے منظور کرنا ہر پنجابی کا فرض اولین ہے۔ یہ توہین کبھی برداشت نہیں کی جا سکتی۔'' روزنامہ امروز نے لکھا کہ یہ عبدالوحید خان صاحب کون ہیں؟ ممکن ہے چودھری خلیق الزماں تو انہیں جانتے ہوں جو لکھنؤ کی دھڑے بندیوں میں ان کا ساتھ دیتے رہے ہوں لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ پاکستان میں ان کی حیثیت کیا ہے؟ وہ پنجاب کے کس حلقہ کی نمائندگی کرتے ہیں؟ روزنامہ احسان کی رائے یہ تھی کہ ''عبدالوحید خان پنجاب کا باشندہ نہیں ہے۔ اُسے مشرقی پنجاب کے باہر کا مہاجر کہنا بھی ٹھیک نہیں کیونکہ اس نے ہجرت نہیں کی بلکہ ترک سکونت کی ہے اور وہ بھی اس لئے کہ آمدنی میں دس گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ لکھنؤ میں آپ کے مکانات اور دوکانات کی جو حقیقت تھی اس کے مقابلہ میں یہاں جو کچھ الاٹ ہوا ہے وہ ایک عظیم الشان ترقی ہے۔''[20]

حسب توقع نوائے وقت کا تبصرہ ان سارے اخبارات سے زیادہ تند و تیز تھا۔ اس اخبار نے لکھا کہ ''مسلم لیگ کی پوری تاریخ میں چودھری خلیق الزماں جیسا گھٹیا آدمی اس مسند پر نہیں بیٹھا۔ چودھری خلیق الزماں (جو عوام میں مفرور الملّت کے لقب سے مشہور ہیں) کا کوئی سیاسی دین و ایمان نہیں۔ وہ پبلک کریکٹر سے بالکل عاری ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا یہ مسلک ہے کہ سیاست کو دیانت سے کوئی تعلق نہیں اور برسر اقتدار رہنے کے لئے ہر حربہ جائز ہے۔ چودھری خلیق الزماں ہندوستان کے مسلمانوں کو جس طرح دھوکا دے کر راتوں رات کراچی پہنچے وہ داستان سب کو معلوم ہے۔ پنجاب مسلم لیگ کی پارٹی بازی اور بیک وقت مختلف گروہوں میں ساز باز کے قصے بھی محرمان راز سے پوشیدہ نہیں۔ مگر موڈی کی برطرفی کی تحریک کے سلسلے میں چودھری خلیق الزماں نے جس پست کردار کا ثبوت دیا تھا اس کا حال بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔ اس زمانہ میں چودھری صاحب لاہور میں آئے تو ہر طرف سے آپ پر زور دیا گیا کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے اور مرکزی پیچیدگیوں سے بچنے کی بہترین تدبیر یہی ہے کہ مرکزی لیگ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لے اور جو فیصلہ مناسب ہو وہ کیا جائے۔ چودھری صاحب نے یہ فرمایا کہ موڈی کی برطرفی ضروری ہے۔ مگر پہلے صوبہ لیگ قرارداد منظور کر لے تو پھر مرکزی لیگ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے گی۔ آپ نے قاضی عیسیٰ کو کہہ کر موڈی کی علیحدگی کے حق میں ایک بیان بھی دلوایا۔ مگر جب صوبہ لیگ نے موڈی کی علیحدگی کا مطالبہ کیا تو چودھری خلیق الزماں نے ایسا رنگ بدلا کہ سب

حیران رہ گئے۔ اب آپ پنجاب کے کارکنوں کو یہ نصیحت فرمانے لگے کہ بابا آپ لوگوں نے کیا اودھم مچا رکھا ہے؟ موڈی چلا گیا تو بڑی گڑبڑ مچے گی۔ مجھ سے امریکن سفارت خانے اور برطانوی ہائی کمشنری کے اعلیٰ ارکان نے کہا ہے کہ موڈی کی علیحدگی کی تحریک خطرناک ہے۔ اگر ایسا شخص اپنے آقایان نامدار کے اشاروں پر ناچے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ تعجب اس پر ہوتا اگر چودھری خلیق الزماں خودداری کا مظاہرہ کرتے۔ چودھری صاحب کی ذات کی حد تک ہمیں مرکزی بورڈ کے فیصلے پر کوئی حیرت ہے نہ افسوس۔ مگر پارلیمنٹ اور مسلم لیگ پر اس فیصلے کا جو ردعمل ہوگا ہم اسے نظرانداز نہیں کر سکتے۔ مرکزی بورڈ کی طرف سے صوبہ لیگ کی اس توہین کے بعد عوام میں مسلم لیگ کی کیا عزت باقی رہ جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ برسر اقتدار گروہ یہ چاہتا ہی نہیں کہ لیگ صحیح معنوں میں مضبوط ہو۔ یہ گروہ لیگ کو بالکل ختم کرنا بھی نہیں چاہتا مگر اس کی تقویت بھی اسے منظور نہیں۔ وہ مسلم لیگ کی پرانی ساکھ سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُسے زندہ رکھنا چاہتا ہے۔"[21]

نوائے وقت کی تلخ گوئی اس لحاظ سے بے بنیاد نہیں تھی کہ چودھری خلیق الزماں فی الحقیقت پس پردہ سیاسی ساز باز کا ماہر تھا۔ لیکن اس اداریے میں جو بات صاف طور پر نہیں کی گئی تھی وہ یہ تھی کہ چودھری خلیق الزماں نے دستور ساز اسمبلی کے لئے پنجابی ارکان کی نامزدگی کے سلسلے میں جو کچھ بھی کیا تھا وہ وزیراعظم لیاقت علی خان کی ہدایت اور خواہش کے مطابق کیا تھا۔ کیونکہ لیاقت علی خان ممدوٹ۔ باری دھڑے کے امیدواروں کی نامزدگی کیسے کر سکتا تھا۔ اس اداریے میں نواب مشتاق احمد گرمانی کی نامزدگی پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا حالانکہ صوبہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے امیدواروں کی جو فہرستیں بھیجی تھیں ان میں اس کا نام بھی شامل نہیں تھا اور تحریک پاکستان میں بھی اس کی کوئی خدمات نہیں تھیں۔ یہ متحدہ پنجاب کے جاگیرداروں کی غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ممتاز رکن تھا اور اس نے قیام پاکستان کے بعد ریاست بہاولپور کے وزیراعظم کی حیثیت سے اس ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق میں کئی ماہ تک پس و پیش کیا تھا۔ نوائے وقت کے اداریے میں نواب گرمانی کے بارے میں خاموشی کی وجہ کوئی خفیہ نہیں تھی۔ گرمانی مدیر نوائے وقت حمید نظامی کا پرانا محسن تھا۔ نواب نے اس نوجوان کو جو ڈاکٹر ستیہ پال کے اُردو اخبار "نیشنل کانگرس" میں کام کیا کرتا تھا، اپریل 1944ء میں اورینٹ نیوز ایجنسی کے لاہور آفس کی منیجری دلا کر اس کے لئے بہتر روزگار کا انتظام کیا تھا"[22] اور پھر قیام پاکستان کے بعد بھی وہ پس پردہ ہر

طرح سے نوائے وقت کی سرپرستی کرتا رہا تھا۔ لہٰذا مدیر نوائے وقت کو نہ تو اس کی جاگیرداریت پر کوئی اعتراض تھا اور نہ ہی اس کے یونینسٹ ہونے پر۔

دستور ساز اسمبلی کے پنجابی ارکان کی نامزدگی کے مسئلہ پر اس ہنگامہ آرائی سے پنجاب میں ایک طرف تو وزیراعظم لیاقت علی خان کے وقار کو مزید نقصان پہنچا دوسری طرف اس کے سب سے بڑے سیاسی حریف حسین شہید سہروردی کو بہت فائدہ ہوا۔ سہروردی نے مرکزی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کے متذکرہ فیصلہ سے دو دن قبل یعنی 22 / مارچ 1950ء کو لاہور میں پرانے مسلم لیگیوں کے ایک کنونشن میں عوامی مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر دیا تھا اور نوائے وقت نے اس اپوزیشن پارٹی کے قیام کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''اپنی ذات کی حد تک مسٹر سہروردی ہر لحاظ سے اس کے اہل ہیں کہ ایک نئی پارٹی کی قیادت کریں۔'' یہ نئی پارٹی دراصل بالکل نئی نہیں تھی اس کی بنیاد صوبہ سرحد میں پیر مانکی شریف نے لیاقت۔ قیوم گٹھ جوڑ کی استبدادیت سے تنگ کر آ کر ستمبر 1949ء میں رکھی تھی۔ پیر مانکی کی پرانی پارٹی اور سہروردی کی اس نئی پارٹی میں فرق صرف یہ تھا کہ پیر مانکی نے قیوم خان کی سکھا شاہی کے خلاف صوبہ سرحد کے پرانے جمہوریت پسند مسلم لیگیوں کو صوبائی سطح پر منظم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اب یہ نئی پارٹی سہروردی کی زیر قیادت اپنا حلقۂ اثر پورے پاکستان میں پھیلانے کا عزم رکھتی تھی۔ پنجاب کا ایک پرانا مسلم لیگی کارکن عبدالستار نیازی اس کا جنرل سیکرٹری مقرر ہوا تھا اور آئین و منشور مرتب کرنے کے لئے جو کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس میں ملک کے سارے صوبوں کے نمائندے شامل تھے۔ سہروردی نے کنونشن کے بعد ایک پریس کانفرنس میں اپنی پارٹی کے منشور کا جو خاکہ پیش کیا تھا اس کے اہم نکات یہ تھے:۔

1۔ پاکستان کو دولت مشترکہ سے علیحدہ ہو کر غیر جانبداری کا اعلان کرنا چاہیے۔

2۔ حکومت پاکستان کو ہندوستان کے تمام علاقوں سے آمدہ مسلمانوں کو مہاجرین تصور کرنا چاہیے اور ان کی آبادکاری کے لئے مناسب اقدام کرنا چاہیے۔

3۔ تمام بین المملکتی مسائل کو گفت وشنید یا ثالث کے ذریعے حل کرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لئے دونوں ممالک کے وزرائے اعظم کو ملاقات کرنا چاہیے۔ بدامنی کے انسداد کے لئے محض اعلانات کافی نہیں۔

4۔ صوبہ سرحد کی وزارت سے پاکستان کو نقصان پہنچ رہا ہے اس لئے اس وزارت کو ختم کر کے کسی اور حکومت کے قیام کا یا 92 الف کے نفاذ کا انتظام کرنا چاہیے۔

5۔ پاکستانی عوام کو جنگ سے خوفزدہ رکھنا یا تنازعہ کشمیر کو حکومت کی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک حربہ کے طور پر استعمال کرنا مناسب نہیں۔ اگرچہ دفاع پر کثیر رقوم خرچ کرنا جائز ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ تعمیری کام کی تکمیل بھی ضروری ہے۔

6۔ مزارعین اور ہاریوں کی فلاح و بہبود کے لئے مناسب اقدام ہونا چاہیے۔

7۔ اساتذہ اور دوسرے کم تنخواہ پانے والوں کی تنخواہ میں اضافہ کیا جائے۔

اس مبہم سے منشور میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ دولتِ مشترکہ سے علیحدگی کی بات محض اس لئے کی گئی تھی کہ ان دنوں پنجاب میں تنازعہ کشمیر کے حل نہ ہونے کے باعث برطانوی سامراج کے خلاف سخت غم وغصّہ پایا جاتا تھا اور جگہ جگہ دولتِ مشترکہ سے علیحدہ ہونے کا مطالبہ کیا جاتا تھا، بین المملکتی معاملات کو محض گفت وشنید یا ثالث کے ذریعے حل کرنے اور مسئلہ کشمیر پر جنگ نہ کرنے کے بارے میں جو کچھ کہا گیا تھا وہ پنجاب کی رائے عامہ کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ بنیادی زرعی اصلاحات کا کوئی ذکر نہیں تھا البتہ شہروں میں کم تنخواہ پانے والوں کے لئے خوش کن وعدہ موجود تھا۔ سرحد میں عبدالقیوم خان کی آمریت ختم کرنے کا مطالبہ مانکی گروپ کی خوشنودی کے لئے کیا گیا تھا اور یہ اس لحاظ سے ترقی پسندانہ تھا کہ قیوم خان نے صوبہ سرحد کو فی الحقیقت ایک قید خانہ بنا رکھا تھا۔ سہروردی نے اپنی اس پریس کانفرنس کے آخر میں کہا کہ عوامی مسلم لیگ کے ارکان قائداعظم کی مسلم لیگ کے صحیح وارث ہیں اور موجودہ سرکاری مسلم لیگ غیر نمائندہ ہے اگرچہ وہ خود پاکستان میں غیر فرقہ وارانہ سیاست کا قائل تھا لیکن اُس نے مصلحتاً اپنی اس نئی پارٹی کے دروازے غیر مسلموں کے لئے بند رکھے اور اعلان کیا کہ ''اس جماعت کی رُکنیت صرف مسلمانوں کے لئے کھلی ہوگی۔''[23]

باب: 10

حسین شہید سہروردی کا سیاسی پس منظر اور پنجاب میں اس کی پذیرائی

نوابزادہ لیاقت علی خان کے برعکس حسین شہید سہروردی از سرتاپا بورژوا تھا۔ بقول شخصے اس کی شخصیت بسیار رُخی، صدرنگی اور ہزار شیوہ تھی۔ اس کا تعلق مدناپور کے ایک اہل علم خوشحال گھرانے سے تھا جہاں اس کی پیدائش 8ستمبر 1893ء میں ہوئی تھی۔ اس کا نانا مولوی عبداللہ ہگلی کالج میں عربی کا پروفیسر تھا اور کلکتہ یونیورسٹی کے طالب علموں کے لئے ایک کتاب ''عربی زبان کی گرامر'' کا مصنّف تھا۔ اس کے والد سرزاہد سہروردی نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی کی ڈگریاں لیں اور پھر انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کی۔ اسے لارڈ چیمسفورڈ کے عہد میں کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا تھا۔ حسین شہید سہروردی کی والدہ خجستہ اختر ایک کتاب ''آئینہ عبرت'' کی مصنّفہ تھی۔ یہ کتاب عورتوں کی تعلیم کے بارے میں تھی کیونکہ وہ تعلیم نسواں کی زبردست حامی تھی۔ اس نے کلکتہ میں مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک سکول بھی شروع کیا تھا جو شاید اپنی قسم کا پہلا سکول تھا۔ اس نے اپنے بیٹے حسین شہید سہروردی کو بھی پہلے کلکتہ میں بی۔ایس۔سی تک تعلیم دلوائی اور پھر اعلیٰ تعلیم کے لئے اسے آکسفورڈ بھیج دیا۔ جہاں سے اس نے ایم۔اے اور بی۔سی۔ایل کے امتحانات پاس کئے اور پھر بارایٹ لاء بن کر واپس کلکتہ آ گیا۔ جہاں اس نے وکالت کے ساتھ سیاست میں دلچسپی لینا شروع کی۔ وہ تحریک خلافت کے دوران اس تحریک کی بنگال برانچ کا سیکرٹری تھا۔ 1919ء میں اس نے سرعبدالرحیم کی بیٹی سے شادی کی جو تین سال کے بعد انتقال کر گئی۔ اس نے 1940ء میں ایک عیسائی خاتون سے شادی

کی مگر اس سے اس کا نباہ نہ ہوسکا اور وہ دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے، وہ بنگال کے وسیع المشرب ہندو لیڈر سی۔ آر۔ داس کے ماتحت کلکتہ کارپوریشن کا ڈپٹی میئر بھی بنا تھا۔ وہ 1921ء سے لے کر 1947ء تک بنگال کی قانون ساز اسمبلی کا منتخب رکن رہا تھا۔ سر محمد ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ جب وہ 1932ء میں سر فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر ہوا تو اُس کے کچھ عرصہ بعد کلکتہ میں اس کی ملاقات حسین شہید سہروردی سے ہوئی۔ ''ابھی جوان تھے لیکن قابلیت ظاہر تھی۔ میں نے وائسرائے سے ذکر کیا اور مشورہ دیا کہ کلکتہ ہائی کورٹ میں جگہ خالی ہونے پر انہیں ججی کا عہدہ پیش کرنا موزوں ہوگا۔ اگر اُنہیں ہائی کورٹ میں جانا منظور ہوتا تو جلد ان کا تقرر ججی پر ہو جاتا۔ لیکن اُنہیں سیاسی سرگرمیاں زیادہ مرغوب تھیں۔''[1] اپریل 1942ء کے بعد صوبائی وزارت کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ بنگال کے عظیم قحط کے دوران وہ خواجہ ناظم الدین کی کابینہ میں سول سپلائز کا وزیر تھا۔ 47-1946ء میں وہ غیر منقسم بنگال کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اگست 1946ء میں کلکتہ کا عظیم ہندو مسلم قتل عام اس کی وزارت اعلیٰ کے عہد میں ہوا تھا جس کے بعد برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہو گئی تھی۔

جب 4/اپریل 1947ء کو انڈین نیشنل کانگرس کی بنگال شاخ نے صوبہ بنگال کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کا مطالبہ کر کے برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ اصولاً تسلیم کر لیا تو حسین شہید سہروردی اس کے ہفتہ عشرہ بعد یعنی 13/اپریل کو کلکتہ سے نئی دہلی پہنچا۔ اس نے 15/اپریل کو قائداعظم جناح سے ملاقات کی اور پاکستان ٹائمز کی رپورٹ کے مطابق ''اس ملاقات میں بنگال کے معاشی و سیاسی مستقبل کا مسئلہ زیر بحث آیا اور ان اقدامات پر بھی غور کیا گیا جو مسلم لیگ کی جانب سے بنگال کی تقسیم کے مطالبہ کی مخالفت کے لئے کئے جائیں گے۔''[2] سہروردی نے اس کے بعد 26/اپریل کو ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی اور ہوڈسن کے بیان کے مطابق اس نے وائسرائے سے یہ کہا کہ ''برصغیر کی تقسیم کا لازمی نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ بنگال کی تقسیم ہو، جو منصوبہ اسے بتایا گیا تھا اس کے تحت رائے شماری اس سوال پر ہونا تھی کہ صوبہ کی تقسیم ہونی چاہیے یا نہیں۔ اگر تقسیم نہیں ہونی چاہیے تو پھر اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے یا ہندوستان کا حصہ بننا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ وہ وثوق سے کہتا تھا کہ اگر کافی وقت دیا جائے تو بنگال کے متحد رہنے کی صورت میں وہ بے شک پاکستان میں شامل نہ ہوگا۔ جب اس دن جناح کی ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات ہوئی تو اس نے بنگال

کے متحد رہنے کے سوال پر بلا تامل یہ کہا کہ مجھے خوشی ہوگی۔ کلکتہ کے بغیر بنگال کسی کام کا نہیں۔ ان کے لئے بہتر یہی ہوگا کہ وہ متحد اور آزاد رہیں مجھے یقین ہے کہ پاکستان سے ان کے تعلقات دوستانہ ہوں گے۔ ہوڈسن مزید لکھتا ہے کہ ''سہروردی متحدہ بنگال میں مخلوط طریقۂ انتخاب پر آمادہ تھا اور صوبائی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر کرن شنکر رائے کا خیال تھا کہ اگر مسلمان مخلوط طریقۂ انتخاب مان جائیں تو بنگال کو متحد رکھا جاسکتا ہے۔ بنگال کے گورنر سر فریڈرک بروز نے بھی اپنے وزیراعلیٰ پر یہ زور دیا تھا کہ وہ یہ پالیسی اختیار کرے کیونکہ وہ کلکتہ کی بندرگاہ کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ کنٹرول میں رکھنے کے حق میں تھا لیکن بعد میں اس نے اپنے اس خیال کو ترک کردیا تھا کیونکہ یہ وائسرائے کے عمومی تصفیہ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ لیکن بالآخر بنگال کو متحد رکھنے کے ڈرامہ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا کیونکہ برصغیر کی تقسیم کا جو قطعی منصوبہ منظور ہوا تھا اس میں کسی صوبہ کے آزاد رہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ہندوستان کے حصے بخرے ہونے کا امکان غیر پسندیدہ تھا۔ اگر بنگال اور پنجاب کو آزاد ریاستوں کی حیثیت سے الگ ہونے کی اجازت دے دی جاتی تو پھر بڑی ریاستوں یا ریاستوں کے گروپوں کو یا دوسرے صوبوں کو آزاد ہونے سے کیسے روکا جاسکتا تھا۔''[3]

وائسرائے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے اگلے دن یعنی 27/اپریل 1947ء کو حسین شہید سہروردی نے نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا جس میں اس نے کہا کہ ہندوؤں نے بنگال کی تقسیم کا مطالبہ محض احساس مایوسی کے تحت کیا ہے۔ یہ بات ہندوؤں کے نقطۂ نگاہ سے بھی خودکشی کے مترادف ہوگی۔ اس کی اپیل یہ تھی کہ ''بنگال کو متحد، غیر منقسم اور خودمختار رکھا جائے جو کہ ہندوستان میں ایک عظیم، امیر ترین اور انتہائی خوشحال ملک ہوگا۔ اس ملک کے عوام کا معیار زندگی اونچا ہوگا۔ اس کا درجہ بلند ہوگا اور اس میں ہر چیز کی بہتات ہوگی۔'' جب اس سے پوچھا گیا کہ آیا اس نے اس سلسلے میں جناح اور لیگ ہائی کمان کے دیگر ارکان کی منظوری حاصل کر لی ہے تو اس کا جواب تھا کہ ''میں یہ بات ذاتی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ میں بنگال کے لئے بول رہا ہوں۔ میں منقسم ہندوستان میں ایک آزاد، غیر منقسم اور خودمختار بنگال دیکھنے کا متمنی ہوں۔''[4]

سہروردی کے اس مؤقف کی حمایت میں بنگال مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے 29/اپریل کو ایک بیان جاری کیا جس میں رائے ظاہر کی کہ ''قرارداد لاہور میں اکھنڈ مسلم ریاست کا تصور پیش نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی اس میں مسلم اکثریت والی کسی ایسی مصنوعی ریاست کا تصور تھا

کہ اجنبی عناصر کو بزور قوت شامل کیا جائے گا یا آبادی کا وسیع پیمانے پر تبادلہ ہوگا۔ اس قرارداد میں بنگال اور ہندوستان کی دوسری ثقافتی اکائیوں کو مکمل خودمختاری دی گئی ہے اور اس امکان کے لئے بھی دروازے کھلے رکھے گئے ہیں کہ ہندوستان میں ایک بین الاقوامی ادارہ قائم ہوگا۔ جو خالصتاً رضا کارانہ بنیاد پر سب کے مفاد کے لئے وجود میں آئے گا۔"[5] قائداعظم جناح یا مسلم لیگ کے کسی اور قابل ذکر لیڈر نے حسین شہید سہروردی اور ابوالہاشم کے ان بیانات کی تردید نہیں کی تھی اور نہ کسی مسلم لیگی نے ان دونوں کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرنے کی تحریک کی تھی۔ چنانچہ اس میں شک نہیں کہ ہوڈسن نے اس سلسلے میں جناح کی ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ جو بات چیت ریکارڈ کی ہے وہ صحیح ہے۔ قائداعظم کو متحدہ بنگال کی ایک آزاد و خودمختار ریاست پر کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ ان کی رائے میں کلکتہ کی بندرگاہ کے بغیر بنگال کسی کام کا نہیں تھا۔ ہوڈسن لکھتا ہے کہ بنگال کا سوشلسٹ لیڈر سرت چندر بوس بھی متحدہ بنگال کی آزاد و خودمختار ریاست کے قیام کا حامی تھا اور ان دنوں بنگال کی "سوشلسٹ جمہوریہ" کے اعلان کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن وائسرائے کا اصرار تھا کہ اس طرح کامن ویلتھ کی رکنیت میں پیچیدگی پیدا ہوگی۔ چنانچہ ماؤنٹ بیٹن نے مئی میں شملہ، جہاں اُس نے جواہر لال نہرو کے مشورہ کے مطابق برصغیر کی تقسیم کا قطعی منصوبہ تیار کیا تھا، سے واپسی پر وزیراعلیٰ سہروردی اور اس کے وزیر مال فضل الرحمان کو بتایا تھا کہ اس منصوبہ کے تحت صوبوں کو صرف ہندوستان یا پاکستان میں شامل ہونے کا حق دیا جائے گا اور کسی صوبے کو آزادی و خودمختاری کا حق نہیں ملے گا۔ اس نے سہروردی کو متنبہ کیا تھا کہ "نہرو بنگال کی آزادی کے حق میں نہیں ہے اور وہ اس صوبہ کے ہندوستان کے ساتھ قریبی تعلق کا خواہاں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تقسیم کے بعد جو مشکلات پیدا ہوں گی ان کی بنا پر مشرقی بنگال بہرصورت چند سال میں ہندوستان سے آملے گا۔"[6]

چودھری محمد علی لکھتا ہے کہ 8 رمئی 1947ء کو جبکہ ماؤنٹ بیٹن شملہ میں نہرو سے خفیہ سودا بازی میں مصروف تھا، گاندھی کلکتہ گیا۔ "وہاں آزاد بنگال کے لئے تحریک شروع ہو چکی تھی اس تحریک میں ایسے امکانات تھے کہ ان سے فائدہ اُٹھا کر پاکستان کو توڑا جا سکتا تھا۔ وزیراعلیٰ بنگال حسین شہید سہروردی نے سبھاش چندر بوس کے بھائی سرت چندر بوس کی تائید کے ساتھ آزاد و خودمختار متحدہ بنگال کی بات اُٹھائی تھی۔ انگریز گورنر بھی اس کا حامی تھا۔ دو سو سال سے سارے بنگال کی دولت کلکتے میں جمع ہوتی رہی تھی۔ یہ سلطنت برطانیہ کا دوسرا سب سے بڑا شہر تھا۔ صوبہ کا

دارالحکومت اوراس کی سب سے بڑی بندرگاہ بھی تھا۔ بنگال کی سب سے اہم تجارتی فصل پٹ سن زیادہ تر مشرقی بنگال میں کاشت کی جاتی تھی۔لیکن پٹ سن کے سارے کارخانے کلکتہ میں یا اس کے اردگرد واقع تھے۔متحدہ بنگال میں پٹ سن پیدا کرنے والے علاقے اور پٹ سن کی صنعت ایک ہی سیاسی وحدت میں اکٹھے رہتے لہٰذا یورپین بھی جن کا پٹ سن کی صنعت میں بڑا سرمایہ لگا ہوا تھا اس خیال کی حمایت کررہے تھے۔ کلکتے میں گاندھی نے سرت چندر بوس، سہروردی اور دوسرے لیڈروں سے، جن میں بنگال مسلم لیگ کا سیکرٹری ابوالہاشم بھی شامل تھا، ملاقات کی...... گاندھی کا اصرار یہ تھا کہ متحدہ بنگال میں حکومت کے ہر اقدام کو انتظامیہ اور مقنّنہ میں ہندو اقلیت کے کم ازکم دوتہائی حصے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔ جو شرط گاندھی نے پیش کی تھی اس کے تحت حکومت کا سارا اختیار ہندوؤں کے ہاتھوں میں منتقل ہوجاتا...... 20رمئی کو ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں سرت چندر بوس اور دوسرے ہندو لیڈر اور سہروردی اور بعض مسلمان لیڈر شامل ہوئے۔اس میں ایک آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کے لئے ایک آزمائشی سمجھوتہ مرتب کیا گیا لیکن بالآخر اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہندوؤں کا ایک بہت مضبوط گروپ جس کی قیادت ہندومہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کے ہاتھ میں تھی متحدہ بنگال کی سکیم کی ایڑی چوٹی سے مخالفت کر رہا تھا۔''[7] لیکن چودھری محمد علی کو یہ لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ قائداعظم محمد علی جناح آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تحریک کے خلاف نہیں تھے۔سہروردی نے یہ تحریک 15راپریل کو قائداعظم جناح سے ملاقات کرنے کے بعد شروع کی تھی۔ قائداعظم جناح یا کسی اور ممتاز مسلم لیگی رہنما نے ان دنوں اس تحریک کے خلاف کوئی بیان نہیں دیا تھا اور نہ ہی حسین شہید سہروردی یا ابوالہاشم کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی کی گئی تھی۔ چودھری محمد علی نے یہ بھی نہیں بتایا کہ 22راپریل 1947ء کو سر ناظم الدین نے بھی آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تحریک کی حمایت کی تھی۔اس نے کہا تھا کہ ''میری پختہ رائے ہے کہ آزاد وخودمختار بنگال صوبہ کے مسلم اور غیر مسلم عوام کے بہترین مفاد میں ہوگا اور اسی طرح مجھے یقین ہے کہ بنگال کی تقسیم بنگالیوں کے لئے مہلک ہوگی۔''[8]

20رمئی 1947ء کو سرت چندر بوس کے مکان پر جو کانفرنس ہوئی تھی اس میں سہروردی کے علاوہ فضل الرحمان، محمد علی بوگرہ، ابوالہاشم اور عبدالمالک نے بھی شرکت کی تھی اور اس کانفرنس میں جو عارضی سمجھوتہ ہوا تھا اس میں یہ طے کیا گیا تھا کہ:

1۔ بنگال ایک آزاد ریاست ہوگی۔ یہ آزاد ریاست بقیہ ہندوستان سے اپنے تعلقات کے بارے میں فیصلہ کرے گی۔ کسی یونین میں شمولیت کا فیصلہ اس آزاد بنگالی ریاست کی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت سے کیا جائے گا۔

2۔ بنگال کی آزاد ریاست کا جو آئین مرتب کیا جائے گا اس کے تحت، بنگال اسمبلی کا انتخاب مخلوط طریقۂ انتخاب اور بالغ رائے دہندگی کے اصول کی بنیاد پر ہوگا۔ البتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے لحاظ سے نشستیں مخصوص ہوں گی۔"[9]

23رمئی کو سرت چندر بوس نے گاندھی کے نام یہ خط لکھا کہ "گزشتہ منگل کی شام کو میرے گھر میں ایک کانفرنس ہوئی تھی جس میں سہروردی، فضل الرحمان، ابوالہاشم، عبدالمالک، کرن شنکر رائے اور ستیہ رنجن بخشی نے شرکت کی تھی۔ اس کانفرنس میں ایک عارضی سمجھوتہ ہوا تھا جس کی ایک نقل اس خط کے ساتھ بھیجی جا رہی ہے۔ اس سمجھوتے پر سب کی موجودگی میں ابوالہاشم اور میں نے دستخط کئے تھے۔ بلا شبہ اسے کانگرس اور مسلم لیگ کے روبرو پیش کیا جائے گا۔ کانفرنس میں جو بحث ہوئی تھی اس سے میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ جہاں تک بنگال میں کانگرس اور مسلم لیگ کی تنظیموں کا تعلق ہے وہ اس کی کہیں کہیں معمولی ترمیم کے ساتھ توثیق کر دیں گی۔ میں ابھی تک یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر آپ کی امداد، مشورے اور رہنمائی سے دونوں جماعتیں اس عارضی سمجھوتے کی بنیاد پر کوئی قطعی سمجھوتہ کر سکیں تو ہم بنگال کا مسئلہ اور اس کے ساتھ آسام کا مسئلہ بھی حل کر لیں گے۔ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اس سمجھوتے کا بقیہ ہندوستان میں بہت صحت مند ردعمل ہو گا۔"[10] چونکہ ان دنوں متحدہ بنگال میں سہروردی کی حکومت تھی اور خواجہ ناظم الدین اس میں شریک نہیں تھا اس لئے کانفرنس میں حسین شہید سہروردی اور فضل الرحمن سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ اس سمجھوتہ کی منظوری کے لئے جناح اور اس کی مجلس عاملہ سے رجوع کریں۔"[11] خواجہ ناظم الدین قبل ازیں متحدہ بنگال کی تحریک کی اعلانیہ تائید وحمایت کر چکا تھا۔ "مولانا راغب احسن کے بیان کے مطابق غیر منقسم بنگال کی سکیم کی حمایت میں جو بیان جاری کیا گیا تھا اس پر سب سے پہلے فضل الرحمان نے (جو بعد میں پاکستان کی پہلی کابینہ میں وزیر تعلیم بنا) دستخط کئے تھے...... اور بنگال لیگ کی مجلس عاملہ کے 27 ارکان میں سے 21 ارکان اس پلان کے حق میں تھے۔"[12]

گاندھی نے سرت چندر بوس کے اس خط کا جواب تقریباً دو ہفتے کے بعد یعنی 8رجون کو

دیا جبکہ برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان ہو چکا تھا۔ جواب یہ تھا کہ ''میں نے ڈرافٹ پڑھا ہے۔اب میں نے اس سکیم کے بارے میں پنڈت نہرو اور سردار پٹیل سے بات کی ہے۔ یہ دونوں ہی اس سکیم کے سخت خلاف ہیں اور ان کی رائے یہ ہے کہ یہ محض ایک چال ہے جو ہندوؤں اور اچھوتوں میں پھوٹ ڈالنے کے لئے چلی گئی ہے۔ ان کو اس چال کے بارے میں محض شبہ ہی نہیں ہے بلکہ یقین ہے۔ وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ اچھوتوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے بہت دولت خرچ کی جارہی ہے۔ اگر یہی بات ہے تو تم کم از کم وقتی طور پر اس جدوجہد کو ترک کردو کیونکہ بداعمالیوں کے ذریعے جو اتحاد خریدا جائے گا وہ کھلی تقسیم سے برا ہوگا...... تمہیں بنگال کے اتحاد کی جدوجہد کو ترک کر دینا چاہیے اور بنگال کی تقسیم کے لئے جو ماحول پیدا کیا گیا ہے اس میں گڑبڑ پیدا مت کرو۔''[13] اس خط سے ظاہر ہے کہ گاندھی کی جانب سے اس سکیم کو سبوتاژ کرنے کی سب سے بڑی وجہ جواہر لال نہرو، سردار پٹیل اور اس کے اپنے اس خدشے میں پنہاں تھی کہ مسلمان ارکان اسمبلی اچھوتوں کو ساتھ ملا کر متحدہ بنگال کی آزاد و خودمختار ریاست کا ہندوستان سے ناطہ توڑ لیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب مئی کے دوسرے ہفتے میں کلکتہ آیا تو اس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ '' حکومت کے ہر اقدام کو انتظامیہ اور مقننّہ میں ہندو اقلیت کے کم از کم دو تہائی حصے کا تعاون حاصل ہونا چاہیے۔'' اس نے 11 رمئی کو حسین شہید سہروردی اور محمد علی بوگرہ کے ساتھ اس سکیم کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنے پر محض اس لئے آمادگی ظاہر کی تھی کہ ''چونکہ بنگال کے لوگوں کی (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) بنیادی وحدت ہی سہروردی کی تجویز کی اساس تھی اور چونکہ بنگال کے مسلمان آبادی کے لحاظ سے پاکستان میں جس کا تصور مسلم لیگ نے پیش کیا تھا، غالب حیثیت کے مالک تھے، بنگالی مسلمانوں کی طرف سے جناح کی رضامندی کے ساتھ دوقومی نظریے کو عملاً مسترد کرنے کا مطلب یہ نکلتا کہ اس نظریے پر مبنی پاکستان کی تجویز کا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔''[14] لیکن 13 رمئی کو گاندھی نے اس سکیم کو سبوتاژ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا جبکہ ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکرجی نے اس سے ملاقات کے دوران سہروردی کی ''چالبازی'' کی مخالفت کی تھی۔ شیاما پرشاد مکرجی کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر ہندوستان متحد رہے تو بھی بنگال کو تقسیم کردینا چاہیے۔ گاندھی کے متذکرہ خط سے قبل 28 رمئی کو بنگال کی مسلم لیگ اور کانگرس دونوں ہی اس سکیم سے لاتعلقی کا اظہار کرچکی تھیں کیونکہ یہ بات الم نشرح ہو چکی تھی کہ ''شملہ میں ماؤنٹ بیٹن اور جواہر لال نہرو کے

درمیان بات چیت میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ ہو چکا ہے اور کسی صوبہ یا ریاست کو آزاد ہونے کا حق نہیں دیا جائے گا۔ لارڈ اسمے اور سردار پٹیل کے بیانات کے مطابق اس وقت تک خفیہ طور پر یہ بھی فیصلہ ہو چکا تھا کہ کلکتہ کی بندرگاہ بہرصورت ہندوستان کے حوالے کی جائے گی۔"[15]

تاہم سرت چندر بوس نے ہمت نہ ہاری اور اس نے 9/جون کو جناح کے نام ایک خط میں اُمید ظاہر کی کہ وہ آزاد متحدہ بنگال کی سکیم کی حمایت کرتے رہیں گے۔ اس نے اس خط میں لکھا تھا کہ میں یہ گذارش "ان نظریات کے مطابق کر رہا ہوں جن کا اظہار آپ نے مجھ سے ملاقات کے دوران کیا تھا۔"[16] سرت چندر بوس نے اپنی تقریروں میں بھی یہ کوشش جاری رکھی کہ بنگال کے ہندو، بنگال کو متحد رکھنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس نے بنگال کی تقسیم کے خلاف 1905ء کی تحریک کی یاد دہانی کرائی اور یہ بھی بتایا کہ شمالی ہندوستان کے لیڈروں نے سی۔ آر۔ داس اور سبھاش چندر بوس سے کیا سودا کیا تھا۔ سی۔ آر۔ داس نے کانگرس کو چھوڑ کر سوراجیہ پارٹی کیوں بنائی تھی اور سبھاش چندر بوس نے کانگرس کے تری پورہ سیشن میں صدر منتخب ہونے کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کر کے فارورڈ بلاک کی تشکیل کیوں کی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر بھارت ماتا کی تقسیم پاپ ہے تو مادرِ بنگال کی تقسیم اس سے بڑا پاپ ہے۔ لیکن سرت چندر بوس کی یہ مہم ناکام رہی۔ بنگال کے بیشتر اخبارات پر مارواڑیوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے انہوں نے اس مہم کی کوئی حمایت نہ کی۔ اس کی تقریریں اخبارات میں چھپتی ہی نہیں تھیں۔ غالباً اس لئے کہ مارواڑیوں کو بھی نہرو کی طرح یقین تھا کہ مشرقی بنگال بہت جلد پھر بھارت ماتا کی گود میں آ جائے گا۔ اس دوران مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ابوالہاشم نے بھی بہت سے جلسوں میں تقریریں کیں۔ اس نے کلکتہ کی کمیونسٹ پارٹی کے زیر اہتمام یونیورسٹی ہال میں ایک کل جماعتی اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہندو دانشوروں کو ہندوستان کی تاریخ کی سپرٹ کے خلاف نہیں جانا چاہیے۔ پرتاپ سنگھ، سیوا جی، چاند سلطانہ، رانی عالیہ بائی، عیسیٰ خان اور کیدار رائے ہندوستانیوں کی نظر میں محض اس لئے ہیرو ہیں کہ وہ اکھنڈ بھارت کے تصور کے خلاف تھے۔ اکھنڈ بھارت کا تصور سامراجیت، استبدادیت اور آمریت کی پیداوار ہے۔ اکھنڈ بھارت کو مغلوں اور انگریزوں جیسے غیر ملکی حکمرانوں نے جنم دیا تھا۔ ہندوستان کبھی بھی ایک ملک نہیں رہا۔ اسے مغلوں اور انگریزوں نے سنگینوں کے زور پر متحد رکھا تھا۔"[17] لیکن سرت چندر بوس کی طرح ابوالہاشم کی جدوجہد بھی ناکام ہوئی اور اس

طرح آزاد وخودمختار بنگال کے لئے سہروردی پلان کی تکمیل نہ ہوسکی۔ حالانکہ قائداعظم جناح اس کے حق میں تھے۔

ایم۔اے۔ایچ اصفہانی لکھتا ہے کہ ''اس امر کا کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے کہ سہروردی نے آزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تحریک قائداعظم جناح کی اجازت سے شروع کی تھی۔''[18] اصفہانی کا یہ موقف سراسر غلط ہے اوراس کی بنیاد سہروردی کے خلاف تعصب پر مبنی ہے۔ یہ دونوں بڑی دیر سے ایک دوسرے کے سیاسی رقیب تھے۔ ان کی رقابت کا ایک مظاہرہ اپریل 1946ء میں ہوا تھا جبکہ سہروردی نے متحدہ بنگال کے وزیراعلیٰ کی حیثیت سے اصفہانی کو کلکتہ کا میئر نہیں بننے دیا تھااوراس کی بجائے ایک سکول ماسٹر محمد عثمان کو میئر منتخب کرادیا تھا۔ اصفہانی نے اپنی کتاب میں سہروردی کی اس ''سازش'' پر بہت غم وغصہ کا اظہار کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس امر کی بے شمار تحریری شہادتیں موجود ہیں کہ قائداعظم جناح کوآزاد وخودمختار متحدہ بنگال کی تحریک پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہ تحریک کوئی خفیہ طور پر نہیں چلائی گئی تھی۔ اپریل اور مئی 1947ء کے اخبارات اس سلسلے میں سہروردی اور سرت چندر بوس کے علاوہ بنگال کے بہت سے مسلمانوں اور ہندولیڈروں کے بیانات اورتقریروں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں تک کہ خواجہ ناظم الدین اور فضل الرحمان کے بیانات اورتقریروں کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ جناح نے بنگال کے تقریباً سارے ممتاز مسلم لیگی لیڈروں کی ان سرگرمیوں پر کبھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ جناح کے کسی ایک بیان سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ ان دنوں اس تحریک کے خلاف تھے۔ چودھری محمد علی نے بھی جو ان دنوں مسلم لیگ ہائی کمان کے بہت قریب تھا یہ نہیں لکھا کہ قائداعظم اس تحریک کے خلاف تھے۔ غالباً اس کی افسرانہ ذہنیت نے اُسے اس مسئلہ پر کھل کر کچھ کہنے کی اجازت نہیں دی۔ البتہ اس نے کلکتہ کی بندرگاہ کی اہمیت کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ جس سے ہوڈسن کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ جناح نے ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کے دوران آزاد ومتحدہ بنگال کی تحریک کی حمایت کی تھی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ کلکتے کے بغیر بنگال کسی کام کا نہیں رہتا۔ گاندھی کا پرائیویٹ سیکرٹری پیارے لال لکھتا ہے کہ ''جناح ہندوستان اور پاکستان سے الگ ایک خودمختار بنگال کی تجویز قبول کرنے پر آمادہ تھا۔ بشرطیکہ اسے اس کے عوض پورا پنجاب مل جائے۔ لیکن اگر ماؤنٹ بیٹن پلان کے مطابق پنجاب کی تقسیم بہرصورت ضروری تھی تو پھر اس کے لئے یہ تجویز

قابل قبول نہیں تھی اور اگر اس طرح صوبہ سرحد کو خود مختاری کا حق ملتا تو پھر اسے آزاد و متحدہ بنگال کی تجویز بالکل منظور نہیں تھی۔"[19]

پیارے لال کے اس بیان کی تائید میں کوئی تحریری ثبوت نہیں ہے۔ ہوڈسن کا بیان ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے مئی میں شملہ سے واپسی کے بعد سہروردی کو متنبہ کیا تھا کہ پنڈت نہرو آزاد بنگال کے حق میں نہیں ہے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ برصغیر کی تقسیم کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوں گی ان کی بنا پر مشرقی بنگال چند سال میں ہندوستان سے آملے گا۔ گاندھی نے بھی 8 رجون کو سرت چندر بوس کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ واضح کیا تھا کہ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل آزاد بنگال کے تصور کے سخت خلاف ہیں۔ گاندھی نے اس خط میں نہرو اور پٹیل کی مخالفت کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ان کی رائے میں یہ سکیم محض ایک چال تھی جس کا مقصد ہندوؤں اور اچھوتوں میں پھوٹ ڈلوانا تھا۔ اس خط میں جناح کے متذکرہ موقف کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ پیارے لال نے غالباً "باپو" کی اس سلسلے میں سیاسی ہیرا پھیری پر پردہ ڈالنے کے لئے جناح کے موقف کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناح کو ہندوستان کے ٹکڑے ہو جانے کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ یہ کانگرسی لیڈر ہی تھے جن کی نیندیں اس خدشہ کی بنا پر حرام ہو گئی تھیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے مئی کے اوائل میں انتقال اقتدار کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں صوبوں کی آزادی کی گنجائش موجود تھی لیکن شملہ میں نہرو نے اس منصوبہ کو قطعی طور پر مسترد کر دیا تھا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ اس طرح ہندوستان بہت سی آزاد ریاستوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ 3 رجون 1947ء کو برصغیر کی تقسیم کے اعلان کے بعد گاندھی کی طرف سے آزاد پٹھانستان کا شوشہ محض سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خان کی اشک شوئی اور نوزائیدہ پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے چھوڑا گیا تھا۔ جب یہ تجویز ماؤنٹ بیٹن کی زیر صدارت لیڈروں کے اجلاس میں اُٹھائی گئی تھی تو جناح نے محض یہ تبصرہ کیا تھا کہ کیا یہ حق ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو بھی دیا جائے گا اس پر ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ نہیں نہیں! میں پہلے ہی اس بارے میں نہرو سے بات کر چکا ہوں اور کانگرس نے اب اپنی یہ تجویز واپس لے لی ہے۔ چنانچہ جولائی 1947ء میں کانگرس نے نہ صرف صوبہ سرحد میں استصواب کرانے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی بلکہ اس نے استصواب کے نتیجے کو بھی منظور کر لیا تھا۔ ایسٹرن کمانڈ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ جنرل فرانسس ٹکر اور ایک اور انگریز مؤرخ ہیوٹنکر نے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا تھا اس سے ظاہر ہوتا

ہے کہ آزاد و متحدہ بنگال کی تجویز دراصل کلکتہ کے انگریز تاجروں اور صنعت کاروں کی جانب سے پیش کی گئی تھی۔ جنہوں نے بنگال اور آسام میں بڑی سرمایہ کاری کر رکھی تھی اور جن کی بنگال اسمبلی میں اتنی نمائندگی تھی کہ صوبہ کا طاقتی توازن ان کے ہاتھ میں تھا۔ جنرل ٹکر لکھتا ہے کہ ہمیں اُمید تھی کہ بنگال میں ایسا انتظام کیا جاسکے گا جس کے تحت مسلمان اور ہندو دونوں ہی کلکتہ کی بندرگاہ کو آزادی سے استعمال کر سکیں گے اور ہیوٹنکر کانگرس میں سردار پٹیل کی آمریت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے ''یہ بات یقینی تھی کہ کلکتہ ہندوستان میں شامل ہوگا لیکن اس کا اندرونی علاقہ پاکستان کے حصے میں جائے گا۔ چنانچہ یہ تجویز پیش کی گئی کہ اگر پاکستان کو کلکتہ کی بندرگاہ کی سہولت دے دی جائے تو اس کے بدلے میں تقسیم کی دیوار کم کی جاسکے گی۔ چنانچہ ایک نمائندہ پٹیل کے پاس بھیجا گیا جس نے تجویز پیش کی کہ کلکتہ کو چھ ماہ کے لئے مشترکہ کنٹرول میں رہنے دیا جائے۔ لیکن سردار نے صرف چھ الفاظ میں اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ اس نے کہا کہ ''چھ گھنٹے کے لئے بھی نہیں۔''[20] اس طرح گاندھی، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل کی اس قسم کی مخالفت کی وجہ سے حسین شہید سہروردی اپنے آزاد و خودمختار متحدہ بنگال کے منصوبہ میں ناکام و نامراد ہوا۔

جب 20 رجون کو بنگال کے مستقبل کے بارے میں صوبہ کی اسمبلی میں رائے شماری ہوئی تو مسلم اکثریت کے علاقے کے ارکان اسمبلی نے بھاری اکثریت میں صوبہ تقسیم کے خلاف ووٹ دیئے تھے۔ تقسیم کے خلاف 106 اور تقسیم کے حق میں صرف 35 ووٹ ڈالے گئے تھے۔ اس کے برعکس ہندو اکثریت کے علاقوں کے ارکان اسمبلی کی اکثریت نے صوبہ کی تقسیم کے حق میں ووٹ دیئے تھے۔ 58 ارکان تقسیم کے حق میں تھے اور 21 مخالف تھے۔ حسین شہید سہروردی نے اسی دن ہندو ارکان اسمبلی کے اس رویہ پر افسوس کا اظہار کیا تھا اور ایک بیان میں کہا تھا کہ ''ہم یکسانیت کی حامل وحدت کے حق میں تھے۔ ہم اس وحدت میں انتہائی ترقی یافتہ اور خوشحال قوم بن سکتے تھے۔ لیکن ہماری تقدیر یہ تھی کہ ہم اکٹھے نہیں چل سکیں گے۔'' پھر اس نے 2 رجولائی کو سلہٹ میں تقریر کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ ''وزارتی مشن کے پلان کو صوبہ آسام کی کانگرس نے سبوتاژ کیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج پنجاب اور بنگال تقسیم ہو رہے ہیں۔''[21] 5 راگست 1947ء مشرقی بنگال اسمبلی کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا انتخاب ہوا تو متحدہ بنگال کا وزیراعظم حسین شہید سہروردی خواجہ ناظم الدین کے مقابلے میں شکست کھا گیا۔ سہروردی کے حق میں صرف 39

ووٹ ڈالے گئے جبکہ خواجہ ناظم الدین کو 75 ووٹ ملے۔ مسلم لیگ ہائی کمان کی طرف سے آئی۔ آئی۔ چندریگر نے اس انتخاب کی نگرانی کی۔ سہروردی کا الزام یہ تھا کہ ''قائداعظم نے خواجہ ناظم الدین کو مشرقی بنگال کی گدی پر مسلط کیا تھا۔''[22] حالانکہ جناح نے قبل ازیں 27 رجولائی کو اور پھر 30 رجولائی کو اپنے بیانات میں اس غلط فہمی کو بے بنیاد قرار دیا تھا کہ وہ صوبائی لیگ اسمبلی پارٹیوں پر بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر اپنی مرضی کے لیڈر مسلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اُن کا بیان یہ تھا کہ ''اس سلسلے میں جتنی افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔ صوبائی لیگ اسمبلی پارٹیوں کے ارکان کا فرض ہے کہ وہ اپنے لیڈر کا انتخاب آزادانہ اور منصفانہ طور پر کریں اور اس سلسلے میں کسی کی طرف سے میرے نام کا استعمال نہ کیا جائے۔'' قمر الدین احمد کا الزام یہ تھا کہ ''لیاقت علی خان نے جو سہروردی کو ناپسند کرتا تھا اس انتخاب میں اپنے وفادار پیروکار سر ناظم الدین کی حمایت کی تھی۔ ابتداً جناح نے اس انتخاب کے بارے میں تامل کیا تھا۔ انہیں یہ احساس تھا کہ ناظم الدین بنگال کی حکومت کا رکن نہیں ہے اس لئے اس کے لئے املاک کی تقسیم کے کام کو سرانجام دینا ممکن نہیں ہوگا۔ جناح نے سہروردی کو یقین دلایا تھا کہ یہ افواہ بے بنیاد ہے کہ مشرقی بنگال اسمبلی پارٹی کے لیڈر کا انتخاب ہوگا اور اگر ایسا کرنا بھی پڑا تو وہ آزاد پاکستان میں نئی حکومت کی تشکیل کے بعد ہوگا۔ ان دنوں سہروردی ان وکلاء کے لئے مواد تیار کرنے میں بہت مصروف تھا جنہوں نے مسلم لیگ کی جانب سے سرحدی کمیشن کے روبرو پیش ہونا تھا۔ وہ اپنے کارکنوں کی ان باتوں پر توجہ نہیں دیتا تھا کہ سر ناظم الدین اپنے انتخاب کے لئے کنویسنگ کر رہا ہے۔ اس نے اپنے کارکنوں کو بتایا تھا کہ اسے پورا یقین ہے کہ لیڈر کا انتخاب نہیں ہوگا۔ اولاً اس لئے کہ جناح نے اسے ایسا ہی یقین دلایا ہوا تھا اور ثانیاً عام انتخابات کے دوران سر ناظم الدین نے یقین دلایا تھا کہ وہ صوبائی سیاست میں دلچسپی نہیں لے گا۔ لیکن لیاقت علی خان نے یکا یک پنجاب اور بنگال میں انتخاب کا اعلان کر دیا۔ چونکہ ایک سمجھوتے کے تحت عام انتخابات میں ناظم الدین کے 52 ارکان منتخب ہو گئے ہوئے تھے اس لئے وہ سہروردی کے بعض دل برداشتہ پیروکاروں اور سلہٹ کے 17 ارکان کی حمایت سے لیڈر منتخب ہو گیا۔ ناظم الدین نے سلہٹ کے ارکان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں صوبائی کابینہ میں تین نشستیں دے گا مگر بعد میں اس نے اپنے اس وعدے کی تکمیل نہ کی۔ ابوالہاشم اس انتخاب میں غیر جانبدار رہا تھا۔''[23]

اے۔کے فضل الحق کا سوانح نگار اے۔ایس۔ایم عبدالرب لکھتا ہے کہ ''خواجہ ناظم الدین 1946ء کے اوائل میں سہروردی کے ہاتھوں تنگ آ کر سیاست سے ریٹائر ہو گیا تھا لیکن برصغیر کی تقسیم کے موقع پر وہ پھر سیاسی سٹیج پر نمودار ہو گیا۔ جب تقسیم کے بعد لیگ پارلیمنٹری پارٹی کے لیڈر کا انتخاب ضروری ہو گیا تو خواجہ ناظم الدین نے بطور اُمیدوار اپنا نام پیش کر دیا اور لیگ ہائی کمان نے اس کی سرگرمی سے حمایت کی۔ طاقت ور سہروردی، جس نے 1946ء کے انتخابات میں بھاری فتح حاصل کر کے پاکستان کی بنیاد رکھی تھی، شکست کھا گیا۔''[24] لیکن ایس۔ایم اکرام نے مختلف عوامل کا مواد دے کر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ''سہروردی کی شکست میں لیگ ہائی کمان کا کوئی ہاتھ نہیں تھا بلکہ اسے مقامی وجوہ کی بنا پر یہ ہزیمت اُٹھانا پڑی تھی۔ خواجہ ناظم الدین ڈھاکہ کا رہنے والا تھا اور اس بنا پر اسے مشرقی بنگال کے ارکان کی اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ مولانا اکرم خان اور دوسرے مذہبی ارکان نے بھی خواجہ کی امداد کی تھی۔ ان کے علاوہ طاقتور اصفہانی خاندان نے بھی سہروردی کو شکست دلوانے کے لئے اپنے سارے ذرائع استعمال کئے تھے اور سلہٹ کے 17 ووٹ بھی خواجہ ناظم الدین کی کامیابی کا باعث بنے تھے۔ مزید برآں سہروردی سیاست میں بہت بے تدبیری کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ متحدہ بنگال میں اپنی کابینہ کے ارکان سے بھی آداب کے ساتھ پیش نہیں آتا تھا۔''[25] تاہم وہ اس شکست کے بعد بھی مغربی بنگال کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا متفقہ طور پر لیڈر منتخب ہو گیا۔ اس پارٹی کے اجلاس کی صدارت بھی آئی۔آئی چندریگر نے کی تھی۔ اس انتخاب کے بعد سہروردی نے ایک ڈیڑھ ماہ تک گاندھی کے ساتھ مل کر کلکتہ میں فرقہ وارانہ امن بحال کرنے کے لئے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اس نے 10 ر ستمبر کو کلکتہ سے ہندوستان کی مرکزی اسمبلی پارٹی کے قائد چودھری خلیق الزماں کو ایک خط لکھا جس میں یہ تجویز پیش کی کہ ''ہندوستان میں اقلیتوں کے مفادات وحقوق کے تحفظ کے لئے پہلے اقلیتی صوبوں کے مسلم ارکان اسمبلی کا کنونشن منعقد کیا جائے اور پھر ہر صوبے میں سرکردہ مسلمانوں کے اجتماعات کا انتظام کیا جائے۔''[26] اس خط سے بالکل واضح ہے کہ اس وقت تک سہروردی نے ہندوستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اس نے 18 ر ستمبر کو نئی دہلی میں اعلان کیا کہ وہ دو ایک دن میں مغربی پنجاب جا کر وہاں فرقہ وارانہ امن بحال کرنے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ وہ 23 ر ستمبر کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچا۔ اسی ہوائی جہاز میں لیاقت علی خان

اور غلام محمد بھی دہلی سے واپس کراچی آئے تھے۔ سہروردی نے کراچی پہنچنے کے فوراً ہی بعد قائداعظم سے تقریباً پونے دو گھنٹے تک ملاقات کی جس کے دوران اس نے پاکستان کے سربراہ مملکت کو مشرقی پنجاب اور دہلی کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اگلے دن اس نے پھر قائداعظم سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک ملاقات کی جس کے دوران دونوں میں فرقہ وارانہ امن بحال کرنے کے لئے طریق کار پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ چودھری محمد علی بتاتا ہے کہ جب ستمبر 1947ء میں سہروردی نے قائداعظم سے یہ ملاقات کی تھی تو مہاجرین کے مسئلہ نے بے پایاں وسعت اختیار کر لی ہوئی تھی۔ چنانچہ وزارت بحالیات مہاجرین کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ ''یہ وزارت بنگال کے سابق وزیراعلیٰ ایچ۔ ایس۔ سہروردی کو پیش کی گئی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔''[27]

28ر ستمبر کو سہروردی واپس کلکتہ چلا گیا جہاں اس نے گاندھی جینتی کی تقریبات میں شرکت کر کے انڈین نیشنل کانگرس کے ''باپو'' کی انصاف پسندی اور رواداری کو خراج تحسین ادا کیا۔ 2ر اکتوبر کو وہ پھر کراچی آیا۔ اس کے ہمراہ چودھری خلیق الزماں بھی موجود تھا۔ 5ر اکتوبر کو اس نے قائداعظم سے ملاقات کی جس کے دوران چودھری خلیق الزماں بھی موجود تھا۔ چودھری خلیق الزماں کا بیان ہے کہ اس ملاقات میں جناح نے مجھ سے بہت خفگی کا اظہار کیا کیونکہ میں نے ستمبر 1947ء میں اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب سر محمد ظفر اللہ کے ایک بیان کے جواب میں جو بیان جاری کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ مشرقی پنجاب میں فسادات کی ساری ذمہ داری حکومت ہندوستان پر عائد نہیں ہوتی لیکن چودھری خلیق الزماں نے سہروردی کے بارے میں جناح کے رویّے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ سہروردی نے ہندوستان میں گاندھی کے ساتھ مل کر فرقہ وارانہ امن کی جو مہم شروع کر رکھی تھی اس میں اس نے کئی ایسے ہی بیانات دیئے تھے اور اس قسم کی تقریریں بھی کی تھیں۔ قائداعظم جناح سے اس ملاقات کے بعد چودھری خلیق الزماں نے پاکستان میں ہی رہنے کا فیصلہ کیا لیکن سہروردی 8ر اکتوبر کو واپس دہلی چلا گیا۔ اگلے دن یعنی 9ر اکتوبر کو اس نے گاندھی اور نہرو سے بند کمرے میں ایک گھنٹہ تک ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بعد وہ پھر کراچی آیا جہاں اس نے 17ر اکتوبر کو کراچی میں ایک بیان میں سندھ کی فرقہ وارانہ صورت حال پر اطمینان کا اظہار کیا۔ اسی دن وہ واپس دہلی چلا گیا جہاں اس نے 19ر اکتوبر کو نہرو سے ملاقات کی اور پھر وہ لاہور گیا۔ ستمبر کے مہینے میں سہروردی کی ان سرگرمیوں کا مقصد یہ تھا کہ

سندھ اور مغربی پنجاب میں فرقہ وارانہ فسادات مزید شدت اختیار نہ کریں کیونکہ گاندھی اور نہرو اس سلسلے میں بہت فکر مند تھے جبکہ پٹیل کا منصوبہ یہ تھا کہ دہلی اور مغربی یو۔ پی کے متعدد اضلاع کے سارے مسلمانوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا جائے۔ بظاہر چودھری خلیق الزماں بھی گاندھی اور ابوالکلام آزاد کے کہنے پر اسی مقصد کے لئے پاکستان آیا تھا لیکن ہندوستان کی مرکزی لیگ اسمبلی پارٹی کا یہ قائد محض اس عجیب وغریب وجہ سے پاکستان میں ہی رہ گیا کہ قائداعظم جناح نے اس کے ایک بیان پر ''خفگی'' کا اظہار کیا تھا۔ اس کے برعکس سہروردی کا اس وقت تک پاکستان میں رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا حالانکہ قائداعظم جناح نے نہ صرف اس سے کسی خفگی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ اسے وزارت بحالیات کا عہدہ پیش کیا تھا۔

سہروردی نے چودھری خلیق الزماں کی اس دغا بازی اور موقع پرستی کے باوجود اپنی 10 ستمبر کی تجویز کے مطابق نومبر کے دوسرے ہفتے میں کلکتہ میں ہندوستان کے سرکردہ مسلمان رہنماؤں کی ایک کانفرنس منعقد کی۔ اس نے اس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہم یہ نہیں چاہتے کہ پاکستان ہمارے لئے لڑائی لڑے۔ ہم انڈین یونین میں اپنے مسائل کا حل خود تلاش کریں گے۔ ہندوستان ہمارا وطن ہے اور ہم اس کے وفادار ہیں۔ اس نے کہا کہ ہم اپنے دلوں پر ہاتھ رکھ کر بلا خوف و ہراس صاف اور واضح الفاظ میں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم ہندوستان کے وفادار شہری ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ''ہندوستان میں ہمارے حقوق کے ضمانت دی جائے گی اور ہماری وفاداری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہماری ثقافت کو تباہ کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی اور ہماری اپنے مفادات کے حصول کی کوشش کو ریاست سے غداری تصوّر نہیں کیا جائے گا۔'' اس نے مزید کہا کہ ''ہم پنڈت نہرو کے لئے اپنی حمایت کا اعلان کرتے ہیں۔ یہ زبانی جمع خرچ نہیں ہے بلکہ یہ دلی حمایت ہے۔ یہ حمایت صرف اس لئے نہیں کہ وہ سربراہ حکومت ہے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ ایک غیر معمولی اور طاقتور شخصیت ہے اور اس کی اعلیٰ اخلاقی اقدار ہمیں اس کی تعریف اور وفاداری پر مجبور کرتی ہیں۔''[28] 22 نومبر کو سہروردی نے دہلی سے واپس کلکتہ پہنچ کر اپنے اس ارادے کا اعلان کیا کہ وہ پارلیمانی سیاست سے ریٹائر ہو جائے گا اور آئندہ وہ خود کو مکمل طور پر ہندوستان اور پاکستان کے مابین امن واتحاد کے بڑھانے کے لئے وقف کر دے گا۔ اس نے کہا کہ وہ نہ تو مشرقی بنگال اسمبلی میں اپنی نشست برقرار رکھے گا اور نہ ہی بھارتی دستوری اسمبلی کے

لئے کسی انتخاب میں حصہ لے گا۔ اس نے اشارۃً یہ بھی بتایا کہ "وہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کی رکنیت سے بھی مستعفی ہو جائے گا۔"[29] اس اعلان کے بعد سہروردی ڈھاکہ پہنچا اور یہاں اس نے 26 رنومبر کو ممتاز شہریوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ "آئندہ سیاسی جماعتوں کی تنظیم مسلم لیگ اور ہندو مہاسبھا کی طرح فرقہ وارانہ خطوط پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان کی تشکیل اس طرح ہونی چاہیے کہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی اس کے رکن بن سکیں۔"[30]

14 ردسمبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا آخری اجلاس کراچی میں منعقد ہوا جس کی صدارت قائداعظم جناح نے کی۔ اس اجلاس میں مسلم لیگ کو دو علیحدہ اور جداگانہ تنظیموں میں تقسیم کر دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک تنظیم پاکستان کے لئے اور دوسری بھارت کے لئے۔ پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے نوابزادہ لیاقت علی خان کو کنوینر مقرر کیا گیا اور بھارت میں مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کے لئے نواب محمد اسماعیل خان کا بطور کنوینر تقرر ہوا۔ اس اجلاس کے اگلے دن یعنی 15 ردسمبر کو سہروردی نے کراچی میں ایک انٹرویو میں اُمید ظاہر کی کہ پاکستان مسلم لیگ غیر مسلم باشندوں کے لئے بھی اپنے دروازے کھول دے گی۔ کیونکہ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کوئی برسر اقتدار پارٹی اپنے آئین کے ذریعے عوام کے ایک حصہ کو اپنی صفوں سے باہر رکھے۔"[31] پھر اس نے 24 ردسمبر کو نئی دہلی میں ایک اور انٹرویو میں کہا کہ "پاکستان میں یہ قوی احساس موجود ہے کہ ملک میں ایک نیشنلسٹ لیگ کی تشکیل کی جائے جس کے دروازے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں ہی کے لئے کھلے ہوں۔ اس نے کہا کہ پاکستان مسلم لیگ میں نیشنلزم کے اثر و دخل کی بنا پر یہ تنظیم لازمی طور پر کم فرقہ وارانہ اور زیادہ ترقی پسندانہ ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ جو عناصر برسر اقتدار ہیں اور لیگ کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے خواہاں ہیں وہ نیشنل لیگ کی تجویز کے خلاف ہیں۔"[32] مارچ 1948ء میں پاکستان کی مرکزی اسمبلی کا بجٹ سیشن شروع ہوا تو وہ پھر کراچی آیا اور اس نے 6 رمارچ کو اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے حکومت پاکستان کو متنبہ کیا کہ وہ "اسلام خطرے میں ہے" یا "پاکستان خطرے میں ہے" کے نعرے بلند نہ کرے اور اپنے دل، دماغ اور سینے کو غیر مسلم اقلیتوں کے لئے کھول دے۔ اس نے خان عبدالغفار خان کے اس اعلان سے اتفاق کیا کہ "اب پاکستان مسلم لیگ کی کوئی گنجائش نہیں۔" وزیراعظم لیاقت علی خان نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ "سہروردی نے یہ تقریر دراصل بھارت اور بھارت کے ارباب اقتدار کے

لئے کی ہے۔ مجھے سہروردی سے ہمدردی ہے لیکن اسے بھارت میں یہ رعایت کبھی نہ ملتی کہ وہ پاکستان کا شہری ہوتے ہوئے وہاں کی پارلیمنٹ سے خطاب کرتا۔'' لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز نے سہروردی کی اس تقریر کی رپورٹ پر یہ سرخی لگائی کہ ''ہندوستان کے شہری'' نے پاکستان پارلیمنٹ کو خطاب کیا ہے۔''[33] 25رمئی کو سہروردی نے کراچی میں ایک انٹرویو کے دوران کہا کہ ہندوؤں کو سندھ میں واپس لانے اور انہیں یہاں دوبارہ آباد کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ سندھ کے ہندو ارکان اسمبلی میں سے کسی ایک کو صوبائی کابینہ میں شامل کیا جائے اور اسے انتظامی اختیارات بھی دیئے جائیں۔ یہ انٹرویو دینے کے بعد وہ اسی دن دہلی چلا گیا اور اس کے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں یہ خبر چھپی کہ وہ دہلی سے 3رجون کو مشرقی بنگال کے دورے پر جائے گا۔ اس کی کراچی سے روانگی کے بعد اسی دن یعنی 25رمئی کو ہی پاکستان دستور ساز اسمبلی کی جانب سے اپنے ضوابط کار کا اعلان کیا گیا جن کے تحت یہ قرار دیا گیا کہ ''اگر اسمبلی کے صدر کے پاس یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہو کہ کوئی رکن پاکستان میں مستقل طور پر رہائش پذیر نہیں ہے یا یہ کہ اس کی وفاداری صرف پاکستان کے ساتھ وابستہ نہیں ہے تو وہ ایسے رکن سے یہ استفسار کرسکتا ہے کہ اسمبلی میں اس کی نشست کو خالی کیوں نہ قرار دے دیا جائے، اگر ایسا رکن صدر اسمبلی کو مقررہ میعاد کے اندر اپنی شہریت اور وفاداری کے متعلق مطمئن نہیں کر سکے گا تو صدر یہ اعلان کرنے کا مجاز ہو گا کہ اس رکن کی دستور ساز اسمبلی کی رکنیت ختم ہو گئی ہے اور اب اس کی نشست خالی ہے۔''[34]

پروگرام کے مطابق حسین شہید سہروردی 3رجون 1948ء کو ڈھاکہ پہنچا تو اسے فوراً ہی مشرقی بنگال سیفٹی آرڈر مجریہ 1948ء کے تحت نظر بند کر دیا گیا۔ اس نظر بندی کے پس منظر میں وہ ایجی ٹیشن تھی جو فروری 1948ء میں ڈھاکہ میں اُردو کو بطور واحد قومی زبان بنانے کے خلاف کی گئی تھی۔ چودھری محمد علی کے مؤقف کے مطابق ''یہ ایجی ٹیشن مشرقی پاکستان میں سیاسی لیڈروں کے ایک مختصر گروہ نے شروع کی تھی جن کا اصلی مقصد ناظم الدین وزارت کو پریشان کرنا تھا لیکن بہت جلد طلباء نے اسے اپنا لیا اور کلکتہ کے مضبوط ہندو پریس نے اس نزاع کی آگ کو خوب بھڑکایا۔''[35] لیکن حکومت مشرقی بنگال نے اس حکم کی وجوہ کے بارے میں جو اعلان کیا تھا اس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ سہروردی نے ملک کے دشمنوں کے ساتھ خفیہ رابطہ قائم کیا ہوا ہے اور وہ مشرقی بنگال کو مغربی بنگال کے ساتھ متحد کرنے کے لئے عوام اور سرکاری ملازمین میں بے چینی

پھیلا رہا ہے۔ سہروردی نے یہ حکم ملنے پر کلکتہ واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا تو اسے بذریعہ ریل گاڑی مشرقی بنگال سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ کلکتہ سے وہ جولائی کے اوائل میں پھر کراچی پہنچا اور اس نے 9؍جولائی کو وزیراعظم پاکستان سے ملاقات کی اور پھر اسی دن اس نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے کہا'' یہ کہا جاتا ہے کہ انڈین یونین کے کسی مسلمان کو پاکستان کے اندرونی معاملات میں دخل دینے کا حق حاصل نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کاش ایسا ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے اس موقع پر اپنے یہاں کے بھائیوں کو بتانا چاہیے کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان معاہدہ کے تحت جب تک آئین مرتب نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی بھی شخص دونوں میں سے کسی بھی ڈومینین کا شہری نہیں۔ اس وقت تک ہر شخص خواہ وہ پاکستان میں رہتا ہو یا ہندوستان میں، برطانوی شہری تصور ہو گا۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ کوئی شخص بیک وقت دونوں ڈومینینوں کا شہری نہیں ہوسکتا تو کیا پاکستان میں انڈین یونین کے مسلمان کی یہ آواز نہیں سُنی جائے گی کہ یہاں اقلیتوں سے فیاضانہ اور منصفانہ سلوک کیا جائے تاکہ انڈین یونین کے مسلمانوں سے بھی ایسا ہی سلوک ہو۔ جب سہروردی سے دریافت کیا گیا کہ آیا وہ پاکستان مسلم لیگ کا رکن ہے تو اس نے نفی میں جواب دیا۔ البتہ جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ وہ پاکستان دستور ساز اسمبلی کا رکن ہے تو اس کا جواب اثبات میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ پاکستان کی شہریت کا اعلان کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور اس سلسلے میں جو خبریں شائع ہوئی ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں۔''[36] سہروردی کی اس پریس کانفرنس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس وقت تک اپنے پاکستان کا شہری ہونے اور اس ملک سے اپنی وفاداری کا اعلان کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ قانونی موشگافی کر کے نہ صرف پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو بلکہ پاکستان کو بھی آزاد و خود مختار تسلیم نہیں کرتا تھا اور اس کے باوجود پاکستان دستور ساز اسمبلی کا رکن بھی رہنے کا متمنی تھا۔ بظاہر اس نے وزیراعظم لیاقت علی خان کے ساتھ ملاقات میں یہی مضحکہ خیز مؤقف پیش کیا تھا اور لیاقت علی نے صحیح طور پر اسے مسترد کر دیا تھا۔ دراصل سہروردی بھی لکھنؤ اور الٰہ آباد وغیرہ کے بعض طالع آزماؤں کی طرح دونوں جہانوں کی نعمتوں سے سرفراز ہونا چاہتا تھا۔ وہ اس پریس کانفرنس کے بعد پھر کلکتہ چلا گیا اور وہاں اس نے 15؍اکتوبر کو ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''مشرقی بنگال کی حکومت کو ہندوؤں میں اعتماد پیدا کرنا چاہیے تاکہ وہ مغربی بنگال کی جانب ہجرت نہ کریں۔'' اس نے مزید کہا کہ

''مشرقی بنگال کی اقلیتوں میں مطلوبہ اعتماد اس طرح پیدا کیا جا سکتا ہے کہ اقلیتی فرقوں کے کچھ ارکان کو نہ صرف صوبائی کابینہ میں شامل کیا جائے بلکہ انہیں اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز کیا جائے۔''[37]

لیکن جب حکومت پاکستان نے 3/ مارچ 1949ء کو سرکاری گزٹ میں پاکستان دستور ساز اسمبلی میں حسین شہید سہروردی کی نشست کو خالی قرار دے دیا اور 11/ مارچ کو مشرقی بنگال اسمبلی کو ہدایت کی کہ وہ اس خالی نشست کے لئے اپنا نیا نمائندہ منتخب کرے تو سہروردی کراچی پہنچ گیا۔ 6/اپریل کو ڈھاکہ میں اس کی جانب سے دستوریہ کی اس خالی نشست کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے گئے جو اس کی اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے خالی قرار دے دی گئی تھی۔ 9/اپریل کو اس نے اپنی اس کاروائی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ''میں مسلم لیگ کے خلاف نہیں ہوں نہ ہی میں مسلم لیگ کی موجودہ قیادت کے خلاف ہوں۔ میں تو صرف مسلم لیگ کے موجودہ تنظیمی ڈھانچے کے خلاف ہوں۔ میری رائے میں لیگ کے دروازے پاکستان کے سب لوگوں کے لئے کھول دینے چاہئیں کیونکہ لیگ کے باہر بے شمار قابل اور اچھے لوگ موجود ہیں۔'' اس نے مزید کہا کہ ''اب جبکہ بھارت میں حالات خاصے بدل چکے ہیں تو اسے بھارت میں مزید ٹھہرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی۔ اب دونوں جانب کے نوجوان یہ سمجھ گئے ہیں کہ یہ دونوں ریاستیں قائم رہنے کے لئے بنی ہیں۔''[38] سہروردی کے اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ خود اسے 1949ء کے اوائل تک پاکستان کے مستقبل کے بارے میں شبہ تھا۔ اسی لئے وہ بیک وقت دو کشتیوں میں سوار رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ پاکستان کی کشتی بے شمار ابتدائی طوفانوں سے گزر کر اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو گئی تھی تو اس نے بالآخر پاکستان کو اپنی سیاسی شکار گاہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی تھی کہ حکومت ہندوستان نے کلکتہ میں اس کی ساری جائیداد اس الزام کے تحت ضبط کر لی تھی کہ اس نے کئی سال کا انکم ٹیکس ادا نہیں کیا تھا۔ سر محمد یامین خان اس بیان کی تائید کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ''حسین شہید سہروردی کو گورنمنٹ ہند نے انکم ٹیکس کے معاملے میں بہت دق کیا ہے۔ اس وجہ سے پاکستان آ گئے ورنہ وہ تو ہندوستان میں ایک مسلم پارٹی بنا رہے تھے اور دہلی میں سر محمد سعد اللہ سابق وزیر اعظم آسام کو لے کر میرے پاس آئے تھے۔''[39] پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے 12/اپریل کو سہروردی کے اس بیان پر سخت نکتہ چینی کی اور الزام عائد کیا کہ وہ مسلم لیگ میں انتشار پیدا کرنے کی کوشش کر رہا

ہے۔خلیق الزماں نے کہا ''سہروردی نے 15/دسمبر 1947ء کو مسلم لیگ کے تنظیمی ڈھانچے کی مخالفت کی تھی لیکن فیصلہ اس کی رائے کے خلاف ہوا تھا پھر اس نے مارچ 1948ء میں دستور ساز اسمبلی میں بھی مسلم لیگ کے بارے میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور اب اس نے مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے فیصلے کے خلاف انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔'' یہ ضمنی انتخاب 14/اپریل 1949ء کو ہوا جس میں مسلم لیگ کے اُمیدوار شہودالحق کو 73 ووٹ ملے اور سہروردی نے 24 ووٹ حاصل کئے۔

دستور ساز اسمبلی کے ضمنی انتخاب میں شکست کھانے کے بعد سہروردی نے پہلے تو یہ کوشش کی کہ وہ سندھ اور پنجاب میں مہاجرین کی شکایات کی بنیاد پر یہاں اپنے سیاسی مستقبل کی تعمیر کرے۔اس نے 2/مئی کو حیدرآباد میں آل سندھ کراچی مہاجر کنونشن سے خطاب کیا اور پھر اس نے 27/جون کو لاہور میں ایک مہاجر کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ان اعلیٰ افسروں کی مذمت کی جو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے مقامیوں اور مہاجروں میں لڑائی کروا رہے تھے۔اس نے حکومت پاکستان کی طرف سے نافذ کردہ پبلک سیفٹی ایکٹ کی بھی مخالفت کی اور صوبہ سرحد میں خان عبدالقیوم خان کی آمریت کی مذمت کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس صوبہ میں گورنر راج نافذ کرکے نئے انتخابات کرائے جائیں۔پھر 18/جون کو اس نے کراچی میں ایک پریس کانفرنس کی جس میں صوبہ سرحد کی متوازی مسلم لیگ کا ایک لیڈر غلام محمد لونڈ خور بھی موجود تھا۔سہروردی نے قیوم حکومت پر اقربا نوازی اور بدانتظامی کا الزام عائد کیا اور اس مطالبہ کا اعادہ کیا کہ وہاں گورنر راج نافذ کرکے نئے انتخابات کرائے جائیں۔غلام محمد لونڈ خور سرحد کی جس متوازی لیگ کا رکن تھا وہ پیر مانکی نے جون 1949ء میں بنائی تھی کیونکہ اسے فروری 1949ء میں پاکستان مسلم لیگ کے عہدیداروں کے انتخاب سے یہ پتہ چل گیا تھا کہ چونکہ قیوم خان کا لیاقت علی خان کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے اس لئے صوبہ سرحد میں قیوم خان کی سکھاشاہی کے خلاف اس کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہوگی۔ تاہم جب سہروردی کو دو تین ماہ کی کوشش کے باوجود مغربی پاکستان میں اپنی سیاسی دال گلتی نظر نہ آئی تو اس نے جولائی میں نواب ممدوٹ کے مقدمے میں وکیل صفائی کے فرائض سنبھال لئے۔یہ ایک اچھا پلیٹ فارم تھا چنانچہ اس نے تین چار ماہ تک پورے انہماک کے ساتھ اس مقدمہ کی پیروی کی اور اس طرح اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف ایک اعلیٰ پایہ کا وکیل ہے بلکہ وہ

وزیراعظم لیاقت علی خان کا عظیم ترین سیاسی حریف بھی ہے۔ جب پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے اینٹی لیاقت شاونسٹوں نے اس کی بہت آؤ بھگت کی تو اس نے جنوری 1950ء میں لاہور میں مستقل طور پر رہائش اختیار کرلی۔

قبل ازیں اس نے نومبر 1949ء میں چودھری خلیق الزماں کے نام ایک خط میں مطالبہ کیا تھا کہ ''1950ء کے لئے مسلم لیگ کے نئے ممبروں کی بھرتی کا کام ان لوگوں کے سپرد کیا جائے جنہوں نے موجودہ مسلم لیگ کی تنظیم میں حصہ نہیں لیا ہے اور اب بھی اس جماعت کے رکن بننے کے خواہاں ہیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو یہ لوگ کوئی نئی عوامی تنظیم بنالیں گے۔'' لیکن چودھری خلیق الزماں نے یہ خط لیگ کی مجلس عاملہ میں بھی پیش نہ کیا کیونکہ سہروردی نے پہلے تو مارچ 1948ء میں مسلم لیگ کے خلاف تقریر کی تھی پھر مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے فیصلے کے خلاف دستور ساز اسمبلی کا انتخاب لڑا تھا اور بعد ازاں مسلم لیگی حکومتوں پر کھلے عام نکتہ چینی کی تھی۔''[40]

چنانچہ 21رجنوری 1950ء کو راولپنڈی میں پرانے سیاسی کارکنوں کا ایک کنونشن ہوا تو اس میں سہروردی نے بھی شرکت کی۔ اس دو روزہ کنونشن کے بعد سہروردی نے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے الزام عائد کیا کہ لیاقت علی خان کی حکومت ''آمرانہ اور فاشسٹ'' رجحانات کی حامل ہے۔ اس نے کہا کہ یہ حکومت سیفٹی قوانین کا استعمال کرکے اور دشمن کے ایجنٹوں کی موجودگی کا ہوا کھڑا کرکے اپنے خلاف ہر قسم کی نکتہ چینی کا سدباب کرنا چاہتی ہے۔ مسلم لیگ، حکومت کی ایک پٹھو تنظیم ہے اور ارباب اقتدار اکثر و بیشتر اسے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ 5رفروری کو سہروردی نے منٹگمری میں اپنی ایک تقریر میں کہا کہ ''پاکستان دستور ساز اسمبلی کے 44 مسلمان ارکان میں سے نصف سرکاری عہدیدار ہیں اور جو سرکاری عہدیدار نہیں ان سے دلکش سفارتی عہدوں کے وعدے کئے گئے ہیں۔ اب پنجاب سے نئے ارکان کی نامزدگی بھی استبدادی حکمرانوں کی جانب سے ہوگی۔ لہٰذا وزیراعظم لیاقت علی خان کو ہمیشہ بھاری اکثریت کی تائید و حمایت حاصل رہے گی۔ وہاں عوام کے جذبات کی ترجمانی کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ لہٰذا میں مطالبہ کرتا ہوں کہ دستور ساز اسمبلی کے نئے عام انتخابات کرائے جائیں تاکہ عوام کے صحیح نمائندے وہاں بیٹھ کر عوامی بہتری کا کوئی کام کرسکیں۔''[41] روزنامہ امروز کی ایک رپورٹ کے مطابق سہروردی نے اس جلسۂ عام میں مزید کہا کہ ''وزیراعظم پاکستان سے صرف اتنی گذارش

کروں گا کہ وہ عوام کے مطالبات پر ہمدردانہ غور کریں اور جو لوگ حکومت کی پالیسی سے متفق نہیں انہیں تخریب پسند کہنا چھوڑ دیں۔ ہم حکومت کی تبدیلی نہیں چاہتے۔ اگر چہ ہم حکومت کو پسند نہیں کرتے اس کے باوجود ان حالات میں، جبکہ لیگ اور دستور ساز اسمبلی غیر نمائندہ ہے اور وزیر اعظم کی کٹھ پتلی ہیں، اسے تبدیل کرنا نہیں چاہتے۔ ہم اپنے مطالبات پیش کرتے ہیں یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو ہمیں دشمن کا ایجنٹ کہا جاتا ہے...... میں وزیر اعظم سے سوال کرتا ہوں کہ کیا وہ لوگ جو ان سے اختلاف کرتے ہیں ملک کے دشمن ہیں؟ وہ ظلم وستم اور دھمکیوں سے لوگوں کے دل نہیں جیت سکتے۔''[42]

جب سہروردی نے منٹگمری میں یہ تقریر کی تھی تو پنجاب میں عام انتخابات کے لئے جاگیرداریت اور برادری کی بنیادوں پر دھڑے بندیاں شروع ہو چکی تھیں۔ یہ دھڑے بندیاں کسی سیاسی، معاشرتی اور معاشی پروگرام کے تحت نہیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ اندرون خانہ جوڑ توڑ اور محلاتی سودا بازی کا نتیجہ تھیں چنانچہ سہروردی نے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد یعنی 22/ مارچ کو اپنی جس عوامی مسلم لیگ کا اعلان کیا اس میں ابتداً پنجاب کا کوئی بڑا جاگیردار شامل نہیں ہوا تھا البتہ صوبہ کے چھوٹے درمیانہ طبقہ کے ایک حصے نے اس کی تائید وحمایت کی تھی۔ اس جماعت کے مختصر اور مبہم سے منشور میں سہروردی کی سیاسی موقع پرستی نمایاں تھی۔ وہ دسمبر 1947ء سے مسلسل یہ موقف پیش کرتا رہا تھا کہ پاکستان میں لیگ کے تنظیمی ڈھانچے کی بنیادیں فرقہ وارانہ بنیاد پر تعمیر نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ اس طرح ملک میں آمریت اور فسطائیت کے دروازے کھل جائیں گے۔ اس نے مارچ 1948ء میں دستور ساز اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اس میں پاکستان کے ارباب اقتدار کو متنبہ کیا تھا کہ وہ اب ''اسلام خطرے میں ہے'' یا ''پاکستان خطرے میں ہے'' کے نعرے لگا کر ملک میں آمرانہ فسطائی نظام رائج کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غیر مسلم اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرنے کے لئے انہیں ہر سطح پر مساوی حقوق دیں۔ پھر اس نے جب مارچ 1949ء میں پاکستان میں مستقل طور پر رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا تو یہی موقف پیش کیا تھا کہ وہ پاکستان مسلم لیگ میں شامل ہونے کو تیار تھا بشرطیکہ اس کی تنظیم نو فرقہ واریت کی خطوط پر نہ ہو۔ مگر 22/ مارچ 1950ء کو وہ یکا یک اپنے اس موقف سے منحرف ہو گیا جبکہ اس نے پنجاب اور سرحد کے بعض عناصر کے اصرار پر اپنی عوامی مسلم لیگ کے دروازے غیر مسلموں پہ بند رکھنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ اس کی یہ حیران

کن قلابازی مشرقی بنگال میں اس کے حامیوں کے لئے قابل قبول نہیں تھی لیکن اس نے وقتی طور پر انہیں خاموش کرادیا کیونکہ ان دنوں اس کا واحد مقصد لیاقت علی خان کا تختہ الٹنا تھا اور اس مقصد کی تکمیل پنجاب کے درمیانہ طبقہ کی تائید وحمایت کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی۔ پنجاب پاکستان کا اسی طرح ''بازوئے شمشیرزن'' تھا جس طرح کہ وہ برطانوی سامراج کا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس صوبہ کے لوگ نسلی اعتبار سے ملک کے دوسرے صوبوں کے لوگوں سے برتر تھے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج نے روسی سامراج کے خلاف اپنی فارورڈ پالیسی کے تحت اس علاقے کو فوجی بھرتی کا مرکز بنایا تھا اور اس نے یہاں نظام حکومت بھی اس طرح کا نافذ کیا تھا جو برصغیر کے دوسرے علاقوں سے مختلف تھا۔ مارچ 1950ء میں پنجاب کے شہروں کی سیاسی فضا سہروردی کے حق میں تھی۔ تاہم وزیراعظم لیاقت علی خان نے لاہور کے سارے اخبارات اور بااثر سیاسی عناصر کے پرزور احتجاج کو نظرانداز کرکے 31/مارچ کو پنجاب سے اپنے پسندیدہ ارکان کو دستور ساز اسمبلی کا ممبر بنالیا۔ کانگرس پارٹی کے لیڈر سریش چندر چٹوپاڈھیا نے ایک پوائنٹ آف آرڈر کے ذریعے یہ اعتراض کیا کہ وزیراعظم کی قرارداد بے ضابطہ ہے لیکن صدر نے اپنی رولنگ میں وزیراعظم کی قرارداد کو باضابطہ قرار دے دیا جس کے بعد افتخار الدین اور شوکت حیات خان نے مرکزی لیگ پارٹی بورڈ کے رویے پر کڑی نکتہ چینی کی۔ دوسری طرف دولتانہ نے پارلیمانی بورڈ کی نامزدگیوں کی حمایت کرکے ایک اور ثبوت مہیا کردیا کہ اس نے پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے مفادات کے خلاف لیاقت علی خان سے گٹھ جوڑ کر رکھا ہے۔ اس سلسلے میں مزید ثبوت یہ تھا کہ مرکزی حکومت اور مرکزی لیگ نے صوبہ لیگ کے صدر میاں عبدالباری کے خلاف پروپیگنڈا کی ایسی مہم شروع کردی تھی جس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ ممتاز دولتانہ صوبہ میں عام انتخابات سے پہلے صوبہ لیگ کی تنظیم پر مکمل قبضہ کرنے کا خواہاں ہے۔ اس مہم پر نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''اگر پنجاب کی مسلم لیگ کا بھی وہی حال کردیا گیا جو بنگال یا بلوچستان میں مسلم لیگ کا ہوچکا ہے تو چودھری خلیق الزماں سارے پاکستان کی مسلم لیگ کو اپنی جیب میں ڈال کر حکومت سے کچھ اور قیمت وصول کرلیں گے۔ مسٹر حسین شہید سہروردی کی نئی جماعت عوامی مسلم لیگ کو اگر عام حالات میں عوام تک پہنچنے کے لئے چھ سال درکار رہیں تو اس سانحہ کے بعد وہ چھ ماہ کے اندر اندر عوام تک پہنچ جائے گی۔''[43]

مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ نے پاکستان دستور ساز اسمبلی میں پنجابی ارکان کی نامزدگی کے سلسلے میں صوبہ لیگ کی سفارشات کو مسترد کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس پر صوبہ کے ہفتہ وار اخبار ''ترجمانِ مسلم لیگ'' کا 31 / مارچ کا مقالۂ افتتاحیہ یہ تھا کہ ''پنجاب پاکستان کا دل ہے اور اس دل میں ارادی یا غیر ارادی طور پر جو بھی ضرب کاری لگائی جائے گی اس کی زد پاکستان کے سارے وجود پر پڑے گی...... ہم صوبائیت کے خلاف ہیں...... مگر ہمیں افسوس ہے کہ گزشتہ دو سالوں سے مرکزی مسلم لیگ میں بعض افراد کے طرز عمل سے پنجاب میں یہ خیال پیدا ہو چلا ہے کہ پنجاب مسلم لیگ کو دانستہ طور پر کمزور اور مفلوج بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے...... گو تلخ سہی لیکن بہرحال یہ بھی حقیقت ہے کہ پنجاب کے عوام کے دلوں میں مرکزی مسلم لیگ کے متعلق وہ جذبات اور احترام مفقود ہے جو صحیح طور پر ایک قومی جماعت کے متعلق ہونا چاہیے...... جینکنز، گلانسی اور خضر کی ریشہ دوانیاں اور جبر و تشدد پنجاب مسلم لیگ کو کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچا سکے جتنا اس ایک استرداد نے جماعتی طور پر مسلم لیگ کو پہنچایا ہے...... مسلم لیگ کے پرچم تلے پنجاب نے اپنے آٹھ لاکھ بیٹوں کی قربانی دی۔ ہماری روح کے دو ٹکڑے ہو گئے لیکن ہم نے اس پرچم کی تابانی کو قائم رکھنے کے لئے مشرقی پنجاب کے چپہ چپہ سے اپنے خون کی قندیلیں روشن کی ہیں۔ ہمارے ستر لاکھ خانماں برباد مہاجرین کی قربانی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم اس صوبہ میں مسلم لیگ کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیں...... وقت کی پکار یہ ہے کہ اس وقت ہم سر جوڑ کر بیٹھیں اور آئندہ کے لئے ایک واضح لائحہ عمل تجویز کریں بصورت دیگر پنجاب کا مستقبل ہمارے سامنے ہے اور یہ ایسا گھناؤنا تصور ہے جس سے پاکستان کا ہر بہی خواہ کانپ اُٹھتا ہے۔''[44] یہ مقالہ اس حقیقت کا مظہر تھا کہ صوبہ لیگ کا درمیانہ طبقہ پنجاب کی دہائی دے کر مرکزی حکومت اور مرکزی لیگ سے باغی ہو رہا تھا اور یہ فضا سہروردی کی سیاست کے لئے بہت سازگار تھی۔

اپریل 1950ء میں حسین شہید سہروردی کے لئے پنجاب کے شہروں کی سیاسی فضا اور بھی سازگار ہو گئی جبکہ کھلم کھلا یہ الزام عائد ہونے لگا کہ وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان پنجاب کی قیمتی متروکہ جائیدادوں کو اپنے رشتہ داروں کے نام ناجائز طور پر الاٹ کروا رہا ہے۔ اس سلسلے میں نوائے وقت کی خبر یہ تھی کہ ''بحالیات بورڈ کا جو اجلاس 28-29 / مارچ کو مسٹر خلیلی ڈائریکٹر جنرل سپلائی اینڈ ڈویلپمنٹ کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا اس میں سینماؤں اور برف خانوں کی

الاٹ منٹ کے لئے ایک ایسی پالیسی وضع کی گئی جس کے ذریعے کرنال اور بھارت کے بعض علاقوں کے بڑے بڑے نوابزادوں کوسینماؤں اور برف خانوں میں حصے الاٹ کئے گئے...... اس پالیسی کے تحت لاہور کے تین بڑے سینما الاٹ کئے جا چکے ہیں۔جن اشخاص کو یہ سینما الاٹ ہوئے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

ریگل سینما:

ڈبلیو۔زیڈ احمد،نوابزادہ اے۔کے ممتاز اور نوابزادہ امتیاز علی خان

رٹز سینما:

نوابزادہ رشید علی خان،نوابزادہ انور حسین اور مسٹر فضلی

پلازا سینما:

مسٹر علی اکبر

رٹز سینما میں پچھلے سال مسٹر فضلی کے ہمراہ کرنال کے نوابزادہ راشد علی خان بھی حصہ دار تھے۔انہیں اس سال راولپنڈی میں سردار کار بالک گیس کمپنی الاٹ کی گئی ہے۔ یاد رہے کہ نوابزادہ اے۔کے ممتاز،نوابزادہ امتیاز علی خان،نوابزادہ انور حسین اور نوابزادہ ارشد علی خان، کرنال کے مشہور نواب خاندان سے ہیں...... پنجاب میں مختلف سینماؤں کے لئے جن تین سو اشخاص نے درخواستیں دے رکھی ہیں ان کو انٹرویو کے لئے بھی نہیں بلایا جا رہا ہے۔لاہور کے جن تین سینماؤں کو الاٹ کیا گیا ہے ان کے لئے درخواست دینے والوں کو قطعاً انٹرویو کے لئے نہیں بلایا گیا بلکہ بورڈ نے خود ہی ان کے نام الاٹ کر دیئے...... برف خانوں اور جننگ فیکٹریوں کی الاٹ منٹ میں بھی کرنال اور بھارت کے مختلف علاقوں کے بڑے بڑے نوابزادوں کو جو اپنے اپنے علاقوں میں بہت بڑے زمیندار تھے معتد بہ حصہ دیا گیا ہے۔''[45] دو تین دن بعد نوائے وقت نے ایک اداریے میں بتایا کہ ''راولپنڈی کی سردار کا بالک گیس فیکٹری کی الاٹ منٹ کا قصہ صنعتی حلقوں میں چہ میگوئیوں کا موضوع بنا ہوا ہے۔اس نہایت اہم فیکٹری کی الاٹمنٹ کے لئے ایسے اشخاص کی درخواستیں موجود تھیں جو مہاجر تھے اور یہ کام کرنے کی اہلیت رکھتے تھے مگر ان کی حق تلفی کر کے یہ کارخانہ ایسے لوگوں کو الاٹ کیا گیا جو اس کام کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ہاں یہ ضرور ہے کہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔''[46]

چونکہ ان دنوں پنجاب میں متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ کا بہت چرچا تھا اور جب کوئی جائیداد کسی شخص کے نام الاٹ ہوتی تھی تو وہ سینکڑوں درخواست دہندگان ناراض ہو جاتے تھے جنہوں نے اس جائیداد کے حصول سے اپنی اُمیدیں وابستہ کی ہوئی ہوتی تھیں اس لئے نوائے وقت کی اس خبر اور اداریے کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وزیر اعظم لیاقت علی خان کا نام متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ میں اعلانیہ طور پر ملوث ہو گیا۔ پنجابی شاونسٹوں کا لیاقت علی خان اور اس کے ''تلییئروں'' کے خلاف یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ایک اور اداریہ شائع ہوا کہ ''صنعتی الاٹ منٹوں بالخصوص سینما اور برف کے کارخانوں کی الاٹ منٹوں کے سلسلہ میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ یہ الاٹ منٹیں ایسے اصحاب کو دی گئی ہیں جن کا صنعت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ وہ بڑے بڑے زمیندار ہیں اور انہوں نے کبھی وہ کاروبار نہیں کیا جو اب انہیں تفویض کیا جا رہا ہے۔ یہ الزام بھی عائد کیا گیا ہے کہ ان اصحاب کو ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو ہزار روپیہ ماہوار گزارہ الاؤنس بھی مل رہا ہے...... یہ الزام بہت سنگین ہے اور حکومت کو اس کی تردید کرنی چاہیے۔ کسی وزیر کا رشتہ دار ہونا تو اس امر کے لئے کافی نہیں کہ وظیفہ بھی ملتا رہے اور بلا استحقاق سینما اور برف خانے بھی الاٹ کر دیئے جائیں''[47] اور پھر یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ ''پنجاب کے برف خانے اور سینما نوابزادوں کو الاٹ کر دیئے گئے ہیں۔ برف خانے جن نوابزادوں کو الاٹ کئے گئے ان کی فہرست یہ ہے:

نوابزادہ احسان علی خان	مالیرکوٹلہ	لاہور چھاؤنی
نوابزادہ صداقت علی خان	کرنال	لاہور
نوابزادہ فیاض علی خان	ضلع کنج پورہ	لاہور
نوابزادہ ولایت علی خان	کرنال	شیخوپورہ
نوابزادہ محمد اظہار بیگ	کرنال	ملتان

سینماؤں میں حصّص

نوابزادہ اے۔ کے ممتاز	کرنال	ریگل لاہور
نوابزادہ رشید علی خان	مالیرکوٹلہ	نشاط لاہور
نوابزادہ اسرار حسین	کرنال	رٹز لاہور
نوابزادی بیگم ممتاز حسن خان	دہلی	رٹز لاہور

راولپنڈی کار بالک گیس فیکٹری: قاضی محبوب عالم صاحب جالندھر،نوابزادہ ابراہیم علی خان آف کنج پورہ کرنال،نوابزادی امتیاز بیگم اورنوابزادہ ارشدعلی خان آف کرنال۔نوابزادہ ولایت علی خان تحریرفرماتے ہیں کہ میں نے حکومت کومطلع کر دیا ہے کہ میں شیخوپورہ آئس فیکٹری کے حصہ سے فائدہ نہیں اُٹھانا چاہتا۔ جب مسٹرعطامحمد خان لغاری کمشنرآبادکاری اورڈاکٹرقریشی ڈائریکٹرانڈسٹریز سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ ہمیں ابھی تک کسی ایسی اطلاع کا علم نہیں۔ خان بہادراحمدحسن نہ مل سکے۔مگران کے نائب احمدحسن صاحب نے کہا کہ میں نے ایسی کوئی چٹھی نوابزادہ ولایت علی خان کی طرف سے نہیں دیکھی۔ممکن ہے انہوں نے خلیلی صاحب کولکھی ہو۔مگر مجھے کوئی علم نہیں۔''[48] وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف اقربا نوازی کا یہ پروپیگنڈا بہت زہریلا تھامگراس کی ہلاکت خیزی میں اس وقت بے پناہ اضافہ ہوجاتا تھا جب یہ لکھا جاتا تھا کہ ''پنجابی تاجر جب پاکستان کی وزارت تجارت کو لائسنس کے لئے درخواست بھیجتے ہیں تو اکثر درخواستیں ردی کی ٹوکری کی زینت بن جاتی ہیں......دارالسلطنت کراچی میں پنجابی کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ارباب اقتدار اُسے پسندنہیں کرتے۔ مرکزی لیگ اسے پسندنہیں کرتی۔لیڈر اُسے پسندنہیں کرتے اورتواورکراچی کی آب وہوابھی پنجابی کوپسندنہیں کرتی۔''[49]

وزیراعظم لیاقت علی خان 11رجولائی 1950ءکوامریکہ سے واپس آیا تو پنجاب میں دھڑے بندی کی سیاست میں شدت پیدا ہوگئی۔جس کی وجہ یہ تھی کہ قبل ازیں 21رجون کوگورنر پنجاب نے پنجاب لیجسلیٹوا سمبلی کے انتخاب کے قانون کا اعلان کر دیا تھا جس کی وجہ سے صوبائی اسمبلی کے آئندہ انتخابات کے لئے پرانے حلقہ ہائے انتخاب کی بجائے نئے حلقہ ہائے نیابت قانونی طور پر جائزقرار دیئے گئے تھے اور یہ طے کیا گیا تھا کہ پنجاب کے 153 حلقوں سے 197 ارکان منتخب کئے جائیں گے اورمہاجروں کوخصوصی نمائندگی دی جائے گی۔ گورنر کے اس اعلان سے صوبہ میں انتخابی مہم زوروشور سے شروع ہوچکی تھی اوراس مہم کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ صوبہ لیگ کی تنظیم پرکس کا قبضہ ہوگا۔صدرصوبہ لیگ عبدالباری نے مئی کے اوائل میں یہ کوشش کی تھی کہ اس کی مرکزی حکومت اورمرکزی لیگ کی قیادت سے مصالحت ہوجائے تا کہ وہ صدارت کے عہدے پر بدستور فائز رہ سکے مگراسے اپنی اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ چونکہ 23رجولائی کوصوبہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا اس لئے ایک طرف تو ممتاز دولتانہ کی کوشش یہ تھی کہ اس

اجلاس میں اس کے دھڑے کی بالادستی قائم کرنے کے لئے اُسے مرکزی حکومت اور مرکزی لیگ کی تائیدوحمایت حاصل ہو دوسری طرف عبدالباری اوراس کے حامیوں کی کوشش یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح وزیراعظم لیاقت علی خان کو غیر جانبدار کرکے صوبہ لیگ پر اپنا قبضہ قائم رکھا جائے۔ 20رجولائی کو اس مقصد کے لئے گورنر کے دومشیر نسیم حسن اور محمد خان لغاری کراچی گئے۔ وہاں انہوں نے لیاقت علی خان سے ملاقات کی جس کے دوران وزیراعظم نے انہیں یقین دلایا کہ وہ پنجاب میں کسی سیاسی دھڑے کے ساتھ نہیں ہیں، وہ اس معاملے میں بالکل غیر جانبدار ہیں اور کسی گروپ کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتے۔ اسی دن عبدالباری نے اس الزام کی پُرزور تردید کی کہ ان کی قیادت میں پنجاب مسلم لیگ مرکزی حکومت پاکستان کے خلاف ہے اور وہ خود ممدوٹ گروپ کا آلۂ کار ہے۔ اس نے کہا کہ پاکستان کا کوئی بہی خواہ اس نازک مرحلہ پر مرکزی حکومت کی مخالفت نہیں کرسکتا۔ میرے خلاف ممدوٹ گروپ کے آلۂ کار ہونے کا پروپیگنڈا دولتانہ اور اُن کے حامی اس اُمید سے کررہے ہیں کہ انہیں مرکز کی امداد و ہمدردی حاصل ہوسکے۔ اس سے اگلے دن نوائے وقت نے یہ الزام عائد کیا کہ ''یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسٹر دولتانہ گزشتہ دو سال سے مسلسل یہ پروپیگنڈا کررہے ہیں کہ آنریبل لیاقت علی خان میرے سرپرست ہیں اور وہ مجھے پنجاب کا وزیراعلیٰ دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پنجاب کے بعض سرکاری افسروں کو بھی اس پروپیگنڈے سے مرعوب کر رکھا ہے اور انہیں اپنا معاون اور بعض صورتوں میں آلۂ کار بنایا ہوا ہے...... اگر ان افسروں کی سرپرستی شامل نہ ہوتی تو دولتانہ صاحب آج سے بہت پہلے سیاسی میدان سے بھاگ کر فرانس پہنچ چکے ہوتے۔''[50] نوائے وقت نے جن دولتانہ نواز افسروں کا ذکر کیا تھا ان میں انسپکٹر جنرل پولیس قربان علی خان سرفہرست تھا۔ یہ شخص بہت جابر اور فرعون مزاج پولیس افسر تھا اوراس کی عملی ہمدردیاں ہمیشہ یونینسٹ جاگیرداروں اور دولتانہ دھڑے کے ساتھ رہی تھیں۔

جب 23رجولائی کو صوبائی مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو اُس دن نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''مرکزی حکومت اس اجلاس میں دولتانہ دھڑے کی فتح کے لئے مداخلت کررہی ہے۔ اولاً مرکزی حکومت کے بعض اعلیٰ افسر تک ووٹوں کی بھیک مانگنے کے لئے پنجاب کے صحراؤں کی خاک چھان رہے ہیں...... مرکزی حکومت لیگ کو اب اپنی لونڈی سمجھتی ہے اور گو اُسے ختم کرنا نہیں چاہتی مگر اس کی کوئی عزت بھی نہیں کرتی۔ مسٹر لیاقت علی خان کے دربار میں

چودھری خلیق الزماں کی آج وہی حیثیت ہے جو اکبر کے دربار میں مُلّا دو پیازہ کی تھی۔"[51] اس اجلاس کے ایجنڈے میں دو اہم قراردادیں تھیں۔ ایک قرارداد دولتانہ دھڑے کی تھی جس میں مشیر اعلیٰ ملک محمد انور پر مختلف بدعنوانیوں کے الزامات عائد کر کے اس پر عدم اعتماد کا اظہار کیا گیا تھا۔ دوسری قرارداد ممدوٹ دھڑے کی تھی جس میں ممتاز دولتانہ پر اقربا نوازی، رشوت ستانی، بدانتظامی اور مسلم لیگ کی تنظیم کو نقصان پہنچانے کے الزامات عائد کر کے صوبائی انتخابات سے قبل اس کے خلاف تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ ایک اور قرارداد میں یہ بھی الزام تھا کہ بیگم دولتانہ کے ایک رشتہ دار کے نام لاہور، راولپنڈی اور ملتان میں چار سینماؤں کی ناجائز الاٹمنٹیں ہوئی ہیں۔ مشیر اعلیٰ ملک محمد انور کے خلاف 24 رجولائی کو قرارداد مذمت پیش ہوئی تو اس پر بحث کے دوران بہت ہنگامہ ہوا اور پھر جب صدر عبدالباری نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ قرارداد پر رائے شماری خفیہ ہوگی تو دھینگا مشتی شروع ہوگئی۔ دولتانہ دھڑے کا مطالبہ تھا کہ رائے شماری کھلے عام ہوتا کہ یہ پتہ چل سکے کہ کس نے کس کو ووٹ دیا ہے۔ جب بدنظمی حد سے بڑھ گئی اور کرسیوں کی لڑائی شروع ہوگئی تو عبدالباری نے اجلاس ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا مگر دولتانہ کے حامیوں نے اس اعلان کو قبول نہ کیا اور انہوں نے باری گروپ کے باہر چلے جانے کے بعد روزنامہ زمیندار کے مالک اختر علی خان کی زیر صدارت دولتانہ کی پیش کردہ دو قراردادیں منظور کیں۔ ایک قرارداد میں عبدالباری کے فیصلے کو منسوخ کیا گیا اور دوسری کے ذریعے مشیر اعلیٰ ملک محمد انور کے خلاف قرارداد مذمت کی توثیق کی گئی۔ اس سے اگلے دن یعنی 25 رجولائی کو عبدالباری نے صوبہ لیگ کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک بیان میں کہا کہ "میں دولتانہ اور اس کے ساتھیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دے رہا ہوں۔" اسی دن مشیر اعلیٰ ملک محمد انور بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہو گیا اور اس نے ایک بیان میں بتایا کہ "میرے خلاف قرارداد منظور کرانے کے لئے ہر ممکن طریقہ استعمال کیا گیا۔ بعض صورتوں میں ووٹروں پر سرکاری دباؤ ڈالا گیا اور جب تک انہوں نے میرے خلاف ووٹ نہ ڈالا ان کی کڑی نگرانی کی جاتی رہی۔"

قدرتی طور پر ممدوٹ دھڑے کے ارکان نے صوبائی مسلم لیگ کونسل کی اس "کاروائی" پر سخت غم وغصہ کا اظہار کیا اور کہا کہ "دولتانہ نے اپنے خلاف قراردادوں کے سلسلے میں مرکزی لیگ کی آڑ لی اور بجائے اس کے کہ وہ اپنی صفائی پیش کرتا اس نے صدر، محرک اور کونسلر کو

دھمکایا کہ قرارداد مرکزی لیگ کے خلاف ہے اور اگر یہ پاس ہوگی تو صدر کے خلاف یقیناً کاروائی ہوگی۔'' نوائے وقت نے اپنے اداریے میں وزیراعظم لیاقت علی پر منافقت کا الزام لگاتے ہوئے لکھا۔''اس دفعہ مرکز کے اعلیٰ افسر بھی جھولی پھیلا کر دولتانہ صاحب کے لئے ووٹوں کی بھیک مانگتے رہے...... اگرچہ سیاست میں منافقت عام ہوتی ہے اور سیاسی لیڈروں کے قول و فعل میں بڑا بُعد ہوتا ہے اور ضروری نہیں ہوتا کہ جو بات ان کی زبان پر ہو وہی ان کے دل میں بھی ہو...... ہم عزت مآب لیاقت علی خان سے گذارش کریں گے کہ وہ اپنی پوزیشن کی وضاحت فرمائیں۔ اگر وہ دولتانہ کی حمایت کرنا چاہتے ہیں تو یہ کوئی جرم نہیں، کھل کر حمایت کریں''[52] اور دو تین دن بعد اس اخبار نے اس مسئلہ پر پھر تبصرہ کرتے ہوئے پنجاب کی ''تذلیل'' پر واویلا کیا۔ ''راہنما یا رہزن'' کے زیرِ عنوان تبصرہ یہ تھا کہ ''آج کراچی میں ایک معمولی کلرک سے لے کر پنجابی وزیر تک شرم سے اپنا سر نہیں اُٹھا سکتے۔ ایک حقیر چھابڑی والے سے لے کر بندر روڈ پر عظیم الشان کاروبار کا مالک پنجاب کا تاجر دارالسلطنت میں آزردہ ہیں اور ان کی ساری آزردگی کا ذمہ دار کون ہے؟ یہی راہنما جنہوں نے اس پر کمر باندھ رکھی ہے کہ پاکستان کا تخیل دینے والے اقبال کے وطن اور پاکستان کے لئے ہتھیلی پر جان رکھ کر لڑنے والے مجاہدین کی سرزمین کے ہر شخص کو ذلیل و رسوا کرنا ہے...... اب ہمارے حال پر رحم کرو۔ پنجاب کو آپ نے مفلوج کر کے رکھ دیا اور پاکستان کے اس بہترین صوبہ کو مفلوج بنا کر آپ نے خود پاکستان کی ترقی روک دی ہے۔''[53] اس تبصرے میں مرکز کے جس پنجابی وزیر کا ذکر تھا وہ مظفر گڑھ کا جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی تھا اور جس عظیم الشان کاروباری شخص کا حوالہ تھا وہ چنیوٹ کا سرمایہ دار شیخ محمد امین تھا۔ یہ دونوں جاگیردار اور سرمایہ دار مدیر نوائے وقت کے عظیم ترین محسن اور سرپرست تھے اور یہی دونوں پنجاب کے ''مفادات وحقوق'' کے بھی عظیم ترین علمبردار تھے۔ اس اداریے میں سب سے زیادہ قابل توجہ فقرہ وہ تھا جس میں پنجاب کو ہتھیلی پر جان رکھ کر لڑنے والے مجاہدین کی سرزمین قرار دیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ اس سرزمین کے ہر شخص کو ذلیل وخوار کیا جارہا تھا۔ بالفاظ دیگر اس فقرے میں پنجابی فوج کو اشتعال دلا کر اسے یہ ترغیب دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ وہ لیاقت علی خان کا تختہ اُلٹ دے۔ لیاقت علی خان کو ڈنکے کی چوٹ پر ایسی دھمکیاں پہلے ایک سے زیادہ مرتبہ دی جا چکی تھیں۔ نوائے وقت کو اس بات میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ دارالسلطنت کا ہر بلوچی، ہر سندھی، ہر

پٹھان اور ہر بنگالی بھی آزردہ ہے اور یہ کہ ان صوبوں کی آبادی بھی ہتھیلی پر جان رکھ کر لڑنے والے مجاہدین پر مشتمل تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ بلوچی، سندھی، پٹھان اور بنگالی مجاہدین کو ایک سامراجی و فسطائی پالیسی کے تحت پاکستانی فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا اور مملکت کے اس اہم ترین شعبہ پر پنجابیوں کی اجارہ داری تھی۔ پنجابی عصبیت ابتدا ہی سے اس کھونٹے پر ناچتی تھی۔ بنگالیوں کو پاکستان کی تجارت، صنعت اور سول وفوجی سروسز میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا لیکن ان کی آزردگی اور افسردگی پر پنجاب میں اسلامی مساوات واخوت کا کوئی علمبردار احتجاج نہیں کرتا تھا حالانکہ حصول پاکستان کی جدوجہد میں بنگالیوں کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔

5 راگست کو صوبائی گورنر سردار عبدالرب نشتر نے بتایا کہ پنجاب میں اسی سال کے آخر تک نئی اسمبلی قائم ہو جائے گی۔ انتخابات کے سلسلے میں تمام انتظامات قریب قریب مکمل ہو گئے ہیں۔ اُمیدواروں کی نامزدگیاں وسط اکتوبر تک طلب کر لی جائیں گی اور پھر یکم دسمبر تک انتخابات شروع ہو سکیں گے۔ 13 راگست کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ اُدھر 21 راگست کو پنجاب مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے عبدالباری کا استعفیٰ منظور کر لیا جبکہ نواب ممدوٹ اور اس کے ساتھی اس اجلاس سے احتجاجاً واک آؤٹ کر گئے۔ مجلس عاملہ نے عبدالباری کی جگہ دولتانہ دھڑے کے ایک سرکردہ رکن صوفی عبدالحمید کو صوبہ لیگ کا صدر منتخب کر لیا۔ اس انتخاب پر نوائے وقت کا طنزیہ تبصرہ یہ تھا کہ ”صوفی صاحب قبلہ کرنال کے شاہی ضلع سے تعلق رکھتے ہیں۔ بعض الاٹ منٹوں میں صاحبزادہ ولایت علی خان کے حصہ دار ہیں۔ بعض حاسدان پر اعتراض کرتے ہیں کہ پڑھے لکھے واجبی سے ہیں اور سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری۔ مگر یہ اعتراض فضول ہے۔ اصلی صدر میاں ممتاز دولتانہ تو ماشاءاللہ ذہین وفطین ہیں۔ اگر نقلی صدر بھی سیاسی شعور سے بہرہ ور ہوتا تو دونوں میں نبھتی کیسے؟ ایک نیام میں دو تلواریں سما سکتی ہیں مگر ایک جماعت میں دو ذہین صدر گزارا نہیں کر سکتے۔“[54]

چنانچہ صوفی صاحب کے انتخاب کے دو دن بعد عبدالباری کے نامزد کردہ تین اور مشیر نسیم حسن، احمد شاہ اور محمد خان لغاری مستعفی ہو گئے کیونکہ وہ صوبہ لیگ کے نئے صدر کے رحم وکرم پر رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس طرح پنجاب کی سیاسی سٹیج پر اس ڈرامہ کا پہلا ایکٹ ختم ہو گیا جس کی ابتدا قیام پاکستان کے دو تین ماہ بعد قائداعظم جناح کی زندگی میں ہی ممدوٹ۔ دولتانہ کشمکش

اقتدار کی صورت میں ہو گئی تھی۔ اس ڈرامہ میں ایک طرف سے تو وزیراعظم لیاقت علی خان، بیشتر مرکزی وصوبائی اعلیٰ حکام اور بڑے جاگیرداروں کی اکثریت نے دولتانہ کا ساتھ دیا اور دوسری طرف مرکزی وزیرامور کشمیر نواب مشتاق احمد گرمانی، وزیرخزانہ غلام محمد، پنجابی شہروں کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں، لاہور، لائل پور اور چنیوٹ کے سرمایہ داروں اور بیوروکریسی کے درمیانہ درجہ کے بیشتر ارکان کے علاوہ گجرات، مظفر گڑھ، ملتان، جھنگ اور ڈیرہ غازی خان کے نوابزادوں، سیدزادوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی اکثریت نے ممدوٹ دھڑے کی پشت پناہی کی۔ ڈرامہ کے پہلے ایکٹ میں ممتاز دولتانہ کی فتح کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ انسپکٹر جنرل پولیس خان قربان علی خان کی زیر قیادت صوبائی پولیس نے کھلم کھلا ہر ممکن طریقے سے دولتانہ کی امداد کی تھی۔ اس پولیس افسر نے جنوری 1949ء میں صوبائی اسمبلی کے متعدد ارکان کو وزیراعلیٰ ممدوٹ کی حمایت سے منحرف کیا تھا اور پھر اس نے ہی جولائی 1950ء میں مسلم لیگ کونسل کے بہت سے ارکان کو صدر عبدالباری کی مخالفت پر آمادہ کیا تھا۔ کونسل کے اس اجلاس میں دولتانہ دھڑے کی جانب سے مشیر اعلیٰ ملک محمد انور کو مذمت کا ہدف اس لئے بنایا گیا تھا کہ وہ صوبہ کے محکمہ نظم ونسق کا انچارج تھا اور پنجاب کے بے تاج بادشاہ خان قربان علی خان کو شیخوپورہ کے اس ''گھٹیا'' وکیل کی ماتحتی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ صوبائی اسمبلی اور مسلم لیگ کونسل کے بہت سے ارکان مفاد پرست اور بددیانت تھے اور اس بنا پر وہ تھانیدار کی حکم عدولی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ تاہم اس ڈرامے کا جو انتہائی ہولناک منظر تھا وہ یہ تھا کہ اس دوران پنجابی شاونزم کے اژدھانے کچھ اس طرح پھنکارنا شروع کر دیا کہ دُور اندیش سیاسی مبصروں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بلاشبہ وزیراعظم لیاقت علی خان کی جاگیردارانہ دھڑے بندی قابل مذمت تھی لیکن پنجاب کے اُبھرتے ہوئے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں نے جاگیردارانہ سیاست کے توڑ کے لئے صوبائی عصبیت کا جو حربہ استعمال کیا وہ اس سے بھی زیادہ قابل مذمت تھا۔ یہ کوتاہ اندیش عناصر ایک طرف تو اسلامی مساوات واخوت اور صوبہ پرستی سے بالاتر ہونے کے دعویدار تھے لیکن دوسری طرف یہ بدترین قسم کی علاقائی مفاد پرستی اور صوبائی عصبیت کا مظاہرہ کرتے تھے۔

باب: 11

چودھری خلیق الزماں کا سیاسی پس منظر اور پنجاب میں اس کی مخالفت

پنجاب کے اس سیاسی ڈرامے میں پاکستان مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں کی سیاسی زندگی بھی تقریباً اختتام پذیر ہوگئی اور یہ کوئی بری بات نہیں ہوئی تھی۔ اس شخص نے قیام پاکستان سے پہلے اور اس کے بعد جس قسم کی سازشی سیاست کو اپنائے رکھا تھا اس کا یہی حشر ہونا چاہیے تھا۔ خلیق الزماں لکھنؤ کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا اور بد قسمتی سے اس کی ذات میں اس کے اپنے طبقے کی خامیوں کی بہتات تھی لیکن اس کے کردار میں درمیانہ طبقہ کی کسی اچھائی کا نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ یہ اپنا شجرۂ نسب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملاتا تھا اور کہتا تھا کہ اس کے آباؤ اجداد مغل شہنشاہ اکبر کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ جہاں ان کی بڑی قدر ومنزلت ہوئی تھی۔ تاہم جبکہ یہ خود 25/دسمبر 1889ء کو یو۔ پی کے ضلع مرزا پور کے ایک قصبہ چونار میں پیدا ہوا تھا تو اس کا والد نائب تحصیلدار تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم وتربیت لکھنؤ میں ہوئی جہاں اس کے اپنے بیان کے مطابق تقریباً300 نواب اور تعلقہ دار رہائش پذیر تھے اور شہر کی تہذیب وثقافت پر اُنہی کا غلبہ تھا۔ ان نوابوں اور تعلقہ داروں میں سے بیشتر مقروض تھے اور یہ ساری زندگی مقدمہ بازی میں مصروف رہتے تھے۔ غالباً اُس نے اندرون خانہ جوڑتوڑ اور محلاتی سازش کی سیاست کا فن غیر شعوری طور پر انہی نوابوں اور تعلقہ داروں کی بد بودار تہذیب وثقافت سے متاثر ہوکر ہی سیکھا تھا۔ اس ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کی تہذیب وثقافت کا اظہار اس کی سیاسی سوانح عمری میں بھی ہوتا ہے جو اس نے قیام پاکستان کے تیرہ چودہ سال بعد 1961ء میں ایوب خان کی آمریت کے عہد میں

شائع کی تھی۔ اس کتاب بعنوان ''پاتھ وے ٹو پاکستان'' کو پڑھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اگر مادرِ اودھ اُسے جنم نہ دیتی تو برصغیر کے مسلمانوں کی تقدیر کی عنان سنبھالنے والا کوئی نہ ہوتا۔

اس نے 1903ء میں جوبلی سکول لکھنؤ سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور پھر یہ مزید تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج میں داخل ہو گیا۔ اُس نے کالج کے زمانے میں کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا اگر چہ ان دنوں حسرت موہانی کانگرس کی تنظیم میں پیش پیش تھا اور وہ اپنی انگریز دشمن سرگرمیوں کے باعث جیل بھی گیا تھا۔ 1910ء میں وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی خواہش کے مطابق کالج کے لئے چندہ جمع کرنے کی خاطر اودھ کا دورہ کر رہا تھا کہ اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا اور انگریزوں نے ترکوں کو براستہ مصر وہاں فوجیں بھیجنے کی اجازت نہ دی۔ اس واقعہ سے برصغیر کے مسلمانوں میں غم وغصہ کی زبردست لہر پیدا ہوئی جو اگلے سال 1911ء میں اور بھی شدید ہو گئی جبکہ برطانوی شہنشاہ جارج پنجم نے ہندوؤں کی پرتشدد سودیشی تحریک کے پیش نظر صوبہ بنگال کی تقسیم کے بارے میں وائسرائے لارڈ کرزن کے 1905ء میں کئے گئے فیصلے کو منسوخ کر دیا۔ 1912ء میں وسطی یورپ میں سلطنت عثمانیہ کے خلاف بلقان کی جنگوں کا آغاز ہوا تو یہ برصغیر کی مسلم رائے عامہ سے بہت متاثر ہوا اور اس بنا پر یہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی ڈاکٹر انصاری کی زیرِ قیادت ہندوستانی مسلمانوں کے ایک میڈیکل مشن کے ساتھ ترکی چلا گیا۔ 1913ء میں یہ ترکی سے واپس آ گیا کیونکہ سلطنت عثمانیہ کی سیاسی، انتظامی اور فوجی حالت ابتر تھی اور اس ابتری کی حالت میں ہندوستانی مسلمانوں کے میڈیکل مشن کے وہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اُس نے 1914ء میں بی۔اے، ایل۔ایل۔بی پاس کیا اور پھر لکھنؤ آ گیا۔ یہ لکھنؤ میں ہی تھا کہ 4راگست کو پہلی جنگ عظیم کا اعلان ہو گیا۔ فروری 1915ء میں جب ہرنیا کے آپریشن کے لئے دہلی آیا تو پورے برصغیر کے مسلمانوں میں خلافت عثمانیہ کے حق میں اور برطانوی سامراج کے خلاف زبردست تحریک چل رہی تھی جس کی قیادت مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی کے ہاتھوں میں تھی۔ دہلی میں اس کی ملاقات عبیداللہ سندھی سے ہوئی تو یہ اس کی باتیں سن کر قائل ہو گیا کہ برطانیہ کے خلاف جہاد کا وقت آ گیا ہے۔ اپنی سوانح عمری میں لکھتا ہے کہ اگر 1916ء میں لکھنؤ میں جداگانہ نیابت کے بارے میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو 1924ء کے بعد برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات

زہر آلود نہ ہوتے۔ چونکہ اس معاہدے کے تحت پنجاب کے مسلمانوں کو مساوی نمائندگی دی گئی تھی حالانکہ یہاں ان کی اکثریت تھی اور بنگال کی مسلم اکثریت کو سیاسی طور پر اقلیت بنا دیا گیا تھا اس لئے برصغیر کی تقسیم کی بنیاد اسی وقت رکھ دی گئی تھی اور یہی بات بالآخر بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا باعث بنی۔ اس نے اپریل 1917ء میں لکھنؤ میں وکالت شروع کی اور اسی مہینے میں اُسے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ 1918ء میں اس کی تحریک پر مولانا عبدالباری نے 500 علماء کے دستخطوں سے ایک فتویٰ وائسرائے کو بھیجا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نظر میں خلافت عثمانیہ کا عہدہ کس قدر مقدس ہے اور اس کے خطرے میں پڑنے سے مسلمانان ہند میں کس قدر تشویش پائی جاتی ہے۔ اس زمانے میں مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا محمود الحسن کابل اور مکّہ میں خلافت عثمانیہ کے لئے مسلمان حکومتوں کی تائید و حمایت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نومبر 1918ء میں اتحادیوں کی فتح کے بعد دہلی میں مسلم لیگ کا سیشن ہوا تو ڈاکٹر انصاری نے تحفظ خلافت کی قرارداد پیش کی۔ جناح نے اس قرارداد کی مخالفت کی مگر جب خلیق الزماں وغیرہ نے قرارداد کی حمایت کی تو جناح اور راجہ محمود آباد اجلاس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ جس کے بعد یہ قرارداد بڑے جوش و خروش کے ساتھ منظور کر لی گئی۔ ستمبر 1919ء میں اس کی تحریک پر لکھنؤ میں سرکردہ مسلمان لیڈروں کی خلافت کانفرنس ہوئی جس میں آل انڈیا سنٹرل خلافت کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کمیٹی کا آئین بھی اُسی نے لکھا تھا۔ لکھنؤ کانفرنس کے بعد دہلی میں خلافت کانفرنس ہوئی جس کی ایک سپیشل میٹنگ کی صدارت گاندھی نے کی۔ گاندھی کی صدارتی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ترکوں کا نصب العین انصاف پر مبنی ہے اور ہم اس کی غیر مشروط تائید و حمایت کرتے ہیں۔ اس دو روزہ خلافت کانفرنس کے دو دن بعد دہلی ہی میں ایک علماء کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مفتی کفایت اللہ کو علماء کی اس تنظیم کا صدر اور مولانا احمد سعید کو سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا۔

نومبر 1920ء میں الٰہ آباد میں خلافت کانفرنس کی میٹنگ ہوئی تو اس میں مولانا عبدالباری نے بعض لوگوں کے استفسار پر یہ فتویٰ دیا کہ موجودہ حالات میں ہندوستان کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ خلیق الزماں کہتا ہے کہ میں نے اس فتویٰ کی مخالفت کی تھی کیونکہ یہ شکست خوردہ ذہنیت کا حامل تھا۔ لیکن اس مخالفت کے باوجود یہ قرارداد منظور کر لی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً 20 ہزار مسلمان اپنا سب کچھ بیچ باچ کر اہل و عیال کے

ہمراہ افغانستان کی جانب روانہ ہو گئے۔لیکن جب افغانستان کے بادشاہ نے انہیں اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی تو وہ نہایت کسمپرسی اور فاقہ کشی کی حالت میں واپس آ گئے۔ اسی سال ناگپور میں کانگرس کا سیشن ہوا جس میں مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں عدم تعاون کی قرارداد منظور کی گئی۔ جناح نے اس کی مخالفت کی اور وہ اسی شام واپس بمبئی چلے گئے۔ کانگرس کے اس اجلاس کے بعد علی برادران علی گڑھ گئے جہاں انہوں نے مسلم یونیورسٹی کے ٹرسٹیوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ حکومت سے گرانٹ لینا بند کر دیں مگر وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس کی مخالفت کی۔ اس پر تقریباً ایک سو طلباء یونیورسٹی کے باہر آ گئے اور مولانا محمد علی نے علی گڑھ میں ہی جامعہ ملّیہ کی بنیاد رکھ دی۔ اس نئے تعلیمی ادارے کے ٹرسٹیوں کی جو پہلی میٹنگ ہوئی اس میں خلیق الزماں نے بھی شرکت کی تھی۔ جب علی گڑھ میں اس جامعہ نے کوئی خاص ترقی نہ کی تو اُسے 1925ء میں دہلی منتقل کر دیا گیا جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین نے اُسے کسی نہ کسی طرح زندہ رکھا۔ 1921ء میں خلیق الزماں نے پچاس ہزار روپے کے سرمائے سے لکھنؤ میں کپڑے کا بڑا کاروبار کرنے کی کوشش کی مگر چند ہی ماہ بعد تحریک خلافت کی بنا پر جب نومبر 1921ء میں بہت سے دوسرے لیڈروں کے ساتھ یہ بھی جیل گیا تو اس سے قبل اس کا یہ کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔ جیل میں یہ موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس کی آئین پسندی کا قائل ہو گیا۔ چنانچہ اس کی سزائے قید میں کمی کر دی گئی اور یہ 22/دسمبر 1922ء کو رہا ہو کر گھر آ گیا۔

جیل سے باہر آ کر خلیق الزماں موتی لال نہرو کی سوراج پارٹی میں شامل ہو گیا اور اس نے یو۔ پی میں اس پارٹی کی انتخابی مہم میں حصہ لیا۔ لیکن ان انتخابات میں سوراج پارٹی کی کامیابی کے فوراً ہی بعد یو۔ پی اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں شدید فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے کیونکہ ایک طرف تو سوامی شردھانند اور لالہ لاجپت رائے نے شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں شروع کر دی تھی اور دوسری طرف بعض مسلمانوں نے تبلیغ اور تنظیم کی جوابی تحریک کی داغ بیل ڈال دی تھی۔ 24/مئی 1924ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں خلافت گروپ اور مسلم لیگ گروپ دونوں ہی نے شرکت کی۔ محمد علی جناح نے دسمبر 1918ء میں مسلم لیگ سیشن سے واک آؤٹ کرنے کے بعد صرف 1919ء میں کلکتہ میں لیگ کونسل کی میٹنگ میں شرکت کی تھی اور

اس کے بعد اب وہ لاہور سیشن میں شریک ہوئے تھے۔ خلیق الزماں لکھتا ہے کہ ''اس سیشن میں میری جانب سے تجویز کردہ ایک قرارداد پیش کی گئی جس میں 1916ء کے معاہدۂ لکھنؤ کی ''سنگین غلطی'' کا ازالہ کیا گیا تھا۔ اس قرارداد کا مفہوم یہ تھا کہ وفاقی ہندوستان کے خود مختار صوبوں میں مختلف فرقوں کو ان کی آبادی کے لحاظ سے نمائندگی ملنی چاہیے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اس قرارداد میں یہ ترمیم پیش کی کہ سارے صوبوں میں اقلیتوں کو مناسب اور موٴثر نمائندگی ملنی چاہیے بشرطیکہ کوئی اکثریت اقلیت نہ بنے اور نہ ہی اُسے مساوی درجہ دیا جائے۔ خلیق الزماں اور مولانا محمد علی نے اس تجویز کی مخالفت کی مگر سر فضل حسین کی بھرپور حمایت کی باعث اس ترمیم کے ساتھ متذکرہ قرارداد منظور کر لی گئی۔'' 1925ء میں علی گڑھ میں مسلم لیگ کا سیشن ہوا تو اس میں بھی علی برادران کے خلاف گروپ، جس میں خلیق الزماں بھی شامل تھا، اور مسلم لیگ گروپ میں خوب رسہ کشی ہوئی۔ مسلم لیگ گروپ کی قرارداد یہ تھی کہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے مگر خلافت گروپ کی تجویز یہ تھی کہ حکومت ہند کو سوراج کا مطالبہ تسلیم کر لینا چاہیے۔ 1926ء میں خلیق الزماں نے موتی لال نہرو کے کہنے پر سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ لیکن وہ مسلم لیگی امیدوار راجہ احمد علی کے مقابلے میں شکست کھا گیا۔ چنانچہ جب 1926ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا سیشن ہوا تو خلیق الزماں لیگ کے جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے مستعفی ہو گیا۔ وہ اس عہدہ پر 1916ء سے فائز تھا جبکہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان لکھنؤ میں جُداگانہ نیابت کے بارے میں معاہدہ ہوا تھا۔ جب 20/مارچ 1927ء میں مسلم لیگ نے دہلی میں محمد علی جناح کی زیر قیادت مخلوط طریقۂ انتخاب کے اصول کو ان شرائط کے ساتھ مان لیا کہ سارے صوبوں کی اسمبلیوں میں مختلف فرقوں کی نمائندگی آبادی کے لحاظ سے ہونی چاہیے۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو 33 فیصد نشستیں ملنی چاہئیں اور سرحد، بلوچستان اور سندھ کو صوبائی درجہ دینا چاہیے اور پھر جب 1928ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کے سیشن میں دہلی کے فیصلے کی تائید کی گئی تو خلیق الزماں کو یہ بات ''پسند'' نہیں آئی تھی۔ حالانکہ یہ خود خلافتی، سوراجی اور کانگرسی ہونے کی حیثیت سے اس اصول کی مسلسل مخالفت کرتا رہا تھا۔ اس نے 1926ء کا انتخاب بھی مخلوط طریقۂ انتخاب کے اصول کے جھنڈے تلے لڑا تھا اور 1928ء میں اُس نے لکھنؤ کانگرس کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ بھی کیا تھا۔

5رجولائی 1929ء کوالہ آباد میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو اس کے دوران یہ فیصلہ کیا گیا کہ ''قوم پرست'' مسلمانوں کی ایک علیحدہ تنظیم ہونی چاہیے تا کہ وہ کانگرس سے علیحدہ پلیٹ فارم پر سے برصغیر کے مسلمانوں میں ''قوم پرستی'' کا پرچار کر کے انہیں موتی لال نہرو کمیٹی کی آئینی رپورٹ قبول کرنے پر آمادہ کرسکیں۔ چنانچہ 27رجولائی 1929ء کو مسلم نیشنلسٹ پارٹی وجود میں آ گئی۔ ڈاکٹر انصاری اس پارٹی کا صدر بنا اور خلیق الزماں اس کا سیکرٹری مقرر ہوا۔ ابوالکلام آزاد اور رفیع احمد قدوائی وغیرہ اس نئی پارٹی کے خلاف نہیں تھے تاہم وہ اس میں شامل نہ ہوئے اور کانگرس میں ہی ''کام'' کرتے رہے۔ جب 26رجنوری 1930ء کو کانگرس کے لاہور سیشن میں موتی لال نہرو کی آئینی رپورٹ کو دریائے راوی میں چھینک کر جواہر لال نہرو کی زیر صدارت مکمل آزادی کی قرارداد منظور کی گئی تو خلیق الزماں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی رکنیت سے مستعفی ہو گیا لیکن اس نے کانگرس کی چار آنے کی رکنیت برقرار رکھی۔ 1931ء میں صوبہ سرحد کا سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان لکھنؤ پہنچا تو خلیق الزماں نے اس کی گاندھی سے ملاقات کرائی۔ یہ گجراتی گاندھی اور سرحدی گاندھی کی پہلی ملاقات تھی۔ اگست 1932ء میں الٰہ آباد میں پنڈت مدن موہن مالویہ کی زیر صدارت یونٹی کانفرنس ہوئی جس میں نواب اسمٰعیل خان کے مسلم کانفرنس گروپ اور چودھری خلیق الزماں کے نیشنلسٹ گروپ نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ تھا کہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے بعد ہونے والے انتخابات میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں کوئی تصفیہ کیا جائے۔ لیکن ابھی یہ کانفرنس جاری ہی تھی کہ لندن سے کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہو گیا اور اس بنا پر اس کی ساری کاروائی کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ تاہم کچھ عرصہ بعد چودھری خلیق الزماں نے مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ گروپوں کی لکھنؤ میں ایک میٹنگ بلائی۔ جس میں مسلم یونٹی بورڈ کے نام سے ایک نئی پارٹی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ راجہ آف سلیم پور اس کا صدر بنا اور چودھری خلیق الزماں اس کا سیکرٹری بن گیا۔ اس پارٹی کا منشور یہ تھا کہ مختلف پارٹیوں کو برطانیہ کا کمیونل ایوارڈ تسلیم کرنے کی بجائے مخلوط طریقۂ انتخاب کے اصولوں کی بنیاد پر فرقہ وارانہ نیابت کے بارے میں باہمی تصفیہ کر لینا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ چودھری خلیق الزماں اور اس کا یونٹی بورڈ متوقع آئینی اصلاحات کے تحت جداگانہ طریقۂ انتخاب کے حق میں نہیں تھے۔ وہ مسلمانوں کے لئے کانگرس سے مراعات کی توقع کرتے تھے۔ 12رمئی 1939ء کو پٹنہ میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی

کا اجلاس ہوا تو چودھری خلیق الزماں نے اس میں شرکت کی۔ اس اجلاس میں سول نافرمانی تحریک معطل کرنے اور 25 رکنی کانگرس پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس بورڈ میں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ تھی جن میں ایک چودھری خلیق الزماں بھی تھا۔ 1934ء کے اوائل میں محمد علی جناح لندن سے عارضی طور پر ہندوستان واپس آئے ہوئے تھے اور وہ 4/ مارچ کو مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہو چکے تھے۔ فروری میں راجہ سلیم پور نے دہلی کے سیسل ہوٹل میں جناح کے اعزاز میں عشائیہ دیا تو مدعوین میں چودھری خلیق الزماں بھی تھا جو اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''عشائیہ کے بعد جناح میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بالکونی میں لے گئے اور وہاں انہوں نے کہا کہ اگر تم میرا ساتھ دینے کا وعدہ نہیں کرو گے تو میں ہندوستان واپس نہیں آؤں گا۔ انہوں نے 1931ء میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا تھا چنانچہ میں نے انہیں کہا کہ میں نے کمیونل ایوارڈ کے بارے میں جو مؤقف اختیار کیا اس سے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے ہیں اور ہوسکتا ہے کہ ہم آئندہ ایک مشترکہ نصب العین کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کریں۔''[1]
تاہم 19/ اگست 1934ء کو یونٹی بورڈ کا اجلاس ہوا تو اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ بورڈ اپنے ٹکٹ پر آئندہ انتخابات میں حصہ لے گا۔

1936ء کے اوائل میں محمد علی جناح نئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت انتخابات میں حصہ لینے کے لئے مستقل طور پر واپس ہندوستان آ گئے تو انہوں نے کانگرس کے خلاف مسلمانوں کی ساری چھوٹی بڑی تنظیموں کا ایک متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے جمعیت العلمائے ہند کے سیکرٹری مولانا احمد سعید کے علاوہ یونٹی بورڈ کے خلیق الزماں سے بھی بمبئی میں بات چیت کی۔ اس پر خلیق الزماں نے اس شرط پر مسلم لیگ کے ساتھ تعاون کا وعدہ کیا کہ مسلم لیگ یو۔ پی کے لئے جو پارلیمانی بورڈ مقرر کرے گی اس میں اس کے یونٹی بورڈ کو اکثریت حاصل ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مئی 1936ء میں محمد علی جناح نے یو۔ پی کے لئے جس پارلیمانی بورڈ کا اعلان کیا اس میں خلیق الزماں کے بورڈ کی اکثریت تھی۔ چونکہ مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان کے لئے یہ صورت حال قابل برداشت نہیں تھی اس لئے وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر نواب چھتاری کی ایگریکلچرسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔ 1937ء کے انتخابات میں یو۔ پی میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لئے مخصوص 36 نشستوں پر اُمیدوار کھڑے

کئے تھے جن میں سے 29 کامیاب ہوئے۔ چودھری خلیق الزماں کے بیان کے مطابق یہ کامیابی اولاً اس لئے ہوئی تھی کہ معاشی پروگرام کے بارے میں کانگرس اور مسلم لیگ کے منشوروں میں کوئی خاص فرق نہیں تھا اور ثانیاً اس لئے کہ مسلم لیگ کے اُمیدواروں کا کردار نیشنلسٹ تھا۔ تاہم مسلمانوں کی نشستوں میں سے کوئی ایک نشست بھی کانگرس نے نہیں جیتی تھی۔ حالانکہ رفیع احمد قدوائی نے مسلم لیگ کے خلاف دو اور نواب چھتاری کے خلاف ایک اُمیدوار کھڑا کیا تھا البتہ کانگرس نے ہندوؤں کی 144 نشستوں میں سے 134 نشستیں جیتی تھیں۔

20/مارچ 1937ء کو چودھری خلیق الزماں یو۔ پی کی مسلم لیگ اسمبلی کا قائد منتخب ہوا۔ جبکہ کانگرس کی طرف سے راجندر پرشاد نے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ کانگرس وزارت سازی کے لئے کسی گروپ یا پارٹی سے تعاون نہیں کرے گی۔ انتخابی نتائج کے چند دن بعد ضلع بھڑائچ کے منتخب مسلم لیگی رکن اسمبلی کا انتقال ہو گیا۔ ایک ماہ کے بعد اس حلقۂ انتخاب میں ضمنی انتخاب ہونا تھا مگر کانگرسی اُمیدوار رفیع احمد قدوائی یہاں سے بلا مقابلہ منتخب ہو گیا۔ چودھری خلیق الزماں نے اس کی عجیب وغریب وجہ یہ بتائی ہے کہ جس شخص نے مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لئے درخواست دی تھی وہ اپنی انتخابی مہم کے لئے 20 ہزار روپے مانگتا تھا چونکہ اس کے لئے اتنی کثیر رقم کا انتظام نہیں ہوسکتا تھا اس لئے کانگرسی اُمیدوار بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا۔ 5/مئی 1937ء کو مرادآباد میں کانگرسی علماء کی میٹنگ ہوئی جس میں خلیق الزماں نے بھی شرکت کی۔ 17/مئی کو الٰہ آباد میں علماء کی ایک اور میٹنگ ہوئی جس میں خلیق الزماں نے تو شرکت نہ کی البتہ ابوالکلام آزاد شریک ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ علماء غیر مشروط طور پر کانگرس کا ساتھ دیں گے۔ اس سے قبل 12/مئی کو چودھری خلیق الزماں نے جواہر لال نہرو سے ملاقات کر کے اس پر زور دیا تھا کہ کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنانے پر آمادہ ہو جائے لیکن نہرو نہ مانا اور اسے مایوس لوٹنا پڑا تھا۔ اس کے بعد خلیق الزماں نے ابولکلام آزاد اور پنڈت گوبند بلبھ پنت سے کئی ملاقاتیں کیں مگر کانگرس مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارت بنانے پر آمادہ نہ ہوئی۔ اس کا مؤقف یہ تھا کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کو کانگرس میں ضم ہو جانا چاہیے اور مسلم لیگی ارکان کو کانگرس کے پروگرام اور نظم وضبط کی پابندی کرنا پڑے گی۔ ابوالکلام آزاد نے اس سلسلے میں چودھری خلیق الزماں کے نام اپنے خط میں لکھا تھا کہ "اگر تم مندرجہ ذیل شرائط ماننے کو تیار ہو تو مسلم لیگ کے کسی ممبر کو ہم وزارت میں جگہ دے سکتے ہیں:

1۔ یو۔پی کی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کو توڑ کر بالکل ختم کر دیا جائے۔
2۔ مسلم لیگ پارٹی کے تمام ممبر کانگرس کے حلف نامے پر دستخط کر کے کانگرسی بن جائیں۔ اس طرح یہ لوگ کلیۃً کانگرس کے نظم وضبط کے تحت آجائیں گے اور آئندہ اپنے تمام اعمال وافعال کے لئے کانگرس کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ کانگرس پارٹی کے جلسوں میں ان لوگوں کو شریک ہونا ہوگا جہاں دیگر کانگرس ممبروں کی طرح یہ لوگ بھی ہر معاملہ میں ووٹ دیں گے۔
3۔ کانگرس کی مجلس عاملہ نے مختلف اسمبلیوں کے کانگرسی ممبروں کے لئے جو ضابطۂ عمل تیار کیا ہے مسلم لیگ کے ان ممبروں کو (جو آئندہ کانگرس کے ممبر سمجھے جائیں گے) اس ضابطہ پر باقاعدہ عمل کرنا ہوگا۔
4۔ مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کو توڑ دیا جائے گا اور آئندہ کسی انتخاب میں مسلم لیگ کو اپنے ٹکٹ پر اُمیدوار کھڑے کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ یہ کام کانگرس کے ذمے ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں اپنے ٹکٹ پر اُمیدوار کھڑے کرے۔
5۔ تمام ممبروں کو کانگرس کے لائحہ عمل پر کاربند ہونا پڑے گا اور کانگرس کے اغراض ومقاصد کی تکمیل میں ہر ممکن کوشش کرنا ہوگی۔
6۔ اگر کانگرس نے کبھی وزارت یا اسمبلی سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کیا تو ان ممبروں کو بھی اس فیصلے کی پابندی کرنا پڑے گی۔

یہ شرائط نامہ 23/ جولائی 1937ء کے اخبارات میں شائع ہوا اور 24/ جولائی کو کانگرس کی جو صوبائی وزارت بنی اس میں مسلمانوں کے نمائندوں کے طور پر کانگرس کے رفیع احمد قدوائی اور جمعیت العلمائے ہند کے حافظ محمد ابراہیم کو شامل کیا گیا۔ چودھری خلیق الزماں کو حزب اختلاف کی بنچوں پر بیٹھنا پڑا جبکہ نوابزادہ لیاقت علی خان آزاد ارکان کے بنچوں پر بیٹھا۔ خلیق الزماں نے کانگرسی لیڈروں سے وزارت سازی کی بات چیت کے دوران جناح سے کبھی کوئی مشورہ نہیں کیا۔''[2]

اکتوبر 1938ء میں خلیق الزماں مصر کے محمد علی علوبہ پاشا کی دعوت پر ہندوستانی مسلمانوں کے چار نمائندوں کے ایک وفد کے ہمراہ لندن گیا۔ مقصد یہ تھا کہ فلسطین کے مسئلہ پر

کانفرنس کے دوران ہندوستانی مسلمانوں کی جانب سے حکومت برطانیہ پر زور دیا جائے کہ وہ عربوں اور یہودیوں کے تنازعہ کا تصفیہ عربوں کے حق میں کرے۔ یہ کانفرنس جاری تھی کہ دسمبر 1938ء میں چودھری رحمت علی نے اُسے ایک خط لکھا جس کے ساتھ ہندوستان کی فرقہ وارانہ آبادی کے اعداد وشمار نتھی کئے ہوئے تھے اور مطالبۂ پاکستان کی تائید وحمایت کی درخواست کی گئی تھی۔ مارچ 1939ء میں خلیق الزماں نے عبدالرحمان صدیقی کے ہمراہ برطانیہ کے وزیر خارجہ (لارڈ زٹلینڈ) سے ڈیڑھ گھنٹہ تک ملاقات کی اور اسے بتایا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم تنازعے کا واحد حل یہ ہے کہ برصغیر کو تقسیم کر دیا جائے۔ لندن سے یہ 12رمئی 1939ء کو واپس ہندوستان پہنچا تو اس نے بمبئی میں اپنے ایک دوست عبداللہ بریلوی کو بتایا کہ اب ہندوستان کے مسئلہ کا حل تقسیم کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اسی شام اس نے صدیقی کے ہمراہ جناح سے ملاقات کی اور انہیں برطانیہ کے وزیر خارجہ سے اپنی بات چیت کا خلاصہ بتایا۔ اس پر جناح نے استفسار کیا کہ تم نے اس اسکیم کے نتائج کا جائزہ لے لیا ہے؟ خلیق الزماں کا جواب یہ تھا کہ چونکہ اب کوئی متبادل راستہ کھلا نہیں ہے اس لئے اب پرانی بنیادوں پر باتیں کرتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ چنانچہ جناح نے یقین دلایا کہ اگرچہ وہ اس سکیم کے خلاف نہیں لیکن اس کے سارے پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہوگا۔ 17رستمبر 1939ء کو دہلی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس کے بعد خلیق الزماں اور سر سکندر حیات خان کی ملاقات ہوئی جس کے دوران سر سکندر نے اُسے بتایا کہ پنجاب میں ملک برکت علی وغیرہ نے مسلم لیگ کی جو برانچیں قائم کر رکھی ہیں وہ سب بوگس ہیں۔ چنانچہ اس نے سر سکندر کی خواہش کے مطابق جناح کو اس صورت حال سے مطلع کیا تو پنجاب میں مسلم لیگ کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے راجہ محمود آباد، نواب اسماعیل اور خلیق الزماں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی۔ 3رفروری 1940ء کو اس نے دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن سر محمد ظفر اللہ خان سے ملاقات کی جس نے اُسے بتایا کہ حکومت برطانیہ کانگرس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ کرنے پر آمادہ ہے۔ لہٰذا مسلم لیگ کو بلا تاخیر کانگرس کے ساتھ کوئی نہ کوئی تصفیہ کر لینا چاہیے۔ اس پر اس کا جواب یہ تھا کہ بس چھوٹ جاتی ہے تو چھوٹ جائے میں غلط بس پر سوار نہیں ہوں گا۔ اس کے بعد مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں سر سکندر حیات نے کنفیڈرل سکیم پیش کی مگر جناح نے اُسے مسترد کر دیا پھر خلیق الزماں نے برصغیر

کی تقسیم کی تجویز پیش کی تو جناح نے اُسے منظور کر کے اس کا اپنی نوٹ بک میں اندراج کر لیا۔ 23/مارچ 1940ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی سیشن ہوا جس میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی۔ یہ قرارداد اے کے فضل الحق نے پیش کی تھی اور چودھری خلیق الزماں نے اس کی تائید کی تھی۔ 1941ء میں اس نے مسلم لیگ کے مدراس سیشن میں شرکت نہ کی کیونکہ یہ ان دنوں انجمن میں منعقدہ سٹیٹس پیپلز کانفرنس میں چلا گیا تھا۔فروری 1942ء میں (پروفیسر کوپلینڈ) ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لئے ہندوستان آیا تو اس نے لکھنؤ میں اس سے ملاقات کے دوران سر سید احمد خان کی 1883ء کی تقریر کا حوالہ دے کر یہ مؤقف پیش کیا کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ان میں مفاہمت نہیں ہوسکتی لہٰذا برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہے۔

مارچ 1942ء میں سر سٹیفورڈ کرپس کی سربراہی میں برطانوی کابینہ کا ایک وفد ہندوستان آیا اور اس نے برصغیر کے مختلف علاقوں اور پارٹیوں کے سرکردہ رہنماؤں سے ملاقاتیں کرنے کے بعد جو آئینی سکیم پیش کی اس کے اہم نکات یہ تھے کہ

1۔ مرکز میں ایک قومی حکومت قائم ہوگی۔

2۔ انڈین یونین کا آئین مرتب کرنے کے لئے ایک مشینری قائم کی جائے گی اور اگر کسی صوبہ کو یہ نیا آئین قابل قبول نہیں ہوا تو اسے یونین سے الگ ہونے کا حق حاصل ہوگا۔

جناح نے اس سکیم پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور کہا کہ اس سکیم میں مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا مگر چودھری خلیق الزماں کے لئے یہ سکیم قابل قبول تھی اور اسے جناح کے اس بیان سے بہت دکھ ہوا تھا۔اس کا خیال تھا کہ اگر کرپس سکیم کو منظور کر لیا جاتا تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم نہ ہوتی۔لاہور کی مارچ 1940ء کی قرارداد میں ان دونوں صوبوں کی تقسیم کی گنجائش رکھی گئی تھی۔1942-43ء میں چودھری خلیق الزماں بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد میں مسلم لیگیوں کے مسائل حل کرنے میں مصروف رہا۔جو کوئی اس کی نصیحت پر عمل کرتا تھا وہ کامیاب ہوتا تھا اور جو کوئی اس کے کہنے پر نہیں چلتا تھا اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔''سیاسی بصیرت و فراست'' میں چودھری خلیق الزماں کا کوئی ''جواب'' نہیں تھا۔اس دوران مولانا شوکت علی کے انتقال پر نوبزادہ لیاقت علی خان مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا اور پھر وہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بن گیا تھا۔1945ء میں وائسرائے ویول نے مرکز میں عبوری حکومت کی

تشکیل کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے سرکردہ رہنماؤں کی میٹنگ بلائی مگر یہ کانفرنس نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ کیونکہ جناح کا اصرار تھا کہ مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور وہی عبوری حکومت میں سارے مسلمان نمائندے نامزد کرنے کی حقدار ہے۔ خلیق الزماں کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا کیونکہ وہ ان دنوں کانگرس کے ساتھ کسی بھی فارمولا کی بنیاد پر مفاہمت کو مسلمانوں کے مفاد کے منافی تصور کرتا تھا۔ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں اقلیت ہونے کے باعث اکثریت کے فیصلے کا پابند ہونا پڑتا۔ اپریل 1946ء میں دہلی میں نئے منتخب شدہ مسلم لیگی ارکان اسمبلی کا کنونشن منعقد ہوا تو اس میں جو قرارداد منظور کی گئی وہ چودھری خلیق الزماں کے بیان کے مطابق اس نے ہی لکھی تھی۔ یہ قرارداد حسین شہید سہروردی نے پیش کی تھی اور چودھری خلیق الزماں، ملک فیروز خان نون، آئی۔ آئی چندریگر اور غلام حسین ہدایت اللہ وغیرہ نے اس کی تائید کی تھی۔ اس قرارداد میں اور مارچ 1940ء کی قرارداد میں نمایاں فرق یہ تھا کہ اس قرارداد میں مسلمانوں کی صرف ایک ریاست کا مطالبہ تھا جبکہ لاہور کی قرارداد میں ایک سے زیادہ خودمختار مسلم ریاستوں کا ذکر تھا۔ خلیق الزماں کہتا ہے ''میں نے قرارداد میں غیر ارادی طور پر ریاستوں کی بجائے لفظ ریاست لکھ دیا تھا شاید اس لئے کہ میرے تحت الشعور میں یہ بات تھی کہ چونکہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرتے ہیں اس لئے وہ ایک ہی ریاست کے خواہاں ہیں۔'' اس قرارداد میں علاقائی ردوبدل کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا حالانکہ قرارداد لاہور میں اس کی گنجائش رکھی گئی تھی۔

فروری 1946ء میں لارڈ پیتھک لارنس کی سربراہی میں برطانیہ کا ایک وزارتی مشن ہندوستان آیا۔ جب اس وفد کی چودھری خلیق الزماں سے ملاقات ہوئی تو سر سٹیفورڈ کرپس نے یکا یک کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں بند کر دیں اور پوچھا کہ ''تم ایک ڈھیلا ڈھالا مرکز قبول کیوں نہیں کر لیتے؟'' چودھری خلیق الزماں کا جواب یہ تھا کہ اگر تم ایسا مرکز قائم کر سکتے ہو جس کے پاس دفاع، امور خارجہ اور مواصلات کے صرف تین محکمے ہوں تو میرا خیال ہے کہ تم مسلم لیگ کو اس تجویز پر غور کرنے پر آمادہ کر سکو گے۔ مگر مجھے بہت شبہ ہے کہ تم کانگرس کو اس پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو گے۔ وہ شاید اس پر ایک نظر بھی نہیں ڈالیں گے۔'' چودھری خلیق الزماں کی وزارتی مشن سے ملاقات کے موقع پر نوابزادہ لیاقت علی خان بھی تھا لیکن وہ بالکل خاموش رہا اس نے ایک مرتبہ لب کشائی نہ کی۔''[3] اکتوبر 1946ء میں جب جناح نے عبوری حکومت کے مسلم لیگ

کے نمائندوں کی فہرست میں ایک اچھوت جوگندر ناتھ منڈل کا بھی نام شامل کر دیا تو نواب اسماعیل خان کے علاوہ چودھری خلیق الزماں کو بھی یہ بات پسند نہ آئی۔ اس کا خیال تھا کہ مسلمانوں کے کوٹہ میں ایک ہندو کی شمولیت دوقومی نظریے کے منافی تھی۔ مارچ 1947ء کے آخری ہفتے میں چودھری خلیق الزماں، جناح کی ہدایت کے مطابق کلکتہ گیا کیونکہ وہاں حمیدالحق چودھری اور فضل الرحمان نے وزیراعلیٰ حسین شہید سہروردی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے کلکتہ میں سب کو سمجھایا بجھایا تو ان میں مصالحت ہوگئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بنگال مسلم لیگ میں انتشار کے باعث پورے برصغیر میں مسلم لیگ کے نصب العین کو سخت دھچکا لگنا تھا۔ اس کے کلکتہ میں قیام کے دوران ان افواہوں کی تصدیق ہوگئی کہ حسین شہید سہروردی ان دنوں ہندو مہاسبھا کے لیڈر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی سے متحدہ بنگال کے لئے بات چیت کر رہا تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سکیم ناکام ہوجائے گی اور حسین شہید سہروردی کو لازمی طور پر مایوسی ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ 8/جون کو جب برصغیر کی تقسیم کے منصوبے کے بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو کمرے میں داخل ہونے سے پہلے سہروردی نے چودھری خلیق الزماں سے شکایت کی کہ کسی نے اس کی متحدہ بنگال کی سکیم کا نوٹس نہیں لیا۔ لیکن اس نے اجلاس میں اس کا ذکر نہ کیا۔ شاید اس لئے کہ مغربی بنگال کے ہندوؤں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بقیہ ہندوستان سے الگ رکھنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ جولائی کے اوائل میں جناح نے چودھری خلیق الزماں کی بہت منّت سماجت کی کہ وہ ہندوستان میں مرکزی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا قائد بن جائے۔ اسے یہ عہدہ قبول کرنے میں تامل تھا کیونکہ اس کی رائے یہ تھی کہ یہ عہدہ نواب اسماعیل خان کو ملنا چاہیے لیکن جب جناح نے بہت اصرار کیا تو وہ اپنے بھائی مشفق سے مشورہ کرنے کے بعد بالآخر یہ عظیم بوجھ اُٹھانے پر تیار ہوگیا کیونکہ اس عہدہ سے ہندوستان کے چار کروڑ مسلمانوں کا مستقبل وابستہ تھا۔ چنانچہ 13/جولائی کو اسمبلی کا اجلاس ہوا تو اسے متفقہ طور پر پارٹی کا قائد منتخب کر لیا گیا۔ 27/جولائی کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کے اجلاس میں آزاد ہندوستان کے پرچم کا مسئلہ زیر بحث آیا۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے وفاداری کا یقین دلایا۔ اس کی یہ تقریر جناح کے 6/جولائی کے اس بیان کے عین مطابق تھی کہ اقلیتوں کو اس ملک کا وفادار رہنا چاہیے جس میں وہ رہتی ہیں۔ جواہر لال نہرو

نے اس کی اس تقریر کے بعد اس سے مصافحہ کیا اور مبارک باد دی۔ 5 راگست کو چودھری خلیق الزماں لاہور آیا اور یہاں اس کی زیر صدارت مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے نواب ممدوٹ کو اپنا لیڈر منتخب کر لیا۔ اس اجلاس میں ملک فیروز خان نون کا نام بھی تجویز کیا گیا لیکن اس نے اپنا نام واپس لے لیا کیونکہ بیگم شاہنواز کے بیان کے مطابق مرکزی لیگ اس کے حق میں نہیں تھی۔

14 راگست کو جب رات کے بارہ بج کر پانچ منٹ پر دہلی میں انتقال اقتدار کی رسم ادا ہوئی تو اس موقعہ پر چودھری خلیق الزماں بھی موجود تھا اور جواہر لال نہرو کے بعد اس نے بھی تقریر کی۔ نہرو اس کی تقریر سے بہت خوش ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر اس سے معانقہ کیا۔ 10 رستمبر کو حسین شہید سہروردی نے کلکتہ سے اُسے ایک خط لکھا جس میں دوقومی نظریے کی افادیت کے بارے میں شبہ کا اظہار کیا گیا تھا اور خود چودھری خلیق الزماں کا بھی خیال تھا ''اس نظریے سے ہمیں کبھی بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا لیکن تقسیم کے بعد یہ نظریہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے یقینی طور پر نقصان دہ ثابت ہوا اور دور اندیشی کی بنیاد پر دیکھا جائے تو یہ ہر جگہ کے مسلمانوں کے لئے ضرر رساں ثابت ہوا۔'' سہروردی کے خط میں بہت سے استفسارات اسی دوقومی نظریے کے بارے میں تھے۔ تاہم وہ بعض واقعات کی وجہ سے اس کے خط کا جواب نہ دے سکا۔''[4] ستمبر میں اقوام متحدہ میں پاکستانی مندوب سر محمد ظفر اللہ خان نے لیک سکسیس میں ایک بیان دیا جس میں اس نے کہا تھا کہ ''اگر مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا منظم قتل عام بند نہ کیا گیا تو ممکن ہے کہ حکومت پاکستان یہ مسئلہ اقوام متحدہ میں اٹھائے اور اگر حکومت پاکستان کو اطمینان حاصل نہ ہوا تو اس امر کا امکان ہے کہ وہ براہ راست اقدامات کرے۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ داری حکومت ہندوستان پر عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ اس سلسلے میں اپنی ذمہ داری نبھانے میں ناکام رہی ہے۔'' سر ظفر اللہ خان کے اس بیان سے قبل خلیق الزماں کا بھائی سعید الزماں پاکستان پہنچ چکا تھا اور اس بیان کے فوراً ہی بعد اس کا برادر نسبتی وسیم بھی غلام محمد کا خط موصول ہونے کے بعد پاکستان آ گیا تھا۔ اس طرح اگرچہ خلیق الزماں کا خاندان دو حصوں میں منقسم ہو گیا تھا تاہم اُس نے سر ظفر اللہ کے متذکرہ بیان کے جواب میں ایک بیان دیا جس میں اس نے اس الزام کی تردید کی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل عام کی ذمہ داری حکومت ہندوستان پر عائد ہوتی ہے۔'' سر ظفر اللہ نے انڈین یونین کے مسلمانوں کے تحفظ کے لئے حکومت پاکستان کے امکانی براہ راست اقدامات کے بارے میں جو بیان دیا ہے اس میں اس

نے ہندوستان میں اپنے ہم مذہبوں سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا ہے۔ اس نے یہ بیان مغربی پنجاب کی مسلم کونسل کی اس قرارداد کے بعد جاری کیا ہے کہ وہاں نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جائے گی۔ بلاشبہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مصائب درپیش ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی پنجاب میں بھی غیر مسلم اقلیت کو مصیبتیں اُٹھانی پڑی ہیں۔" 30ر ستمبر کو چودھری خلیق الزماں بنگال کے گورنر۔ راجگوپال اچاریہ کے ایک پیغام کی تعمیل میں دہلی گیا۔ وہاں اُس نے گاندھی سے ملاقات کی جس نے اُسے کہا کہ اگر تم سندھ کے ہندوؤں کو وہاں سے بھاگنے سے روک سکو تو مجھے ہندوستان میں مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں آسانی ہوگی۔ چنانچہ یہ گاندھی کے مشورے کے مطابق اس سلسلے میں جناح سے ملاقات کرنے کے لئے کراچی جانے پر تیار ہو گیا۔ گاندھی سے اس ملاقات کے بعد خلیق الزماں، ابوالکلام آزاد سے بھی ملا اور پھر 2ر اکتوبر کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچ گیا۔ 5ر اکتوبر کو اُس نے گورنر جنرل پاکستان سے ملاقات کی تو جناح نے اس کے اس بیان پر بہت خفگی کا اظہار کیا جو اس نے سر ظفر اللہ خان کے بیان کے جواب میں جاری کیا تھا۔ اس پر اس نے کہا کہ اگر آپ میرے جوابی بیان سے اس قدر غیر مطمئن ہیں تو میں ہندوستان واپس نہیں جاؤں گا بلکہ یہیں سے استعفیٰ بھیج دوں گا تا کہ کوئی اور قابل اعتماد شخص ہندوستانی مسلمانوں کی خدمت کر سکے۔ اسی شام حسین شہید سہروردی نے اس سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا کہ آیا وہ (سہروردی) ہندوستان واپس جائے یا نہ جائے۔ اس پر خلیق الزماں نے کہا کہ "جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے فیصلہ کیا ہے میں واپس نہیں جاؤں گا کیونکہ مسٹر جناح سے انٹرویو کے بعد میں محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کرسکوں گا۔ لیکن تم اپنے بارے میں خود ہی فیصلہ کرو کیونکہ تم خود ہی فیصلہ کر سکتے ہو کہ تم ہندوستانی مسلمانوں کی کس قدر امداد کر سکتے ہو۔"[5] چنانچہ اس ملاقات کے بعد حسین شہید سہروردی تو واپس ہندوستان چلا گیا لیکن چودھری خلیق الزماں نے یہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ قبل ازیں اس کا بھائی اور متعدد دوسرے رشتہ دار کراچی پہنچ چکے تھے۔ نومبر کے اوائل میں اُسے ہندوستان سے حسین شہید سہروردی کا ایک تار موصول ہوا جس میں اس کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ کلکتہ میں ہندوستانی مسلمان لیڈروں کی کانفرنس میں شرکت کرے۔ خلیق الزماں کی جانب سے اس تار کا بذریعہ تار جواب یہ دیا گیا تھا کہ "میں نے یو۔ پی کی اسمبلی اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا ہے تا کہ

ہندوستان کے نئے ڈھانچے میں نوجوان خون پالیسیوں کی تشکیل وتکمیل کر سکے۔ مزید برآں میں اپنے آپ کو ہندی زبان سیکھنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اسے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی مساعی کے باوجود سرکاری زبان کا درجہ دے دیا گیا ہے۔"[6]

چودھری خلیق الزماں کی سیاسی زندگی کا یہ خلاصہ اس کی زبان قلم سے نکلا ہوا ہے۔ اس نے خودنوشت سوانح حیات میں اس قدر خودستائی کی ہے کہ اسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ انسان اتنا بر خود غلط بھی ہوسکتا ہے۔ 1910ء کے بعد برصغیر کی تاریخ میں ہر وہ واقعہ جس میں مسلمانوں کے مفاد کو کوئی فروغ حاصل ہوا تھا اس میں چودھری خلیق الزماں کا کردار "اہم ترین" تھا اور جس واقعہ سے مسلمانوں کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچا تھا اس میں جناح اور دوسرے اسی قسم کے "ٹٹ پونجیے" لیڈروں کا ہاتھ تھا۔ چودھری خلیق الزماں 1916ء کے لکھنؤ پیکٹ کے خلاف تھا کیونکہ اس پیکٹ کے تحت کانگرس نے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر کے اور مسلم لیگ نے پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان کی اکثریتی پوزیشن سے محروم کر کے برصغیر کی تقسیم کی بنیاد رکھی تھی۔ تحریک خلافت کے دوران جو اچھی بات ہوئی وہ چودھری خلیق الزماں کی وجہ سے تھی اور جو بری بات ہوئی وہ اس لئے ہوئی کہ اس میں اس کی رائے کا دخل نہیں تھا۔ 1934ء میں محمد علی جناح نے انگلستان سے واپس آنے کا فیصلہ محض اس لئے کیا تھا کہ خلیق الزماں نے اُن سے تعاون کرنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ 1937ء کے انتخابات میں یو۔ پی میں مسلم لیگ کی کامیابی محض اس لئے ہوئی تھی کہ یہ انتخابات اس کی زیر قیادت لڑے گئے تھے۔ 1939ء میں حکومت برطانیہ کو برصغیر کی تقسیم کی تجویز سب سے پہلے اس نے پیش کی تھی اور جناح نے بھی تقسیم کے منصوبے کو اسی کے کہنے پر قابل غور سمجھا تھا۔ چونکہ 1940ء کی قرارداد کے لکھنے میں اس کا ہاتھ نہیں تھا اس لئے وہ خامیوں سے بھرپور تھی۔ 1942ء میں کرپس پلان اسی کی تجویز کے مطابق مرتب ہوا تھا۔ 1946ء میں وزارتی مشن کا منصوبہ بھی اسی کے مشوروں کا مرہون منت تھا۔ اپریل 1946ء میں مسلم لیگ ارکان اسمبلی کی قرارداد اسی نے لکھی تھی اور اس نے وہ ساری خامیاں دور کر دی تھیں جو 1940ء کی قرارداد میں تھیں۔ ان سب باتوں کے باوجود 1947ء میں اس کی رائے یہ تھی کہ دوقومی نظریہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بلکہ ہر جگہ کے مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ قائداعظم جناح نے 11 راگست 1947ء کو پاکستانی قومیت کے مذہب سے بالاتر ہونے کے

بارے میں جو پالیسی تقریر کی تھی وہ بھی انہوں نے خلیق الزماں اور اس کے ساتھیوں کی رائے کے زیر اثر لکھی تھی اور پھر جب اس نے 2/اکتوبر کو کراچی آ کر یہیں ڈیرے ڈال لئے تو پٹیل نے لکھنؤ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''پاکستان کا بنوانے والا اسی شہر کا باشندہ تھا۔ بھگوان کی دیا سے وہ چلا گیا ہم بہت خوش ہیں۔'' گویا پاکستان کی تشکیل میں مسلم عوام الناس، مسلم لیگ اور صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ اگر خلیق الزماں نہ ہوتا تو یہ معجزہ رونما نہ ہوتا۔ اس کی سوانح عمری کے بعض حصے پڑھنے سے یہ تاثر ملتا ہے کہ درمیانہ طبقہ کے اس شخص پر لکھنؤ کے بعض اخلاق باختہ نوابوں اور تعلقہ داروں کی ''تہذیب وثقافت'' کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی۔ اس نے ساری عمر سیاست بازی تقریباً اسی طرح کی جس طرح کہ بعض نوابان اودھ بھنگ پی کر شطرنج بازی، بٹیر بازی اور مقدمہ بازی کیا کرتے تھے۔ اندرون خانہ جوڑ توڑ، محلاتی سازش، ہیر پھیر اور چالبازی اس کی سیاست کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ اسے یو۔ پی کے لاکھوں مسلمان غریب کسانوں، مزدوروں اور دوسرے مظلوم عوام سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ چنانچہ جب جواہر لال نہرو نے جولائی 1937ء میں کانگرس کی صوبائی وزارتوں کی تشکیل کے بعد مسلم رابطۂ عوام کی مہم کے دوران بہت سے فرقہ وارانہ تضادات کو یکسر نظر انداز کر کے یورپ کے سوشل جمہوریت پسندوں کی طرح سیکولر سوشلزم کے گمراہ کن نعرے لگائے تو چودھری خلیق الزماں بہت پریشان ہوا اور اسے نہرو کی اس مہم میں طبقاتی جنگ کا خطرہ نظر آیا۔ چنانچہ اُس نے 15/ مارچ 1938ء کو گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ''برطانوی سامراج کے علاوہ ہمیں اپنی صفوں میں ان غیر منظم قوتوں سے بھی خطرہ لاحق ہے جو ہمارے معاشرتی ڈھانچے اور روحانی پس منظر کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ سرخ روس میں سرکردہ اشخاص اور ممتاز شہریوں کے خلاف وطن اور کمیونسٹ نظریے کے نام پر روزانہ جو سرعام مقدمے چلائے جا رہے ہیں وہ میرے جیسے انداز فکر رکھنے والوں کو یہ حوصلہ نہیں دیتے کہ وہ اپنے عوام میں طبقاتی جنگ کے خیالات کے فروغ کو چیلنج نہ کریں بالخصوص ایسی حالت میں کہ ہمیں مشترکہ دشمن کے خلاف جدوجہد میں ہر ایک ہندوستانی کی شرکت کی ضرورت ہے۔''[7] برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی سٹیج پر چودھری خلیق الزماں جیسے عناصر سیاسی طور پر اس قدر رجعت پسند تھے کہ وہ جواہر لال نہرو جیسے لوگوں کو ''خطرناک ملحد و کمیونسٹ'' تصور کرتے تھے حالانکہ یہ ''خاندانی رئیس'' محض کمیونزم کا سدباب کرنے اور مروجہ معاشرتی نظام کو برقرار

رکھنے کے لئے سوشل ڈیموکریسی کے نعرے لگاتے تھے۔

محمد علی جناح انگلستان میں کئی سال تک قیام کرنے کے بعد جب 1936ء میں واپس ہندوستان آ گئے تو اُنہیں یو۔ پی اور ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کے حالات سے اچھی طرح آ گاہی نہیں تھی۔ ان کی جانب سے یو۔ پی کے مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور چودھری خلیق الزماں کے ہاتھوں میں دینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ خود ازسرتاپا جدیدیت پسند بورژوا ہونے کی وجہ سے یو۔ پی کے رجعت پسند نوابوں اور تعلقہ داروں کے خلاف تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ چونکہ خلیق الزماں کا سیاسی پس منظر خلافتی، سوراجی اور کانگرسی تھا اس لئے امید کی جاسکتی تھی کہ انتخابات کے بعد مسلم لیگ اور کانگرس میں کوئی نہ کوئی مفاہمت ہوجائے گی۔ لیکن یو۔ پی میں خلیق الزماں کے اصلی موقعہ پرستانہ کردار کو کانگرسی لیڈروں کے علاوہ اس کے مسلمان سیاسی حریف بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے ان مسلمان سیاسی حریفوں میں میرٹھ کا ایک جغادری جاگیردار محمد یامین خان بھی تھا۔ یہ شخص برطانوی سامراج کا پشتینی پٹھو بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ تھا۔ یہ بڑے ''صاحب بہادروں'' کی طرح ڈائری لکھا کرتا تھا۔ اس نے اپنی اسی ڈائری کی بنیاد پر تحریر کردہ سوانح عمری شائع کی ہے جو تقریباً 1550 صفحے پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ سوانح عمری پڑھی جائے تو برصغیر کے مسلمان جاگیرداروں، نوابوں اور تعلقہ داروں کی بڑی گھناؤنی تصویر سامنے آجاتی ہے اور یہی اس کتاب کی خوبی ہے۔ اس نے چودھری خلیق الزماں کے برعکس حالات و واقعات کو توڑنے مروڑنے کی بہت کم کوشش کی ہے۔ بعض جگہوں پر تو اُس نے اپنے اور اپنے طبقہ کے بارے میں بڑی صاف دلی سے ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن پر اُسے پردہ ڈالنا چاہیے تھا۔ اُس نے یہ بات کہیں بھی نہیں چھپائی کہ اسے ہندوستان کے ہر وائسرائے اور یو۔ پی کے ہر گورنر تک رسائی حاصل ہوتی تھی اور یہ اکثر کام ان کے مشوروں اور ہدایات کے مطابق کیا کرتا تھا اور انہیں وقتاً فوقتاً یہ بھی یقین دلایا کرتا تھا کہ نہ صرف وہ خود اور اُس کا جاگیردار طبقہ بلکہ برصغیر کے سارے مسلمان برطانوی سلطنت کے وفادار ہیں اور کانگرسی لیڈر اور سارے ہندو غیر وفادار ہیں۔ اس نے یہی بے لاگ انداز تحریر چودھری خلیق الزماں کا سیاسی کردار بیان کرتے ہوئے اختیار کیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس میں اس کا اپنا طبقاتی تعصب نمایاں ہے اور مبالغہ کا عنصر بھی نظر آتا ہے لیکن یہ حق وصداقت سے سراسر عاری نہیں ہے۔

سر محمد یامین نے اپنی سوانح عمری کے دیباچے میں ہی چودھری خلیق الزماں کی کتاب ''پاتھ وے ٹو پاکستان'' کی غلط بیانیوں'' کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''خلیق الزماں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کس طرح مسلم لیگ پارٹی کے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں لیڈر مقرر ہوئے اور اپنا پورا بیان جو کانگرس کا جھنڈا بلند ہوتے وقت دیا اپنی کتاب میں نہیں دیا بلکہ اس کی مصدقہ کاپیاں موجود ہیں۔ نیز یہ صاف طور پر بیان کرنا چاہیے تھا کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کو چھوڑ کر، جس میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بنے تھے، کراچی کیوں آ گئے اور فوراً ہی استعفیٰ کیوں نہیں بھیجا۔''[8] ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ ''مسٹر جناح نے 1929ء ماہ مارچ میں اپنی مسلم لیگ کی میٹنگ دہلی میں بلائی تھی جو اس مسلم کانفرنس کے بعد تھی جس کی صدارت آغا خان نے کی تھی۔ اسمبلی میں مسٹر جناح کی پارٹی کے سب مسلمان ممبروں نے، جو اس کانفرنس کے محرک تھے، مسٹر جناح سے بہت اختلاف رائے کیا تھا۔ اس لئے انہوں نے دہلی میں اپنی مسلم لیگ کا اجلاس طلب کیا تھا اور اپنے چودہ نکات بنائے تھے جو اس کانفرنس کے اغراض کو سامنے رکھ کر بنائے جو زیر صدارت آغا خان ہوئی تھی۔ جن کو وہ پیش کرانا چاہتے تھے۔ لیکن چند کانگرسی پٹھو جو کانگرس کے اشارے پر انتخاب مشترکہ کرانا چاہتے تھے چونکہ مسلمان پبلک میں نہایت بدنام تھے اور ان کا کوئی اثر نہیں تھا اور انتخاب جداگانہ سے منتخب ہونے کی کوئی امید نہیں تھی یہ سب دہلی میں مسلم لیگ کے کمرے میں پہنچ گئے۔ جن میں رفیع احمد قدوائی، خواجہ عبدالحمید، چودھری خلیق الزماں اور ڈاکٹر عالم وغیرہ تھے۔ انہوں نے چاہا کہ مسٹر جناح کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر انتخاب مشترکہ کا ریزولیوشن پاس کر دیں اور پبلک کو دکھائیں کہ جناح لیگ نے انتخاب مشترکہ اور نہرو رپورٹ کو منظور کر لیا ہے اس لئے اپنے میں سے ایک کو صدر جلسہ منتخب کر لیا تھا اور دروازے بند کر دیئے تھے لیکن مسلم لیگ کے اسسٹنٹ سیکرٹری نے پولیس کی مدد سے ان سب کو باہر نکال دیا جو مسلم لیگ کونسل کے ممبر نہیں تھے اور نہ چندہ دیا تھا لہٰذا جناح جو دیر سے میٹنگ میں پہنچے جب یہ گڑبڑ کرنے والے نکالے جا چکے تھے اور اُن کا بنایا ہوا ریزولیوشن آگ کی نذر کر دیا لیکن وہ چودہ نکات مسلم لیگ کے سامنے پیش نہ کر سکے مگر پبلک کے سامنے آ گئے کیونکہ وہ چھپ چکے تھے۔''[9]

سر محمد یامین خان نے جناح کی جانب سے 1936ء کے اوائل میں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کا ذکر بھی بڑی صاف گوئی سے کیا ہے۔ وہ 16ر فروری 1936ء کی ڈائری

میں لکھتا ہے کہ ''اس زمانے میں کچھ وہ مسلمان جن کا قوم میں کوئی ذاتی وقار نہیں ہے اور کسی حلقہ سے اپنے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں کھڑے نہیں ہو سکتے اور کانگرس کے پٹھو ہیں اور یونٹی بورڈ کے نام کا ڈھونگ بنایا تھا۔ ان کو میرے الیکشن (1934ء) میں اپنی ساری قوت کا اندازہ ہو گیا اور بُری طرح شکست کھائی۔ اب انہوں نے اپنے ساتھ ان مسلمانوں کو ملایا جو اپنا روپیہ خرچ نہیں کر سکتے تھے اور بغیر پارٹی کی امداد کے الیکشن میں نہیں کھڑے ہو سکتے تھے۔ ان میں یو۔ پی کے خاص پارٹی بند چودھری خلیق الزماں اور رفیع احمد قدوائی اور دو تین پنجاب کے ہیں۔ یہ دہلی میں جمع ہوئے کہ مولانا شوکت علی کی امداد حاصل کریں اور نواب محمد اسماعیل کو شیشے میں اُتارا چونکہ وہ الیکشن میں کافی روپیہ برباد کر چکے تھے اور اب خرچ نہیں کر سکتے تھے اور مسٹر جناح سے ان کے تعلقات دوستانہ 1924ء لغایت 1930ء بہت ہو گئے تھے اور مسٹر جناح ان کی بہت مانتے تھے چونکہ یہ اُن کی انڈیپنڈنٹ پارٹی کے ممبر رہے تھے۔ 1934ء میں چونکہ نواب اسماعیل مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری عیوضی طور پر کر رہے تھے اور مستقل خزانچی تھے اور نیشنلسٹ گروپ اور دیگر ممبران نے اُمید دلائی تھی کہ وہ وائس چانسلر ہو جائیں گے اسی لئے (1934ء) میں سنٹرل اسمبلی میں کھڑے نہیں ہوئے تھے۔ چودھری خلیق الزماں نے نواب اسماعیل کو تیار کیا کہ مسٹر جناح کی پوزیشن سے فائدہ اُٹھایا جائے کہ وہ مسلم لیگ کے صدر پھر ہو گئے ہیں اور اب دو لیگیں نہیں رہیں چونکہ شفیع لیگ تو ختم ہو گئی اور اب جناح لیگ اور شفیع لیگ کے سب لوگ ایک لیگ میں ہیں۔ ان کو تیار کیا جائے کہ وہ لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی الیکشن لڑیں اور آپ بھی لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں۔ نواب اسماعیل خان یہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ چودھری خلیق الزماں کانگرسی ہیں اور کانگرس کے ٹکٹ پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کے کسی حلقے سے وہ کامیاب نہیں ہو سکتے اور یونٹی بورڈ کا ڈھونگ سب سمجھ گئے ہیں کہ یہ کانگرسی مسلمانوں اور کچھ خلافت والوں کی مشترکہ جماعت ہے جسے کچھ علمائے دیوبند کی حمایت حاصل ہے مگر یہ مسلم زمینداروں کا یو۔ پی میں مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مسٹر جناح کا رجحان ابھی تک ہندوؤں کی طرف ہے لیکن وہ گورنمنٹ کے مخالف رہے ہیں اور اب بھی ہیں اور ان کو کوئی شخص یہ الزام نہیں دے سکتا کہ وہ کوئی ذاتی لالچ گورنمنٹ سے رکھتے ہیں اس لئے ان کا دامن اس سے پاک ہے۔ لیکن ساتھ میں صرف یہ کمزوری ہے کہ وہ صرف اس مطالبہ پر رائے دیتے ہیں اور اسپیچ کہتے ہیں کہ جہاں ان کا نام ہو کہ انہوں نے یہ شکست گورنمنٹ کو دی اور اپنی نمود چاہتے ہیں۔ پبلک اس کمزوری سے

واقف نہیں، ہم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں۔ نواب اسماعیل خان سادہ طبیعت واقع ہوئے ہیں۔ وہ اس پھندے میں پھنس گئے اور انہوں نے مولانا شوکت علی کی مدد سے خلیق الزماں کو ساتھ لے کر مسٹر جناح کو تیار کر لیا کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی الیکشن لڑے جائیں۔

''مسٹر جناح نے ابھی تک اپنا دل بڑے زمینداروں سے صاف نہیں کیا چونکہ وہ سب متفقہ طور پر انتخاب جُداگانہ کے حامی تھے اس لئے شفیع لیگ میں تھے اور جناح لیگ جو کلکتہ میں دسمبر 1928ء میں ہوئی اس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے اور اس کے مخالف تھے اور اسی زمانے میں سر آغا خان کی زیر صدارت جو جلسہ دہلی میں ہوا اس میں، میں شریک ہوا تھا۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات کے بعد یہ شرط کہ اگر ہندو ان کو منظور کر لیں تو انتخاب مشترکہ منظور کیا جائے گا۔ اس پر مسلمان تیار نہیں تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوؤں کے ہاتھ میں گردن کسی قیمت پر نہیں دینی چاہیے۔ مسٹر جناح کو وہ اس معاملے میں ناتجربہ کار سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ وہ بمبئی میں اونچے طبقہ والوں سے ملتے ہیں ان کو یو۔ پی اور بہار کا تجربہ نہیں ہے۔ لیکن کانگرسی مسلمان اس پر مسٹر جناح سے قطعی متفق تھے چونکہ وہ جانتے تھے کہ کانگرس ہمیشہ ہندوؤں کی ووٹیں انہیں دلائے گی۔ رفیع احمد قدوائی، اے۔ ایم خواجہ، چودھری خلیق الزماں وغیرہ نے یہ اطمینان گوبند بلبھ پنت کو دلا رکھا ہے کہ اگر وہ الیکشن میں کامیاب ہو کر آ گئے تو انتخاب مشترکہ کو مسلمانوں کی ایک جماعت سے منظور کرا دیں گے اور ہر بات میں کانگرس سے تعاون کریں گے۔ مسٹر جناح بڑے زمینداران یو۔ پی کو پسند نہیں کرتے لیکن ان کے قطعی مخالف ہو کر کامیابی نہیں دیکھتے۔ اِدھر پنجاب میں سر فضل حسین کی پارٹی کے خلاف کوئی دال نہیں گل سکتی۔ اس لئے اس پر تیار ہو گئے کہ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے جائیں اور زمینداروں کو مشورہ میں شامل کیا جائے لیکن ان کو نمائندگی کم دی جائے اور پارلیمنٹری بورڈ جو نمائندے منتخب کرے گا اس میں زمیندار گروپ جو اس وقت برسراقتدار رہے اور جس کی یو۔ پی میں گورنمنٹ ہے، کو نمائندگی بہت کم دی جائے گی تا کہ ان کے نمائندے الیکشن میں صرف وہ لئے جائیں جن کو مسلم لیگ شکست نہیں دے سکتی۔ بقیہ سب وہ لوگ ہوں گے جو اپنے آپ کو نیشنلسٹ یعنی ہندوؤں کا جاسوس کہتے ہیں اور گورنمنٹ انگریزی کو کمزور کر کے مسلمانوں کی گردن میں رسی ڈال کر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں۔ اس نے سب کو مشورے کے لئے جو اس وقت کونسل آف انڈیا مسلم لیگ میں ہیں اس کے بعد قطعی فیصلہ دیں

گے۔تاریخ اس مشورہ کی اپریل کی کوئی تاریخ ہوگی۔"[10]

سرمحمد یامین جون 1936ء میں مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ سے نواب چھتاری اور سرمحمد یامین کے مستعفی ہونے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان کے اس استعفیٰ کے بارے میں چودھری خلیق الزماں کا بیان چھپا ہے۔ وہی خلیق الزماں جو کہ "سازشیوں کے سرکردہ ہیں اور جو اب تک کانگرسی بھی ہیں اور اس حق کو چھنوانا چاہتے ہیں اور اب کانگرس کے جاسوس کی حیثیت سے مسلم لیگ میں شامل ہو کر اندر سے خلفشار پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بیان صاف ظاہر کرتا ہے کہ بھیڑ کی کھال پہن کر بھیڑیا بول رہا ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ کانگرس کا جاسوس مسلم لیگ میں داخل ہو کر مسلمانوں کو تباہ کرنا چاہتا ہے اور وہ حق چھنوانا چاہتا ہے جس کو نواب وقارالملک، سر آغا خان اور نواب سلیم اللہ خان ڈھاکہ والے نے اصولاً منوایا تھا اور جو 1917ء میں ہندوؤں نے مان لیا تھا اور جس کے لئے ہم اس وقت تک لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے لئے ملازمتوں میں حصہ اڑھائی فیصدی سے بڑھوا کر 25 فیصدی میں نے اور میرے ساتھیوں نے کرایا ہے۔"[11]

پھر 1937ء کے انتخاب کے بعد جب یو۔پی کی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی قیادت کے انتخاب کا موقع آیا تو سر یامین خان کے بیان کے مطابق چودھری خلیق الزماں نے سازش کر کے جناح سے اپنی نامزدگی کرالی حالانکہ نواب اسماعیل خان اس عہدہ کا مستحق تھا کیونکہ پارٹی کے ارکان کی اکثریت اس کے حق میں تھی۔ سر یامین لکھتا ہے کہ "جناح کو مدعو کیا گیا اور ان کو خفیہ طور پر سمجھایا گیا کہ نواب اسماعیل خان فوری طور پر کھڑے ہو کر تقریر نہیں کر سکتے اور پہلے جب مرکزی اسمبلی میں تھے تو کوئی تقریر چھ سال کے عرصے میں نہیں کی تھی۔ اس لئے اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کا لیڈر خلیق الزماں کو کر دیا جائے جو وہاں لڑائی لڑتے رہے ہیں اور صوبائی لیگ کے صدر نواب اسماعیل خان ہوں۔ چونکہ صوبہ میں ان کی عزت و وقعت ہے اور خلیق الزماں کو اودھ کے باہر کوئی نہیں جانتا۔ مسٹر جناح اس پر تیار ہو گئے۔ تب پارلیمنٹری بورڈ میں یہ تجویز کی گئی کہ مسٹر جناح پر چھوڑ دیا جائے کہ جس کو چاہیں منتخب کر لیں۔ نواب اسماعیل خان اس اندرونی سازش سے قطعی ناواقف تھے۔ وہ بھی رضامند ہو گئے۔ مسٹر جناح نے بھی فیصلہ دیا کہ نواب اسماعیل خان صوبائی لیگ کے صدر ہوں اور چودھری خلیق الزماں اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر ہوں۔ اس طرح چودھری خلیق الزماں منسٹری کے مستحق بنے چونکہ اب وہ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر ہو گئے اگرچہ

مسلم لیگی ممبران کی اکثریت نواب اسماعیل خان کے ساتھ تھی۔ ''[12]

12 رمئی 1933ء میں نواب سر محمد یامین خان لکھتا ہے کہ '' آج بادشاہ جارج ششم کی لندن میں تاج پوشی ہوئی اور بادشاہ کے حکم سے مجھ کو تاج پوشی کا تمغہ ملا۔ جس پر بادشاہ اور ملکہ کی تصویر ہے اور بادشاہ کی طرف سے سرٹیفکیٹ ملا کہ میں اس تمغہ کو لگاؤں...... جمیعت العلماء کے مولویوں نے مسلم لیگ کی مدد اس اندرونی سازش کے تحت کی تھی کہ مسلم لیگ کے ممبران الیکشن کے بعد کانگرس میں شامل ہو جائیں گے اور ایک ریزولیوشن مرادآباد میں لیگ کی معاونت کا پاس کر دیا تھا۔ خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان نے ایک مسودہ پر دستخط کر کے کانگرس کو دے دیئے تھے کہ وہ کانگرس کے ساتھ تعاون کریں گے اور کانگرس کے ساتھ رہیں گے۔ اس کے بعد خلیق الزماں جواہر لال نہرو کے پاس پہنچے کہ وہ ان کو اور نواب اسماعیل کو وزارت میں لے لیں جیسا کہ ابوالکلام آزاد نے ان کو اطمینان دلایا ہے لیکن جواہر لال نہرو نے ترکیب چلنی شروع کر دی اور کہا کہ صرف ایک کو لیا جائے گا۔ چونکہ رفیع احمد قدوائی کانگرس کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے تھے وہ لئے جائیں گے۔ جواہر لال نہرو کی نواب اسماعیل خان سے پرانی دوستی تھی اس لئے وہ ان کی طرف مائل تھے۔ یہ بھی نہرو نے کہا کہ کانگرس کے ٹکٹ پر دستخط کر دو تو لے لئے جاؤ گے۔ خلیق الزماں بھاگے ہوئے میرٹھ آئے۔ نواب اسماعیل خان نے کانگرس میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میرٹھ کی ساری مسلمان پبلک مجھ کو حقارت سے دیکھے گی اور مسٹر جناح کو میں کیا منہ دکھاؤں گا...... جمیعت العلماء نے الٰہ آباد میں جلسہ کر کے اپنے آپ کو لیگ سے علیحدہ کر دیا اور مولوی احمد سعید دہلی والے نے خط اس مضمون کا لکھ دیا کہ جمیعت لیگ سے علیحدہ ہو گئی۔ نواب اسماعیل خان کے انکار کے بعد خلیق الزماں نے، جو اب بھی کانگرسی خیال کے تھے، یہ چاہا کہ وہ اگرچہ معاونت کے معاہدے پر تو دستخط کر چکے ہیں اب خفیہ طور پر کانگرس کی ممبری پر دستخط کر دیں۔ یہ خبر جمیعت العلماء کے ذریعے حافظ محمد ابراہیم نگینہ والے کو ہو گئی اور انہوں نے خلیق الزماں پر سبقت کر کے کانگرس کی ممبری پر دستخط کر دیئے لہٰذا کانگرس نے حافظ محمد ابراہیم اور رفیع احمد قدوائی کو وزارت میں لے لیا...... چودھری خلیق الزماں کی تمام امیدوں اور منصوبوں پر جو دو سال میں بنائے تھے پانی پھر گیا...... ان کی تمام ریشہ دوانیوں کا نتیجہ ان کی شکست میں نمودار ہوا اور یہ منہ دیکھتے رہ گئے۔ اب ان کی کانگرس سے لڑائی شروع ہو گئی ہے اور وہاں بھی ان کا اعتبار ختم ہو گیا لیکن یہ اس

کوشش میں ہیں کہ اب بھی سمجھوتہ ہو جائے۔''[13] نواب یامین نے مارچ 1940ء کی قرارداد لاہور کا ذکر کرتے ہوئے بھی چودھری خلیق الزماں کو نہیں بخشا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''چودھری خلیق الزماں سے جو چار سال قبل تک پہلے کانگرسی تھے، اس لئے تائید کرائی گئی کہ یہ اس سے منحرف ہو کر کانگرس سے پھر نہ جاملیں۔''[14]

30/اگست 1942ء کو جبکہ انڈین نیشنل کانگرس کرپس پلان کو مسترد کر کے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پرتشدد تحریک شروع کر چکی تھی، ہندو مہاسبھا کے جنرل سیکرٹری راجہ مہیشور دیال سیٹھ کی جانب سے برصغیر کی تقسیم کے بارے میں ہندوستان ٹائمز میں ایک بیان شائع ہوا۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ اس نے اپنے بیان میں تقسیم کا جو فارمولا پیش کیا ہے اس کی بنیاد ان باتوں پر ہے جو لیگ کے ایک سربرآوردہ ممبر نے مسٹر جناح کی طرف سے بتائی تھیں۔ اس کا فارمولا یہ تھا کہ:

1۔ ایک کمیشن ان علاقوں کی حد بندی کرے گا جہاں شمال مغرب اور شمال مشرق میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔
2۔ ان علاقوں میں ہر بالغ کو رائے دینے کا حق ہوگا کہ آیا وہ ہندوستان کے دیگر حصہ سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے یا نہیں۔
3۔ علیحدگی کی صورت میں مغربی اور مشرقی علاقوں کے درمیان راستہ نہیں دیا جائے گا۔
4۔ بقیہ علاقوں میں، جو ہندوستان کے ہوں گے، ان میں مسلمان اقلیت کے لئے کوئی حقوق نہ مانے جائیں گے۔ دونوں حصوں کو حق ہوگا کہ وہ مذہبی اقلیتوں کے واسطے کوئی سمجھوتہ کر لیں۔
5۔ گورنمنٹ مشینری قائم کی جائے گی جو آبادی کی منتقلی اپنے انتظام سے کرے گی۔
6۔ دیسی ریاستیں علیحدہ کر دی جائیں گی۔

نواب یامین کا الزام یہ ہے کہ چودھری خلیق الزماں نے قائداعظم سے بالا بالا مہیشور دیال سیٹھ سے اس فارمولے کے بارے میں گفت وشنید کی تھی۔ ''لیکن قائداعظم نے کہا کہ انہوں نے کبھی کسی کو ایسی گفتگو ان کی طرف سے کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی طرف سے گھڑ کر بیان کر دی ہوگی۔''[15] اس واقعہ کے تقریباً پانچ سال بعد یعنی 15/اگست 1947ء کو جب ہندوستان کو آزادی ملی اور چودھری خلیق الزماں نے مرکزی مسلم لیگ اسمبلی کے

قائد کی حیثیت سے ہندوستانی پرچم کو سلامی دی، حلف وفاداری اُٹھایا اور پھر اپنی تقریر میں وعدہ کیا کہ اب ہم فرقہ وارانہ سوال نہیں اٹھائیں گے تو سر محمد یامین خان کا ردعمل یہ تھا کہ ''اب اس شخص نے چالاکی سے نواب اسماعیل خان کو اس لئے ہٹایا اور خود لیڈر بن کر جواہر لال نہرو کی خوشامد شروع کی ہے کہ وزارت مل جائے۔ جس کے لئے اس نے جان توڑ کوشش اپنی تمام عمر کی تھی۔''[16]

5ر ستمبر 1947ء کو نواب یامین خان کانپور سے بذریعہ گاڑی لکھنؤ جا رہا تھا کہ دہلی سے ایک شخص سردار جوگندر سنگھ اس کے ''کوپے'' میں آ گیا۔ یہ شخص اسمبلی میں کانگرس پارٹی کا ڈپٹی وِہپ تھا اور اودھ کا تعلقہ دار تھا اور یامین خان کا بڑا دوست تھا۔ سردار جوگندر سنگھ نے اپنی باتوں میں بتایا کہ ''چودھری خلیق الزماں نے اوّل کوشش کی کہ ان کو مرکزی وزارت میں لیا جائے لیکن جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل دونوں نے نامنظور کر دیا۔ اب وہ اس کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ یو۔ پی کی وزارت میں لئے جائیں مگر پنڈت گوبند بلبھ پنت ان کو ہرگز نہ لے گا...... وہ خلیق الزماں کو بہت بُرا، ناقابل اعتبار اور چالاک وخود غرض سمجھتے ہیں۔ پہلے کانگرسی تھے پھر کانگرس کے خلاف مسلم لیگ میں داخل ہو کر سودے بازی کی اور اپنی بے اعتباری کا پورا ثبوت دے چکے۔ وہ مطلب کے یار ہیں اس لئے کانگرسی حلقوں میں سب ان کے خلاف ہیں...... کانگرسی لیڈر ان کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ان کی باتوں میں آنے والے نہیں۔ جب تک انتخاب مشترکہ رائے سے ہونے کی اُمید تھی یہ کانگرسی علمبردار تھے۔ جب میکڈانلڈ ایوارڈ نے انتخاب جداگانہ قائم رکھا تو یہ مسلم لیگ میں جا شامل ہوئے چونکہ کانگرس ٹکٹ پر منتخب ہونے کی کوئی امید نہیں رہی تھی۔ اب پاکستان جدا ہو جانے سے انتخاب جداگانہ ختم ہو جائیں گے تو یہ پھر کانگرس میں آنا چاہتے ہیں۔ ان کی وہی مثال ہے جو چرندوں پرندوں کی لڑائی کا قصہ اسکول کی کتابوں میں پڑھا ہے۔''[17] ستمبر کے اواخر میں نواب یامین کی دہلی میں پہلے ابوالکلام آزاد کی کوٹھی میں اور پھر رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی میں خلیق الزماں سے ملاقات ہوئی۔ ''ایک گھنٹے باتیں ہوئیں جس میں قائداعظم کی بابت وہ خراب الفاظ استعمال کئے جن کو تحریر کرنا خلاف تہذیب ہے۔ لب لباب یہ تھا کہ ایک خودسر شخص ہم سب کو تباہ کر کے پاکستان ادھورا لے کر وہاں کا گورنر جنرل بن بیٹھا اور یہاں کشت وخون جاری کرا گیا۔ کیبنٹ مشن پلان بہت اچھی تھی اس کو طرح طرح سے ٹھکرا دیا اور مسلمانوں کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ یہاں مسلمانوں کا آئندہ حال بہت تاریک اور مصیبتیں بھگتیں گے۔ ہم نے بہت زور دیا کہ کیبنٹ

پلان منظور کرلو مگر اس کو ٹھکرا کر بٹا ہوا پنجاب اور بٹا ہوا بنگال لے کر کل قوم کو مصیبت کے گڑھے میں ڈال دیا جس کا نتیجہ یہ فسادات اور کشت وخون ہے"[18] اور پھر 9ردسمبر لغایت 31ردسمبر 1947ء کی دہلی کی ڈائریوں میں نواب یامین کی تحریر یہ ہے کہ "چودھری خلیق الزماں جوترکیبوں اور ہتھکنڈوں سے مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر بن گئے تھے اور وزارت کا خواب دیکھنے لگے تھے اور یہاں مایوس ہو گئے تھے۔ پھر مولانا آزاد نے ان کو کراچی بھجوایا تھا کہ مسٹر جناح کو سمجھائیں۔ لیکن مالی فائدہ وہاں دیکھ کر وہاں رہ پڑے حالانکہ قائداعظم کی مرضی کے بالکل خلاف تھا اور یہاں استعفیٰ بھی نہیں بھیجا کہ ان کی جگہ دوسرا مسلم لیگی ہوجائے۔ مسلمان لیڈروں کے یہ کارنامے ہیں۔"[19]

بلاشبہ میرٹھ کے اس رجعت پسند اور سامراج نواز جاگیردار نے چودھری خلیق الزماں کے سیاسی کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں اس کی درمیانہ طبقہ کے خلاف طبقاتی نفرت وحقارت نمایاں ہے۔ لیکن اس کے باوجود نواب سرمحمد یامین خان کی ڈائری کی متذکرہ تحریروں کو کئی وجوہ کی بنا پر سراسر بے حقیقت و بے صداقت تصور نہیں کیا جاسکتا۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یامین خان کی سوانح عمری پڑھنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص نے اپنی زندگی کے سیاسی ومعاشرتی حالات کے بیان میں کوئی نمایاں ہیرا پھیری نہیں کی۔ اس نے اپنے بارے میں بھی بے وقوفی یا سادہ لوحی یا صاف دلی کی بنیاد پر بہت سی باتیں ایسی لکھی ہیں جن سے اس کی شخصیت خاصی بدنما نظر آتی ہے۔ یہ شخص 1970ء میں شائع شدہ اپنی سوانح عمری میں ایسی باتیں بآسانی حذف کرسکتا تھا یا انہیں اس طرح پیش کرسکتا تھا کہ اس کی سیاسی ومعاشرتی شخصیت کا بدصورت پہلو سامنے نہ آئے۔ جو شخص اپنے بارے میں بھی حقائق کو توڑنے اور مروڑنے کی نمایاں کوشش نہیں کرتا اس کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اس نے خلیق الزماں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سراسر بے جواز اور بے بنیاد نہیں ہوسکتا۔ نواب یامین خان نے یہ انداز تحریر صرف خلیق الزماں کے بارے میں ہی اختیار نہیں کیا بلکہ اس نے نوابزادہ لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی، ابوالکلام آزاد، نواب اسماعیل خان اور دوسرے بہت سے سیاسی زعماء کے علاوہ قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں ایسی ہی صاف بیانی کا مظاہرہ کیا ہے۔ کئی جگہ انسان اس کی صاف بیانی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایسے منہ پھٹ رجعت پسند مؤرخین ان نام نہاد مہذب وترقی پسند مؤرخین سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں جو ہر تاریخی واقعہ کو اپنی یا اپنے طبقے کی مصلحت کے تحت توڑنے مروڑنے میں کوئی تامل

نہیں کرتے ہیں۔ یامین خان کی اِن تحریروں پر بہت حد تک اعتبار کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی تائید چودھری خلیق الزماں کی خودنوشت سوانح عمری سے بھی ہوجاتی ہے۔ اگرچہ خلیق الزماں نے ان تمام حقائق پر پردہ ڈالا ہے یا انہیں توڑا مروڑا ہے جن کی بنیاد پر اُسے سیاسی مجرم قرار دیا جاسکتا تھا۔ تاہم یہ اپنی اس کوشش میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا کیونکہ تاریخ کا ہر سنجیدہ طالب علم اس کی کتاب کے ہر صفحے پر اس کی چالاکی، ہیرا پھیری اور غلط بیانی کی بآسانی نشاندہی کرسکتا ہے اور پھر ''دروغ گورا حافظہ نداردؔ'' کے مصداق یہ کئی جگہوں پر اپنے بیانات کی خود ہی تردید بھی کردیتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے کوئی اہل نظر اس تاثر سے بچ نہیں سکتا کہ اس کی سیاسی زندگی مصلحت کوشی، موقع پرستی اور ابن الوقتی سے بھرپور تھی۔ اس کی سیاست کی بنیاد کبھی بھی کسی غلط یا صحیح اصول ونظریے پر نہیں رہی تھی۔ 12-1910ء میں یہ خلافت عثمانیہ کی امداد کی سیاست میں محض اس لئے ملوث ہوگیا تھا کہ برصغیر کی مسلم رائے عامہ ترکوں کی زوال پذیر سلطنت کے حق میں اور برطانوی سامراج کے خلاف تھی۔ 17-1914ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد اس کے تحریک خلافت میں شامل ہونے کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان دنوں مسلم لیگ کی تنظیم مٹھی بھر مسلمان جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر مشتمل تھی اور وہ برصغیر کی مسلم رائے عامہ کی سامراج دشمنی کا ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ ابوالکلام آزاد، گاندھی اور علی برادران نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا اور چودھری خلیق الزماں بھی اس سیاسی بارات میں شامل ہوگیا۔ جب 1926ء میں تحریک خلافت ناکامی پر منتج ہوئی تو موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس کی سوراج پارٹی کا ستارہ عروج پر تھا۔ چنانچہ یہ بلا تامّل ان کی پارٹی میں شامل ہوگیا اور پھر جب کچھ عرصے کے بعد سوراج پارٹی پھر کانگرس میں مدغم ہوگئی تو خلیق الزماں کانگرس کے جلوس میں شریک ہوگیا۔ اس نے 1932ء میں غیر مسلم لیگی مسلمان لیڈروں کی یونٹی کانفرنس کی ناکامی کے بعد اپنا مسلم یونٹی بورڈ اس لئے بنایا تھا کہ اسے جداگانہ انتخاب کے تحت کانگرس کے ٹکٹ پر صوبائی یا مرکزی اسمبلی کے لئے کامیاب ہونے کی کوئی اُمید نظر نہیں آتی تھی۔ قبل ازیں یہ سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر شکست کھاچکا تھا۔ 1936ء میں یہ مسلم لیگ سے اس لئے منسلک ہوگیا تھا کہ یہ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کے سیاسی وقار سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ تنہا اپنے یونٹی بورڈ کے سہارے یو۔ پی کے مسلمان جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی سیاسی زندگی کا انتہائی داغدار سال 1937ء کا سال ہے جبکہ اس نے مسلم

لیگ کے ٹکٹ پر پہلی مرتبہ صوبائی اسمبلی کا رکن منتخب ہو کر اور لیگ اسمبلی پارٹی کا لیڈر نامزد ہو کر کانگرس کی وزارت میں شامل ہونے کی سرتوڑ کوشش کی۔ چونکہ 39-1938ء میں برصغیر کی مسلم رائے عامہ ہندوراج کے خوف کی بنا پر مسلم لیگ کی طرف مائل ہو گئی تھی اور مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں مسلمانوں کی علیحدہ مملکت کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا اس لئے خلیق الزماں بھی یکا یک برصغیر کی تقسیم کا علمبردار بن گیا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ مطالبہ کانگرس سے ہر سطح پر سودا بازی کرنے کے لئے ایک مؤثر سیاسی حربہ ثابت ہوگا۔ جب اگست 1947ء میں پاکستان وجود میں آ ہی گیا اور اسے جناح کی ہدایت کے مطابق ہندوستان میں ہی رہنا پڑا تو یہ پھر دوقومی نظریے کے خلاف ہو گیا اور اس کی رائے یہ تھی کہ یہ نظریہ نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بلکہ ہر جگہ کے مسلمانوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ لیکن جب اکتوبر 1947ء میں اس نے اچانک پاکستان میں آ کر یہیں مستقل طور پر ڈیرے ڈال دیئے تو یہ پھر دوقومی نظریے کا علمبردار بن گیا۔ لیاقت علی خان کی تائید وحمایت اور اپنے روایتی جوڑ توڑ کی بنا پر یہ پہلے فروری 1948ء میں پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر بن گیا اور پھر فروری 1949ء میں متفقہ طور پر اس کا صدر منتخب ہو گیا۔ جب یہ ہندوستان کے بے آسرا اور بے سہارا مسلمانوں سے دغا کر کے پاکستان میں وارد ہو گیا تھا تو قائداعظم جناح کو اس پر اتنا غصہ آیا تھا کہ جتنی دیر وہ زندہ رہے انہوں نے اس کو کبھی ملاقات کا موقع نہیں دیا تھا اور پھر مس فاطمہ جناح نے بھی کبھی اس کو منہ نہیں لگایا تھا۔ اس کی قوم پرستی اور ترقی پسندی کا بھانڈا 1949ء میں بین الاقوامی سٹیج پر پھوٹ گیا تھا۔ جبکہ اس نے برطانوی سامراج کے کہنے پر عالم عرب میں اسلامستان کا ڈھونگ رچانے کی بھونڈی کوشش کی تھی۔ یہ کوشش اس قدر بھونڈی تھی کہ روزنامہ ڈان کو بھی اس سے بے تعلقی کا اظہار کرنا پڑا تھا۔ نواب یامین خان نے خلیق الزماں کے 1937ء کے سیاسی کردار کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کی بہت حد تک تائید ابوالکلام آزاد، ستیہ مورتی، خالد بن سعید اور بعض دوسرے مؤرخین کے علاوہ جناح کے 3رمئی 1937ء کے ایک بیان سے بھی ہوتی ہے۔ چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب میں صدر مسلم لیگ کے اس بیان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ جناح کا بیان یہ تھا کہ ”مجھے یقین ہے کہ یو۔ پی کے مسلمان اس نازک وقت میں مسلمانان ہند کے خلاف غداری نہیں کریں گے۔ فریق ثانی کے ساتھ محض چند افراد کا سمجھوتہ، ہر چند کہ اس سمجھوتے سے دو ایک آدمیوں کو ذاتی فائدہ پہنچنے کا امکان بھی کیوں نہ ہو،

ہمارے قومی مسائل کا حق نہیں ہے۔ یو۔ پی اسمبلی کی مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر مسٹر خلیق الزماں نے میرے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنے ہاں کے حالات سے مجھے مطلع کریں گے۔ میں ان کو اس سلسلے میں کئی بار یاددہانی بھی کرا چکا ہوں لیکن گزشتہ تین ہفتوں کے مسلسل انتظار کے باوجود انہوں نے مجھے کوئی اطلاع نہیں بھیجی۔ میں اُن کی اس پراسرار خاموشی کا مطلب سمجھنے سے معذور ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ فریق ثانی کے ساتھ ایسی کوئی مفاہمت نہیں کریں گے جسے انجام کار اُن کے صوبے ہی کے مسلمان نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے مسلمان رد کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ محض چند متفرق افراد یا چند افراد کے کسی گروہ کے ساتھ قومی مسائل کے تصفیے کی گفت وشنید کرنے کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں نکلے گا کہ مسلمان قوم کی پوری جمعیت کو درہم برہم کر کے اُسے مختلف گروہوں اور صوبائی حد بندیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔''[20]

تاہم ابوالکلام آزاد اور ستیہ مورتی کے اس الزام کی پوری طرح تائید نہیں ہوتی کہ ''خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان نے ابوالکلام آزاد کے پیش کردہ متذکرہ شرائط نامے پر دستخط کر دیئے تھے۔ لیکن یہ بیل اس لئے منڈھے نہ چڑھ سکی کہ جواہر لال ان دونوں کو وزارت میں شامل کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔'' 7رفروری 1959ء کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس کے دوران جواہر لال نہرو سے ابوالکلام آزاد کے اس ریمارک کے بارے میں پوچھا گیا تھا کہ آیا ''یو۔ پی میں مسلم لیگ مخلوط حکومت میں شامل ہونے پر آمادہ تھی بشرطیکہ چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان دونوں ہی کو وزارت میں شامل کر لیا جاتا اور ان دونوں نے کانگرس کے پروگرام کو قبول کر کے ایک دستاویز پر دستخط بھی کر دیئے تھے؟'' اس پر نہرو کا جواب یہ تھا کہ ''22 برس پہلے کی کسی بات کی تفصیلات کو دُہرانا بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چودھری خلیق الزماں اور نواب اسماعیل خان اس وقت دستخط کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کانگرس اور مسلم لیگ کی مشترکہ پارٹی کے نظم وضبط کے پابند رہنے پر مجموعی لحاظ سے تیار تھے۔ میں قطعی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ وہ مشترکہ پارٹی کے اکثریتی فیصلے کو بالعموم تسلیم کر لیتے۔ ابوالکلام آزاد کا متذکرہ ریمارک اس لحاظ سے صحیح ہے کہ مشترکہ پارٹی میں کانگرسیوں کی بھاری اکثریت ہوتی اور کانگرس ارکان جو فیصلہ کرتے اسے تسلیم کر لیا جاتا۔''[21] خالد بن سعید نے نیویارک ٹائمز کے حوالے سے اس سلسلے میں نہرو کے ایک بیان کا ذکر کیا ہے جس کے مطابق نہرو

نے یہ کہا تھا کہ "اس کی 1937ء میں خواہش تھی کہ کانگرس یو۔ پی میں زرعی اصلاحات نافذ کرے اس لئے وہ مسلم لیگ کو، جو بڑے زمینداروں کی نمائندگی کرتی تھی، وزارت میں شامل کرنے کے خلاف تھا۔ حالانکہ مسلم لیگ اکثریت کے فیصلے کی پابند رہنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔"[22] جمیعت العلمائے ہند کے مولوی احمد سعید کے 6/اگست 1937ء کے خط سے بھی خلیق الزماں کی گھٹیا سودے بازی کی تائید ہوتی ہے۔ احمد سعید نے لکھا تھا کہ "ہاں یہ تو فرمایئے کہ اس خبر میں کہاں تک صداقت ہے کہ اگر آپ کے لئے اور نواب اسماعیل خان کے لئے کوئی جگہ نکل آتی تو آپ کا کانگرس سے سمجھوتہ ہو جاتا۔ کانگرس ایک منسٹری تو نکالنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن آپ نواب صاحب کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور ان کے لئے کوئی موقع نہ تھا۔ اس لئے صلح ناتمام رہی اور کیا یہ بھی سچ ہے کہ مسٹر رفیع احمد قدوائی، جن کی آپ نے پوری امداد کی تھی اور ان کے مقابلے سے احتراز کیا تھا، انہوں نے بھی آپ کے ساتھ غداری کی۔"[23] ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی سمجھ میں بھی ابھی تک یہ راز نہیں آیا کہ یو۔ پی مسلم لیگ نے اپنی جیتی ہوئی نشست کیوں مفت میں کانگرس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ "مجھے یاد ہے کہ اس وقت عام طور پر یہ افواہ مشہور تھی کہ چودھری خلیق الزماں کی درپردہ کوشش سے رفیع احمد قدوائی کامیاب ہوئے ہیں اور چودھری خلیق الزماں ہی کے ایماء سے مسلم لیگ نے اپنا اُمیدوار کھڑا نہیں کیا تھا۔ چونکہ اس واقعہ کو بیس بائیس سال کا عرصہ گزر چکا ہے اس لئے یہ کتاب لکھتے وقت مجھے اندیشہ ہوا کہ مبادا میرے ذہن سے بعض باتیں نکل گئی ہوں۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر اشرف کو دہلی خط لکھ کر اس بارے میں مزید تصدیق کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ "رفیع احمد قدوائی عام انتخابات کے بعد ایک حلقے سے چنے گئے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلم لیگ نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی کامیابی میں خلیق صاحب کو بھی دخل تھا۔" اسی طرح الہ آباد کے حاجی محمد حسین نے جو اس زمانے میں کونسل آف سٹیٹ کے ممبر تھے اپنے ایک طویل بیان میں جو اپریل 1937ء کے تیسرے ہفتے میں ہندوستان کے بعض روزنامہ اخبارات میں شائع ہوا تھا، چودھری خلیق الزماں پر یہی الزام عائد کیا تھا...... رفیع احمد قدوائی کے اسمبلی میں داخل ہوجانے کے بعد سیاسیات نے ایک رخ پلٹا جو ہر اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے پریشان کن اور مسلم لیگ کے لئے نقصان رساں ثابت ہوا"[24] اور نواب یامین خان کا کہنا ہے کہ خلیق الزماں صوبائی وزارت میں شمولیت کی خاطر کانگرس کی ممبری پر دستخط

کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن ''یہ خبر جمعیت العلماء کے ذریعے حافظ محمد ابراہیم نگینہ والے کو ہو گئی اور انہوں نے خلیق الزماں پر سبقت کر کے کانگرس کی ممبری پر دستخط کر دیئے لہٰذا کانگرس نے حافظ محمد ابراہیم اور رفیع احمد قدوائی کو وزارت میں لے لیا۔''

پاکستان میں یہ شخص جتنی دیر پاکستان مسلم لیگ کا چیف آرگنائزر اور پھر صدر کے عہدوں پر فائز رہا اس کے لئے کسی طرف سے بھی کلمۂ خیر سنائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی اندرون خانہ ساز باز کی سیاست نے اس کو سب کے سامنے بے نقاب کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ یو۔ پی کے مہاجرین بھی اس سے نالاں تھے۔ کراچی کے اخبارات ڈان، جنگ اور انجام وغیرہ اُسے اکثر و بیشتر ہدف تنقید بناتے تھے اور پنجاب کے اخبارات کے لئے تو اس کا نام گالی بن گیا تھا۔ اسے ''مفرور الملت'' لکھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ مسلم لیگ کی پوری تاریخ میں چودھری خلیق الزماں جیسا گھٹیا آدمی اس مسند پر کبھی نہیں بیٹھا۔ اس کا کوئی سیاسی دین وایمان نہیں۔ وہ پبلک کریکٹر سے بالکل عاری ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جن کا یہ مسلک ہے کہ سیاست کو دیانت سے کوئی تعلق نہیں اور برسر اقتدار رہنے کے لئے ہر حربہ جائز ہے...... ''چودھری خلیق الزماں پاکستان کے سینے کا رستا ہوا ناسور ہے۔ اس شخص نے تنظیم ملّت کا دامن پارہ پارہ کرنے کے لئے جو سازشیں اور شرارتیں کی ہیں ان کے تصور سے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے''...... ''لیاقت علی کے دربار میں چودھری خلیق الزماں کی حیثیت ایسی ہی ہے جیسی کہ اکبر کے دربار میں ملا دو پیازہ کی ہوتی تھی۔'' جب یہ کراچی میں مہاجرین کے مسلسل پر تشدد مظاہروں کے پیش نظر مسلم لیگ کی صدارت سے مستعفی ہوا تو اس سے ایک ہفتہ قبل نوائے وقت نے اپنے طنزیہ کالم میں مہاجرین کے لئے چودھری خلیق الزماں کی ''خدمات'' گنواتے ہوئے لکھا تھا کہ ''چودھری صاحب قبلہ نے لاڑکانہ میں دھان کی بہترین مل الاٹ کرائی تو صرف اس خیال کے پیش نظر کہ غریب مہاجرین کو اچھے چاول دستیاب ہوسکیں۔ ان کی بیگم صاحبہ کراچی میں ایک ہوٹل چلانے بیٹھیں تو ان کا مقصد بھی وہی تھا کہ مہاجرین کا بھلا ہو۔ یہ ہوٹل نہ ہوتا تو مہاجر بھوکے رہتے۔ پھر چودھری صاحب نے صرف مہاجرین کی خاطر ہی اپنے فرزند ارجمند کو حکومت پاکستان کے خرچ پر بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت بھیجا تاکہ واپس آکر وہ مہاجرین کے مقدموں کی پیروی کرسکیں۔ چودھری صاحب نے مہاجرین کی بھلائی کے پیش نظر فنانس کارپوریشن کی ڈائریکٹری قبول کی ورنہ یہ عہدہ کسی ایسے آدمی کو مل جاتا جو مہاجرین کا ہمدرد نہ

ہوتا۔ اب سندھ اسمبلی میں مہاجرین کے لئے جو نشستیں خالی ہیں ان کے لئے چودھری صاحب کی بیگم صاحبہ اور بہو صاحبہ نامزدگی کی اُمیدوار ہیں تو وہ بھی محض اس لئے کہ ان سے زیادہ مہاجرین کا درد کس کے دل میں ہوگا۔ چودھری صاحب کے ایک بیٹے نے جوتوں کا کاروبار شروع کرنے کے لئے اسی کارپوریشن سے 25 ہزار کا قرضہ مانگا جس کے ابا جان ڈائریکٹر ہیں۔ اس میں بھی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں۔ مقصد صرف اس قدر ہے کہ لیگ کونسل کے اجلاس میں اگر کونسلر آپس میں لڑیں تو وہ اس جنگ میں خالص مسلم لیگی جوتے استعمال کریں......ان سب قربانیوں کے باوجود اگر لیگ روز بروز ذلیل ہو رہی ہے تو اس میں قبلہ چودھری صاحب کا کیا قصور ہے۔''[25]

لاہور کا روزنامہ امروز، سیاسی لیڈروں پر نکتہ چینی کرتے ہوئے بالعموم سخت زبان استعمال نہیں کرتا تھا اور نہ ہی یہ اخبار پنجابی شاونزم کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ تاہم چودھری خلیق الزماں کے مسلم لیگ کی صدارت سے استعفیٰ کے بعد اس کا فکاہیہ کالم یہ تھا کہ ''ہندوستان کے اخبار روزنامہ ''سیاست'' کانپور نے ''پاکستان چودھری خلیق الزماں سے بچے'' کے عنوان سے ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا ہے جس میں چودھری صاحب کو بہت برا بھلا کہا گیا ہے اس مقالہ کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

''اس مفرور الملت کو ہندوستانی مسلمانوں نے انقلاب حکومت کے سب سے نازک دور میں اپنا کل ہند لیڈر منتخب کیا اور نواب اسماعیل خان جیسے شریف اور وضع دار مسلمان کو پیچھے ہٹا کر اس کو رہنمائی کا تاج پہنایا لیکن یہ شخص دکھاوے کے لئے جمہوریہ ہند کے جھنڈے کو سلامی دے کر راتوں رات اپنے اہل وعیال سمیت کراچی بھاگ گیا اور مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ ان چار کروڑ مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جن کی عزت وساکھ کو تاراج کر کے یہ اپنے عیش کے لئے پاکستان جا رہا ہے۔

''سیاست''، کانپور نے جو کچھ لکھا ہے اس کے صحیح ہونے میں تو کلام نہیں لیکن ''سیاست'' کا لب و لہجہ بہت تلخ ہے۔ شکر ہے کہ پاکستان کا کوئی لیڈر اس طرح بھاگ کے ہندوستان نہیں گیا لیکن خدانخواستہ ہمارے کسی لیڈر سے اس قسم کی کوئی حرکت ہو جاتی جب بھی ہم اس قسم کا لب ولہجہ اختیار نہ کرتے۔

''بہر حال ''سیاست'' کو معلوم ہونا چاہیے کہ چودھری خلیق الزماں کے پاکستان آنے میں ہمارا کوئی قصور نہیں۔ ہم نے نہ تو ان کے پاس کوئی پیغام بھیجا نہ انہیں خط لکھا۔ وہ خود تشریف لے آئے اور اب ہندوستان واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ ہاں پاکستان کی حکومت نے

از راہ مروت دو فیکٹریاں اور ایک ہوٹل ان کے نام ضرور الاٹ کر رکھا ہے۔ مروت ہی مروت میں لوگوں نے انہیں مسلم لیگ کا صدر بھی بنا دیا ہے۔ لیکن اس سے صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کی حکومت بڑی مہمان نواز ہے اور صرف ایک چودھری صاحب پر کیا موقوف ہے پاکستان کی مہمان نوازی سے مسٹر رضوان اور مسٹر عبدالوحید خان نے بھی تو فائدہ اُٹھایا ہے۔

''سیاست کو ہم یقین دلاتے ہیں کہ اگر چودھری صاحب ہندوستان واپس جانا چاہیں تو ہم اُنہیں نہیں روکیں گے۔ اگر آپ پاکستان کو چودھری صاحب سے بچانا چاہتے ہیں تو جہاں آپ نے اتنا کرم کیا ہے وہاں رتی تکلیف اور گوارا فرمایئے کہ کراچی تشریف لا کے چودھری صاحب کو اپنے ساتھ لے جایئے۔ ہم ان کا جلوس نکالیں گے۔ ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالیں گے اور انہیں ہنسی خوشی رخصت کریں گے لیکن پہلے یہ طے کر لیجئے کہ چودھری صاحب ہندوستان میں قیام پذیر ہونے پر آمادہ ہو گئے تو انہیں آپ کیا دلوائیں گے۔ ان کے لئے ایک اچھے سے بنگلے اور اگر زیادہ نہیں تو ایک آدھ فیکٹری کا انتظام ضرور ہو جانا چاہیے۔ خدا نے چاہا تو چودھری صاحب آئیں گے پیچ کھیت آئیں گے۔ یہ کہتے ہوئے آئیں گے کہ:

کودا کوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہو گا

جو کام ہوا ہم سے وہ رستم سے نہ ہو گا

''چودھری صاحب کی وجہ سے پاکستان میں خاصی رونق ہے۔ کبھی وہ جنوبی کوریا کی مصیبتوں کو یاد کر کے رونا شروع کر دیتے ہیں تو امریکہ والوں کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آتی ہیں۔ کبھی وہ اسلامستان کے نسخے کے اجزاء فراہم کرنا شروع کرتے ہیں اور لندن تک ''سارا عالمِ اسلام'' چھان مارتے ہیں تو چرچل صاحب کا سر بھی ہل جاتا ہے اس لئے ان کے ہندوستان تشریف لے جانے سے ہمیں قلق تو بے حد ہو گا لیکن ہم اُن کے ہجر کا صدمہ برداشت کر لیں گے۔ بہر حال آپ انہیں شوق سے لے جائیں البتہ اتنی احتیاط کیجئے گا کہ وہ پھر کبھی بھاگ کر کراچی نہ آسکیں...... چودھری صاحب کا وجود اگر بہت بڑی نعمت ہے تو یہ نعمت ہمارے ہندوستانی بھائیوں کو مبارک ہو۔ ہم ان کے فراق میں نہ تو آنسو بہائیں گے نہ انہیں پاکستان واپس لانے کی کوشش کریں گے بلکہ یہ کہہ کر چُپ ہو رہیں گے کہ:

''دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا۔''[26]

خلیق الزماں کے مستعفی ہونے سے دو دن قبل نوائے وقت کا اداریہ یہ تھا کہ ''دنیا کے کسی ملک میں چودھری خلیق الزماں سے زیادہ سیاسی اخلاق و کردار سے تہی مایہ اور ناکارہ شخص نے کسی کل ملک جماعت کی مسندِ صدارت کو داغدار نہیں کیا ہوگا'' [27] اور پھر جس دن یہ مستعفی ہوا تو نوائے وقت کا ''رائے عامہ کی پہلی فتح'' کے عنوان سے تبصرہ یہ تھا کہ ''چودھری خلیق الزماں کے پاکستان مسلم لیگ سے استعفیٰ کی خبر پر سارے ملک میں اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے...... چودھری خلیق الزماں کا استعفیٰ قیام پاکستان کے بعد اس ملک کے عوام کی پہلی فتح ہے۔ 19/اگست 1947ء کے بعد 13/اگست 1950ء کو رائے عامہ پہلی مرتبہ ارباب اقتدار کو اپنے سامنے جھکانے میں کامیاب ہوئی ہے...... چودھری خلیق الزماں کا عبرت ناک انجام ان کے بھائی بند ارباب اقتدار کے لئے ایک بروقت انتباہ ہے۔ اگر وہ نشۂ اقتدار سے بدمست رہے اور انہوں نے عوام کی مشکلات و مسائل کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کی کوشش کے بجائے حسب سابق کھوکھلے نعروں سے دل پر چانے اور سیفٹی ایکٹ کے ڈنڈے سے ان کی آواز دبانے کی کوشش کی تو عوام بالآخر اُن سے بھی وہی سلوک کریں گے جو سلوک انہوں نے چودھری خلیق الزماں سے کیا ہے۔ جو چودھری خلیق الزماں کے انجام سے بھی عبرت حاصل نہیں کریں گے تاریخ میں اول تو اُن کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں ہوگی اور اگر ان کا ذکر آیا بھی تو احمقوں کے زمرے میں آئے گا۔'' [28] یہ خطرناک اشتعال انگیزی وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف تھی۔ یہ اخبار دو دن قبل لکھ چکا تھا کہ ''یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلم لیگ کو سب سے زیادہ نقصان خود اس کی قیادت کے ہاتھوں پہنچا۔ مسلم لیگ کے قاتل دراصل اس کے لیڈر ہیں اور لیگ کے قاتلوں کی اس فہرست میں سب سے اُوپر دو نام ہیں۔ ایک مسٹر لیاقت علی خان کا اور دوسرا چودھری خلیق الزماں کا۔'' [29] اس کی رائے یہ تھی کہ ''محترمہ فاطمہ جناح کو عوام کا سب سے زیادہ اعتماد حاصل ہے اور اگر انہیں لیگ کی قیادت قبول کرنے پر آمادہ کیا جاسکے تو وہ اسے نئی زندگی بخش سکتی ہیں۔'' مطلب یہ تھا کہ پنجاب کا درمیانہ طبقہ مس جناح کا نام استعمال کر کے لیاقت علی خان کا بہر قیمت تختہ اُلٹنے کے درپے تھا۔ ان دنوں اگرچہ کوریا کی جنگ کے باعث ملک کی معیشت کی حالت بہت اچھی تھی لیکن اس کے باوجود فاطمہ۔ لیاقت تضاد نے ملک کی سیاسی فضا میں بڑی کشیدگی پیدا کر رکھی تھی اور چودھری خلیق الزماں کے خلاف مظاہروں میں بھی مس جناح کا ہاتھ تھا۔

باب: 12

پنجابی شاونزم کی شدید لہر اور لیاقت کا آمرانہ ردِّ عمل

کوریا کی جنگ نے پنجاب کے شاونسٹوں کے نقطۂ نگاہ سے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے خلاف شکایات کی فہرست میں بہت اضافہ کر دیا۔ یوں تو 1949ء کے اوائل ہی سے صوبہ کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے کاروباری عناصر نے گاہے بگاہے اس بنا پر صدائے احتجاج بلند کرنا شروع کر دی تھی کہ انہیں درآمدی و برآمدی لائسنسوں کا مناسب کوٹہ نہیں ملتا۔ لیکن جون 1950ء میں کوریا پر امریکی سامراج کے حملے کے بعد پاکستان کی زرمبادلہ کی آمدنی میں یکا یک بے پناہ اضافہ ہو گیا تو ان کاروباری عناصر نے مرکزی حکومت کے خلاف شکایات کا دفتر کھول دیا۔ پنجاب کے اخبارات میں تقریباً روزانہ اس مضمون کی قراردادوں، بیانات اور تقریروں کی تشہیر ہونے لگی کہ مرکزی حکومت درآمدی اور برآمدی لائسنسوں کی تقسیم کے سلسلے میں پنجابیوں سے ناروا سلوک کر رہی ہے۔ 20/اگست کو نوائے وقت نے ''پنجاب کے تاجروں کی مشکلات'' کا کھل کر تذکرہ کیا۔ اس نے لکھا کہ ''پنجاب کے تاجروں کو مرکزی حکومت کے محکمہ درآمد و برآمد کے متعلق جو شکایات ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ بڑی تعویق اور طویل انتظار کے بعد لاہور میں اس محکمہ کا ایک ذیلی دفتر کھولا گیا مگر اس دفتر کی حیثیت ایک پوسٹ آفس سے زیادہ نہیں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ کنٹرول کے ذریعے ساری تجارت درآمد و برآمد پر حکومت کا قبضہ ہے اور لائسنس کے بغیر کوئی کام نہیں چل سکتا۔ چھوٹے اور معمولی تاجر کے لئے کراچی جانا اور وہاں سے لائسنس حاصل کرنا ایک ناممکن سی بات ہے۔ سیالکوٹ، وزیر آباد، ناظم آباد، گوجرانوالہ میں بیسیوں ایسے چھوٹے

چھوٹے تاجر ہیں جن کا کام صرف اس وجہ سے رُکا ہوا ہے کہ ان کے پاس نہ اتنے پیسے ہیں اور نہ ہی اتنی فرصت کہ وہ کراچی جا کر لائسنس حاصل کریں۔ پنجاب کے جو تاجر کراچی جا کر لائسنس حاصل کرنے کی ہمت دکھاتے ہیں، ان کا تجربہ بھی زیادہ خوشگوار نہیں...... یہ حقیقت ہے کہ ان میں سے بہت کم کو لائسنس ملتے ہیں۔ اس کے برعکس انہیں کراچی میں ہی ایسے خوش قسمت لوگ مل جاتے ہیں، جن کی جیب میں ایک سے زیادہ لائسنس ہوتے ہیں اور یہ پنجابی تاجر 50-40 ہزار اور بعض صورتوں میں ایک لاکھ روپیہ دے کر یہ لائسنس خرید لیتے ہیں...... پنجاب کے تاجروں سے سوتیلی ماں کے سے سلوک کی بجائے منصفانہ سلوک کیا جائے اور لاہور کے دفتر کو پورے اختیارات دے کر پنجاب کے تاجر پیشہ طبقے کی مشکلات دور کی جائیں۔"[1]

لیکن جب یہ "پنجابی تاجر پیشہ طبقہ" نوائے وقت اور دوسرے اخبارات کے ذریعے اس قسم کا واویلا کرتا تھا تو اسے کبھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ بلوچستان، سندھ، سرحد اور مشرقی بنگال کے تاجر پیشہ طبقہ کی بھی کوئی مشکلات ہیں۔ اُسے کبھی یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ مشرقی بنگال کے کسی تاجر کو اس مقصد کے لئے ڈھاکہ سے کراچی آنے میں کتنی تکلیف ہوتی تھی۔ یہ اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سیاسی اور معاشی خودمختاری کا مطالبہ کرتے تھے لیکن جب کبھی بنگالیوں، بلوچیوں، سندھیوں اور پٹھانوں کی طرف سے اپنے حقوق طلب کئے جاتے تھے تو یہ ان پر فوراً صوبہ پرستی اور غداری کا الزام عائد کرتے تھے۔ نوائے وقت کے اداریے میں مطالبہ یہ نہیں تھا کہ محکمہ درآمد و برآمد کے بااختیار دفاتر ملک کے سارے صوبوں میں کھولنے چاہئیں اور لائسنسوں کے اجراء کے سلسلے میں سارے صوبوں کے لوگوں سے منصفانہ سلوک ہونا چاہیے۔ اس کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ پنجابیوں سے "منصفانہ" سلوک کیا جائے یعنی پنجابیوں کو زیادہ سے زیادہ لائسنس بآسانی لاہور میں ہی دے دیئے جائیں۔ ڈھاکے کے تاجر اگر اس مقصد کے لئے کراچی میں دھکے کھاتے رہیں تو کوئی حرج نہیں۔ پنجابیوں سے اس قسم کا یکطرفہ "منصفانہ" سلوک کا مطالبہ کرنے والے عناصر کو یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ملک کے دوسرے صوبوں کے عوام اور بالخصوص مشرقی بنگال کے عوام سے کس قدر بے انصافی کرتے تھے۔ جب یہ پنجاب کی "حق تلفی" کا ذکر کرتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ "حق تلفی" کراچی میں صوبہ پرستی کی بنا پر ہو رہی ہے لیکن جب مشرقی بنگال اور دوسرے صوبوں کے عوام اپنی بے شمار حق تلفیوں کی شکایت کرتے تو کہتے تھے کہ ان شکایات کی

بنیاد صوبہ پرستی پر ہے۔ گویا یہ کوتاہ اندیش عناصر صوبہ پرستی اور غداری کا ٹھپہ دوسرے صوبوں کے لوگوں پر لگانے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے لیکن خود بدترین قسم کی صوبہ پرستی کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اسلامی مساوات و اخوت اور حب الوطنی کے اجارہ دار بنتے تھے۔ ان کا حسنِ کرشمہ ساز بہت منہ پھٹ اور بے لگام تھا، وہ جو چاہتا تھا، کہتا تھا اور جو چاہتا تھا، کرتا تھا کیونکہ ملک کی سول و فوجی بیوروکریسی پر ان کا غلبہ تھا۔ اگر شیخ محمد امین، نصیر اے شیخ، سید مراتب علی اور سعید سہگل وغیرہ وغیرہ کو ان کی حسب خواہش درآمدی و برآمدی لائسنس نہیں ملتے تھے تو پنجابی شاونزم کے پیٹ میں بہت مروڑ اُٹھتا تھا لیکن اگر مشرقی بنگال کے تاجر طبقہ کو بیرونی تجارت میں ذرا سا بھی حصہ نہیں ملتا تھا تو ان کی رگ انصاف میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی تھی۔

پنجاب کے یہ عناصر ''صوبائی تعصب'' پر کس طرح ''لعنت'' بھیجتے تھے اس کی ایک مثال نوائے وقت کے 7ر ستمبر 1950ء کے شمارے میں ملتی ہے۔ اس شمارے کے اداریے کا عنوان ''صوبائی تعصب کی لعنت'' تھا اور اس میں لکھا تھا کہ ''بلوچستان میں ایجنٹ گورنر جنرل کی امداد کے لئے جو مشاورتی کمیٹی مقرر کی گئی ہے، اس کے ارکان میں ایک پنجابی کو بھی نہیں لیا گیا یعنی اس صوبہ کی پانچ لاکھ کی آبادی میں سے 60 ہزار باشندے پانچ فیصد نیابت کے مستحق بھی نہیں سمجھے گئے۔ ہم صوبائی عصبیت پر لعنت بھیجتے ہیں اور کسی کے لئے محض ''پنجابیت'' یا ''بنگالیت'' کی بنا پر کوئی حق نہیں مانگتے...... انتخاب کا معیار قابلیت و صلاحیت اور سابقہ خدمات کا ریکارڈ ہونا چاہیے نہ کہ پنجابی ہونا یا پنجابی نہ ہونا...... پاکستان کی بنیاد ہی اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور برابر ہیں۔ ان میں سندھی، پنجابی اور بنگالی کی کوئی تخصیص نہیں۔ ہمیں اعتراض اس پر ہے کہ ایڈوائزری کونسل میں اس قسم کی تخصیص سرے سے روا ہی کیوں رکھی گئی ہے۔ بوہروں، پارسیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کے نام پر نامزدگیاں کیوں ہوئیں؟ چودھری خلیق الزماں کے ایک ہم زلف کی ممبری کے لئے یو۔ پی کے ایک ہزار افراد کی نمائندگی کا ڈھونگ کیوں رچایا گیا جبکہ ساٹھ ہزار پنجابیوں کو جو سالہا سال سے بلوچستان میں رہتے ہیں اور ''بلوچستانی'' بن چکے ہیں اس قابل نہ سمجھا گیا کہ انہیں ایک نشست بھی دی جاتی۔ حالانکہ سب کو اقرار ہے کہ وہ بلوچستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمیں اعتراض اس پر نہیں کہ کسی بوھرے یا بلوچ یا پٹھان کو کیوں نامزد کیا گیا۔ وہ بھی ہمارے بھائی ہیں۔ اگر سبھی ممبر بلوچ یا پٹھان ہوتے تو بھی ہم

کوئی اعتراض نہ کرتے بشرطیکہ معیار انتخاب قابلیت اور صلاحیت ہوتا نہ کہ قبائلیت اور صوبائیت۔''[2] اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اداریہ نویس اپنے غیر پنجابی قارئین کو عقل و فہم سے بالکل عاری سمجھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ الفاظ کے ہیر پھیر سے اپنی بدترین صوبائی عصبیت کا جو مظاہرہ کر رہا ہے...... اسے کوئی نہیں سمجھ پائے گا۔ جب اس نے یہ لکھا تھا کہ پنجابی بلوچستان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں اور معیار انتخاب قابلیت اور صلاحیت پر ہونا چاہیے تو اسے یاد نہیں رہا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں ہندو سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے اور ان کا مؤقف بھی یہی ہوتا تھا کہ سب بھائی بھائی ہیں۔ انتخاب قابلیت اور صلاحیت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ ان کے اسی مؤقف نے برصغیر کو تقسیم کیا تھا اور پنجابی شاونسٹ عناصر یہی مؤقف اختیار کر کے پاکستان کی سالمیت کی بیخ کنی کر رہے تھے۔

نوائے وقت کے اس اداریے میں اس حقیقت کا ذکر نہیں کیا گیا تھا کہ ان دنوں بلوچستان کا ایجنٹ گورنر جنرل میاں امین الدین ایک ایسا پنجابی افسر تھا جو اپنی بد دماغی اور فرعونیت کی وجہ سے اتنا ہی بدنام تھا جتنا کہ مشرقی بنگال کا چیف سیکرٹری عزیز احمد تھا۔ اس کے علاوہ بلوچستان سیکرٹریٹ کے زیادہ تر چھوٹے بڑے اہلکار پنجابی تھے اور کسی بلوچ کے پاس کلرکی کی ملازمت بھی نہیں تھی۔ مزید برآں بیشتر ڈپٹی کمشنر اور پولیٹیکل ایجنٹس پنجابی تھے اور پولیس میں انسپکٹر جنرل سے لے کر ایک معمولی سپاہی تک کم از کم 80 فیصد عملہ پنجابی تھا۔ بلوچستان کی ہمہ گیر پسماندگی کی انتہا یہ تھی کہ مدیر نوائے وقت وقتاً فوقتاً پنجابیوں کو یہ کہہ کر ڈراتا رہتا تھا کہ اگر لیاقت علی خان کی حکومت پنجاب سے اسی قسم کا سلوک کرتی رہی تو اس صوبہ کی حالت بھی ایسی ہی ہو جائے گی جیسی کہ بلوچستان کی ہے۔ ایجنٹ گورنر جنرل کی مشاورتی کونسل میں پنجابی مشیر کی عدم موجودگی پر شور مچانے کی اصل وجہ یہ تھی کہ نہ صرف چنیوٹ کے ایک پراچہ خاندان نے بلوچستان کی کوئلہ کی کانوں پر قبضہ کر رکھا تھا بلکہ بلوچستان کی تجارت پر بھی پنجابیوں ہی کی اجارہ داری تھی اور پنجاب کا سہگل خاندان بھی وہاں اپنے استحصالی پنجے پھیلانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ چونکہ پراچہ خاندان کو ایک بے اختیار مشاورتی کونسل میں جگہ نہیں ملی تھی اس لئے پنجاب کی زبردست ''حق تلفی'' ہو گئی تھی۔ پنجاب کے ان کم اندیش عناصر کو ان کے مفادات نے بالکل اندھا کر رکھا تھا۔ انہیں یہ شعور ہی نہیں تھا کہ اگر دوسرے صوبوں کے ہم وطنوں سے اس قدر سنگدلی کا سلوک جاری رہا تو زود یا بدیر وہ بغاوت

کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اگر قابلیت وصلاحیت کو ہی ہر عہدہ کے لئے انتخاب کا معیار قرار دے دیا جاتا تو پھر بنگالیوں، بلوچیوں اور سندھیوں کے لئے تو پاکستان کے ہر شعبۂ زندگی میں کوئی مقام حاصل کرنے کی گنجائش ہی نہیں تھی اور پٹھانوں کو بھی مشکل ہی سے کوئی جگہ ملتی۔ لیکن قربان جائیے اس دیدہ دلیری اور ڈھٹائی پر کہ ان سب باتوں کے باوجود پنجاب کے یہ عناصر ''صوبائی عصبیت پر لعنت'' بھیجتے تھے اور کہتے تھے کہ ''پاکستان میں سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور برابر ہیں۔ ان میں سندھی، پنجابی اور بنگالی کی کوئی تخصیص نہیں۔'' ایشیا اور افریقہ میں مغربی سامراجیوں کے نظریاتی گماشتے پادریوں کے لبادے اوڑھ کر محکوم ومظلوم عوام کو یہی درس دیا کرتے تھے، بلکہ وہ تو عالمگیر اخوت ومساوات کے علمبردار بنتے تھے۔ افریقہ میں ان پادریوں کے وعظ کا یہ مطلب سمجھا جاتا تھا کہ ''تم کتاب پکڑو اور ہم زمین پکڑتے ہیں۔'' بلوچستان کے بارے میں پنجابی سامراجیوں کا کچھ اسی قسم کا رویہ تھا کہ ایجنٹ گورنر جنرل ہمارا ہو۔ سول وفوجی بیوروکریسی پر ہمارا غلبہ ہو، تجارت پر ہماری اجارہ داری ہو اور مشاورتی کونسل میں بھی ہمارا نمائندہ ضرور ہو کیونکہ سب مسلمان ''بھائی بھائی'' ہیں اور سب ''برابر'' ہیں۔

8 ستمبر کو نواب افتخار حسین خان ممدوٹ کو ہائی کورٹ کی رپورٹ کے پیش نظر بری کر دیا گیا تو پنجابی شاونزم کی اور بھی زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی اور صوبہ میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ نوائے وقت کا اسی دن کا تبصرہ یہ تھا کہ ''بالآخر حق باطل پر غالب آیا اور کذب وافترا کے سیاہ بادل صداقت کی روشنی کی تاب نہ لا کر چھٹ گئے۔'' 10 ستمبر کو ''لاہور کے شہریوں'' نے باغ بیرون موچی دروازہ میں نواب ممدوٹ کے لئے ایک جلسۂ عام کا انتظام کیا۔'' اس جلسہ میں لوہاری دروازے کے تاجروں نے خان ممدوٹ کے گلے میں ہار ڈال کر عقیدت کا اظہار کیا...... پہلوانانِ پنجاب نے اپنی روایات کے مطابق خان ممدوٹ کی خدمت میں دستار پیش کی...... اور ممدوٹ نے اپنی تقریر میں کہا کہ دراصل میرے خلاف انکوائری پنجاب کو بدنام کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی۔ اب میری بریت پنجاب کے مسلمانوں کی بریت ہے۔''[3] یہ جلسہ اتنا کامیاب تھا کہ نواب ممدوٹ کی نئی پارٹی کی تشکیل کی باتیں ہونے لگیں۔ ایسی ہی پارٹی جیسی کہ قبل ازیں سہروردی بنا چکا تھا۔ نواب ممدوٹ کو یقین ہو گیا تھا کہ پنجاب کے عوام اس کی بھرپور تائید وحمایت کرتے ہیں۔ چنانچہ نوائے وقت نے اگلے ہی دن وزیر اعظم لیاقت علی خان کو

دعوت دی کہ پنجاب میں ''تشریف لائیے اور صوبہ کے سیلاب زدہ علاقوں کا پیدل دورہ کیجئے۔''[4]
مطلب یہ تھا کہ آؤ گے تو تمہارے خلاف مظاہرے ہوں گے۔ ممدوٹ کی نئی پارٹی کی افواہ اس قدر تیزی سے پھیلی کہ صوبائی گورنر سردار عبدالرب نشتر نے 11 ستمبر کو قائداعظم کے یوم وفات کے موقع پر اس کا نوٹس لیا۔ اس نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''ملک میں ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے۔'' نوائے وقت نے نشتر کی اس تقریر پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ ''گورنر کی حیثیت سے انہیں اس قسم کے سیاسی مباحث سے بالاتر رہنا چاہیے''۔ بلکہ اس کے ذکر کی ابتدا خود نوائے وقت نے کی تھی جبکہ اس نے مئی 1950ء اور اس کے ساتھ ہی چوکھٹے میں 1945ء کا یہ فرمودۂ قائداعظم شائع کیا کہ ''مجھے یقین ہے کہ پاکستان میں ایک پارٹی کی حکومت نہیں ہوگی۔ میں خود ایک پارٹی حکومت کی مخالفت کروں گا۔ طاقتور پارٹی کے مقابلے میں جو مختلف پارٹیاں ہوتی ہیں وہ اس کی غلطیوں کی اصلاح میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔'' اس فرمودۂ قائداعظم کی اشاعت نہ صرف نواب ممدوٹ کی جانب سے نئی پارٹی بنانے کے ارادے کے اعلان کے مترادف تھی بلکہ اس سے یہ بھی اشارہ ملتا تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کی حکومت کے خلاف نواب ممدوٹ، حسین شہید سہروردی اور افتخارالدین میں گٹھ جوڑ کا قوی امکان ہے۔ لیاقت علی خان اس امکان کے پیش نظر فی الحقیقت بوکھلا گیا تھا۔ چنانچہ اس نے 11 ستمبر کو کراچی کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے حسین شہید سہروردی اور اسی قسم کے دوسرے اصحاب کے متعلق بڑے سخت الفاظ استعمال کئے۔ اس نے کہا کہ ''پاکستان کے دشمنوں نے ان کتوں کو کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ غدار، جھوٹے اور منافق ہیں۔'' اس پر نوائے وقت کا یہ تبصرہ بالکل صحیح تھا کہ ''گالی کمزوری کی نشانی ہے اور ایسے ہی لوگ گالی دیتے ہیں جو کمزور ہوں یا اپنے آپ کو کمزور محسوس کرتے ہوں۔'' لیاقت علی خان کے پاؤں کم از کم پنجاب کے شہروں میں اُکھڑ چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نوائے وقت نے ایک ہفتہ میں دو مرتبہ ممتاز دولتانہ کو چیلنج دیا تھا کہ ''صوبہ کے دارالسلطنت اور دل لاہور سے خان افتخار حسین خان کا مقابلہ کریں اور کامیابی تو بڑی بات ہے صرف اپنی ضمانت بچا کر دکھا دیں۔''

ممتاز دولتانہ نے یہ چیلنج تو قبول نہ کیا البتہ اس نے مشترکہ دوستوں کی وساطت سے نواب ممدوٹ کے ساتھ صلح کی بات چیت کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی کیونکہ ممدوٹ دھڑا ''عوامی فتح'' کے نشہ سے بدمست تھا اور اس کا کہنا تھا کہ ''ایک ہی جماعت کے اندر رہ کر ایک

دوسرے کا گلا کاٹنے سے یہی بہتر ہے کہ اس خانہ جنگی کو ختم کرنے کی کوئی اور تدبیر سوچی جائے...... دولتانہ صاحب بھی سیاست پر ایک مہرہ نامی چیز ہیں۔خود شاطر نے اس سلسلے میں کیا کہا اور کیا کیا، یقیناً یہ بات ان سے مخفی نہ ہوگی۔ پیش کش کیا تھی؟ کس کی معرفت آئی؟ کہاں بات چیت ہوئی؟ اور اب کس مرحلہ پر ہے؟...... یہ ابلیسی چکر کب تک چلتا رہے گا۔ دو صورتیں سب کے سامنے ہیں۔ ایک ہی جماعت کے اندر رہ کر شخصی اور ذاتی لڑائی لڑتے جاؤ اور جو کچھ بھی کرو قوم و ملک اور صوبہ کی بہتری کی بجائے اپنے دھڑے کی بہتری کے لئے، یا واضح اصول اور واضح پروگرام کی بنا پر مختلف پارٹیاں اپنا اپنا مؤقف عوام کے سامنے رکھیں۔ آپس میں ذاتی اور شخصی لڑائی لڑنے کی بجائے اصولی لڑائی لڑیں اور...... عوام کو موقع دیں کہ وہ جس کے پروگرام کو اچھا سمجھیں اس کا ساتھ دیں۔''[5] اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ لیاقت علی خان شاطر ہے اور دولتانہ ابلیس ہے۔ ممدوٹ دھڑے کے ''فرشتوں'' کا ان کے ساتھ گزارا نہیں ہوسکتا۔ وہ اپنی الگ پارٹی بنا کر صوبہ کے آئندہ انتخابات میں حصہ لیں گے۔ بظاہر اسی فیصلے کی وجہ سے لیاقت علی خان اور اس کی بیگم پر ذاتی حملوں میں بھی شدت پیدا کر دی گئی۔ نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے دورۂ لاہور کے اگلے دن محکمہ تعلقات عامہ کی ''ناقص پبلسٹی کی شکایت'' کرتے ہوئے لکھا کہ جن کی خوشامد مقصود ہے ان کے متعلق تو یہاں تک تفصیلات درج ہوتی ہیں کہ ''حضور پُرنور نے سلیٹی رنگ کا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا، جناب...... کے سر پر نسواری رنگ کی جناح کیپ تھی، محترمہ نے سبز رنگ کا غرارہ پہن رکھا تھا، مسٹر...... موٹر سے نکلتے وقت مسکرائے اور داہنا ہاتھ بڑھا کر مسٹر...... سے مصافحہ کیا۔'' اسی طرح تصویروں کی بھرمار ہے کہ اب صاحب ہوائی اڈے پر کھڑے سگریٹ کے کش لگا رہے ہیں۔ اب صاحب ہوائی جہاز سے اُترے۔ اب صاحب موٹر میں بیٹھے۔ یہ سب کچھ تو ہے...... لیکن یہ نہیں بتائیں گے کہ کہیں کوئی نیا ہسپتال یا کالج بھی کھل رہا ہے یا نہیں۔''[6] یہاں بیگم لیاقت علی خان کے غرارے کا ذکر معاندانہ صحافت کی گھٹیا مثال تھی۔ بیگم رعنا لیاقت علی کے خلاف اس قسم کا پروپیگنڈا دراصل 1948ء میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ قائداعظم جناح کی شدید علالت کے دوران اس نے اپنی پبلک زندگی کا آغاز کیا تھا۔ سب سے پہلے ضلع سیالکوٹ کے احراری مُلّا اور پیر صاحبزادہ فیض الحسن نے 27راگست 1948ء کو موضع بھلر میں سید امام علی کے عرس کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اس قسم کی بدزبانی کی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ

''بیگم لیاقت علی خان اور دوسری عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں سب طوائفیں ہیں۔''[7] بیگم لیاقت علی خان کے غرارے کا ذکر صوبائی محکمہ تعلقات عامہ نے شروع نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ذکر کی ابتدا خود نوائے وقت نے کی تھی جب کہ اس نے مئی 1950ء میں وزیر اعظم لیاقت علی خان کی امریکہ کے لئے روانگی کی رپورٹ میں اس امر کا خاص طور پر ذکر کیا تھا کہ بیگم لیاقت علی خان نے ''ساٹن کا غرارہ'' پہنا ہوا تھا۔ نوائے وقت کے 28 ستمبر 1950ء کے شمارے میں طنزیہ کالم میں پھر اسی قسم کی غلاظت اچھالی گئی۔ لکھا تھا کہ ''ڈھاکہ میں مسلمان لڑکیوں کے ایک سکول میں کتابوں کی تعلیم سے زیادہ رقص وسرود اور موسیقی کی طرف توجہ دی جاتی ہے...... اور سکول جانے والی طالبات کے ہاتھوں میں کتابوں کی بجائے طبلے اور سرنگیاں نظر آتی ہیں اور خیر سے اس اسکول کی ہیڈ مسٹریس مشرقی بنگال کے وزیر با تدبیر کی سگی ہمشیرہ ہیں جو ''بڑی بیگمات'' کے ''اسوۂ حسنہ'' کی پیروی کر رہی ہیں۔'' یہ اس اخبار نویس کی تحریر تھی جس نے جولائی 1950ء میں اپنے ایک اداریے میں لکھا تھا ''میں قلم کی عصمت کو ماں بہن کی عصمت سے کم مقدس نہیں سمجھتا۔''[8]

وزیر اعظم لیاقت علی خان اپنی بیگم اور بچے کے ہمراہ 12 ستمبر کو لاہور آیا تھا۔ اس نے اخباری نمائندوں سے باتیں کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہوائی اڈے پر اُترنے سے قبل اس نے ہوائی جہاز سے سیلاب زدہ علاقوں کا معائنہ کیا۔ تقریباً دو گھنٹے میں اس نے بذریعہ موٹر شاہدرہ اور شالامار کے نزدیک سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ کر کے سیلاب کی تباہ کاریوں کا بچشم خود معائنہ کیا اور پھر وعدہ کیا کہ مرکزی حکومت سیلاب زدگان کی امداد کرے گی۔ لیکن اس وعدے کی فوراً تکمیل نہ ہوئی تو پنجاب کے ''ٹھیکیداروں'' نے شور مچا دیا کہ ''پنجاب میں قیامت صغریٰ کے باوجود کراچی میں امدادی سرگرمیاں ناپید ہیں...... ہم یہ نہیں کہتے کہ کراچی والے آ کر لاہور میں سیلاب کا پانی خشک کریں یا روٹیاں پکا کر بھیجیں لیکن وہ ان وبائی امراض کے لئے دوائیاں اور روپیہ تو بھیج سکتے ہیں جن کے، سیلاب کے بعد، پنجاب میں پھیلنے کا اندیشہ ہے...... یہ شقاوتِ قلبی کی انتہا ہے یا ناواقفیت اور لاعلمی کی انتہا ہے؟ کسی کو پنجاب کی مصیبت عظمیٰ کا اندازہ ہی نہیں یا اندازہ تو ہے مگر کسی کو کچھ کرنے کی فرصت ہی نہیں؟ دونوں صورتوں میں ہماری حالت قابل رحم ہے؟...... پچھلے پچاس سال میں بلقان کے مسلمانوں پر کوئی مصیبت آئی تو پنجاب کے مسلمانوں نے اُسے اپنی مصیبت سمجھا۔ تُرک مبتلائے استبداد ہوئے تو پنجابی مسلمانوں کو اس کی تکلیف اس طرح پہنچی گویا وہ خود

مبتلائے ابتلا ہوئے ہوں۔ فلسطینی مسلمان کے پاؤں میں کانٹا چبھا تو پنجابی مسلمان نے اس کی خلش محسوس کی۔ ہندوستان اور پاکستان کے اندر یا باہر دنیا میں کہیں بھی مسلمانوں کی امداد کے لئے کوئی فنڈ جاری ہوا تو اس میں سب سے زیادہ چندہ پنجاب کے مسلمانوں نے دیا۔ ہم زندہ دلان پنجاب سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آج خود ان پر مصیبت نازل ہوئی ہے تو انہیں اس میں گھبرانا نہیں چاہیے...... وہ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔"[9] پنجاب کے سیلاب زدگان کے لئے یہ گریہ وزاری دراصل نواب ممدوٹ کی اس پارٹی کا منشور تھا جس کا چند دنوں میں اعلان ہونے والا تھا۔ اس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ پنجاب میں سیلاب کی تباہ کاریوں کے دوران لیاقت علی خان، ممتاز دولتانہ اور ان کے حلیف تونتھیا گلی، مری اور کوئٹہ میں دادِ عیش دیتے رہے جبکہ ممدوٹ دھڑے کے غریب کارکن حتی الامکان سیلاب زدگان کی امداد کرتے رہے۔ یہ شقاوت قلبی کی انتہا تھی کہ سیلاب زدگان کی مصیبتوں کے پنکھے سے صوبائی شاونزم کو ہوا دے کر لیاقت علی خان کے خلاف ایک نئی پارٹی کے قیام کے لئے فضا ہموار کی جا رہی تھی۔ صوبائی گورنر کے اعلان کے مطابق پنجاب میں چند ماہ کے بعد عام انتخابات ہونے والے تھے۔ جب وزیر اعظم لیاقت نے 4/اکتوبر کو مرکزی اسمبلی میں یقین دلایا کہ صوبائی حکومت نے جو امداد مانگی ہے وہ دی گئی ہے تو مرکزی حکومت سے پوچھا گیا کہ اب تک مرکزی حکومت نے

"1۔ کتنا روپیہ صوبائی حکومت کو بھیجا۔

2۔ اناج کے کتنے ہزار ٹن یا من پنجاب بھیجے گئے۔

3۔ مرکزی حکومت نے ادویہ کی کتنی مقدار پنجاب بھیجی۔

4۔ کتنے ڈاکٹر مرکزی حکومت نے پنجاب میں روانہ فرمائے۔"[10]

اس سوال میں دراصل یہ جواب مضمر تھا کہ وزیر اعظم لیاقت علی کی یقین دہانی بے بنیاد ہے۔ مرکزی حکومت نے پنجاب کے سیلاب زدگان کے لئے کچھ نہیں کیا۔ پنجاب کے مفادات کے نگہبان صرف ہم ہیں۔ ہمارا قائد نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ ہے "جس کو دستور ساز اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے خلاف ووٹ دینے کی بنا پر مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا تو پنجاب کی سیاست کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔"[11]

ستمبر 1950ء کے آخری ہفتے میں اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کے لئے پنجابی افسر اعلیٰ

چودھری محمد علی کی نئ پالیسی کا اعلان کیا گیا۔ جس کے مطابق غیر پاکستانی اُمیدواروں کے لئے 1949ء میں جو پندرہ فیصد اسامیاں مخصوص کی گئی تھیں وہ اُڑا دی گئیں اور یہ طے کیا گیا کہ اب سب اسامیاں پاکستانی اُمیدواروں سے پر کی جائیں گی۔ نیا فارمولا یہ تھا کہ 20 فیصد اسامیاں محض قابلیت کے معیار کے مطابق پر کی جائیں گی باقی ماندہ 80 فیصد اسامیوں میں مندرجہ ذیل تناسب مقرر کیا گیا تھا۔

مشرقی بنگال	=	40 فیصد
پنجاب و بہاولپور	=	23 فیصد
کراچی	=	2 فیصد
سندھ، سرحد اور بلوچستان	=	15 فیصد

چودھری محمد علی کا خیال تھا کہ یہ فارمولا ''قوم کے بہترین مفاد میں ہے۔ ایسی پالیسی کے ثمرات کو کافی وقت گزرنے کے بعد ہی دیکھا جا سکتا ہے۔'' لیکن پنجاب کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے مفاد پرستوں کی رائے یہ تھی کہ یہ فارمولا بھی ''حسب سابق بالکل غلط، عاقبت نا اندیشانہ اور انتہائی مذمت کا مستحق ہے...... اول اس لئے کہ اس فیصلے سے صوبائی تعصب کو فروغ ملے گا اور پاکستانی ایک قوم بننے کی بجائے مختلف قومیتوں میں بٹ جائیں گے۔ دوسرے اس لئے کہ اس پالیسی پر عمل درآمد سے سروسز کا معیار پست ہو جائے گا۔ حکومت لائق اور موزوں آدمیوں کی خدمات سے محروم رہے گی اور نااہل وغیر موزوں آدمی اس لئے اعلیٰ اسامیوں پر فائز ہو جائیں گے کہ ملازمتوں میں ان کے صوبے کے لئے کوٹہ مخصوص کیا جا چکا ہے...... حیرت ہے کہ خود یہ وزارت پاکستان کے بنیادی اصول پر کلہاڑا چلانے کے درپے ہے اور کسی اور معاملہ میں نہیں اپنی اعلیٰ ملازمتوں میں تناسب مقرر کر کے صوبائی عصبیت کے سانپ کو سرکاری سرپرستی کا دودھ پلا کر آستین میں پالنا چاہتی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ آزادی سے قبل غیر منقسم ہندوستان میں بھی ملازمتوں میں صوبائی تناسب کبھی مقرر نہیں کیا گیا۔''[12] پنجاب کے یہ تنگ نظر و تنگ دل عناصر جب ایسی باتیں کرتے تھے تو یہ نہیں بتاتے تھے کہ اگر ان کے ''قابلیت و صلاحیت'' کے فارمولے پر عمل کیا جائے تو پھر مشرقی بنگال، بلوچستان، سندھ اور سرحد کے تعلیمی لحاظ سے پسماندہ عوام کو اعلیٰ سرکاری ملازمتوں میں کوئی جگہ کب اور کیسے ملے گی اور اگر انہیں سول اور فوجی بیوروکریسی میں کوئی حصہ نہ ملا

تو بالآخر نتیجہ کیا نکلے گا۔ مزید برآں 1940ء میں قرارداد لاہور میں پاکستان کے لئے وفاقی ڈھانچے کا وعدہ کیا گیا تھا اور وفاقی آئین کے تحت نہ صرف صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری حاصل ہوتی ہے بلکہ انہیں مرکزی وفاقی حکومت کے ہر شعبہ میں ان کی آبادی کے لحاظ سے حصّہ ملنا ضروری ہوتا ہے۔'' جب فروری 1948ء میں قائداعظم کی زیرِ صدارت پاکستان مسلم لیگ قائم ہوئی تھی تو اس کی تشکیل کے لئے وفاقی ڈھانچہ اختیار کیا گیا تھا۔ لیگ کونسل میں ہر صوبے کے لئے نشستوں کی تعداد مقرر کر دی گئی تھی۔ مشرقی بنگال کے لئے 180، پنجاب کے لئے 150، سندھ کے لئے 50، شمال مغربی سرحدی صوبہ کے لئے 40، بلوچستان کے لئے 20 افراد کو صدر نے نامزد کیا تھا۔''[13]

یاد رہے کہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بجائے پاکستان مسلم لیگ کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ قیام پاکستان سے پہلے لیگ کا تنظیمی ڈھانچہ ایسا نہیں تھا اور کسی بھی صوبہ کے لئے کونسلروں کی تعداد مقرر نہیں تھی۔ صوبائی لیگوں کو بہت محدود اختیار حاصل تھا اور وہ مرکزی تنظیم کی ہدایات پر عملدرآمد کرنے کی پابند تھیں۔ مرکزی تنظیم کی طاقت کا منبع اس کے صدر قائداعظم کی مضبوط شخصیت تھی۔ اب اگر لیگ کے وفاقی ڈھانچے کی کونسل کے لئے صوبائی کوٹہ مقرر کیا جا سکتا تھا تو وفاق پاکستان کی اعلیٰ ملازمتوں کے لئے صوبائی کوٹہ کیوں مقرر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ خود نوائے وقت کے بیان کے مطابق پنجاب سب سے زیادہ تعلیم یافتہ صوبہ تھا اور اس وجہ سے سب سے زیادہ اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرنا چاہتا تھا حالانکہ اس طرح پاکستان کی سالمیت کو زبردست خطرہ لاحق ہونے کا خدشہ تھا۔ لیکن لیاقت علی خان کے خلاف معاندانہ سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ ملک کی اعلیٰ ملازمتوں میں پنجاب کے ''حقوق'' کی علمبرداری کر کے پنجابی سول و فوجی بیوروکریسی کی حمایت حاصل کی جائے اور پھر اس کی امداد سے ''مادر پنجاب'' کے اس دشمن کا بہر قیمت تختہ اُلٹا جائے۔

8/ اکتوبر کو لیاقت علی خان پاکستان مسلم لیگ کا متفقہ طور پر صدر منتخب ہو گیا تو پنجاب کے آئندہ انتخابات میں شدید محاذ آرائی یقینی ہو گئی۔ لیاقت علی خان نے صدر بننے سے پہلے لیگ کونسل سے جماعت کے آئین میں سے فروری 1948ء کی وہ دفعہ منسوخ کروا دی جس کے تحت یہ قرار دیا گیا تھا کہ کوئی صوبائی یا مرکزی وزیر مسلم لیگ کا عہدیدار نہیں بن سکے گا۔ نوائے وقت کا کہنا یہ تھا کہ ''قائداعظم نے اپنی زیرِ صدارت پاکستان مسلم لیگ کے آئین میں یہ دفعہ شامل

کروائی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ وزارت وصدارت کا ایک شخص کی ذات میں جمع ہونا بڑے فتنوں کا دروازہ کھول دے گا۔''[14] یہ مؤقف سراسر جھوٹ پر مبنی تھا۔نوائے وقت نے محض لیاقت دشمنی کی بنا پر اپنے قلم کی ایک مرتبہ خود ہی عصمت دری کر دی تھی۔ چودھری محمد علی کا بیان ہے کہ ''مسلم لیگ کے آئین میں یہ ترمیم قائداعظم کی مرضی کے خلاف منظور کی گئی تھی......قائداعظم کو اس قاعدے سے مستثنٰی قرار دینے کی تجویز پیش کی گئی۔ لیکن انہوں نے یہ پیش کش مسترد کر دی۔''[15] لیاقت علی خان نے بطور کنوینر پاکستان مسلم لیگ کا جو آئین مرتب کیا تھا اس میں ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں تھی۔ اس مسودۂ آئین میں ''یہ ترمیم پیر مانکی نے پیش کی تھی۔ اس ترمیم کا اثر قائداعظم محمد علی جناح اور لیاقت علی خان پر بھی پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں ایک طرف مسلم لیگ جماعت کے صدر اور جنرل سیکرٹری تھے اور دوسری طرف مسلم لیگی حکومت کے گورنر جنرل اور وزیراعظم بھی تھے۔ ارباب عبدالغفور خان نے پیر صاحب کی اس ترمیم کی تائید کی اور دوسرے لوگوں کے علاوہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے بھی اس کے حق میں رائے دی۔ ادھر قائداعظم ،لیاقت علی خان اور تمام حکومتی پارٹی اس کے سخت خلاف تھی۔ چنانچہ اس ترمیم پر پورے تین دن تک بحث ہوتی رہی اور روزانہ قائداعظم خود اس موضوع پر تقریریں کرتے رہے۔ اس کے باوجود تیسرے دن رائے شماری میں دس ووٹوں کی اکثریت سے یہ ترمیم پاس ہوگئی۔ اس کے بعد چودھری خلیق الزماں کو پاکستان مسلم لیگ کا آرگنائزر مقرر کیا گیا جو اس کام کے لئے بڑا نااہل ثابت ہوا۔ اس نے تنظیم کا تمام کام صوبائی حکومتوں کو سونپ دیا۔ سرحد میں عبدالقیوم خان کو بحیثیت وزیراعلیٰ یہ کام سپرد کیا گیا جس نے مسلم لیگ کو ایک خانہ ساز ادارہ بنا ڈالا۔''[16] گویا پیر مانکی نے جس لعنت کے سدباب کے لئے قائداعظم کی مرضی کے خلاف یہ ترمیم منظور کروائی تھی، چودھری خلیق الزماں نے وہی لعنت صوبہ سرحد کے عوام کے گلے میں ڈال دی تھی اور اب لیاقت علی خان کے صدر منتخب ہونے کے بعد یہ لعنت رسمی طور پر پورے ملک کے عوام کے گلے کا طوق بن گئی تھی۔

لیاقت علی خان نے پاکستان مسلم لیگ کا صدر منتخب ہونے کے بعد لیگ کونسل کے اجلاس میں جو پہلی تقریر کی اس سے فی الحقیقت یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ پارلیمانی جمہوریت سے منحرف ہو کر جاگیردارانہ آمریت کی راہ پر گامزن ہونے کا عزم رکھتا ہے۔ قبل ازیں صوبائی گورنر سردار عبدالرب نشتر اعلانیہ کہہ چکا تھا کہ ملک میں صرف ایک پارٹی ہونی چاہیے اور خود

لیاقت علی خان بھی حسین شہید سہروردی اور اپنے دوسرے سیاسی حریفوں کو غدار اور منافق کے خطابات دے چکا تھا۔ 8 اکتوبر کو لیگ کونسل کے اجلاس میں لیاقت علی کی تقریر یہ تھی کہ "اب مسلم لیگ کونسل کی اہمیت پارلیمنٹ سے زیادہ ہے لہٰذا یہاں جو لفظ بھی کہا جائے وہ اس کے وقار اور ذمہ داری کے مطابق ہونا چاہیے۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور میرا ہمیشہ یہی پختہ عقیدہ رہا ہے کہ نہ صرف لیگ کا وجود بلکہ اس کی قوت پاکستان کے وجود اور قوت کے برابر ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ابتدا ہی میں یہ فیصلہ کر لیا تھا اور اب میں اپنے اس فیصلے کی پھر تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو لیگ کا وزیراعظم سمجھا ہے۔ میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا منتخب وزیراعظم تصور نہیں کیا۔ جس دن مجھے معلوم ہوا کہ لیگ کو مجھ پر اعتماد نہیں رہا، اسی دن آپ دیکھیں گے لیاقت علی پاکستان کا وزیراعظم نہیں رہا۔"[17] نوائے وقت کے الفاظ میں لیاقت علی کی اس تقریر کا مطلب یہ تھا کہ:۔

مسلم لیگ — پاکستان ہے
میں — مسلم لیگ ہوں۔
اس لئے میں ہی پاکستان ہوں۔
سٹیٹ؟ میں ہی سٹیٹ ہوں۔ (لوئی چہاردھم)

بالفاظ دیگر ماؤنٹ بیٹن کے پریس سیکرٹری نے اگست 1947ء میں قائداعظم جناح کے آمر مطلق ہونے کے بارے میں جو الفاظ استعمال کئے تھے وہ اب لیاقت علی خان پر بھی صادق آتے تھے۔ لیکن ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ قائداعظم جناح کو پاکستان کے عوام الناس کی بھرپور تائید وحمایت حاصل تھی جبکہ لیاقت علی خان عوام کی بھاری تعداد کی حمایت سے محروم تھا۔ لیاقت علی محض جابرانہ قوانین، سول وفوجی بیوروکریسی کی حمایت اور غیرملکی سامراج کی تائید سے ہی وہ مقام حاصل کرنا چاہتا تھا جو قائداعظم جناح کو برصغیر کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کی تائید وحمایت سے حاصل ہوا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کی زیر قیادت پاکستان مسلم لیگ کی ساکھ تقریباً ختم ہو چکی تھی لیکن لیاقت علی اس نیم مردہ گھوڑے پر سوار ہو کر جاگیردارانہ آمریت کی منزل پر پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے عوام کی طرف سے حکومت پر نکتہ چینی اور اس کے احتساب کے سب دروازے بند کر دیئے تھے لہٰذا اب اس کے خلاف کسی کل پاکستان جماعت کا وجود میں آنا ناگزیر تھا۔ حسین شہید

سہروردی، جوقبل ازیں فروری 1950ء میں اپنی عوامی مسلم لیگ کے قیام کا اعلان کر چکا تھا، کا تبصرہ یہ تھا کہ ''پاکستان نہایت تیزی کے ساتھ ایک آمرانہ مملکت بنتا جا رہا ہے......لیاقت علی خان نے یہ سب اس لئے کیا ہے کہ پنجاب میں انتخابات ہونے والے ہیں......اب یہاں کے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے گی کہ مسلم لیگ کی مخالفت پاکستان کی مخالفت ہے۔ پنجاب کے بڑے بڑے سرکاری افسر وزیراعظم کی مسلم لیگ کی حمایت کریں......جو لوگ مطلق العنانی کا سدباب کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ پاکستان کو ابدی غلامی سے محفوظ کرنے کے لئے آنے والے انتخابات میں مسلم لیگ کی مخالفت کریں۔''[18]

17ر اکتوبر کو لیاقت علی خان کے دورۂ لاہور کا اعلان ہوا تو لاہور کارپوریشن کے ارکان کی اکثریت نے یہ تجویز نامنظور کر دی کہ وزیراعظم کی لاہور میں آمد پر اس کی خدمت میں کارپوریشن کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا جائے۔ اس پر نوابزادہ رشید علی خان نے یہ رائے ظاہر کی کہ ''وزیراعظم لیاقت علی خان کی توہین کی گئی ہے۔ آج کے اجلاس کی کاروائی اخبارات میں شائع ہوگی تو عوام کیا رائے قائم کریں گے؟'' نوائے وقت نے اس سوال کا براہ راست تو کوئی جواب نہ دیا۔ البتہ دو تین دن بعد اس مضمون کا انتباہی اداریہ لکھا کہ ''آثار بتاتے ہیں کہ برسراقتدار گروپ نے تہیہ کر لیا ہے کہ نتائج وعواقب کی پروا کئے بغیر ہر اس جماعت اور ادارہ کو کچل دیا جائے جو اس پر نکتہ چینی کی جسارت کرتا ہے...... ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ تنقید واحتساب کو کچلنے کے لئے حد سے زیادہ تشدد کیا جائے تو نتیجہ ہمیشہ خراب نکلتا ہے اور بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ ارباب اقتدار کو جس جماعت کو تشدد سے دبانا مقصود ہوتا ہے وہ جماعت تشدد ہی کی وجہ سے فروغ پاتی ہے۔'' 24ر اکتوبر کو لیاقت علی خان لاہور پہنچا تو اسی دن نوائے وقت نے اپنے اداریے میں اس سے پانچ چھ سوالات پوچھے جن کی بنیاد صوبائی عصبیت پر تھی۔ ان میں سے اشتعال انگیز سوالات یہ تھے کہ:

''1۔ پنجاب کا مسلمان یہ جاننے کے لئے مضطرب ہے کہ کشمیر کب آزاد ہوگا۔

2۔ پنجاب کا مسلمان یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ پاکستان صحیح معنوں میں کب اپنی آزادئ کامل کا اعلان کرے گا یعنی برطانیہ کی دولت مشترکہ سے کب الگ ہوگا۔

3۔ ایک بات خاص طور پر اس بدنصیب صوبہ کے متعلق ہے جو ہر حساس پنجابی مسلمان

کے دل میں ہے اور وہ یہ کہ ہم کب تک ''خلیق الزمانی سیاسیات'' کا شکار بنے رہیں گے۔ ہماری مراد خاص چودھری خلیق الزماں سے نہیں بلکہ اس ذہنیت اور سیاست سے ہے جس کا مقصود و منتہا یہ رہا ہے کہ اپنے مخصوص مصالح کی خاطر اس صوبہ میں افتراق پیدا کیا جائے اور پھر یہ پروپیگنڈا کیا جائے کہ پنجاب میں ہر شخص نالائق، خودغرض، بددیانت اور شر پسند ہے۔ اس غلط مفروضہ کی بنیاد پر پنجاب سے جو سلوک کیا جا رہا ہے پنجابی مسلمان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کب تک جاری رہے گا۔''[19] اس اداریے کے اگلے دن سابق صدر صوبہ مسلم لیگ میاں عبدالباری کے علاوہ شیخ محمد رشید، ذکی الدین پال اور ملک غلام نبی وغیرہ لیگ سے مستعفی ہو گئے۔ چنانچہ جب دو تین دن بعد یعنی 28 ر اکتوبر کو لاہور کی یونیورسٹی گراؤنڈ میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تو حسب توقع اس میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ سیاہ جھنڈیاں لہرائی گئیں اور ''مسلم لیگ مردہ باد'' اور ''پنجاب کو ذلیل کرنے والے مردہ باد'' کے نعرے لگائے گئے۔ یہ ہنگامہ پورے 30 منٹ جاری رہا جس کے دوران لیاقت علی خان تقریر نہ کر سکا۔ چونکہ لاہور کی فضا نواب ممدوٹ کے لئے سازگار تھی اس لئے نوائے وقت کے مشورے کے مطابق اس نے دو دن بعد اپنی ''جناح مسلم لیگ'' کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس پر سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رائے یہ تھی کہ ''جناح مسلم لیگ نے ہر پنجابی کے دل میں اُمید کی ایک شمع روشن کر دی۔'' پاکستان ٹائمز کا خیال تھا کہ ''پنجاب میں جو کچھ ہوا ہے وہ ایک نیک فال کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ صاف طور پر نظر آ رہا ہے کہ نئے پیدا شدہ حالات و کوائف میں مسلم لیگ کے اندر نہیں بلکہ مسلم لیگ سے باہر قومی یک جہتی کا مقصد پوری طرح حاصل ہو جائے گا۔''[20] ایسٹرن ٹائمز، گارڈین، نظام ویکلی، ایوننگ نیوز، امروز اور مجاہد نے بھی اس نئی جماعت کا خیر مقدم کیا۔ لیاقت علی خان کا تبصرہ یہ تھا کہ ''خودغرض لوگ جماعت سے نکل گئے ہیں۔ اب صرف وہی لوگ مسلم لیگ میں ہیں اور رہیں گے جنہیں ملک و قوم کا مفاد عزیز ہے۔'' تاہم 10 ر نومبر کو افتخار الدین کی زیر قیادت ایک حزب اختلاف یعنی ''آزاد پاکستان پارٹی'' کے قیام کا اعلان ہو گیا۔ پارٹی کے اغراض و مقاصد میں شہری آزادیوں کی بحالی، جاگیرداریوں کی تنسیخ، موجودہ

زرعی نظام کی اصلاح، دیہات میں مہاجرین کو زمینوں پر مستقل ملکیت دلانے، شہری متروکہ جائیدادوں اور بڑی بڑی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے اور دولت مشترکہ سے پاکستان کی کامل علیحدگی پر زور دیا گیا تھا۔

اس طرح پنجاب میں انتخابی دنگل کے لئے اکھاڑہ تیار ہو گیا تو بڑے بڑے جغادری سیاسی پہلوان اور خلیفے بھی میدان میں آ گئے۔ ایک طرف تو ملک فیروز خان نون جو ان دنوں مشرقی بنگال کا گورنر تھا، یہاں پہنچ گیا اور دوسری طرف راجہ غضنفر علی خان جو تہران میں پاکستانی سفیر کی حیثیت سے ناخوش تھا، آ دھمکا۔ دولتانہ اور ممدوٹ کے علاوہ یہ دونوں بھی صوبہ کی وزارت اعلیٰ کے اُمیدوار تھے۔ ملک فیروز خان نون کا کہنا یہ تھا کہ میں دولتانہ اور ممدوٹ میں صلح کراؤں گا۔ میں اس مقصد کے لئے گورنر شپ سے مستعفی ہو کر صوبہ کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے پر تیار ہوں اور اس کا عوام کو مشورہ یہ تھا کہ ''سہروردی صاحب کا کہنا نہ مانو اور جب وہ آئیں تو انہیں کہہ دو کہ اپنے بنگال تشریف لے جایئے۔''[21] راجہ غضنفر علی خان کہتا تھا کہ ''نئی سیاسی جماعتوں کو غدار قرار دینا انتہائی زیادتی ہے۔'' جب اسے بتایا گیا کہ تمہارا یہ مؤقف وزیر اعظم کے مؤقف کے منافی ہے تو اس نے کہا کہ ''جو کچھ میں نے کہا ہے وہ میری ذاتی رائے ہے اور میں ذاتی رائے کے سلسلے میں کسی سے متاثر ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں نے اپنا ضمیر کسی کے پاس فروخت نہیں کیا۔ میں حق بات کہنے سے نہیں ڈرتا۔ ایسے نازک مرحلہ پر اپنی بات ضمیر کے مطابق نہ کہنا بہت بڑی ناانصافی ہے۔'' اس نے حکام کو مشورہ دیا کہ وہ انتخابات میں کامل غیر جانبداری سے کام لیں۔[22]

دراصل نہ تو فیروز خان نون مصالحانہ مشن پر پنجاب میں آیا تھا اور نہ ہی راجہ غضنفر علی خان کے یہاں آنے کا مقصد اپنے ضمیر کی آواز بلند کرنا تھا۔ اصل بات یہ تھی کہ دونوں ہی یہ جائزہ لینے آئے تھے کہ ان کے امکانات کیا ہیں۔ پنجاب میں آنے والے انتخابی معرکے کے لئے صف آرائی کچھ اس طرح ہو رہی تھی کہ صوبہ کے بڑے بڑے جاگیردار لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے ساتھ ہو رہے تھے اور اُبھرتے ہوئے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے عناصر سہروردی۔ ممدوٹ دھڑے کے ساتھ مل رہے تھے۔ ایک طرف تو روزانہ اخبارات میں مختلف شہروں کے درمیانہ طبقہ کے مسلم لیگی لیڈروں اور کارکنوں کی جانب سے ''سرکاری'' لیگ سے لاتعلقی کے اعلانات شائع ہوتے تھے اور دوسری طرف دیہاتی علاقوں کے بڑے بڑے جاگیردار سہروردی۔ ممدوٹ دھڑے کے خلاف

برادریوں وغیرہ کے نام پر اندرون خانہ گٹھ جوڑ کر رہے تھے۔ گجرات کے نوابزادوں، جھنگ کے سیدزادوں اور ڈیرہ غازی خان کے سرداروں نے ممدوٹ کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ وہ بدستور سرکاری لیگ میں ہی شامل رہے تھے۔ حتیٰ کہ ممدوٹ کی پانچ رکنی کابینہ کے تین ارکان عبدالحمید دستی، چودھری فضل الٰہی اور میجر مبارک علی بھی مسلم لیگ میں ہی رہے اور پانچواں رکن نوراللہ سیاست سے ریٹائر ہو گیا۔ سرکاری محکموں میں بھی حالت کچھ ایسی ہی تھی۔ چھوٹے اور درمیانہ درجہ کے سرکاری ملازمین کی ہمدردیاں سہروردی اور ممدوٹ کے ساتھ تھیں لیکن اعلیٰ سرکاری افسر لیاقت علی اور دولتانہ کے فرمانبردار تھے۔ اگرچہ لیاقت علی خان کو شہروں کے مخالفانہ ماحول سے قدرے پریشانی تھی لیکن وہ اس وجہ سے مطمئن تھا کہ دیہاتی علاقوں میں بڑے بڑے جاگیرداروں کی حمایت کے باعث اس کی کامیابی یقینی تھی۔ کاروباری عناصر لیاقت حکومت کے خلاف تھے کیونکہ انہیں ان کی حسب خواہش درآمدی و برآمدی لائسنس بآسانی نہیں ملتے تھے اور اس طرح پنجاب کی ''حق تلفی'' ہوتی تھی اور پنجاب کو ''ذلیل'' کیا جا رہا تھا۔

مذہبی عناصر بھی دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ احراریوں کا گروپ لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کی حمایت کرتا تھا اور ان کے مخالفین کے خلاف قادیانی ہونے یا قادیانیوں کے حامی ہونے کا فتویٰ صادر کرتا تھا۔ جماعت اسلامی وغیرہ پر مشتمل گروپ لیاقت علی کے مخالفین میں شامل تھا اور الزام عائد کرتا تھا کہ اس کی حکومت میں فحاشی، عریانی اور دوسری غیر اسلامی برائیوں نے فروغ پایا ہے۔ چنانچہ ایسے ہی عناصر کی ''تبلیغ'' کا اثر تھا کہ نوائے وقت کا ایک طنزیہ پیراگراف یہ تھا کہ ''جھنگ میں تو خواتین میں ''اینٹی غرارہ'' تحریک شروع ہو چکی ہے۔ ہمارے خیال میں کچھ نیک بیبیوں کو یہ تحریک سارے پاکستان میں شروع کرنی چاہیے اور اس کی شاخیں بڑے بڑے شہروں میں ہوں۔ غرارہ پوشوں کا زور ہے اور ''اینٹی غرارہ'' تحریک اپنے ٹکٹ پر خواتین کی نشستوں کے لئے انتخاب لڑے۔ خدا نے چاہا تو ایک غرارہ پوش بھی اسمبلی میں نہیں پہنچ سکے گی۔''[23] مطلب یہ تھا کہ بیگم لیاقت علی خان غرارہ پہنتی ہے اور پنجاب میں جو عورتیں اس کی خوشنودی کے لئے یا اس کی نقل میں غرارہ پہنتی ہیں وہ نیک بیبیاں نہیں ہیں۔ غرارہ فحاشی کی علامت ہے۔ قلم کی عصمت اور اسلامی اخلاق کے ٹھیکیداروں کو مسلمان عورتوں کے غراروں پر طنز کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ لکھتے تھے کہ یوں تو ''غرارہ آرائی'' کے مواقع ٹینس

چیمپئن شپ کے مقابلوں کے دوران میں بھی مل جائیں گے لیکن کوئی خاص لطف نہیں آئے گا اور شالا مار ایسی رنگینی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ پنچولی والے دیوان سرداری لال ہی کسی ورائٹی شو کا انتظام کر دیں یا مسٹر اقبال چیمہ امرتسر والی مختار بیگم سے سفارش کریں کہ وہ اپنی نیلی کی سالگرہ دوبارہ منانے کا انتظام کریں۔''[24] امرتسر والی مختار بیگم طوائف تھی اور نیلی اس کی بیٹی تھی۔ غرارے کا نیلی کی سالگرہ کے ساتھ ذکر کرنے کا مطلب یہ تھا کہ سب غرارہ پہننے والی طوائفیں ہیں اور جو غرارہ نہیں پہنتیں وہ نیک بیبیاں ہیں۔ اس نے یہ خبر بھی شائع کی کہ ''جھنگ میں اینٹی غرارہ تحریک اسلام پسند خواتین کے حلقوں میں خاصی مقبول ہو رہی ہے۔ شہر مگھیانہ کے تین محلوں میں اس کی ابتدائی شاخیں قائم ہو چکی ہیں اور اس انجمن کے دفاتر پاکستان کے بڑے شہروں میں بھی کھولے جا رہے ہیں۔''[25] بظاہر ان دنوں نوائے وقت کی نظر میں ایسی خبریں سوقیانہ صحافت میں شمار نہیں ہوتی تھیں۔ لیاقت علی خان کے خلاف ہر حربہ جائز تھا۔

وزیر اعظم لیاقت علی خان نے جنوری 1951ء کے اوائل میں کامن ویلتھ کانفرنس کے لئے لندن جانے میں چند دن کے لئے پس و پیش کیا کیونکہ حکومت برطانیہ اس کانفرنس میں مسئلہ کشمیر کو رسمی طور پر زیر بحث لانے پر آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ لیکن پنجاب کے درمیانہ طبقہ کو اس کے باوجود یہ یقین نہیں آتا تھا کہ لیاقت علی خان مسئلہ کشمیر کے حل کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ اس کا یہ تاثر تھا کہ لیاقت علی نے جنوری 1949ء میں جنگ بندی قبول کر کے مسئلہ کشمیر کے حل کی اُمیدیں خود ہی خاک میں ملا دی تھیں اور اب وہ اس سلسلے میں سنجیدگی کا مظاہرہ محض الیکشن سٹنٹ کے طور پر کر رہا ہے۔ نوائے وقت کا طنزیہ تبصرہ یہ تھا کہ ''خان لیاقت علی خان صرف پنجاب کے الیکشن کی وجہ سے تذبذب میں پڑے ہوئے ہیں کہ لندن جائیں یا نہ جائیں...... دونوں نے انہیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ اگر الیکشن قریب نہ ہوتے تو کشمیر کے مسئلے کو دولت مشترکہ کے وزرائے اعظم کے اجلاس کے ایجنڈے میں شامل کرانے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔''[26] پنجاب کے وسطی اضلاع میں مسئلہ کشمیر کے بارے میں جذبات اس قدر شدید تھے کہ اس سلسلے میں لیاقت علی خان کی عدم سنجیدگی کا ذکر کر کے انہیں بہت جلد برانگیختہ کیا جا سکتا تھا۔ 14ر جنوری کے نوائے وقت نے لیاقت علی خان کے دورۂ لندن کے التوا کی ایک اور وجہ بتائی۔ وہ یہ تھی کہ ''جن دنوں مسٹر لیاقت علی خان لندن جانے سے انکار فرما کر اپنے ملک کے وقار میں اضافہ کر رہے تھے انہی دنوں

کراچی کی ایک ٹیلرنگ فرم محترمہ بیگم صاحبہ کے لئے ایک شاندار فرکوٹ تیار کر رہی تھی جو خاص طور لندن میں استعمال کے لئے بنوایا جا رہا تھا۔ جب یہ کوٹ تیار ہو کر بیگم صاحبہ کی خدمت میں بھیجا گیا تو آپ نے اسے پسند نہ فرمایا اور کچھ نقائص نکالے۔ چنانچہ مناسب اصلاح کے بعد کوٹ دوبارہ حاضر خدمت کر دیا گیا مگر اس مرتبہ بھی شرف پسندیدگی نہ بخشا گیا اور دوبارہ واپس کیا گیا۔ اِدھر یہ فرکوٹ پرائم منسٹر ہاؤس سے ٹیلرنگ فرم اور ٹیلرنگ فرم سے پرائم منسٹر ہاؤس کا فاصلہ طے کر رہا تھا ادھر مسٹر لیاقت علی ہر روز اپنی بکنگ منسوخ کر کے دوسرے دن کے لئے عارضی بکنگ کرا لیتے تھے۔ یہ بات ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی مگر بعض گستاخ یہ حساب بھی لگا رہے ہیں کہ سفر لندن میں جو تعویق ہوئی اس میں ٹیلرنگ فرم کا کتنا قصور ہے...... عارضی بکنگ اور تنسیخ، تنسیخ اور عارضی بکنگ کے سلسلے میں ایک اور لطیفہ سنیئے۔ اس کے راوی کراچی کے اخباری رپورٹر ہیں۔ ایک عورت صدر کراچی میں ٹرام میں داخل ہوئی مگر بیٹھنے سے پہلے اُتر گئی۔ ٹرام چلنے لگی تو اس نے پھر اشارہ کیا اور دوبارہ سوار ہو گئی مگر ٹرام چلنے سے پہلے پھر نیچے اُتر گئی تو اس نے پھر اشارہ کیا اور دوبارہ سوار ہو گئی مگر ٹرام چلنے سے پہلے پھر نیچے اُتر گئی۔ اس پر ٹرام والے نے کہا۔ ''واہ بہن! آپ تو بالکل لیاقت علی بن گئی ہیں۔''[27]

ملک کے وزیر اعظم پر اس قدر سنگین بہتان تراشی اور اس کی اتنی گھٹیا تضحیک آزادیٔ صحافت کے نام پر کی جا رہی تھی اور بظاہر اس کا قلم کی عصمت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ درمیانہ طبقہ کی شائستگی اور تہذیب کی حدود صرف اس طبقہ کے مفادات تک ہی محدود رہتی ہیں۔ چنانچہ نوائے وقت میں 17 رجنوری کو اس مسئلہ پر پھر خامہ فرسائی کی گئی۔ لکھا گیا تھا کہ ''سنتے ہیں کہ جب لندن سے وزیر اعظم کو بلاوا آیا تو انہوں نے اس پر پہلے غور کیا پھر خوض کیا اور پھر شام کو گھر جا کر اپنی بیگم سے اس کے متعلق ان کا خیال دریافت کیا۔ بیگم صاحبہ نے گہرے سوچ بچار کے بعد فرمایا۔ خیال تو نیک ہے۔ ذرا تبدیلیٔ آب و ہوا بھی ہو جائے گی، تبدیلیٔ غذا اور تبدیلیٔ خیالات بھی ہو جائے گی۔ بچے بھی ذرا گھوم پھر لیں گے۔ وزیر اعظم نے کہا بہت خوب تو پھر کیا جواب دوں مسٹر ایٹلی کو؟

''بیگم نے فرمایا۔ بس یہی کہ آپ کا بلاوا ہمیں منظور، ہمارے خدا کو منظور، ہمارے بچوں کو منظور۔'' شوہر نے فرمایا۔ لیکن عوام کو......!

''جواب ملا...... جو آپ کو منظور وہ عوام کو بھی چاروں کھونٹ منظور! بھلا پھر آپ محبوب

وزیراعظم ہی کدھر سے ہوئے۔ جب آپ کی منظوری عوام کو نامنظور ہوا اور آپ کو عوام کی منظوری حاصل کرنی پڑے۔''[28] یہ تھا ''قصّہ سوتے جاگتے کا'' اور اس کا قلم کی عصمت سے کوئی تعلق نہیں تھا اور نہ ہی اس پر کوئی صحافتی اخلاق کا اطلاق ہوتا تھا۔ پاکستان کے اخبارات میں آزادیٔ تحریر وتقریر کے نام پر عام شہریوں اور ان کے خاندانوں کی کردارکشی تو ایک معمول بن چکا تھا۔ ہر اخبار میں روزانہ بلاتصدیق وجواز کسی نہ کسی کی بڑی سنگدلی سے پگڑی اچھال دی جاتی تھی لیکن ملک کے وزیراعظم اور اس کے خاندان کی کردارکشی کا سب سے بڑا سہرا پنجابی شاونسٹوں کے ترجمان اخبار نوائے وقت کے ہی سر پر تھا۔ وجہ ظاہر تھی۔ اس اخبار کو نہ صرف پنجاب کے کاروباری حلقوں، وکیلوں، لیکچراروں، اُستادوں اور سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی کے بیشتر پنجابی ارکان کی پشت پناہی حاصل تھی بلکہ اُسے مرکزی حکومت میں گرمانی۔ غلام محمد گٹھ جوڑ سے بھی ہلاشیری ملتی تھی۔ ملّاؤں کا ایک بڑا عنصر بھی اس اخبار کی حمایت میں فتوے دیتا تھا کیونکہ یہ اسلام کا عظیم ترین علمبردار بنتا تھا حالانکہ اس کے اسلام کی حدود پنجاب کے ابھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ اور لاہور اور چنیوٹ کے سرمایہ داروں کے مفادات کے باہر نہیں جاتی تھیں۔ اگرچہ اس کا پنجابی اسلام، سندھیوں، بلوچوں، پٹھانوں اور بنگالیوں کے اسلام سے مختلف تھا لیکن اس کا دعویٰ یہ تھا کہ ''اصلی تے وڈا'' اسلام اس کا ہے کیونکہ پنجابی مسلمانوں نے ترکوں اور فلسطینیوں کی ''سب سے زیادہ'' امداد کی تھی۔ وہ اس ''عظیم امداد'' میں ان گولیوں کا ذکر نہیں کرتا تھا جو پہلی جنگ عظیم کے دوران پنجابی مسلمانوں نے مکے پر چلائی تھیں۔ یہ ان فتوؤں کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا جو پنجابی ملاؤں نے برطانوی سامراج کی طرف سے مکے پر گولی چلانے کے جواز میں صادر کئے تھے اور نہ ہی یہ ان ''گراں قدر اسلامی خدمات'' کا کوئی حوالہ دیتا تھا جو دین محمد، الٰہی بخش اور متعدد دوسرے جرنیلوں کے علاوہ فقیر برادران جیسے ''سرکردہ'' مسلمانوں نے پنجاب میں سکھا شاہی کے نفاذ کے لئے سرانجام دی تھیں۔

نوائے وقت کی جانب سے اپنے قلم کی یہ آبروریزی اس کی اس رائے پر مبنی تھی کہ ''کسی ملک کی سیاست کا رُخ بدلنے والا طبقہ اس کا پڑھا لکھا، سیاسی شعور سے بہرہ ور اور ذہین طبقہ ہوتا ہے اور پنجاب کے اس طبقہ کے متعلق اب شاید ہی کوئی فہمیدہ آدمی غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔ اس حقیقت کو جھٹلانا ناممکن ہے کہ پنجاب کے پڑھے لکھے اور ذہین طبقہ کی

غالب اکثریت سرکاری مسلم لیگ سے بیزار اور متنفر ہے۔ اس طبقہ کی نفرت اور بیزاری کے باوجود لیگ اُن اَن پڑھ اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ووٹروں کو جبر و تشدد اور تخویف و ترغیب سے گمراہ کر کے الیکشن جیت سکتی ہے۔ مگر صوبہ کے پڑھے لکھے اور ذہین طبقہ کی مخالفت کی وجہ سے اس کی جیت عملاً شکست سے بہتر نہ ہوگی کیونکہ کوئی پارٹی پڑھے لکھے اور ذہین طبقہ میں غیر ہردلعزیز ہو جائے تو اس کی مدد کے بغیر زیادہ دیر تک اپنے آپ کو زندہ نہیں رکھ سکتی...... سرکاری مسلم لیگ کی موت یقینی ہے...... مسلم لیگ انتخابات سے پہلے ہی ہار چکی ہے۔ اگر وہ روپے، برادریوں اور سرکاری مشینری کی مدد سے وزارت بنانے میں کامیاب ہو بھی گئی تو یہ کامیابی یونینسٹ پارٹی کی نمائشی کامیابی کی طرح عارضی ہوگی اور ایک مہلک ناکامی کا پیش خیمہ۔ اس کے بعد جس طرح یونینسٹ پارٹی ذلت و نامرادی کی موت مرگئی سرکاری مسلم لیگ بھی ہمیشہ کے لئے ذلت و نامرادی کی موت مر جائے گی۔"[29] نوائے وقت کی اس ادارتی رائے کا پس منظر یہ تھا کہ گجرات کے نوابزدہ اصغر علی خان، جھنگ کے کرنل عابد حسین اور ڈیرہ غازی خان کے سردار محمد خان لغاری نے "جناح مسلم لیگ" میں شامل ہونے سے قطعی طور پر انکار کر دیا تھا اور اس وجہ سے اسے دیہاتی علاقوں میں ممدوٹ دھڑے کی کامیابی کی اُمید نہیں رہی تھی۔ مزید برآں انسپکٹر جنرل خان قربان علی خان کی پولیس پورے پنجاب میں لیاقت۔ دولتانہ دھڑے کے حق میں پوری طرح سرگرم عمل ہوگئی تھی اور ان دنوں دیرینہ روایات کے مطابق پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں عام انتخابات کے دوران پولیس کا کردار فیصلہ کن تصور کیا جاتا تھا۔ چونکہ نوائے وقت کا "تعلیم یافتہ، سیاسی شعور سے بہرہ ور اور ذہین طبقہ" قیام پاکستان کے بعد متروکہ جائیدادوں کی لوٹ کھسوٹ، درآمدی و برآمدی لائسنسوں کے حصول اور چھوٹی بڑی ملازمتیں حاصل کرنے میں ہمہ وقت مصروف رہا تھا، لہٰذا اسے جاگیرداری نظام اور سرکاری مشینری کے مظالم کے خلاف "اَن پڑھ اور بے شعور" غریب کسانوں کو منظم کرنے کی نہ تو فرصت ملی تھی اور نہ ہی اُس نے اس کی کوئی ضرورت محسوس کی تھی۔ یہ خود سیاسی طور پر اتنا پسماندہ تھا کہ اُسے نواب ممدوٹ جیسے دقیانوسی جاگیردار کے سوا کوئی لیڈر ہی نہیں ملتا تھا۔ نوائے وقت نے سرکاری لیگ کی انتخابی کامیابی کے باوجود اس کی موت کے یقینی ہونے کا جو بار بار ذکر کیا تھا وہ خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ یہ اخبار قبل ازیں کئی بار کہہ چکا تھا کہ سرکاری لیگ دراصل لیاقت علی خان کی ذات کا ہی دوسرا نام ہے۔

چنانچہ 24رجنوری کوحکومت پنجاب نے نوائے وقت کے پرنٹر، پبلشر و مدیر اعلیٰ حمید نظامی اورامرت الیکٹرک پریس کے کیپر سے تین تین ہزار روپے کی ضمانتیں طلب کر لیں۔ الزام یہ تھا کہ اس نے اپنی 9رجنوری 1951ء کو ایک قابل اعتراض خبر بعنوان ''مسلم لیگ اب محض غداروں کی ٹولی بن کر رہ گئی'' شائع کی تھی یہ قابل اعتراض خبر نواب ممدوٹ کی دو تقریروں پر مشتمل تھی جو اُس نے ملتان اور مظفر گڑھ میں کی تھیں۔ اس کی ملتان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ لیاقت علی خان، خلیق الزماں اور ممتاز دولتانہ نے پنجاب کو سیاسی طور پر بہت ذلیل کیا ہے۔ لیاقت علی خان کے بہت سے رشتہ دار ایسے ہیں جن کے پاس ہندوستان میں معمولی سی جائیداد بھی نہیں تھی لیکن اب انہیں بڑے بڑے مل، کارخانے اور سینما الاٹ کر دیئے گئے ہیں۔ اس کی مظفر گڑھ کی تقریر یہ تھی کہ ''اب لیگ ان لوگوں کی جماعت بن کر رہ گئی ہے جو ہمیشہ پاکستان کے نظریہ کی مخالفت کرتے رہے ہیں...... لیگ کے پرانے خادموں پر غداروں کو ترجیح دی جاتی ہے۔'' سیفٹی ایکٹ کے تحت حکومت کی اس کاروائی کے اگلے دن یعنی 25رمئی کو نوائے وقت نے وحدت واتحاد کے نام پر صوبائی عصبیت کا پرچار کیا۔ موضوع پرانا ہی تھا۔ یعنی یہ کہ اعلیٰ ملازمتوں میں بھرتی کے لئے صوبائی کوٹہ کیوں مقرر کیا گیا۔ ''اگر ملازمتوں میں داخلہ کا معیار یہی رہا اور نسبتاً نااہلوں کو اپنے سے زیادہ لائق اُمیدواروں پر محض اس لئے ترجیح دی جاتی رہی کہ وہ ایک خاص صوبہ سے تعلق رکھتے ہیں تو چند سال بعد نہ صرف پاکستان کے مختلف حصوں میں بسنے والے لوگوں کے مابین اتحاد واخوت کا رشتہ کمزور ہو جائے گا بلکہ ملک کی اعلیٰ ملازمتوں کا معیار بھی اس قدر پست ہو جائے گا کہ اعلیٰ عہدیداروں میں سے اکثریت ایسے نااہلوں کی ہوگی جو محض اپنی پنجابیت یا بنگالیت کی وجہ سے افسر بنا دیئے گئے ہیں۔'' اُسی دن اس اخبار نے کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خان کی اس تقریر کی تعریف کی جو اس نے اپنے کمانڈر انچیف بننے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 24رجنوری کو اسلامیہ کالج پشاور میں کی تھی۔ اس نے اس تقریر میں کہا تھا کہ ''فوج کا موجودہ سلیکشن سسٹم نہایت سائنٹیفک ہے۔ انتخاب کے وقت صرف قابلیت اُمیدوار کا معیار ہوتی ہے اور کوئی صوبائی امتیاز و تخصیص موجود نہیں ہوتی۔'' اس نے اسی دن نوشہرہ میں بھی اسی قسم کی تقریر کی تھی اور کہا تھا کہ ''فوج میں پٹھان، بنگالی اور پنجابی کا کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔ فوجی وردی میں ملبوس ہر شخص پاکستانی کے سوا اور کچھ نہیں۔'' نوائے وقت کی رائے یہ تھی کہ ''جنرل ایوب کا یہ فلسفہ صحیح فوجی فلسفہ تو

ہو گا ہی، صحیح اسلامی فلسفہ بھی ہے...... یہی سپرٹ پاکستان کے مستقبل کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔''[30] جنرل ایوب خان کا یہ فلسفہ نہ تو صحیح فوجی فلسفہ تھا اور نہ ہی صحیح اسلامی۔ یہ ایک خالص سامراجی فلسفہ تھا جو اس نے اپنے برطانوی آقاؤں سے ورثہ میں حاصل کیا تھا۔ اس نام نہاد فلسفہ کی بنیاد نسلی برتری پر تھی اور اس کے تحت بنگالیوں اور سندھیوں کے لئے فوج میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی یہ سپرٹ پاکستان کے مستقبل کی سب سے بڑی ضمانت نہیں تھی بلکہ اس میں پاکستان کی سالمیت کے لئے زبردست خطرہ پنہاں تھا۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے لئے یہ فلسفہ اس لئے صحیح اسلامی تھا اور یہ سپرٹ اس لئے اچھی تھی کہ ان سے سول اور فوجی بیوروکریسی میں پنجابیوں کے غلبہ کی ضمانت ملتی تھی۔ مزید برآں اس فلسفہ و سپرٹ سے اس امر کی نشاندہی ہوتی تھی کہ ایوب خان بھی زود یا بدیر لیاقت علی کے خلاف گرمانی۔ غلام محمد گٹھ جوڑ میں شامل ہو جائے گا۔ چونکہ سول ملازمتوں میں صوبائی کوٹہ کے پنجابی غلبہ کے راستہ میں حائل ہونے کا خطرہ تھا اس لئے نوائے وقت کی رائے میں ''وحدتِ قوم'' خطرہ میں تھی۔ ''وحدتِ قوم'' صرف اسی طرح قائم رہ سکتی تھی کہ غیر پنجابی صوبوں کے پسماندہ عوام ''سب سے زیادہ تعلیم یافتہ'' پنجابیوں کی سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی کی بالادستی بلا چون و چرا قبول کرلیں۔ مزید برآں 1۔ پنجاب کے لئے امپورٹ لائسنسوں کا کوٹہ مقرر کیا جائے۔ 2۔ لاہور میں امپورٹ ایکسپورٹ کے دفتر کو بااختیار بنایا جائے اور 3۔ پنجابی تاجروں اور ریلوے حکام میں تعاون بڑھایا جائے۔''[31]

حکومت پنجاب کی جانب سے نوائے وقت سے ضمانت طلبی سرکاری لیگ کی انتخابی مہم کا ایک حصہ تصور کی گئی۔ چنانچہ دوسرے دن یعنی 25 رجنوری کو اس کا جواب اس طرح دیا گیا کہ حسین شہید سہروردی اور نواب ممدوٹ کے درمیان رسمی طور پر گٹھ جوڑ ہو گیا یعنی سہروردی کی عوامی مسلم لیگ اور نواب ممدوٹ کی جناح مسلم لیگ کا ادغام ہو گیا اور اس متحدہ پارٹی کا نام جناح عوامی مسلم لیگ رکھا گیا اس موقع پر سہروردی اور ممدوٹ نے جو مشترکہ بیان جاری کیا اس میں اعلان کیا گیا تھا کہ رجعت پسند سرکاری مسلم لیگ کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا جائے گا۔ اس نئی پارٹی کے لئے سہروردی، ممدوٹ، پیر مانکی، عبدالباری اور پیر الٰہی بخش پر مشتمل ایک تنظیمی کمیٹی مقرر کی گئی مگر پارٹی کا کوئی منشور جاری نہیں کیا گیا تھا۔ ان دنوں دائیں بازو کی ان پارٹیوں کی تشکیل عجیب وغریب طریقے سے ہوتی تھی۔ اس مقصد کے لئے کوئی کنونشن منعقد نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی کسی پروگرام یا

منشور کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ ان کا یک نکاتی پروگرام یا منشور یہ تھا کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کا کسی نہ کسی طرح تختہ اُلٹا جائے۔ ان پارٹیوں کے لیڈر عوام الناس کو باور کرانے کی کوشش کرتے تھے کہ پاکستان میں ساری سیاسی، معاشرتی اور معاشی برائیوں کا سرچشمہ لیاقت علی خان ہے۔ اگر اسے ملک کے صفحۂ سیاست سے مٹا دیا جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ البتہ افتخار الدین کی بائیں بازو کی آزاد پاکستان پارٹی کا اعلان ایک واضح منشور کے ساتھ کارکنوں کے ایک باقاعدہ اجلاس میں کیا گیا تھا۔ لیکن یہ پارٹی عوام الناس کے دلوں میں اپنا مطلوبہ مقام محض اس لئے پیدا نہ کرسکی کہ اس کا ہندوستان کے ساتھ قومی تضاد اور تنازعہ کشمیر کے بارے میں مؤقف واضح نہیں تھا۔ مزید برآں اس میں بعض ایسے کمیونسٹ عناصر شامل تھے جو پاکستان کے وجود کے جواز کو ہی تسلیم نہیں کرتے تھے اور مختلف طریقوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ پاکستان دراصل برطانوی سامراج کی سازش کی پیداوار ہے اور سامراج کی اس ''حرامی اولاد'' کو دوبارہ بھارت ماتا کی گود میں چلے جانا چاہیے۔ اگر افتخار الدین ان نام نہاد کمیونسٹوں کے نرغے میں نہ آتا اور پاکستانی نیشنلزم کی بنیاد پر یہاں کے وسیع المشرب درمیانہ طبقہ کو ساتھ لے کر کسی پارٹی کی تشکیل کرتا تو وہ لازمی طور پر پروان چڑھتی۔ اس ملک کے غریب کسانوں، مزدوروں اور درمیانہ طبقہ کے مظلوم عوام کی بدقسمتی تھی کہ افتخار الدین جیسا روشن خیال جاگیردار ان بداندیش کمیونسٹوں کے چنگل میں پھنس گیا جو بمبئی سے لائن لیتے تھے۔ اگر اس نے ازخود پاکستان کے تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی محرکات کا صحیح تجزیہ کیا ہوتا تو وہ پاکستان کے ہندوستان کے ساتھ قومی تضاد کو کبھی نظرانداز نہ کرتا۔ اگرچہ پنجابی شاونزم کے عروج کے دور میں یہاں صحیح قومی خطوط پر کسی پارٹی کی نشوونما کا کام خاصا مشکل تھا لیکن یہ ناممکن نہیں تھا۔ ضرورت صرف صحیح حکمت عملی اور صحیح تدابیر کی تھی۔ پنجاب میں دائیں بازو کے رجعت پسند عناصر مختلف طریقوں سے صوبائی عصبیت کو فروغ دے کر نوزائیدہ ملک کی آزادی، خودمختاری اور سالمیت کو تباہ و برباد کرنے کے درپے تھے۔ اگر بائیں بازو کے ترقی پسند عناصر قوم کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مستقبل کی بنیاد حقیقی جذبۂ حب الوطنی کے ساتھ اُستوار کرتے تو ان رجعت پسند عناصر کے ناپاک عزائم کو ناکام کیا جاسکتا تھا۔

باب: 13

پنجاب کے انتخابات میں دھاندلی اور لیاقت علی خان کا قتل

10رفروری کوحکومت پنجاب نے نوائے وقت پر پری سنسر شپ عائد کر دیا۔سرکاری طور پراس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ''یہ اخبار وزیراعظم پاکستان کو رسوا کرنے کے لئے بے بنیاد الزام تراشی کرتا ہے۔حال ہی میں اس نے یہ بے بنیاد الزام عائد کیا تھا کہ وزیراعظم نے کامن ویلتھ کانفرنس میں شمولیت کے لئے روانگی میں التوا اس لئے نہیں کیا تھا کہ وہ مسئلہ کشمیر کو خاص اہمیت دیتا تھا بلکہ اس کا سبب محض یہ تھا کہ کراچی میں ان کا درزی ان کی بیگم صاحبہ کا کوٹ تیار کرنے میں دیر کر رہا تھا۔مزید برآں اس اخبار نے یہ الزام تراشی بھی کی ہے کہ برطانیہ میں پاکستانی ہائی کمشنر نے حکومت پاکستان کے فیصلے کے مطابق لندن میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یوم ولادت کے موقع پر ایک محفل رقص کا اہتمام کیا تھا جس میں شراب بھی مہیا کی گئی تھی......اگر اس شرانگیزی کے کنٹرول کے لئے اس سے بھی زیادہ شدید کاروائی عمل میں لائی جاتی تو بھی حکومت اس میں حق بجانب ہوتی مگر آئندہ انتخابات کے پیش نظر حکومت نہیں چاہتی کہ خفیف سی احتیاطی تدبیر کے طور پر ان پابندیوں کے علاوہ زیادہ قیود عائد کی جائیں۔'' نوائے وقت اور امرت الیکٹرک پریس نے حکومت پنجاب کے اس حکم کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں درخواستیں دائر کیں جن کی سماعت اپریل کے اوائل میں جسٹس ایس۔اے رحمان۔جسٹس محمد جان اور جسٹس خورشید زمان پر مشتمل فل بنچ کے روبرو ہوئی جبکہ صوبہ میں عام انتخابات مکمل ہو چکے تھے۔تاہم مقدمہ کی اس کاروائی کی جو رپورٹیں نوائے وقت میں شائع ہوئیں ان میں تاثر دیا گیا کہ جج صاحبان کا رویہ

درخواست دہندگان کے مؤقف کے بارے میں ہمدردانہ ہے۔ 4/اپریل کو اس مقدمہ کا فیصلہ محفوظ رکھا گیا۔ 6/اپریل کو صوبہ میں ممتاز دولتانہ کی وزارت کی تشکیل ہوگئی اور 17/اپریل کو جب اس سلسلے میں عدالت عالیہ کا فیصلہ صادر ہوا تو معلوم ہوا کہ نوائے وقت اور امرت الیکٹرک پریس کی درخواستیں مسترد کر دی گئی ہیں۔ قبل ازیں 11/اپریل کو دولتانہ وزارت کے برسراقتدار آنے کے صرف پانچ روز بعد نوائے وقت پریس اس الزام میں ضبط کرلیا گیا تھا کہ 7/مارچ کو اس اخبار نے پری سنسر شپ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس طرح نوائے وقت کی بندش کے دو دن بعد یعنی 14/اپریل کو اس ادارے کی جانب سے ''جہاد'' کے نام سے ایک اخبار جاری کیا گیا جس کی پیشانی پر یہ حدیث درج تھی کہ ''بہترین جہاد جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا ہے۔''

نوائے وقت اور حکومت پنجاب کے درمیان اس جھگڑے کے دوران 9/ مارچ 1951ء کو پاکستانی فوج کے چیف آف سٹاف میجر جنرل اکبر خان اور برّی و ہوائی فوج کے متعدد افسروں کے علاوہ پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر فیض احمد فیض کو بھی حکومت کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار کرلیا گیا۔ سرکاری بیان کے مطابق اس سازش میں مغربی پاکستان کی کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری سجاد ظہیر بھی ملوث تھا۔ 10/مارچ کو صوبہ بھر میں پولنگ شروع ہوئی جو دس دن تک جاری رہی۔ مارچ کے اواخر تک انتخابات کے نتائج کے اعلانات ہوئے اور 30/مارچ کو یہ پتہ چلا کہ لیاقت علی خان کی سرکاری مسلم لیگ بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگئی ہے۔ سرکاری اعلان کے مطابق پارٹی پوزیشن یہ تھی:

مسلم لیگ	=	140
جناح عوامی مسلم لیگ	=	32
آزاد پاکستان پارٹی	=	1
جماعتِ اسلامی	=	1
آزاد	=	17
اقلیتیں	=	5

تقریباً 42 لاکھ لوگوں نے یعنی تقریباً 50 فیصد رائے دہندگان نے اپنا حق رائے

دہندگی استعمال کیا۔تقریباً 42 لاکھ ووٹروں میں سے تقریباً 20 لاکھ نے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دیئے۔نو حلقوں میں مسلم لیگ کے اُمیدوار پہلے ہی بلا مقابلہ منتخب ہو چکے تھے۔انتخابی نتائج کے اس اعلان کو ابھی دو تین دن ہی گزرے تھے کہ پارٹی پوزیشن اور بھی زیادہ مسلم لیگ کے حق میں ہو گئی۔اب مختلف پارٹیوں کے ارکان کی تعداد حسب ذیل تھی:

مسلم لیگ	=	143
مسلم لیگ میں شامل ہونے والے آزاد ارکان	=	8
جناح عوامی مسلم لیگ کے ارکان جو مسلم لیگ میں شامل ہو گئے	=	2
		....
میزان		153

جناح عوامی مسلم لیگ	=	29
آزاد	=	5
اقلیتیں	=	5
آزاد پاکستان پارٹی	=	1
جماعت اسلامی	=	1
		....
کل میزان		194

یکم اپریل کو وزیر اعظم لیاقت علی خان کراچی سے لاہور آیا۔اس نے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے انٹرویو کے دوران اس الزام کی تردید کی کہ انتخابات میں کوئی بے قاعدگی ہوئی ہے اور کہا کہ "یہ الزام لغو اور بے ہودہ ہے۔ان انتخابات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پنجاب کا دل،

دماغ اور روح مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔‘‘ 2/اپریل کو صوبہ میں گورنر راج کے خاتمہ کا اعلان کر دیا گیا۔ 3/اپریل کو لیاقت علی خان کی زیر صدارت لیگ اسمبلی پارٹی کے اجلاس میں ممتاز دولتانہ کو متفقہ طور پر قائد منتخب کیا گیا۔ 4/اپریل کو گورنر نے اُسے وزارت سازی کی دعوت دی اور 5/اپریل کو اس کی سات رکنی کابینہ نے حلف اُٹھایا۔ ممتاز دولتانہ کے علاوہ اس کابینہ کے دوسرے ارکان صوفی عبدالحمید، سردار عبدالحمید دستی، چودھری محمد حسین چٹھہ، سردار محمد خان لغاری، شیخ فضل الٰہی پراچہ اور سید علی حسین گردیزی تھے۔ ان میں سے سردار عبدالحمید دستی (مظفر گڑھ) اور سردار محمد خان لغاری (ڈیرہ غازی خان) ممدوٹ کابینہ میں بھی شامل تھے۔ یہ جناح عوامی مسلم لیگ میں شامل نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق حکمران پارٹی سے ہی منسلک رہے تھے اور اب انہیں ان کا حصہ مل گیا تھا۔ 6/اپریل کو لیاقت علی خان واپس کراچی چلا گیا۔ اس نے یکم اپریل کو لاہور میں اپنی آمد پر جو بیان دیا تھا وہ سراسر لغو اور بے ہودہ تھا۔ اس نے اتنا بڑا اور اتنا کھلم کھلا جھوٹ بول کر پاکستان کے عوام کی بالعموم اور پنجاب کے عوام کی بالخصوص بہت توہین کی تھی۔ یہ صحیح تھا کہ انتخابی مہم کے دوران پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹوں نے بدترین صوبائی عصبیت کے علاوہ وزیراعظم لیاقت علی اور اس کی بیگم کے خلاف انتہائی قابل مذمت بے ہودگی اور ناشائستگی کا مظاہرہ کیا تھا اور اس بنا پر نوائے وقت کے خلاف جو تادیبی کارروائی کی گئی تھی وہ بے جواز نہیں تھی۔ بایں ہمہ کسی بھی صاحب ایمان کے لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا کہ پاکستان کے ان پہلے انتخابات میں اتنے وسیع پیمانے پر دھاندلی کی گئی تھی کہ انہیں انتخابات کہا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ لیاقت علی خان نے اپنی جاگیردارانہ ذہنیت کی بنا پر پاکستان کے قیام کے تقریباً پونے چار سال بعد ہی پارلیمانی جمہوریت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ یہ انتخابات نہیں تھے۔ یہ جمہوریت کا قتل عام تھا، جس کے بعد پاکستان کے ہر باشعور شہری کو یقین ہو گیا تھا کہ جب تک اس میں قرون وسطیٰ کی جاگیرداریت اور سامراج نواز بیوروکریسی کا غلبہ رہے گا اس وقت تک یہاں سرمایہ دارانہ جمہوریت کے فروغ پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیاقت علی خان نے ویسے تو پہلے بھی کبھی پارلیمانی جمہوریت کے کسی اصول پر عمل نہیں کیا تھا اور اس کے قول و فعل سے ہمیشہ جاگیردارانہ استبدادیت کا اظہار ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ ملک کے پہلے عام انتخابات میں اتنی دھاندلی اور غنڈہ گردی ہو گی اور سول بیوروکریسی کے

اعلیٰ حکام اس طرح کھلم کھلا اس میں ملوث ہوں گے یہاں تک کہ لاہور شہر میں لاکھوں لوگوں کی نظروں کے سامنے جمہوریت کو کند چھری کے ساتھ ذبح کیا جائے گا۔ چنانچہ ان انتخابات میں نہ صرف مسلم لیگ کی سیاسی موت واقع ہوگئی بلکہ لیاقت علی خان کے اقتدار کا بھی جنازہ نکل گیا۔ اب وہ محض جاگیرداروں، سامراجیوں اور اعلیٰ افسروں کی امداد سے زیادہ دیر تک حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سیاسی طور پر بڑا ہی کوتاہ اندیش تھا۔

انتخابی دھاندلیوں کی خبریں دراصل پولنگ شروع ہونے کے فوراً بعد آنا شروع ہوگئی تھیں۔ مثلاً راولپنڈی میں مسلم لیگ کے علاوہ باقی تمام سیاسی پارٹیوں نے 12 / مارچ کو ہی انتخابات میں حکام کی مداخلت اور لیگی اُمیدواروں کی بدعنوانیوں کے خلاف بطور احتجاج انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا لیکن پولنگ بدستور 17 / مارچ تک جاری رہی۔ 15 / مارچ کو یہ خبر ملی کہ لاہور کے تھانے صدر کے موضع فتح گڑھ میں ایک پارٹی نے پولنگ آفس کو باہر سے تالہ لگا دیا ہے اور پولنگ آفیسر اور اس کے عملے کے گلے میں جوتوں کا ہار پہنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ 16 / مارچ کو یہ خبر شائع ہوئی کہ ''میاں دولتانہ کے حلقہ میں بے ضابطگیوں کی انتہا ہو چکی ہے...... یہاں تک کہ طوائفوں کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں اور انہیں اس حلقہ میں شریف خواتین کی بے آبروئی پر مامور کیا گیا ہے'' اور پھر 18 / مارچ کو یہ خبر آئی کہ شیخوپورہ میں مقامی حکام کی طرف سے انتخابی قواعد وضوابط کی شدید خلاف ورزی ہوئی ہے...... گورنر پنجاب کے سابق مشیر اعلیٰ ملک محمد انور نے بطور احتجاج انتخاب کا بائیکاٹ کر دیا ہے...... خلاف ورزی مسلم لیگی اُمیدوار چودھری محمد حسین چٹھہ کو امداد دینے کی کوشش میں روا رکھی گئی۔ 20 / مارچ کو پولنگ ختم ہوئی تو جناح عوامی مسلم لیگ کے کنوینر حسین شہید سہروردی نے ایک پریس کانفرنس میں مطالبہ کیا کہ ''پنجاب میں جو انتخابات ہوئے ہیں انہیں کالعدم قرار دے کر صحیح حالات کے تحت صوبہ میں ازسرِ نو انتخابات کرائے جائیں...... ایسے انتخابات سے صوبہ میں دفعہ 92 الف کا نفاذ یا کسی نامزد اسمبلی کا قیام ہی بہتر ہوتا...... دیہاتی علاقوں میں ووٹروں پر زبردست دباؤ ڈالا گیا اور بددیانتی کی انتہا ہوگئی...... ہر قسم کا ظلم اور مکاری روبہ کار لائی گئی...... میں ابھی ابھی لائل پور سے آیا ہوں جہاں میں نے خود حالات کا مشاہدہ کیا۔ ایک سٹیشن پر ایک محلہ کا پولنگ شروع تھا۔ مسلم لیگی اُمیدوار مل کے مزدور کو لے آئے حالانکہ وہ اس محلہ کے باشندے نہ تھے۔ کارخانہ کے مالکوں نے حصول خوشنودی

کے لئے کارخانہ بند کر دیا۔ مل کے مزدوروں کو مسلم لیگ کے ٹرکوں پر لایا گیا۔ اُن کی خاطر مدارات کے علاوہ انہیں جعلی ووٹ کے لئے دو روپے فی کس دیا گیا۔ پریذائیڈنگ آفیسر، پولنگ آفیسر غرضیکہ جس شخص سے بھی ملا ہوں اس نے اعتراف کیا کہ ووٹر بالکل بوگس تھے...... ضلع سیالکوٹ میں ایک حلقہ میں مسلم لیگی اُمیدوار کو انتخاب سے ایک رات قبل ہی پرچیاں دے دی گئیں چنانچہ بکسوں میں سے ان جعلی پرچیوں کے بنڈل برآمد ہوئے ہیں...... جناح عوامی مسلم لیگ کے دفتر میں 80 حلقوں سے پولیس اور دیگر سرکاری اہل کاروں کے تشدد کی سنگین شکایات موصول ہوئی ہیں چنانچہ گورنر پنجاب نے حضرو اور ٹھیکری والا کے تھانیداروں کے خلاف انکوائری کا حکم دے دیا ہے۔''

26 / مارچ کو جھنگ سے یہ خبر موصول ہوئی کہ کڑیاں والا گاؤں کے ووٹ جو حلقہ نمبر 6 میں شامل تھے دراصل حلقہ نمبر 5 میں ڈالے گئے ہیں۔ 27 / مارچ کو گورنر پنجاب کے سابق مشیر میر احمد شاہ نے ایک بیان میں ضلع کیمبل پور کے سرکاری حکام اور مسلم لیگی اُمیدواروں کی دھاندلیوں کی مثالیں دیتے ہوئے انتخابات کو ایک ڈھونگ قرار دیا۔ اس نے کہا کہ ''پولیس نے نہ صرف دیہاتی ووٹروں کو خوفزدہ کیا بلکہ سرکاری ملازمین کے دل میں بھی یہ خوف پیدا کر دیا کہ اگر انہوں نے مسلم لیگی اُمیدواروں کے حق میں ووٹ نہ ڈالے تو مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ ہر گاؤں کے سربراہ چودھری یا نمبردار یا پولیس کی طرف سے یہ دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مسلم لیگ کی حمایت کریں۔'' 27 / مارچ کو منٹگمری کے حلقہ نمبر 4 کے پولنگ میں سرکاری عملہ کی مداخلت کی سنگین شکایت ملی۔ جناح عوامی مسلم لیگ کے اُمیدوار کے 5504 ووٹ ناجائز قرار دے دیئے گئے۔ منٹگمری کے ایک اور حلقہ میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہوا۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جناح لیگ کے اُمیدوار مہر رحمت اللہ کاٹھیا کامیاب ہو رہے تھے مگر 23 / مارچ کو جب ایک پولنگ سٹیشن کے تھیلے کھولے گئے تو ایک تھیلے پر اُن کے ایجنٹ کی مہر غائب تھی۔ اس نے اس کے خلاف احتجاج کیا مگر شنوائی نہ ہوئی جب ووٹ گنے گئے تو تھیلے سے مہر رحمت اللہ کے صرف 31 ووٹ نکلے اور ان کے حریف کے 1046۔ حالانکہ 19 / مارچ کو جب پولنگ ختم ہوا تو پریذائیڈنگ آفیسر کے اپنے دستخطوں سے اعداد و شمار کے متعلق جو پرچہ انہیں دیا گیا اس میں مہر رحمت اللہ کے ووٹ 231 اور لیگی اُمیدوار ملک جہانگیر لنگڑیال کے ووٹ صرف 129 تھے۔ جماعت اسلامی کے اُمیدوار کو بھی

پریذائیڈنگ آفیسر کی طرف سے ایک پرچہ دیا گیا جس پر یہی اعداد وشمار تھے۔ ان دونوں دستاویزات کی فوٹوسٹیٹ اخبارات میں شائع ہوئیں۔'' حسین شہید سہروردی نے ان اطلاعات کے پیش نظر 27ر مارچ کو پھر مطالبہ کیا کہ دوبارہ انتخابات کرائے جائیں کیونکہ سرکاری ملازمین نے مداخلت کر کے اپوزیشن پارٹیوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور اسی دن صاحبزادی محمودہ بیگم نے بھی مطالبہ کیا کہ موجودہ انتخابات کو کالعدم قرار دیا جائے۔

اگر دھاندلیوں کی شکایات صوبہ کے دور افتادہ دیہاتی علاقوں کے حلقوں تک ہی محدود رہتیں تو شاید شہروں کا درمیانہ طبقہ ان کی صداقت پر شبہ کرتا۔ لیکن جب لاہور، گوجرانوالہ، گجرات، لائل پور، ملتان اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں کھلم کھلا بے ضابطگیاں ہوئیں تو لوگ سناٹے میں آ گئے۔ یہ بات کسی کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی کہ لاہور میں بھی ایسی دھاندلی ہوگی جیسی کہ ووٹوں کی گنتی کے موقع پر سینکڑوں ہزاروں لوگوں کی نظروں کے سامنے کی گئی۔ لاہور شہر کے حلقہ نمبر 3 کا پولنگ ختم ہوا تو غیر سرکاری اعداد وشمار کے مطابق مہاجر نشست پر جناح لیگ کا اُمیدوار سید شمیم حسین قادری کامیاب تھا اور مقامی نشست سے جناح لیگ ہی کے امیدوار میاں مشتاق احمد کے مقابلے میں مسلم لیگ کے مقامی اُمیدوار میاں محمد شریف کے کم وبیش تین ہزار ووٹ کم تھے مگر جب ووٹوں کے تھیلے کھولے گئے تو شمیم حسین تو واقعی کامیاب قرار پائے مگر میاں مشتاق احمد کے مقابلے پر ابوسعید انور کامیاب قرار پایا۔ جسے مسلم لیگ سات سال کے لئے خارج کر چکی تھی۔ ابوسعید انور مہاجر نشست سے اُمیدوار تھا مگر چونکہ وہ نمبر 2 پر آیا تھا اس لئے لاہور کے حلقہ نمبر 3 میں سے دونوں مہاجر اُمیدوار کامیاب قرار دیئے گئے۔ میاں مشتاق احمد کا دعویٰ تھا کہ اس نے 9405 ووٹ حاصل کئے ہیں اور ابوسعید انور نے 8847۔ ابوسعید انور کا دعویٰ تھا (جو اخباروں میں شائع ہوا) کہ میں نے 9152 ووٹ حاصل کئے ہیں مگر تھیلے کھولے گئے تو ووٹوں کی تعداد مختلف نکلی۔ ابوسعید انور کے ووٹ 6401 نکلے اور ان میں سے 75 ناجائز قرار دیئے گئے۔ میاں مشتاق احمد کے ووٹ 9288 نکلے ان میں سے 432 ووٹ ناجائز قرار دیئے گئے۔ لاہور کے حلقہ نمبر 4 سے جناح لیگ کے دونوں اُمیدوار ریٹرننگ آفیسر سید سعید جعفری کے جانبدارانہ رویہ کے خلاف بطور احتجاج واک آؤٹ کر گئے۔ دونوں کے لفافوں کے مجموعہ اور فارم نمبر 11 کے مطابق جناح لیگ کے حاجی مہربان احمد کے 7735 ووٹ تھے اور لیگی اُمیدوار عبدالوحید نے

7385 حاصل کئے تھے۔ مگر جب گنتی کی گئی تو عبدالوحید خان کے 7696 اور حاجی مہربان کے 7503 کر دیئے گئے۔ عبدالوحید کے ووٹوں میں یکا یک 311 ووٹوں کا اضافہ ہزاروں لوگوں کے لئے حیرت انگیز تھا۔ مگر لاہور میں سب سے بڑا اسکینڈل 30 / مارچ کو ہوا جبکہ ریٹرننگ آفیسر سید سعید جعفری نے ایک ایسے مقامی حلقے کے ووٹوں کی سرکاری گنتی کی جہاں سے ایک مزدور رہنما مرزا محمد ابراہیم کامیاب ہو رہا تھا۔ پہلی سرکاری گنتی میں ووٹوں کی تعداد حسبِ ذیل تھی۔

مرزا محمد ابراہیم	=	8083
ملک محمد اسلم	=	7769
احمد سعید کرمانی	=	7759

ایک مرتبہ جانچ پڑتال کے بعد ریٹرننگ آفیسر جعفری نے مرزا ابراہیم کے 1170 ملک محمد اسلم کے 627 اور مسلم لیگی اُمیدوار احمد سعید کرمانی کے صرف 23 ووٹ ناجائز قرار دے دیئے۔ مگر غیر لیگی اُمیدواروں کے نمائندوں کے اصرار پر دوبارہ جانچ پڑتال کی گئی۔ جس کے نتیجہ میں محمد ابراہیم کے 946 ملک محمد اسلم کے 449 اور احمد سعید کرمانی کے 424 ووٹ ناجائز قرار دیئے گئے۔ اس طرح مرزا ابراہیم سے 214 اور ملک محمد اسلم سے صرف 13 ووٹوں کی اکثریت سے لیگی اُمیدوار کی کامیابی کا اعلان کر دیا گیا۔''[1]

یہ سنسنی خیز ڈرامہ سینکڑوں لوگوں نے ضلع کچہری میں دیکھا۔ ان دنوں سید سعید جعفری لاہور کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ وہ بہت متعصب ''تلئیر'' ہونے کے باعث غیر رسمی طور پر قائم یو۔ پی آفیسرز ایسوسی ایشن کا سرگرم رکن تھا۔ لیاقت علی خان کا چہیتا تھا۔ اس نے لاہور میں یہ سب کچھ یہ ثابت کرنے کے لئے کیا تھا کہ اس شہر کے لوگوں کی اکثریت بھی ''قائدِ ملّت'' کی فدائی ہے۔ اگلے دن یعنی یکم اپریل کو جب لیاقت علی لاہور پہنچا تو شہر میں انتخابی دھاندلیوں کی وجہ سے کہرام مچا ہوا تھا مگر وزیر اعظم نے اس خانہ خراب آفیسر کے خلاف کوئی کاروائی کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ کچھ عرصہ بعد اسے بطور انعام کمشنر بحالیات بنا دیا گیا اور اس حیثیت سے اس نے اپنے اور اپنے رشتہ داروں کے نام اتنی الاٹمنٹیں کیں کہ سعید جعفری کا نام بدعنوانی، اقربا نوازی اور رشوت خوری کی علامت بن گیا۔ جب وزیر اعظم لیاقت نے لاہور اور دوسرے شہروں میں اس قسم کی کھلی دھاندلیوں کے الزامات کو ''لغو اور بے ہودہ'' قرار دیا تو اُسے اس کے نتائج کا شعور نہیں تھا۔ اسے

احساس نہیں تھا کہ اگر پرُامن انتقال اقتدار کے سارے دروازے بند کر دیئے جائیں تو پھر کیا ہوتا ہے۔ اگر اس میں ذرا سی سیاسی دوراندیشی ہوتی تو وہ پنجاب کے تعلیم یافتہ شہری عوام کو اتنا زیادہ ناراض نہ کرتا۔ بظاہر اس کی جانب سے یہ سب کچھ کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ پنجاب کے شہری اور دیہاتی دونوں ہی علاقوں میں ہر دلعزیز ہے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ جناح عوامی مسلم لیگ کو اتنی نشستیں نہیں دینا چاہتا تھا کہ اس کا سب سے بڑا سیاسی حریف حسین شہید سہروردی پاکستان دستور ساز اسمبلی میں پہنچ جائے۔ وہ اسے کُتّا، غدار اور منافق قرار دے چکا تھا۔ لیکن یہ اس کی محض جاگیردارانہ ہٹ دھرمی تھی۔ اگر مزدور لیڈر مرزا ابراہیم صوبائی اسمبلی میں چلا جاتا اور اگر جناح عوامی مسلم لیگ چالیس پچاس نشستیں جیت کر حسین شہید سہروردی کو پاکستان دستور ساز اسمبلی میں بھیج دیتی تو آسمان کے ٹوٹنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پارلیمانی جمہوریت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ لیاقت علی خان کو اگر اس کے جاگیردارانہ عناد نے بے حس نہ کیا ہوتا تو اُسے یہ احساس ہوتا کہ پنجاب کے شہروں میں اس کے خلاف صوبائی عصبیت زوروں پر ہے اور بالخصوص کاروباری عناصر نے جائز و ناجائز شکایات کا طومار باندھ رکھا ہے۔ یہاں تک کہ پنجاب کے ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے صدر فاروق احمد شیخ کا الزام یہ تھا کہ ''مرکزی حکومت لائسنسوں کے اجراء کے سلسلے میں پنجاب کے کاروباری طبقے سے انصاف نہیں کرتی۔'' اس کاروباری طبقے کا کہنا تھا کہ اگرچہ 75 فیصد درآمدی اشیاء کی کھپت پنجاب میں ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود 95 فیصد درآمدی لائسنس کراچی والوں کو ملتے ہیں۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ درآمدی لائسنسوں کا کم از کم 50 فیصد کوٹہ پنجاب کو دیا جائے اور پرانے اور نئے درآمدی تاجروں کے درمیان امتیاز کو ختم کیا جائے۔''[2] ان کاروباری عناصر کے سب سے بڑے ترجمان اخبار نوائے وقت کا تبصرہ یہ تھا کہ ''لاہور میں مسلم لیگی اُمیدوارں نے اسمبلی تک پہنچنے کے لئے جس دھاندلی اور جس سینہ زوری سے کام لیا ہے اس نے یونینسٹوں ہی کو مات نہیں کر دیا، نازی پارٹی کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ لیگی اُمیدواروں نے جو ہتھکنڈے استعمال کئے وہ ایسے شرمناک ہیں کہ نازی بھی زندہ ہوتے تو شرماتے...... اگر لاہور میں مسلم لیگ کی یہ کرتوتیں ہیں تو دیہاتی پنجاب میں اُس نے کیا قیامت نہ ڈھائی ہوگی۔ اگر مسلم لیگی قیادت اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس طرح وہ لاہور میں اپنی ''ہر دلعزیزی'' ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گی تو یہ اس کی

غلط فہمی ہے۔ اس دھاندلی سے اُس نے عوام کے دلوں میں بیزاری کا ایسا بیج بویا ہے جس نے مسلم لیگ کی رہی سہی ساکھ ختم کر دی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مسلم لیگ نے انتخاب جیتنے کی خاطر جمہوریت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ 197 اصحاب کی ایک فہرست مرتب کر کے انہیں اسمبلی کا ممبر نامزد کر دیا جاتا۔ اگر ووٹروں کی رائے کا احترام منظور نہیں تھا تو انتخاب کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ ڈھونگ کا لفظ اس انتخاب کے بارے میں بڑا نرم لفظ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لغت میں کوئی ایسا لفظ ہی نہیں جو عوام کے ساتھ اس عظیم فراڈ کا پورا مفہوم ادا کر سکے۔"[3] نوائے وقت کا یہ تنقیدی تبصرہ بالکل صحیح تھا۔ لاہور شہر کا بچہ بچہ اس کی صداقت کی گواہی دیتا تھا۔ لیاقت علی خان نے صرف جمہوریت کا گلا ہی نہیں گھونٹا تھا بلکہ اس نے اپنے اقتدار کے گلے پر بھی چھری پھیری اور ستم بالائے ستم یہ تھا کہ یہ سب کچھ ایک ایسے گورنر کی موجودگی میں ہوا جو درمیانہ طبقہ کی شریفانہ اخلاقی اقدار کا حامل تصور کیا جاتا تھا۔

سرمایہ دارانہ جمہوریت پر مزید قاتلانہ حملہ 11/اپریل 1951ء کو ہوا جبکہ دولتانہ حکومت نے سیفٹی ایکٹ کے تحت نوائے وقت کے امرت الیکٹرک پریس کو ضبط کر لیا۔ اس سلسلے میں جو سرکاری اعلان جاری کیا گیا اس میں بتایا گیا تھا کہ صوبائی حکومت نے 10/فروری کو سیفٹی ایکٹ کے تحت اس اخبار پر جو سنسر عائد کیا تھا اس نے کئی بار اس کی خلاف ورزی کی۔ مگر نوائے وقت کو جو حکم دیا گیا اس میں یہ بات درج نہیں تھی۔ اس میں صرف یہ کہا گیا تھا کہ نوائے وقت نے 8/مارچ کو خاتونِ پاکستان محترمہ فاطمہ جناح کا ایک بیان شائع کیا تھا مگر اس کا ترجمہ صحیح نہیں کیا تھا۔ یہ سنسر شپ صوبہ بھر میں پولنگ ختم ہونے کے پانچ دن بعد 25/مارچ کو اُٹھا لیا گیا تھا اور 10/فروری اور 25/مارچ کے درمیانی عرصے میں اس پر سنسر شپ کی خلاف ورزی کا کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا تھا۔ مس جناح کا بیان 7/مارچ کو شائع کیا گیا تھا مگر اس پر گورنر راج کے دوران کوئی کاروائی نہیں کی گئی تھی لیکن دولتانہ وزارت کے قیام کے پانچ دن بعد یعنی متذکرہ بیان کی اشاعت کے پورے 36 دن بعد یکا یک صوبائی حکومت کے نوٹس میں یہ بات آ گئی اور امرت الیکٹرک پریس کو ضبط کر کے اخبار کی اشاعت بند کر دی گئی۔ نوائے وقت کی جانب سے 12/اپریل کو نئے پریس کے ڈیکلریشن کی درخواست دے دی گئی مگر اس پر کوئی کاروائی نہ کی گئی اور درخواست پر فیصلہ معرضِ التوا میں ڈال دیا گیا کیونکہ وزیر اعلیٰ ممتاز دولتانہ کا جذبۂ انتقام

پورے جوش پر تھا۔ ضلع ملتان کے اس جاگیردار کو اپنی ''اعلیٰ تعلیم، ذہانت، فطانت اور سیاسی بصیرت'' پر بڑا فخر تھا۔ اس کے خوشامدی ''اخبارنویس'' اور برآمدہ نشین ''سیاسی کارکن'' اسے بہت اعلیٰ پایہ کا دانشور قرار دیتے تھے۔ اس نے وزیراعلیٰ بنتے ہی نوائے وقت کے خلاف جس بھونڈے طریقے سے انتقامی کاروائی کی اس سے اُس نے نہ صرف اپنے سیاسی مستقبل پر بلکہ وزیراعظم لیاقت علی کی سیاسی زندگی پر بھی سخت ضرب لگائی۔ نوائے وقت کو اس کاروائی سے کوئی خاص نقصان نہ پہنچ سکا کیونکہ اسے صوبہ کے خوشحال درمیانہ طبقے اور سرمایہ دار طبقے کی اکثریت کی امداد حاصل تھی۔ 12/اپریل کو نوائے وقت بند ہوا تو دو دن بعد اس ادارے کی جانب سے ''جہاد'' کے نام سے ایک اخبار کی اشاعت شروع ہوگئی۔ جب نوائے وقت کی اس جبری بندش کو دو ہفتے گزر گئے تو مروجہ ''قانون'' کے مطابق اس اخبار کا ڈیکلریشن بھی ازخود منسوخ ہوگیا۔ چنانچہ 28/اپریل کو دولتانہ کے ایک خوشامدی اخبارنویس نے جوان دنوں روزنامہ احسان کا ایڈیٹر تھا، نوائے وقت کے نام سے ایک اخبار جاری کرنے کی درخواست دے دی۔ بالآخر مئی کے وسط میں مرکزی سیفٹی آرڈیننس کے تحت نوائے وقت کو پریس کی تبدیلی کا ڈیکلریشن دینے سے انکار کر دیا گیا اور اس اخبار کا ڈیکلریشن ایڈیٹر احسان کو دے دیا گیا۔

وزیراعلیٰ ممتاز دولتانہ نے نوائے وقت کے خلاف یہ ساری مضحکہ خیز انتقامی کاروائی اپنے محکمہ تعلقات عامہ کے ڈائریکٹر سید نور احمد کے مشورے کے مطابق کی تھی۔ نور احمد 1937ء کے عام انتخابات کے موقع پر لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں رپورٹر تھا۔ ان انتخابات کے بعد متحدہ پنجاب کا یونینسٹ وزیراعلیٰ سر سکندر حیات خان اس کی سرپرستی کیا کرتا تھا کیونکہ اُسے اس بااثر اخبار میں اپنی، اپنی پارٹی اور اپنی حکومت کی تشہیر کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہندوؤں کا اخبار ٹریبون سر سکندر حیات خان کو اس کی خواہش کے مطابق پبلسٹی نہیں دیا کرتا تھا۔ نور احمد اگرچہ خود انبالہ ڈویژن کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا لیکن نوعمری میں ہی جاگیردارانہ ماحول میں رہنے کی وجہ سے اس کی ذہنیت بھی جاگیردارانہ ہوگئی ہوئی تھی لہٰذا وہ جاگیرداروں کی طرح گھٹیا جوڑ توڑ اور سازشیں کیا کرتا تھا۔ اُسے یہ شعور نہیں تھا کہ نوائے وقت صرف حمید نظامی کی ذات کے خیالات کی ترجمانی نہیں کرتا تھا بلکہ وہ صوبہ بھر کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے ان عناصر کی ترجمانی کرتا تھا جن کے سیاسی و معاشی عزائم قیام پاکستان کے بعد یکا یک آسمان تک جا پہنچے تھے اور جو

''اسلام اور وحدتِ قوم'' کا پرچم اُٹھا کر دراصل پورے پاکستان کو ایک پنجابی سلطنت میں تبدیل کر دینے کے متمنی تھے۔ ان عناصر میں پنجاب کی سول، فوجی اور عدالتی بیوروکریسی کے علاوہ متوسط درجہ کے بہت سے مالکان اراضی، خوشحال تاجر، ابھرتے ہوئے صنعت کار، وکلاء اور چھوٹے بڑے اساتذہ بھی شامل تھے۔ نوائے وقت کے اداریوں اور خبروں کی بنیاد ان عناصر کے مہیا کردہ افکار، عزائم اور اطلاعات پر ہوتی تھی۔ محض نوائے وقت کی اشاعت بند کر دینے سے پنجاب کے ان شہری شاونسٹوں یا سامراجیوں کی زبان بندی نہیں کی جا سکتی تھی۔ چونکہ نور احمد اور اس کے آقاؤں کی سیاست جاگیردارانہ اور عوام دشمن تھی اس لئے یہ بات ان کے فہم وادراک سے بالا تھی کہ پنجاب کے بے لگام شاونسٹوں کے سدباب کے لئے کس قسم کا صحیح، مؤثر اور سائنسی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ 1953ء میں دولتانہ کے اقتدار کا تختہ اُلٹ جانے کے بعد نور احمد، راجہ غضنفر علی خان کی سرپرستی میں آ گیا تھا اور پھر ریٹائر ہونے کے بعد اس نے راجہ غضنفر علی خان کے ''کاغذات'' کی بنیاد پر ایک کتاب بعنوان ''مارشل لاء سے مارشل لاء تک'' لکھی جو جانبدارانہ اور سطحی ہونے کی وجہ سے غلط بیانیوں سے بھرپور ہے۔ اس نے اپنی اس کتاب میں بہت سے ایسے حقائق پر پردہ ڈالا ہے جو اس کے آقاؤں کے بدنما چہروں کو بے نقاب کر سکتے تھے اور بہت سے دوسرے حقائق کو اس نے غالباً اس لئے نامکمل طور پر توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے کہ اس پر نمک حرامی کا الزام عائد نہ ہو۔

نوائے وقت کے خلاف نور احمد کی اس سازشی کارروائی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اور نہ ہونا تھا۔ ادارہ نوائے وقت کی طرف سے روزنامہ ''جہاد'' کے ذریعے نہ صرف لیاقت۔ دولتانہ گٹھ جوڑ کے خلاف گالی گلوچ کا سلسلہ جاری رہا بلکہ صوبائی عصبیت کے زہر آلود پروپیگنڈے میں بھی کوئی کمی واقع نہ ہوئی جبکہ چنیوٹ کے سرمایہ دار میاں محمد امین اور نوائے وقت کے دوسرے قارئین کی طرف سے نوائے وقت پبلیکیشنز کے ''حصص'' خریدنے کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ 28/اپریل کے ''جہاد'' میں بیگم لیاقت علی خان کے غرارے کا پھر ذکر آ گیا۔ طنزیہ کالم میں لکھا تھا کہ ''عورتوں کے لباس کے بارے میں کافی لے دے ہو رہی ہے۔ کوئی محترمہ ساڑھی، جمپر کی تعریف میں رطب اللسان تو کوئی محترمہ قمیض شلوار کے گن گا رہی ہے۔ لیکن قومی فیصلے چونکہ آج کل کراچی میں ہوتے ہیں اس لئے ان سب سے غرارہ بازی لے گیا کیونکہ کراچی میں غرارے کی وہ سرپرستی ہوئی کہ بچاری ساڑھی دم دبا کر بنگال تشریف لے گئی اور قمیض شلوار لاہور آ گئی۔ اس

سے پہلے ایک محترمہ غرارے کی باریکیوں پر امریکہ لیکچر دے آئی تھیں۔ اس لئے کم از کم کراچی میں غرارے کو پاکستانی خواتین کا قومی لباس بنتے ہوئے کچھ مشکل پیش نہ آئی۔ پاکستانی بیگمات نے جس رفتار سے غرارے کی سرپرستی فرمائی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ غرارہ اب پاکستان کا نام چمکا کر ہی رہے گا۔ چنانچہ انگلستان کی شہزادی کی شادی ہوئی تو اُسے ریشمی غرارے کا سیٹ پاکستان کی طرف سے بھیجا گیا۔ شاہِ ایران کی شادی خانہ آبادی ہوئی تو ان کی ملکۂ عالیہ کو بھی غرارہ پاکستانی تحفے کے طور پر ملا''[4] اور 14 رمئی کے ''جہاد'' کا اداریہ یہ تھا کہ ''پنجاب کے تاجروں کے ایک ادارہ نے وزیراعلیٰ پنجاب کی معرفت پنجاب کے تاجر پیشہ طبقہ کی شکایات کو مرکزی حکومت تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ بڑی شکائیتیں دو ہیں۔ اول، درآمد و برآمد کے لائسنسوں کی تقسیم کے بارے میں، دوسری بینکوں کے بارے میں...... لائسنس اس طرح جاری کئے جاتے ہیں کہ تجارت درآمد و برآمد کراچی کے ایک مخصوص طبقے کے ہاتھوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے...... پنجاب میں بینکاری کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بڑے پاکستانی بینکوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کو چار ہزار روپے کے ڈرافٹ کی ضرورت ہو تو اس کے لیے بھی کراچی کی پیشگی منظوری لازمی ہے...... تین چار روز ہوئے یہ اعلان ہوا تھا کہ حکومت نے پاکستان کے دو بڑے سرمایہ داروں کو ایک ایک کروڑ روپیہ قرضہ یورپ سے فولاد خریدنے کے لئے دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ دونوں اصحاب کروڑ پتی ہیں۔ اگر دو آدمیوں کے لئے دو کروڑ روپیہ قرض کی گنجائش نکل سکتی ہے تو پنجاب کی صنعتوں کو دو کروڑ قرضہ کی شکل میں ہی مل جائے تو سیالکوٹ، وزیرآباد، گجرات اور جھنگ کے صناع اور کاریگر بے شمار چیزوں کے معاملے میں پنجاب کو نیم براعظم ہند و پاکستان کے سب علاقوں سے آگے لے جائیں گے۔''[5] ظاہر ہے کہ غرارے کے بارے میں متذکرہ طنزیہ تحریر وزیراعظم لیاقت اور اس کی بیگم کے لئے نہایت ہتک آمیز اور اشتعال انگیز تھی۔ تاہم اگر تجارتی لائسنسوں اور بنکوں کے قرضوں کے بارے میں اس اداریے کو صوبائی عصبیت پھیلانے والی سابقہ تحریروں سے الگ کر کے دیکھا جائے تو شاید اس میں کوئی خاص قابل اعتراض بات نظر نہیں آئے گی لیکن اگر اسے اس موضوع پر لکھے گئے پچھلے اداریوں اور مضامین کے ساتھ پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صوبائی عصبیت کے سلسلے کی ہی ایک اور کڑی تھی۔ اداریہ نویس نے کبھی اس قسم کی باتیں بلوچوں، سندھیوں اور بنگالیوں کے حق میں نہیں لکھی تھیں۔

تاہم وزیراعظم لیاقت علی خان کے خلاف سب سے خطرناک اور اشتعال انگیز اداریہ 18رمئی کے شمارے میں تھا۔ یہ اداریہ بظاہر تو راولپنڈی سازش کے سلسلے میں مزید دس فوجی افسروں کی گرفتاری پر تبصرہ کرنے کی غرض سے لکھا گیا تھا لیکن اس مسئلہ کا ذکر پانچ چھ سطور سے زیادہ نہیں تھا'' کیونکہ اب جبکہ مقدمہ کی سماعت کے لئے تین ممتاز ججوں پر مشتمل ٹربیونل قائم ہو چکا ہے ہم نفسِ مقدمہ یا الزامات کے بارے میں کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔'' اداریے میں اصلی بات اس طرح کہی گئی تھی کہ ''نفسِ مقدمہ سے قطع نظر ہم یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ تشدد کے ذریعے سیاسی مقصد حاصل کرنے کا نظریہ ملک وملت کے لئے بے حد مضر اور بے حد خطرناک ہے۔ یہ حربہ کسی جمہوری ملک کے لئے کبھی فائدہ مند ثابت نہیں ہوا...... ایران کی مثال سب کے سامنے ہے کہ وزیراعظم علی رزم آرا کو اس لئے قتل کیا گیا کہ اس پر ملکی مفاد سے اغماض اور غداری کا الزام تھا مگر اب وزیراعظم مصدق کو بھی یہی خدشہ لاحق ہے کہ میرا انجام بھی وہی نہ ہو...... مشرق وسطیٰ کے بیشتر ملکوں کی کمزوری و پسماندگی کی بڑی وجہ یہی ہے...... کبھی اس ملک سے کسی وزیراعظم کے قتل کی خبر آتی ہے اور کبھی اس ملک سے...... برطانیہ کے کسی وزیراعظم کے متعلق کبھی یہ سننے میں نہیں آیا کہ کسی نے اسے قتل کی دھمکی دی ہو۔ اس لئے کہ انگریزوں نے اپنے پارلیمانی جمہوری نظام کو اتنا پختہ کرلیا ہے کہ انگریز عوام کو سیاسی مقصد کے حصول کے لئے تشدد کے استعمال کا خیال تک نہیں پیدا ہوتا۔ وہ جانتے ہیں کہ چرچل جیسے وزیراعظم کو بھی منصفانہ اور آزادانہ انتخابات کے ذریعے ہم چاہیں تو مسند اقتدار سے اُتار دیں۔ پاکستان ایک نیا ملک ہے...... ابتدائی دور میں جو کچھ ہوگا بعد میں آنے والے اسی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں گے۔ اس لئے پاکستان کی حکومت، پاکستان کے ارباب اختیار واقتدار، پاکستان کے سیاسی رہنماؤں، اخبارات اور سوچنے سمجھنے والے افراد کا فرض ہے کہ وہ عوام کو اس طرح تربیت دیں کہ سیاسی مقصد کے لئے تشدد کے استعمال کے تصور سے ہی انہیں نفرت ہو جائے۔ محض حکومت اس بیماری کا علاج نہیں کرسکتی ہے۔ حکومت اور عوام مل کر ہی اس کا مداوا سوچ سکتے ہیں۔ اس بیماری کے استیصال کی یقینی صورت یہ ہے کہ جمہوریت کو صحیح خطوط پر فروغ دیا جائے اور آمرانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔''[6] اس اداریے کے مفہوم کے بارے میں کوئی ابہام نہیں۔ اس میں وزیراعظم لیاقت علی خان کو صاف الفاظ میں متنبہ کیا گیا تھا کہ اگر تم نے پرُ امن انتقال اقتدار کے دروازے بند رکھے

اور اپنے سیاسی حریفوں پر تشدد کا سلسلہ بند نہ کیا تو تمہارا حشر بھی ویسا ہی ہوگا جیسا کہ مشرق وسطیٰ کے وزرائے اعظم کا آئے دن ہوتا رہتا ہے۔ اس اداریے سے دو تین دن قبل خاکسار لیڈر عنایت اللہ مشرقی کو سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اس کی خاکسار جماعت ایک فاشسٹ تنظیم تھی جو اپنے سیاسی مقصد کے حصول کے لئے قتل و تشدد کو جائز سمجھتی تھی۔ قائداعظم جناح پر بمبئی میں اسی تنظیم کے ایک رکن نے قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

4/جون 1951ء کو وزیراعظم لیاقت نے صوبائی وزرائے اعلیٰ کی کانفرنس میں اعلان کیا کہ مرکزی حکومت 52۔1951ء کے مالی سال کے دوران صوبائی حکومتوں کی ترقیاتی سکیموں کے لئے کل 18 کروڑ روپے کی امداد دے گی۔ جس کی تقسیم حسب ذیل طریقے سے ہوگی:

مشرقی بنگال	=	ساڑھے 5 کروڑ
پنجاب	=	5 کروڑ
سندھ	=	2 کروڑ
سرحد	=	ڈیڑھ کروڑ
بلوچستان	=	80لاکھ
کراچی	=	1 کروڑ 90لاکھ
سرحدی علاقے	=	80لاکھ
بہاولپور	=	35لاکھ

لیکن پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کو مرکزی امدادی رقم کی اس تقسیم پر سخت اعتراض تھا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ”پنجاب اس سے زیادہ کا حقدار تھا۔ پنجاب نے مرکزی حکومت کو بیس بائیس کروڑ روپے کی رقم تو صرف کپاس پر برآمدی محصول میں اضافہ کی شکل میں ہی مہیا کی ہے...... اب جبکہ حکومت پاکستان نے صوبوں کو عوامی بہبود کی سکیموں کے لئے سرمایہ دینا منظور کیا ہے تو پنجاب کو صرف پانچ کروڑ روپیہ دینا پیاسے کے منہ میں شبنم ٹپکانے کے مترادف ہے۔“[7] پنجابی شاونسٹوں کا یہ مطالبہ تنگ نظر و تنگدل صوبہ پرستی کی بدترین مثال تھا۔ پاکستان کے ہر شخص کو معلوم تھا کہ مشرقی بنگال کی آبادی کا تناسب پورے ملک کی آبادی کے 50 فیصد سے زیادہ تھا اور وہ صوبہ معاشی لحاظ سے بھی انتہائی پسماندہ تھا یہاں تک کہ وہاں پٹ سن کا کوئی چھوٹا سا

کارخانہ بھی نہیں تھا۔ لیکن پنجاب میں ''اسلام وحُبّ الوطنیٰ'' کے اجارہ دار عناصر کو اپنے پسماندہ بنگالی بھائیوں کی ترقی وخوشحالی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں اس امر پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ ملک کی اتنی بڑی پسماندہ آبادی کے لئے صرف ساڑھے 5 کروڑ روپے دیئے گئے تھے اور اگرچہ ان عناصر کے لئے بلوچوں کی پسماندگی بڑی ڈراؤنی تھی لیکن یہ ان کے لئے مخصوص کردہ امدادی رقم کی کمی کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں اگر فکر تھی تو صرف پنجاب کی۔ انہیں اعلیٰ ملازمتوں میں بھی ''قابلیت وصلاحیت'' کے معیار کے مطابق سب سے زیادہ حصہ ملنا چاہیے تھا اور ان کے لئے مرکز کی امدادی رقم بھی سب سے زیادہ ہونی چاہیے تھی حالانکہ ان کی آبادی ملک کی کل آبادی کے ایک تہائی سے زیادہ نہیں تھی۔ انہیں کوئی احساس نہیں ہوتا تھا کہ ان کی یہی خودغرضی اور مفاد پرستی ایک نہ ایک دن ملک کی سالمیت کے لئے مہلک ثابت ہوگی۔

چونکہ اس دوران ادارہ نوائے وقت کے روزنامہ ''جہاد'' نے وزیراعظم لیاقت علی خان کے قول وفعل میں تضاد، اس کے ٹیل کوٹ اور اس کی بیگم کے سرسراتے ہوئے غرارے کا ذکر ترک نہیں کیا تھا اور وہ ''جابر سلطان'' کے سامنے ''کلمۂ حق'' کہتا رہا تھا۔ اس لئے 28/جولائی 1951ء کو یہ اخبار بند کردیا گیا۔ اس کی بندش کے لئے بھی تقریباً اسی قسم کا بھونڈا طریقہ اختیار کیا گیا جیسا کہ 11/اپریل 1951ء کو نوائے وقت کو بند کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا۔ محکمہ تعلقات عامہ کا ڈائریکٹر نور احمد اپنے آقاؤں کے اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس سے بہتر طریقہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوا اس طرح تھا کہ روزنامہ ''جہاد'' جس ''گیلانی پریس'' میں چھپتا تھا اس کا مالک سید شریف حسین سہروردی صوبہ مسلم لیگ کا خزانچی بھی تھا۔ وہ 28/جولائی کی صبح کو حمید نظامی کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ بعض حلقوں کی طرف سے مجھ پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ میں ''جہاد'' نہ چھاپوں، آج تک میں نے اس دباؤ کی پروا نہیں کی مگر اب یہ میری تاب سے باہر ہے لہٰذا آپ کسی دوسرے چھاپہ خانے کا انتظام کرلیں۔ چنانچہ 31/جولائی کو ادارہ نوائے وقت نے نئے پریس کا انتظام کرلیا تو اُسی دن ڈیکلریشن کی تبدیلی کی درخواست دے دی مگر ایک ماہ تک ڈیکلریشن نہ ملا۔ بالآخر 35 دن کے بعد ادارہ نوائے وقت نے ایک اور اخبار ''نوائے پاکستان'' شائع کرنے کا بندوبست کرلیا۔ لیکن اس اخبار کی پیشانی پر ''جابر سلطان'' والی حدیث نہیں تھی۔ اس کی بجائے ''دولتِ خداداد پاکستان کا واحد بے خوف اور حقیقی ترجمان'' لکھا گیا تھا۔

18 ستمبر کو پاکستان مسلم لیگ کے صدر اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے چیئرمین لیاقت علی خان نے ایک بیان میں بتایا کہ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کے چھ نمائندوں کا انتخاب پنجاب اسمبلی نے کیا تھا۔ اب چونکہ پنجاب میں نئی اسمبلی معرض وجود میں آچکی ہے اس لئے ان نشستوں کا دوبارہ انتخاب ہوگا۔ مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کرنے والے اُمیدوار اپنی درخواستیں 29 ستمبر تک ایک ہزار روپے کے زرضمانت کے ساتھ مرکزی لیگ کے سیکرٹری کو بھیجیں۔ لیاقت علی خان کا یہ بیان اس کے جاگیردارانہ سیاسی اندازفکر کا مظہر تھا۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک پنجابی رکن شیخ کرامت علی کے انتقال کے باعث وہاں دراصل پنجاب کی سات نشستیں خالی تھیں لیکن لیاقت علی نے ان میں سے چھ نشستوں کے ضمنی انتخاب کا اعلان محض اس لئے کیا تھا کہ اگر ساتوں نشستوں کا بیک وقت انتخاب ہوا تو حسین شہید سہروردی بھی جناح عوامی مسلم لیگ کے ارکان کی حمایت سے مرکزی اسمبلی کا رکن منتخب ہوجائے گا اور یہ بات نوابزادہ لیاقت علی خان کے لئے قابل برداشت نہیں تھی۔ پنجاب اسمبلی اپریل کے اوائل میں وجود میں آ گئی تھی مگر اس وقت سے اس کا کوئی سیشن منعقد نہیں کیا گیا تھا۔ 7 رمئی کو صرف تین گھنٹے کے لئے اسمبلی کا اجلاس ہوا تھا جس میں ارکان اسمبلی نے حلف اُٹھایا تھا اور پھر یہ اجلاس یکا یک کسی کاروائی کے بغیر غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔ حالانکہ ایجنڈا کے مطابق یہ اجلاس دو دن تک جاری رہنا چاہیے تھا۔ مگر ارکان اسمبلی کے حلف وفاداری اُٹھانے اور سپیکر کے انتخاب کے بعد ایوان کے لیڈر ممتاز دولتانہ کی تحریک پر کثرت رائے سے اجلاس غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ جس کی بنا پر ڈپٹی سپیکر کا انتخاب بھی نہ ہوسکا۔ جناح عوامی مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے نوائے وقت کے خلاف تعزیری کاروائی اور عام انتخاب میں سرکاری مداخلت کے متعلق تحاریک التوا پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا اور یہ تحاریک 8 رمئی کے اجلاس میں پیش ہونا تھیں۔ اس ڈرامائی التوا کی وجہ اس خطرے میں مضمر تھی کہ اگر اسمبلی کا سیشن جاری رہا تو نہ صرف نوائے وقت کے خلاف تعزیری کاروائی اور انتخابی دھاندلیوں کی تشہیر ہوگی بلکہ مرکزی اسمبلی کے ارکان کے انتخاب کا مسئلہ بھی اُٹھے گا اور اگر ان ارکان کا انتخاب اسمبلی کے کھلے اجلاس میں ہوا تو سہروردی حزبِ اختلاف کے اُمیدوار کی حیثیت سے کامیاب ہوجائے گا۔ سب کو معلوم تھا کہ ممتاز دولتانہ نے یہ ڈرامائی کاروائی لیاقت علی خان کی زیرہدایت کی تھی۔ جس کی جاگیردارانہ سیاست پنجاب میں صوبائی عصبیت کے فروغ کا باعث

بنی تھی۔ بدقسمتی سے لیاقت علی نے اس سے کوئی سبق نہیں سیکھا تھا۔ وہ اپنی خاندانی جاگیردارانہ سیاست پر گامزن رہا۔ اس نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس قسم کی غیر جمہوری سیاسی ہیرا پھیری یا بددیانتی بالآخر کس قدر خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ وہ سہروردی کو کتا، غدار اور منافق کہتا تھا اور ڈرتا تھا کہ اگر یہ شخص مرکزی اسمبلی میں پہنچ گیا تو اس کے لئے بہت مشکلات پیدا کرے گا۔ لیاقت علی خان نے اسی وجہ سے پنجاب سے ملک عمر حیات اور ملک فیروز خان نون کی نشستوں کو خالی قرار نہیں دیا تھا حالانکہ عمر حیات ایک عرصہ سے ٹوکیو میں پاکستانی سفیر کے عہدہ پر فائز تھا اور فیروز خان نون مشرقی بنگال کا گورنر بن گیا ہوا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر چھ کی بجائے بیک وقت نو نشستوں کا انتخاب ہوا تو سہروردی کے علاوہ ایک اور مخالف رکن بھی مرکزی اسمبلی میں آجائے گا اور پھر اس کے لئے ''قیامت'' آجائے گی۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کی بھاری اکثریت کے پیش نظر تھڑدلی کا یہ مظاہرہ عجیب وغریب معلوم ہوتا تھا۔ بعض لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لیاقت علی خان اس قسم کے آمرانہ رویہ پر کیوں مصر تھا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا جاگیردارانہ ذہن بورژوا پارلیمانی جمہوریت کی سپرٹ کو قبول نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے اس غیر جمہوری رویے کا کوئی اور جواز پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے پہلے صوبہ کے عام انتخابات میں کھلم کھلا دھاندلی کروا کر سرعام جمہوریت کا گلا گھونٹا اور پھر صوبائی اسمبلی کے اجلاس کو غیر معین عرصے کے لئے التوا میں ڈلوا کر اُسے دفن کردیا۔ پنجاب میں اس کے سیاسی گھوڑے ممتاز دولتانہ کو ابلیس سیاست کہا جاتا تھا لیکن خود لیاقت علی خان کی اپنی سیاست بھی شاطرانہ بدعنوانیوں سے خالی نہیں تھی۔

6راکتوبر کو لاہور کے اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کی نشستوں کا انتخاب 30راکتوبر کو ہوگا۔ کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی آخری تاریخ 16راکتوبر ہے اور نام واپس لینے کی تاریخ 20راکتوبر ہے۔'' 10راکتوبر کو جناح عوامی مسلم لیگ کے رکن اسمبلی شمیم حسین قادری نے ایک بیان میں مطالبہ کیا کہ پنجاب اسمبلی کا اجلاس بلانے کے لئے کوئی قریبی تاریخ مقرر کی جائے۔ اس نے کہا کہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کا انتخاب عام طور پر اسمبلی کے اجلاس میں ہی کیا جاتا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ اب یہ انتخاب نیابتی ووٹوں کے ذریعے کیا جائے گا۔ یہ طریقہ معمول کے مطابق نہیں۔ خطرہ ہے کہ مفصلات کے ارکان اسمبلی پر ڈپٹی کمشنروں اور پولیس افسروں کے ذریعے دباؤ ڈالا جائے گا۔ یہ انتخاب بغیر کسی دباؤ کے ایوان

اسمبلی میں ہی ہونا چاہیے۔‘‘ شمیم حسین قادری کا شبہ بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ ان دنوں کراچی میں مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس میں یہی پروگرام بنایا گیا تھا۔ لیاقت علی خان اور ممتاز دولتانہ کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ اگر انتخاب صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں ہوا تو بعض مسلم لیگی ارکان خفیہ رائے شماری میں محض دولتانہ کے ساتھ ذاتی مخاصمت کی وجہ سے حزب اختلاف کے اُمیدوار کو ووٹ دے دیں گے اور اس طرح وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے تحت پہلے انتخابی دھاندلیاں کی گئی تھیں اور پھر اسمبلی کے اجلاس کو غیر معین عرصے کے لئے معرض التوا میں ڈالا گیا تھا۔ 11/ اکتوبر کو مرکزی مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ کا ایک اور اجلاس ہوا جس میں تین گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد دستور ساز اسمبلی میں پنجاب کی چھ نشستوں کے انتخاب کے لئے نواب مشتاق احمد گرمانی، میر خلیل الرحمان، غلام بھیک نیرنگ، ملک شوکت علی اور میر اعظم خان کو لیگ کے ٹکٹ دیئے گئے اس سلسلے میں نوائے وقت کی رپورٹ میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ ’’شیخ کرامت علی مرحوم کی نشست کو خالی قرار نہیں دیا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حزب مخالف جناح عوامی مسلم لیگ کو ایک نشست بھی حاصل کرنے کا موقع نہ ملے۔‘‘ لیکن لیاقت علی خان اپنی حسب خواہش یہ انتخاب نہ کروا سکا۔ 16/ اکتوبر 1951ء کو وہ آزاد کشمیر کے دورے کے لئے راولپنڈی پہنچا۔ اسی دن سہ پہر کو جب وہ ایک جلسۂ عام کو خطاب کرنے کے لئے سٹیج پر کھڑا ہی ہوا تھا کہ اُسے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جب شام کو یہ المناک خبر لاہور پہنچی تو بعض پنجابی شاونسٹوں نے میٹرو ہوٹل میں کھلم کھلا خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ نواب ممدوٹ کی پرائیویٹ کابینہ کے دو ایک ارکان بھی شامل تھے۔

اگلے دن ادارہ نوائے وقت کے اخبار نوائے پاکستان نے اس قومی المیہ پر جن الفاظ میں اظہار افسوس کیا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس اخبار کی رائے میں لیاقت علی خان خود اپنی موت کا باعث ہے۔ اس میں 17/ اکتوبر 1951ء کو وزیر اعظم کے قتل کی جو خبر شائع کی گئی تھی اس کے ساتھ ہی ’’فرمودۂ قائد‘‘ کے زیر عنوان قائد اعظم جناح کی ڈھاکہ کی 24/ مارچ 1948ء کی تقریر کا ایک اقتباس چوکھٹے میں شائع کیا گیا تھا۔ فرمودۂ قائد یہ تھا کہ ’’آزادی کا مطلب بے راہروی نہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب آپ جو چاہیں کریں اور ریاست اور دوسرے لوگوں کے مفاد کے علی الرغم من مانی روش اختیار کریں۔ آپ پر ایک عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور ہمیں اس کے

برعکس ایک متحد اور منظم قوم کی طرح کام کرنا چاہیے۔ ہمیں اب جنگ آزادی کے دوران کی متحارب روح کی بجائے تعمیری روح کی ضرورت ہے۔'' اگر اس اقتباس کو نوائے وقت کے ان الزامات کے پس منظر کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس کا اصلی مطلب سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔ جنوری 1949ء میں ممدوٹ وزارت اور صوبائی اسمبلی کی برطرفی کے بعد نوائے وقت بڑے تسلسل کے ساتھ یہ جائز و ناجائز الزامات عائد کرتا رہا تھا کہ لیاقت علی خان نے من مانی روش اختیار کر لی ہے۔ اس کا رجحان آمرانہ ہے اور اس نے پنجاب میں ایک منصوبہ کے تحت انتشار پیدا کر دیا ہے اور اس نے ''وحدتِ قوم'' کو نقصان پہنچایا ہے۔ 17/ اکتوبر 1951ء کو ہی نوائے وقت پاکستان کا اس المناک حادثہ پر اداریہ یہ تھا کہ ''سیاست میں تشدد کے استعمال کا رجحان اس قدر خطرناک اور نقصان دہ ہے کہ اس کا اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ملک کو کوئی شخص اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا سکتا کہ وہ سیاست میں تشدد کے استعمال کی رسم ڈالے۔ سیاسی مقصد کے حصول کے لئے تشدد کا استعمال ایک ایسی لعنت ہے کہ اگر ایک مرتبہ اس کا آغاز ہو جائے تو اس کی انتہا نہیں۔ یہ ایک ایسا خطرناک اور مذموم چکر ہے کہ ایک مرتبہ چل نکلے تو پھر اسے روکنا مشکل ہوتا ہے۔ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں اور سارے سیاسی عناصر کو اس افسوس ناک قتل کی شدید اور غیر مبہم مذمت کرنی چاہیے اور اس خطرناک رجحان کے (جو اس افسوس ناک حادثہ کا ذمہ دار ہے) استیصال کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اگر اس رجحان کو فوراً ہی نہ کچل دیا گیا تو اس ملک میں جمہوریت کا کوئی مستقبل نہیں بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ خود اس ملک کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔''[8] اس کے اگلے دن اس اخبار نے بالفاظ دیگر اپنی اس رائے کا اعادہ کیا تھا۔ 18/ اکتوبر کا اداریہ یہ تھا کہ ''آج اس امر کا فیصلہ ہم لوگوں پر ہے کہ پاکستان کا مستقبل خدانخواستہ ہمیشہ مخدوش اور غیر یقینی ہو گا جہاں آخری فیصلہ افہام و تفہیم اور دلیل اور ووٹ کی بجائے گولی سے ہو گا یا پاکستان ایک ایسا ملک ہو گا جہاں عقل و تدبر کا دور دورہ ہو گا اور افراد اور حکومت اور ملک کی قسمت کا فیصلہ صرف اور صرف جمہور کی رائے سے ہوا کرے گا؟ مسٹر لیاقت علی خان کی المناک موت نے اس سوال کو پورے ملک کی آنکھوں کے سامنے موٹے حروف میں لکھ دیا ہے۔ کوئی شخص اب اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ ہر شخص کو جسے ملک سے محبت ہے اور پاکستان کا مستقبل عزیز ہے، جرأت کے ساتھ صورت حال کا سامنا کرنا چاہیے جو اس عظیم قومی ٹریجڈی کا

باعث ہوا۔ اگر آج اس رجحان کو نہ کچلا گیا تو آئندہ لکھی جانے والی تاریخ کا کوئی ورق بھی خون کے دھبوں سے خالی نہ ہوگا۔ قاتل سر پھرا تھا یا مجنوں۔ یہ اس کا ذاتی انفرادی پاگل پن تھا یا وہ کسی کا آلۂ کار تھا......ضرورت اس امر کی ہے کہ اُس رجحان کو قتل کیا جائے جس نے اسے قاتل بنایا۔‘‘[9]

اگر ان اداریوں کو روزنامہ ’’جہاد‘‘ کے 18 رمئی 1951ء کے اداریے کے ساتھ پڑھا جائے تو ان کا مطلب اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس اداریے میں مشرق وسطیٰ کے ممالک کے وزرائے اعظم کے آئے دن قتل کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ ’’پاکستان ایک نیا ملک ہے...... ابتدائی دور میں جو کچھ ہوگا بعد میں آنے والے اسی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں گے۔ اس لئے پاکستان کی حکومت، پاکستان کے ارباب اختیار و اقتدار، پاکستان کے سیاسی رہنماؤں، اخبارات اور سوچنے سمجھنے والے افراد کا فرض ہے کہ وہ عوام کو اس طرح تربیت دیں کہ سیاسی مقصد کے لئے تشدد کے استعمال کے تصور سے ہی انہیں نفرت ہو جائے۔ محض حکومت اس بیماری کا علاج نہیں کر سکتی ہے۔ حکومت اور عوام مل کر ہی اس کا مداوا سوچ سکتے ہیں۔ اس بیماری کے استیصال کی یقینی صورت یہ ہے کہ جمہوریت کو صحیح خطوط پر فروغ دیا جائے اور آمرانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے۔‘‘

ادارہ نوائے وقت کا یہ مؤقف بے بنیاد نہیں تھا لیکن اس میں نقص یہ تھا کہ یہ تصویر کا صرف ایک پہلو تھا۔ بلاشبہ لیاقت علی خان نے پورے پاکستان میں بالعموم اور پنجاب میں بالخصوص محلاتی سازشوں، انتخابی دھاندلیوں اور جابرانہ قوانین کے ذریعے جاگیردارانہ استبدادی آمریت قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور اس نے پرُ امن انتقال اقتدار کے دروازے بند کر کے نہ صرف خود تشدد کی راہ اختیار کی تھی بلکہ اس نے پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونسٹ عناصر میں تشدد کاری کا رجحان پیدا کیا تھا لیکن یہ پورا سچ نہیں تھا۔ اس تصویر کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ پنجاب کے اُبھرتے ہوئے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے شاونسٹ عناصر نے لیاقت علی خان کی ذات کے خلاف اس قدر معاندانہ مہم چلائی تھی کہ اس کا منطقی نتیجہ وزیر اعظم کے قتل کی صورت میں ہی نکل سکتا تھا۔ اس زہریلی مہم کے دوران کوئی حربہ ایسا نہیں تھا جو استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ پنجاب کی سیاسی ’’تذلیل‘‘، کشمیر سے ’’غداری‘‘ لائسنسوں کی تقسیم میں پنجابیوں سے ’’بے انصافی‘‘ اعلیٰ ملازمتوں میں پنجابیوں کی ’’عدم نمائندگی‘‘، اسلام سے ’’روگردانی‘‘، ’’فحاشی و عریانی‘‘ کی حوصلہ افزائی اور

اس قسم کے مزید کئی الزامات روزانہ اس قدر اشتعال انگیز زبان میں عائد کئے جاتے تھے کہ انہیں محض ''آزادیٔ تحریر وتقریر'' کا ٹھپہ لگانے سے معاف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایک انتہائی پسماندہ جاگیردارانہ معاشرے میں نہایت ترقی یافتہ صنعتی معاشرے کی اس قسم کی ''شہری آزادی'' کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد دیہاتی علاقے کے زوال پذیر جاگیردار طبقے اور شہری علاقے کے عروج پذیر درمیانہ طبقے کے درمیان تضاد کا شدید سے شدید تر ہونا ناگزیر تھا۔ پنجاب میں اس تضاد کی نمود دراصل 1919ء کی اصلاحات کے فوراً ہی بعد شروع ہوگئی تھی اور 1923ء میں سر فضل حسین کی زیر قیادت پنجاب کے جاگیرداروں کی غیر فرقہ وارانہ جماعت ''یونینسٹ پارٹی'' اسی تضاد کی پیداوار تھی۔ ان دنوں اس تضاد کا اظہار دیہاتی علاقوں کے جاگیرداروں اور شہری علاقوں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے ہندو عناصر کے درمیان کشمکش اقتدار کی صورت میں ہوتا تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد اس طبقاتی کشمکش نے دیہاتی علاقوں کے مسلمان جاگیرداروں اور شہری علاقوں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے مسلمان عناصر کے درمیان ہر شعبۂ زندگی میں شدید رسہ کشی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اگر نوابزادہ لیاقت علی خان پشتینی جاگیردار نہ ہوتا اور اس میں بورژوا سیاست کی قدرے دوراندیشی ہوتی تو وہ پنجاب کے زوال پذیر جاگیردار طبقہ سے اندرون خانہ گٹھ جوڑ کرنے کی بجائے یہاں کے اُبھرتے ہوئے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں سے اتحاد کرتا اور اس طبقاتی تضاد کو اس قدر معاندانہ نہ ہونے دیتا کہ یہ بالآخر اس کے لئے جان لیوا بن جاتا۔ پنجابی شاونزم کو دراصل 1919ء کی اصلاحات کے نفاذ کے بعد اس صوبہ کے جاگیرداروں نے ہی جنم دیا تھا اور انگریزوں نے اپنے سامراجی مفادات کے تحفظ وفروغ کے لئے اس سانپ کو دودھ پلایا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس صوبہ کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں نے اس کو اپنی پٹاری میں ڈال لیا اور اس کی کچھ اس طرح پرورش کی کہ یہ تین چار سال میں آدم خور اژدھا بن گیا۔ 16/اکتوبر 1951ء کو اُس نے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان کو نگل لیا اور پھر اس نے نئے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کی طرف رُخ کرلیا۔

جس شخص نے لیاقت علی خان کو گولیاں ماری تھیں وہ افغانستان کا باشندہ تھا اور ایبٹ آباد میں نظر بند تھا۔ حکومت پاکستان نے گزر اوقات کے لئے اس کا ماہانہ مشاہرہ مقرر کیا ہوا تھا۔ جب راولپنڈی کے جلسۂ عام میں اس نے یہ واردات کی تھی تو بھگدڑ مچ گئی تھی جس کے دوران

ایک پولیس انسپکٹر نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ بیگم رعنا لیاقت علی کا بیان ہے کہ ''میرے مرحوم شوہر کو ایک سازش کے ذریعے قتل کیا گیا۔ قاتل اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز رہے اور ابھی تک پکڑے نہیں گئے...... لیاقت علی کسی بیرونی سازش کا شکار نہیں ہوئے...... ان کے قتل کی کبھی کوئی سنجیدہ تفتیش عمل میں نہیں لائی گئی اور یہ کیسے ہو سکتی تھی؟ جن لوگوں نے قتل کیا تھا وہ اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز تھے اور جو قتل میں ملوث تھے، اُن کو ترقیاں حاصل ہوئی تھیں۔''[10]

لیاقت علی خان کے پولیٹیکل سیکرٹری اور کراچی میں قائد ملت کے بہت سے دوسرے مقلدین کا بھی الزام یہ ہے کہ ''ایک بڑی گہری سازش کے تحت وزیر اعظم کو صفحۂ ہستی سے مٹایا گیا تھا...... ایک عرصہ سے گمنام خطوط موصول ہو رہے تھے جن میں بالعموم وزیر اعظم کو قتل کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ کبھی بم سے اڑا دینے، کبھی گولی کا نشانہ بنانے کی دھمکی دی جاتی تھی۔ کچھ خباثت پسندوں کے خطوط گالی گلوچ سے پُر ہوتے تھے...... بڑھتے ہوئے کاموں کی زیادتی کی وجہ سے نوابزادہ صاحب نائب وزیر اعظم مقرر کرنے والے تھے تاکہ ان کے اعتماد کا ایک آدمی ان کا ہاتھ بٹا کر ان کا بوجھ ہلکا کرے۔ انہوں نے اپنا آدمی بھی منتخب کر لیا تھا اور وہ پنجاب کے گورنر سردار عبدالرب نشتر تھے جو لاہور سے آ کر پنڈی میں ملنے والے تھے...... پنجاب کے نئے گورنر کا بھی انتخاب کر لیا گیا تھا اور وہ ہمارے معزز اور واجب التعظیم رہنما نواب محمد اسماعیل خان صاحب تھے۔ اتفاق سے ان دنوں وہ کراچی میں اپنے صاحبزادوں اور عزیزوں سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ نوابزادہ صاحب نے ان کو بمشکل راضی کیا اور وعدہ لیا کہ وہ دو ہفتہ میں ہندوستان سے لوٹ کر اپنا عہدہ سنبھالیں گے...... وزیر خزانہ غلام محمد کو اس کی شدید بیماری کی وجہ سے ریٹائر کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا اور وہ پنشن پر جانے سے قبل اپنی رخصت کے دن اپنے راولپنڈی والے عزیز، ڈی۔ ایم ملک کے گھر گزار رہا تھا...... طے شدہ منصوبہ کے مطابق سردار عبدالرب نشتر کو وزارت خزانہ سونپی جانے والی تھی...... خواجہ شہاب الدین کو وزارت داخلہ سے علیحدہ کر کے مصر کی سفارت دی جانے والی تھی...... نواب مشتاق احمد گرمانی کو بھی علیحدہ کیا جانے والا تھا...... کسی مہاجر (تلیئر) پولیس آفیسر کو قتل کی تفتیش کا کام سپرد نہیں کیا گیا تھا۔''[11] مشتاق احمد وجدی لکھتا ہے کہ ''بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قتل ایک بڑی سازش کا نتیجہ تھا لیکن نہ کسی کے پاس ثبوت ہے نہ اس کی تفصیل۔ دنیا نے محض یہ دیکھا کہ غلام محمد صاحب کو وزارت سے نکالا جا رہا تھا۔ انہوں نے

استعفیٰ دینے سے پہلے چند دن کی مہلت مانگی تھی۔ اس مدت کے اختتام سے پہلے ہی یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ وہ گورنر جنرل بن گئے۔ پنجاب کے انسپکٹر جنرل پولیس وزیر اعظم کی حفاظت کے ذمہ دار تھے۔ انہوں نے جس طرح اپنے فرض کو انجام دیا، اس کے عوض میں وہ ترقی کر کے بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ بنا دیئے گئے۔ جس افسر نے قاتل کو گولی مار کر موقع پر ہی ہلاک کر دیا تھا اور اس طرح تحقیقات ناممکن بنا دی تھی، اس کو ترقی پر ترقی ملتی رہی۔ اعتزاز الدین صاحب مرحوم (تلمیذ) انسپکٹر جنرل پولیس تھے۔ ان کے سپرد اس معاملے کی تحقیق ہوئی۔ ان سے پوچھا تو کچھ نہ بتایا۔ صرف اتنا کہا کہ میاں موت سر پر کھیل رہی ہے۔ آخر دوران سفر ہوائی جہاز کے حادثے کا شکار ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی وہ کاغذات بھی تباہ ہوئے جو اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ پھر بیرونی ماہرین طلب کئے گئے۔ لیکن بات وہیں کی وہیں رہی۔ لیاقت علی خان صاحب کے ساتھ پاکستان میں جمہوری طرز کی حکومت کی اُمیدیں دفن ہوئیں۔''[12]

اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ کا بیان ہے کہ ''لیاقت علی خان نے قتل سے دو روز پہلے مجھے کراچی بلا کر بتایا تھا کہ وہ سردار عبدالرب نشتر کو نائب وزیر اعظم بنا رہے ہیں اور حسین شہید سہروردی کو بھی اپنی کابینہ میں شامل کرنے والے ہیں اور غلام محمد کو وزارت سے نکال رہے ہیں جس کے بارے میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بالکل کام کرنے کے قابل نہیں رہا...... 14 رتاریخ کو انہوں نے مجھ سے اس بارے میں بات چیت کی اور 16 کو مجھے بحیثیت وزیر اعلیٰ پنجاب کچھ بتائے بغیر راولپنڈی میں اجلاس سے خطاب کرنے گئے...... اس روز پنڈی میں جو لوگ موجود تھے ان میں مشتاق احمد گرمانی، غلام محمد، خان قیوم، چودھری ظفر اللہ خان اور شاید سردار بہادر خان بھی۔ اس کے علاوہ خواجہ شہاب الدین بھی پشاور سے آ گئے تھے جو وہاں گورنر تھے...... لیاقت علی کے قتل کی خبر مجھے قربان علی خان نے بتائی تھی اور اس کے بعد چودھری محمد علی نے تمام صوبائی وزرائے اعلیٰ سے کہا تھا کہ وہ نازک وقت میں اپنے اپنے ہیڈ کوارٹر پر رہیں اور مجھے بتایا تھا کہ سردار عبدالرب نشتر کو پارلیمانی پارٹی کا لیڈر منتخب کر کے وزیر اعظم بنایا جائے گا مگر راولپنڈی میں موجود اسی روز وزرائے نے جو وزیر اعظم کے قتل کے بعد وزیر بھی نہیں رہے تھے، سردار نشتر کو اس اجلاس میں شریک نہیں ہونے دیا اور خود ہی غلام محمد کو گورنر جنرل اور خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم بنا دیا اور لیاقت علی کی میت طیارے میں رکھنے سے

پہلے یہ سب انتظام کر لیا۔"[13]

قائدِ ملت کے پروردہ اور بھی کئی افراد نے اخباروں، رسالوں اور کتابوں میں اسی قسم کے الزامات عائد کئے ہیں جن کا لُب لباب یہ ہے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کا قتل غلام محمد اور گرمانی کی سازش کا نتیجہ تھا کیونکہ لیاقت علی نے ان دونوں کو اپنی کابینہ سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور چند دن میں مرکزی کابینہ میں ردو بدل ہونے والا تھا۔ اس قتل کی تفتیش مناسب طریقے سے محض اس لئے نہ ہوئی کہ اکتوبر 1951ء کے بعد یہ دونوں سازشی یعنی غلام محمد اور گرمانی برسر اقتدار رہے اور انہوں نے کسی ایماندار پولیس افسر کو صحیح تفتیش کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ ایک مہاجر پولیس افسر اعتزاز الدین نے حسب خواہش تفتیش مکمل کر لی تھی اور اس نے سازش کا ثبوت ڈھونڈ لیا تھا لیکن ایک اور سازش کے ذریعے جنگ شاہی کے پاس ہوائی جہاز کا حادثہ کرا دیا گیا جس میں اعتزاز الدین کے ساتھ وہ کاغذات بھی تباہ ہو گئے جو اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتے تھے۔ چونکہ ان بیانات میں بعض بنیادی حقائق کو صحیح طور پر پیش نہیں کیا گیا ہے لہٰذا ان پر الزامات کی جو بلند و بالا عمارت تعمیر کی گئی ہے اس کا ڈھانچہ سیدھا اور مستحکم نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ستمبر 1951ء میں جب غلام محمد کو فالج ہوا تھا تو اخبارات میں مرکزی کابینہ میں ردو بدل کی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ لیکن ان میں سے کسی خبر میں بھی نواب مشتاق احمد گرمانی کے ہٹائے جانے کا ذکر نہیں تھا بلکہ 11 ر اکتوبر کو لیاقت علی کی زیر صدارت مرکزی پارلیمانی بورڈ نے پاکستان دستور ساز اسمبلی کی رکنیت کے لئے جن پنجابی امیدواروں کا انتخاب کیا تھا ان میں نواب مشتاق احمد گرمانی کا نام سرفہرست تھا اور یہ خبر ملک کے سارے اخباروں میں چھپی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ لیاقت علی خان نے غلام محمد کو اس کی شدید علالت کی وجہ سے کابینہ سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا لیکن اُس نے اسے ریٹائر کرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا بلکہ فیصلہ یہ تھا کہ اسے امریکہ میں سفیر مقرر کیا جائے گا تاکہ وہ وہاں اپنا مناسب علاج کرا سکے اور غلام محمد وزیر اعظم کی اس مہربانی پر اس کا شکر گزار تھا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل بنانے کا فیصلہ راولپنڈی میں گرمانی اور غلام محمد کی خفیہ میٹنگ میں نہیں ہوا تھا بلکہ یہ فیصلہ کراچی میں کابینہ کے اجلاس میں ہوا تھا کیونکہ بعض وزراء کا خیال تھا کہ نیم مردہ غلام محمد گورنر جنرل کی حیثیت سے کاروبار حکومت میں کوئی مداخلت نہیں کر سکے گا اور چونکہ اقتدار وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کے پاس ہو گا اس لئے وہ اپنے خطوط پر طرز حکومت وضع کر سکیں گے۔ چودھری محمد علی نے

وزراءکواسی رات ہی بتادیا تھا کہ لیاقت علی مرحوم، سردار عبدالرب نشتر کو نائب وزیراعظم بنانے کا خواہاں تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ''زندگی غیر یقینی چیز ہے۔ اگر میں زندہ نہ رہا تو نشتر خود بخود وزیراعظم بن جائے گا اور اس طرح حکومت کا تسلسل قائم رہے گا مگر ایک وزیر نے اس خیال کو پسند نہیں کیا تھا اور چودھری محمد علی ساری رات سو نہیں سکا تھا۔''[14] جس پولیس افسر نے قاتل کو گولی مار کر ہلاک کیا تھا اسے کوئی غیر معمول ترقی پر ترقی نہیں ملی تھی۔ وہ اکتوبر 1951ء میں سب انسپکٹر تھا۔ کئی سال بعد انسپکٹر بنا اور پھر اس کے کئی سال بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کے عہدہ پر پہنچ کر ریٹائر ہوا۔ انسپکٹر جنرل قربان علی خان، لیاقت۔ دولتانہ دھڑے سے تعلق رکھتا تھا۔ پنجاب کے ہر شخص کو معلوم تھا کہ مارچ 1951ء کے عام انتخابات میں اس کا جانبدارانہ کردار لیاقت لیگ کے حق میں فیصلہ کن تھا۔ اس کے گرمانی اور غلام محمد سے کبھی بھی تعلقات نہیں رہے تھے اس لئے اس کے لیاقت کے قتل کی سازش میں ملوث ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسے ریٹائرمنٹ کے بعد بلوچستان میں گورنر جنرل کا ایجنٹ اس لئے نہیں بنایا گیا تھا کہ اس نے لیاقت علی خان کو قتل کروانے کا کارنامہ سرانجام دیا تھا بلکہ اس کا یہ تقرر محض اس لئے ہوا تھا کہ مغربی پاکستان میں ون یونٹ کے نفاذ کے لئے بلوچستان میں ایک جابر حکمران کی ضرورت تھی۔ یہ کہنا کہ جنگ شاہی کے نزدیک ہوائی جہاز کا حادثہ بھی ایک ایسی سازش کا نتیجہ تھا جس کا مقصد محض اعتزاز الدین کو ہلاک کرنا تھا کیونکہ اسے لیاقت کے قتل کا راز پتہ چل گیا تھا، ایک ایسی مضحکہ خیز اور غیر ذمہ دارانہ بات ہے کہ اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس بدنصیب ہوائی جہاز میں اعتزاز الدین کے علاوہ کئی اور سول اور فوجی اعلیٰ حکام موجود تھے جو سب کے سب جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس حادثہ کی تحقیقات کے دوران کسی شخص نے بھی یہ الزام عائد نہیں کیا تھا کہ یہ حادثہ محض اعتزاز الدین کو ہلاک کرنے کے لئے کرایا گیا تھا۔ مشتاق احمد وجدی پاکستان کے آڈیٹر جنرل کے عہدے سے ریٹائر ہوا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس قسم کا غیر ذمہ دار، متعصب اور تنگ نظر شخص اتنے بڑے عہدے پر کیسے پہنچ گیا تھا۔ یہ پاکستان کے عوام کی بدقسمتی تھی کہ اس ملک کی انتظامیہ کی باگ ڈور اس قسم کے غیر ذمہ دار اور ناشکرے افراد کے ہاتھوں میں تھی۔ بایں ہمہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ گرمانی اور غلام محمد کا گٹھ جوڑ تھا اور وہ پنجاب میں اینٹی لیاقت عناصر کی پس پردہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اگر لیاقت کا قتل واقعی ان دونوں کی سازش کا نتیجہ تھا تو یہ سازش محض اس لئے کامیاب ہوئی کہ لیاقت

علی خان کی جاگیردارانہ سیاست اور پنجابی عصبیت کے معاندانہ تضاد نے اس کی کامیابی کے لئے سیاسی فضا سازگار کر رکھی تھی۔

لیاقت علی خان کی جاگیرداریت اور پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے شاونزم کے درمیان عناد اور مخاصمت کی انتہا یہ تھی کہ اگرچہ اس کے قتل کے بعد کراچی اور سندھ کے ''تلئیروں'' نے اُسے قائد ملت اور شہید ملت کے دائمی خطابات دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی لیکن پنجابی شاونسٹوں نے اُسے معاف نہ کیا تا آنکہ خواجہ ناظم الدین کے عہد اقتدار میں اور اس کے بعد بنگالیوں، سندھیوں، بلوچوں اور پٹھانوں کے خلاف ''پنجابیوں'' اور ''تلئیروں'' کا گٹھ جوڑ ہو گیا۔ اپریل 1952ء میں پنجابی مفاد پرستوں کا مؤقف یہ تھا کہ ''مسٹر لیاقت علی خان مرحوم کے رجحانات آخر میں سراسر فسطائی رنگ اختیار کر گئے تھے اور ان کی منزل آمریت بن گئی تھی۔ ہمارا ایمان ہے کہ آمریت غیر اسلامی ہی نہیں تباہ کن بھی ہے مگر مرحوم کو (خدا ان کی مغفرت کرے) اس کا احساس نہیں رہا تھا۔ انہوں نے جائز تنقید کو سننے سے انکار کر دیا تھا۔ جمہوریت کا ابتدائی اصول یہ ہے کہ جمہوری نظام کے لئے اپوزیشن کا وجود ضروری ہے مگر مرحوم اپوزیشن کو وطن دشمنی کے مترادف سمجھتے اور کہتے تھے۔ انتہا یہ تھی کہ انہوں نے پبلک جلسے میں اپوزیشن لیڈر کو ''کتا'' کہہ ڈالا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی سیاست بے حد تلخ ہو گئی۔ اپوزیشن سے وابستہ لوگ بھی آخر انسان تھے انہوں نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور حالات روز بروز ابتر ہوتے گئے۔''[15] لیاقت علی خان مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر نوائے وقت نے اپنے ادارتی صفحہ پر لاہور کے ایک اخبار نویس عزیز بیگ کا طویل مضمون شائع کیا۔ جس میں ملک کے پہلے وزیر اعظم کے خلاف اسی قسم کی زہر افشانی کی گئی تھی۔ مضمون میں لکھا تھا کہ ''خوش قسمتی سے لیاقت کو ایک ایسی موت نصیب ہوئی جس نے نہ صرف ڈرامائی انداز میں بعض لوگوں کے نزدیک ان کی عظمت میں اضافہ کر دیا بلکہ معجزاتی طور پر انہیں اپنے سیاسی اعمال کے نتائج سے بھی بچا لیا۔ اگر وہ وقت سے پہلے فطری طور پر جاں بحق ہوتے تو یہ بات بھی کافی بُری ہوتی۔ لیکن ان کا قتل اس سے بھی بُری بات ہے۔ سب سے بہتر موت یہ ہوتی کہ انہیں جمہوری طور پر ''قتل کیا جاتا۔'' کیونکہ انہوں نے جمہوریت کو نہایت سنگدلی و بے دردی سے قتل کیا تھا...... لیاقت نے دوشیزۂ جمہوریت کو بھدے اور زنگ آلود ہتھیاروں سے ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کتنے افسوس کی بات ہے کہ پیشتر اس کے کہ

دوشیزۂ جمہوریت اس کا بدلا چکاتی، انہیں قتل کر دیا گیا۔ لیاقت نے اپنی ذات کو جمہوریت کے مقابلے میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ عزم انہیں ایک فضیحت ناک انجام سے دوچار کرتا بشرطیکہ کوئی سید اکبران کی جان نہ لیتا اور انہیں اس بات کا نامور شہید نہ بناتا۔ خوش قسمت اس مواخذہ سے بچ گئے اور انہیں جمہوری قوتوں کے مقابلے میں اپنی کمزوری پیش کرنے کا موقع نہ ملا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو وہ جمہوریت کا صحیح شکار ہوتے...... انہوں نے سیاست میں تشدد کے عنصر کو داخل کیا۔ اگر آپ کسی پر تشددانہ حملہ کریں گے تو آپ پر بھی تشددانہ حملہ کیا جائے گا۔ لیاقت نے یہ بات فراموش کر دی کہ غنڈے لیڈروں کے بھی پیروکار ہوتے ہیں۔ اگر لیڈر کو پبلک میں بُرا بھلا کہا جائے اور اس کی بے عزتی کی جائے تو اس کے پیروکار ضرور بدلہ لیتے ہیں...... لیاقت یہ بھول گئے کہ کتے بھونک بھی سکتے ہیں اور کاٹ بھی سکتے ہیں۔''[16] کراچی کے جو لوگ لیاقت علی خان کے قتل کو محض گرمانی اور غلام محمد کی سازش کا نتیجہ سمجھتے ہیں انہیں جنوری 1949ء کے بعد کی اس قسم کی بے شمار تحریروں اور تقریروں کے پیش نظر اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ پنجاب میں لیاقت علی خان کی زیر سرکردگی جاگیرداریت اور درمیانہ وسرمایہ دار طبقوں کے شاونزم کے درمیان تضاد اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ اس کے پرامن طریقے سے حل ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی اور جب کوئی تضاد پرامن طریقے سے حل نہ ہو تو اس مقصد کے لئے دھماکہ یا تشدد ناگزیر ہو جاتا ہے۔ یہ تشدد سازش کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے اور سازش کے بغیر بھی بروئے کار آ سکتا ہے۔ کوئی معاندانہ تضاد غیر معین عرصہ تک لاینحل نہیں رہ سکتا۔

حوالہ جات

حوالہ جات

باب:1 نوزائیدہ پاکستان کی جغرافیائی، تاریخی اور معاشی صورتِ حال

1- Mohammad Ali Jinnah, *Speeches As Governor General of Pakistan, 1947-48,* Pakistan Publications Karachi, p. 32

2- Chaudhri Mohammad Ali, *The Emergence of Pakistan,* First Published By Columbia University Press, New York & London, 1967, Reprinted by Research Society of Pakistan, University of Punjab, Lahore 1973, p. 337

3- *Ibid,* pp. 249-50

4- Mohammad Ali Jinnah, *Op. cit.*, p. 164

باب:2 پاکستان کی تعمیر و ترقی کے راستے میں اندرونی تضادات کی دیواریں

1۔ محمد یامین خان ''نامۂ اعمال'' جلد اول۔ آئینہ ادب، لاہور 1970ء ص 260-61

2۔ ایضاً۔ ص 486-87

3- Hector Bolitho, *Jinnah: Creator of Pakistan,* Oxford University Press, Karachi, First Published 1954, Reprinted 1969, pp. 104-05

4- Chaudhry Khaliquzzaman, *Pathway to Pakistan* Longmans, Lahore 1961, p. 131

5- Lapel H. Griffin K.C.S.I and Colonel Charles Francis Massy, *Chiefs And Families of Note in Punjab,* Civil And Military Gazette Press, Lahore 1909, Vol. 1 p. 32

6۔ محمد یامین خان۔ محولہ بالا، ص 779

7۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ ''اقبال کے آخری دو سال'' اقبال اکادمی۔
کراچی۔1961ء۔ ص618

8۔ محمد یامین خان، محولہ بالا، ص615-16

9۔ ایضاً۔ ص631-32

10۔ ایضاً۔ ص633-34

11- Ch. Khaliquzzaman, *Op. cit.* p. 140.

12۔ محمد یامین خان، محولہ بالا، ص635, 636, 637

13۔ ایضاً۔ ص643-44

14۔ ایضاً۔ ص644-45

15۔ محمد ظفر اللہ خان ''تحدیثِ نعمت'' لاہور۔1971ء۔ ص388, 401
ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن۔ڈھاکہ 1971ء

16۔ محمد یامین خان، محولہ بالا، ص734

17- Ch. Khaliquzzaman *Op. cit.* p. 239

18۔ محمد یامین خان۔ ''نامۂ اعمال'' ۔محولہ بالا۔ جلد دوم۔صفحات 958 تا 961

19- H. V. Hodson, *The Great Divide,* Hutchinson of London, Oxford University Press, Karachi 1969, p. 119

20- Ch. Khaliquzzaman *Op. cit.* p. 239

21- Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom,* Orient Longmans, New Delhi 1975, p. 121.

22- Khalid Bin Saeed, *Pakistan, The Formative Phase (1857-1948),* Oxford University Press, Karachi 1960, pp. 127-28

23- Ishtiaq Hussain Qureshi Dr., *The Struggle For Pakistan,* University of Karachi, 1974, p. 224

24۔ مختار مسعود۔ آواز دوست، النور لاہور 1973۔ص234

25- H.V. Hodson, *Op. cit.* p. 125

26- V.P. Menon, *The Transfer Of Power In India* Princeton University Press, New Jersey 1957, p. 214

27- Khalid Bin Saeed, *Op. cit.* p. 131

28- (i) *Ibid,* p. 130
(ii) Wavell, *Viceroy's Journal,* Edited By Penderal Moon, Oxford University Press, Karachi 1974, p. 153

29۔ محمد یامین خان۔محولہ بالا، ص1019

30- Abul Kalam Azad, *Op. cit.* pp. 147-48

31- *Ibid.* p. 148

32- Ch. Khaliquzzaman, *Op. cit.* p. 370

33- Khalid Bin Saeed, *Op. cit.* p. 159

34- H.V. Hodson, *Op. cit.* p. 183

35- *Ibid,* p. 237

36- *The Transfer Of Power 1942-47,* Vol 10, Edited by Nicolas Mansergh and Penderal Moon, Her Majesty's Stationery Office, London 1981, pp.331-33

37- *Ibid,* Vol II, 1982, pp. 899-900

38- H. V. Hodson, p. 331

باب:3 گورنر جنرل کی خودمختاری اوروزیراعظم کی بےاختیاری

1- Alan Campbell Johnson, *Mission With Mountbatten,* Robert Hale, London, 1951, p. 147

2- H. V. Hodson, *Op. cit.* p. 375

3- Alan Campbell Johnson,*Op. cit.* p. 156

4- Hector Bolitho, p. 217

5- Mushtaq Ahmad, *Government And Politics Of Pakistan,* Space Printers, Karachi 1970, pp.20-22

6- Ch. Mohammad Ali, *Op. cit.* pp. 385-86

7- Keith Kallard, *Pakistan, A Political Study,* Oxford University Press, Karachi 1969, p.20

8- Hector Bolitho,*Op. cit.* p. 102

9- Khalid Bin Saeed,*Op. cit.* pp. 229-30

10- (i) *Dawn*, July 13,14 and 15, August 18, 1947

11- Mushtaq Ahmad, *Op. cit.*p.22

12- Khalid Bin Saeed, *Op. cit.*p. 242

13۔ محمد ظفر اللہ خان۔ محولہ بالا، ص 526-27

14- Sharifuddin Pirzada, *The Last Days of The Quaid-i-Azam."* The Pakistan Times, Lahore, October 17, 1979. About the letter of Liaqat Ali Khan, Pirzada says, *"I understand that the letter in original is in the papers of the Jinnah cell and is one of those documents which have been sealed."*

15- *Ibid*

16۔ فیروز خان نون۔ ''چشم دید'' فیروز سنز۔لاہور۔1974ء۔ ص282

17- *Interview of Miss Jinnah* By Itrat Hussain Zubaire, Quoted by Pirzada. *Op. cit.*

18- (i) Fatima Jinnah, *My Brother, The Manuscript* lying in Quaid-i-Azam papers in National Archives of Pakistan, Islamabad.

(ii) For Incomplete version see *My Brother,* Edited By Sharif-ul-Mujahid, Quaid-i-Azam Academy Karachi 1987, pp. 29-30

18۔ (iii) قدرت اللہ شہاب۔ شہاب نامہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ بار ہفتم 1989ء۔ ص438-39

19۔ Sharifuddin Pirzada, *Op. cit.*

20- *The Pakistan Times*, August 11, 1947

21- (i) Fatima Jinnah, *Op. cit.*

21۔ (ii) قدرت اللہ شہاب۔ محولہ بالا، ص439

22۔ ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش۔ قائداعظم کے آخری ایّام،'' مکتبہ المعارف، لاہور۔1949ء۔ص79

23- Fatima Jinnah, *Op. cit.,* p.34

24۔ ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش۔ محولہ بالا، ص۔96

25- Fatima Jinnah, *Op. cit.*, p. 35

26۔ (i) ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش۔ محولہ بالا، ص ص 110 تا 114

26- (ii) Fatima Jinnah *Op. cit.* pp. 36-37

27- *The Pakistan Times*, September 13, 1948

28۔ مشتاق احمد وجدی۔ ''ہنگاموں میں زندگی، فیروزسنز لاہور۔ 1974ء ص172

29۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔21/دسمبر، 1949ء

30۔ ایضاً 7/مئی، 1950ء

31۔ ایضاً 19/مئی، 1950ء

32۔ صدیق علی خان۔''بے تیغ سپاہی'' الائز بک کارپوریشن، کراچی۔1971ء (طبع ثانی۔ ص41-440)

باب:4 وزیراعظم لیاقت علی خان اور مس فاطمہ جناح کے درمیان تضاد

1۔ صدیق علی خان۔ محولہ بالا۔ ص494-493

2۔ ثریا خورشید، فاطمہ جناح کے شب و روز، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور۔ص47-146

3۔ ایضاً۔ ص 105

4۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ 24/اپریل 1949ء

5۔ ایضاً 3/جون 1949ء

6۔ ایضاً 18/جون 1949ء

7- *The Pakistan Times*, September 12, 1949

8۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور، 4/مارچ 1950ء

9۔ ایضاً 20/مارچ 1950ء

10۔ ایضاً 25/مئی 1950ء

11- *The Pakistan Times*, September 13, 1950

12- *Ibid.*, October 3, 1950

13- *Ibid.*, October 9, 1950

14۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ 26/اکتوبر 1950ء

15۔ ایضاً 2/نومبر 1950ء

16۔ ایضاً 24/نومبر 1950ء

17- *The Pakistan Times*, November 24, 1950

18- *Ibid.*, November 16, 1950

19۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 28/دسمبر 1950ء

20۔ ایضاً 30/دسمبر 1950ء

21۔ ایضاً 31/دسمبر 1950ء

22۔ قدرت اللہ شہاب۔ محولہ بالا، ص۔ 435

23۔ مختار مسعود۔ محولہ بالا، ص۔ 234

24- *The Pakistan Times*, Februrary 13, 1951

25- *Ibid.*, February 18, 1951

26۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 8/مارچ 1951ء

27- *The Pakistan Times*, December 12, 1950

28۔ روزنامہ امروز، لاہور 26/ستمبر 1951ء

29- *Dawn*, September 23, 1951

30۔ روزنامہ امروز، لاہور 24/ستمبر 1951ء

31۔ قدرت اللہ شہاب۔ محولہ بالا، ص 441۔

باب:5 مس فاطمہ جناح اور پنجابی شاونزم کی حوصلہ افزائی

1۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 20/نومبر 1947ء

2۔ ایضاً 3/دسمبر 1947ء

3۔ ایضاً 6/دسمبر 1947ء

4۔ سردار محمد ابراہیم خان۔ ''کشمیر کی جنگِ آزادی'' کلاسیک، لاہور 1966ء ص102-103

5- *The Pakistan Times*, October 1, 1947

6۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 27/نومبر 1947ء

7۔ ایضاً 10/جنوری 1948ء

8۔ ایضاً 14/جنوری 1948ء

9۔ ایضاً 18/جنوری 1948ء

10۔ ایضاً 28/جنوری 1948ء

11۔ ایضاً 8/جنوری 1948ء

12۔ ایضاً 13/مارچ 1948ء

13۔ ایضاً 17, 18/مارچ1948ء

14۔ ایضاً 18/مارچ1948ء

15۔ ایضاً 21/مارچ 1948ء

16۔ ایضاً یکم اپریل1948ء

17- *The Pakistan Times*, April 6, 1948

18۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 9/اپریل1948ء

19- *The Pakistan Times*, April 10, 1948

20۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ یکم مئی1948ء

21- *The Pakistan Times*, May 1, 1948

22۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 15/مئی1948ء

23- *The Pakistan Times*, May 19, 1948

24۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 20/مئی1948ء

25۔ ایضاً 31/مئی1948ء

26۔ ایضاً 3/جون1947ء

27۔ ایضاً 4/جون1948ء

28۔ ایضاً 3/ستمبر1948ء

باب:6 وزیراعظم لیاقت علی خان اور پنجابی شاونزم کے درمیان محاذ آرائی

1۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 27/ستمبر1948ء

2۔ ایضاً 13/اکتوبر1948ء

3۔ ایضاً 28/اکتوبر1948ء

4۔ ایضاً نومبر 1948ء

5۔ ایضاً 11/نومبر 1948ء

6۔ ایضاً 11/نومبر 1948ء

7۔ صدیق علی خان، محولہ بالا، ص 494

8۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 20,19/نومبر 1948ء

9۔ ایضاً 26/نومبر 1948ء

10۔ ایضاً 28/نومبر 1948ء

11۔ ایضاً 2/دسمبر 1948ء

12۔ ایضاً 11/دسمبر 1948ء

13- *The Pakistan Times*, November 27, 1948

14۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 26/دسمبر 1948ء

15۔ سید نور احمد۔ ''مارشل لاء سے مارشل لا تک'' لاہور 1966ء ص 377-376

16۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 6/جنوری 1949ء

17۔ فیروز خان نون، محولہ بالا، ص 83-282

18- Ch. Muhammad Ali, *Op. cit.* p.387

19- *Ibid Op. cit.* pp. 307-08

20۔ میجر جنرل فضل مقیم خان ''تگ و تازِ جادوانہ'' آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی 1967ء صفحات 132,131,130

21۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 7/جنوری 1949ء

22۔ میجر جنرل فضل مقیم خان، محولہ بالا، ص 135 ,134

23- *The Pakistan Times*, January 20, 1949

24- *Ibid.*, January 25, 1949

25- *Ibid.*

26- *Dawn*, January 26, 1949

27- *The Pakistan Times*, January 26, 1949

28- *Ibid.*, February 2, 1949

29- *Ibid.*, February 9 and 16, 1949

باب:7 لیاقت علی خان کے بالا حصار پر پنجابی شاونزم کی شدید گولہ باری

1۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 2/مارچ 1949ء

2۔ ایضاً 10/مارچ 1949ء

3۔ ایضاً 7/مارچ 1949ء

3- *The Pakistan Times*, March 11, 1949

5۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 8/اپریل 1949ء

6۔ ایضاً 17/اپریل 1949ء

7۔ ایضاً 20/اپریل 1949ء

8- *The Pakistan Times*, April 24, 1949

9۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 21/اپریل 1949ء

10۔ ایضاً 8/مئی 1949ء

11۔ ایضاً 20/مئی 1949ء

12۔ ایضاً 20/مئی 1949ء

13۔ صدیق علی خان۔ محولہ بالا، ص 496

14۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ 20/مئی 1949ء

15۔ ایضاً 25/مئی 1949ء

باب:8 پنجابی شاونزم کی جانب سے فوجی دھمکیاں

1۔ روز نامہ نوائے وقت، لاہور 2/جون 1949ء
2۔ ایضاً یکم جون 1949ء
3۔ ایضاً یکم جولائی 1949ء
4۔ ایضاً 9/جولائی 1949ء
5۔ ایضاً 13/جولائی 1949ء

6- *The Pakistan Times*, July 21, 1949

7- *Ibid.*, July 27, 1949

8- Ch. Muhammad Ali, *Op. cit.* p. 271

9۔ روز نامہ نوائے وقت، لاہور 11/ اگست 1949ء
10۔ ایضاً 15/اگست 1949ء

11- Ch. Mohammad Ali, *Op. cit.* p.363

12۔ روز نامہ نوائے وقت، لاہور 13/ اگست 1949ء
13۔ ایضاً 22/اگست 1949ء
14۔ ایضاً 5/ستمبر 1949ء
15۔ ایضاً 15/ستمبر 1949ء
16۔ ایضاً 21/ ستمبر 1949ء
17۔ ایضاً 5/نومبر 1949ء
18۔ ایضاً 6 اور 7/ دسمبر 1949ء

باب:9 پنجابی شاونسٹوں اور ''تلیئروں'' کے درمیان تضاد

1۔ روز نامہ نوائے وقت، لاہور 4/ دسمبر 1949ء

2۔ ایضاً 8/دسمبر 1949ء

3۔ اشتیاق حسین قریشی ''برعظیم پاک وہند کی ملت اسلامیہ''
مترجم ہلال احمد زبیری کراچی یونیورسٹی 1967ء ص 94, 95 اور 96

4۔ مشتاق احمد وجدی۔ محولہ بالا، صفحات 7تا9

5۔ ایضاً ص 94

6۔ ایضاً ص 162

7۔ ایضاً ص 156

8۔ ایضاً ص 129 تا 130

9۔ ایضاً ص 130تا 131

10۔ ایضاً ص 136تا 137

11۔ ایضاً ص 172تا 173

12۔ ایضاً ص 179

13۔ ایضاً ص 159

14۔ ایضاً ص 203

15۔ صدیق علی خان۔ محولہ بالا، ص 126

16- *Constituent Assembly Debates,* 22 May, 1948 Vol. III, November 3 pp. 78-80

17۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 2/جنوری 1950ء

18۔ ایضاً 14/جنوری 1950ء

19۔ ایضاً 23/جنوری 1950ء

20۔ ایضاً 3/مارچ 1950ء

21۔ ایضاً 27/مارچ 1950ء

22- S.M. Ikram, *Modern Muslim India And The Birth of Pakistan,* Sh. Mohammad Ashraf, Lahore 1965, Rev. Ed. 1970, P-265

23۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 24/مارچ 1950ء

باب:10 حسین شہید سہروردی کا سیاسی پس منظر اور پنجاب میں اس کی پذیرائی

1۔ محمد ظفر اللہ خان، محولہ بالا، ص 312

2- *The Pakistan Times*, April 17, 1947

3- H. V. Hodson. *Op. cit.* pp. 246, 247, 275

4- *The Pakistan Times*, April 29, 1947

5- *Ibid.*, May 1, 1947

6- H. V. Hodson, *Op. cit.* p. 276

7- Ch. Mohammad Ali, *Op. cit.* pp. 147-48

8- Kamruddin Ahmad, *A Social History Of Bengal,* Progoti Publishers, Dacca 1967, Third Ed. 1970, p. 84

9- S. M. Ikram *Op. cit.* p. 301

10- Kamruddin Ahmad, *Op. cit.* pp. 82-83

11- S.M. Ikram, *Op. cit.* p. 301

12- *Ibid,* p. 303

13- Kamruddin Ahmad, *Op. cit.* p. 83

14- Ch. Mohammad Ali, *Op. cit.* p. 147

15- S. M. Ikram, *Op. cit.* p. 306

16- *Ibid,* p. 303

17- Kamruddin Ahmad, *Op. cit.* p. 84

18- M. A. H. Ispahani, *Quaid-i-Azam Jinnah As I Knew Him,* Forward Publication Trust, Karachi 1966, p. 216

19- S. M. Ikram, *Op. cit.* p. 300

20- *Ibid,* p. 302

21- *The Pakistan Times*, June 22 & July 4, 1947

22- *Ibid.*, October 7, 1948

23- Kamruddin Ahmad, *Op. cit.* pp. 85-86

24- A.S.M Abdur Rab, *A.K. Fazlul Haq,* Feroze Sons, Lahore 1966, pp. 162-63

25- S.M. Ikram, *Op. cit.* pp. 307-08

26- Ch. Kahliquzzaman, *Op. cit.* p. 399

27- Ch. Muhammad Ali, *Op. cit.* p. 241

28- *The Pakistan Times*, November 11, 1947

29- *Ibid.*, November 11, 1947

30- *Ibid.*, November 28, 1947

31- *Ibid.*, November 16, 1947

32- *Ibid.*, December 25, 1947

33- *Ibid.*, March 7, 1947

34- Gazette Of Pakistan, May 28, 1948, pp. 267-68

35- Ch. Mohammad Ali, *Op. cit.* p.365

36- *The Pakistan Times*, July 10, 1948

37- *Ibid.*, October 21, 1948

38- *Ibid.*, April 10, 1949

39۔ محمد یامین خان۔ محولہ بالا، ص1485

40- *Dawn*, December 30, 1949

41- *The Pakistan Times*, February 7, 1950

42۔ روزنامہ امروز، لاہور 8/فروری 1950ء

43۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 2/اپریل 1950ء

44۔ ''ترجمانِ مسلم لیگ'' لاہور 31/مارچ 1950ء

45۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 13/اپریل 1950ء

46۔ ایضاً 16/اپریل 1950ء

47۔ ایضاً 30راپریل1950ء

48۔ ایضاً یکم مئی1950ء

49۔ ایضاً 2رجون1950ء

50۔ ایضاً 21رجولائی1950ء

51۔ ایضاً 23رجولائی1950ء

52۔ ایضاً 27رجولائی1950ء

53۔ ایضاً 31رجولائی1950ء

54۔ ایضاً 23راگست1950ء

باب: 11 چودھری خلیق الزماں کا سیاسی پس منظر اور پنجاب میں اس کی مخالفت

1- Ch. Khaliquzzaman, *Op. cit.* p. 131

2- *Ibid,* p. 181

3- *Ibid,* pp. 350-51

4- *Ibid,* p. 400

5- *Ibid,* p. 413

6- *The Pakistan Times*, November 4, 1947

7- Ch. Kahliquzzaman, *Op. cit.* p. 180

8۔ محمد یامین خان محولہ بالا، ص 12

9۔ ایضاً۔ ص 393

10۔ ایضاً۔ ص 615, 614 اور 616

11۔ ایضاً۔ ص 639, 638

12۔ ایضاً۔ ص 673, 672

13۔ ایضاً۔ ص 677, 676

14۔ ایضاً۔ ص 781, 780

15۔ محمد یامین خان محولہ بالا، ص 968

16۔ ایضاً۔ ص 1336, 1335

17۔ ایضاً۔ ص 1348

18۔ ایضاً۔ ص 1377

19۔ ایضاً۔ ص 1394, 1393

20۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی، محولہ بالا۔ ص 404 ,403

21- *The Statesman*, February 9, 1959

22- Khaid Bin Saeed, *Op. cit.* p. 84

23- Ch. Khaliquzzaman, *Op. cit.* p.418

24۔ عاشق حسین بٹالوی، محولہ بالا۔ ص 408، 409

25۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ 5/اگست 1950ء

26۔ ایضاً۔ 6/ستمبر 1950ء

27۔ ایضاً۔ 13/اگست 1950ء

28۔ ایضاً۔ 17/اگست 1950ء

29۔ ایضاً۔ 15/اگست 1950ء

باب:12 پنجاب کے انتخابات میں دھاندلی اور لیاقت علی خان کا قتل

1۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔ 21/اگست 1950ء

2۔ ایضاً 7/ستمبر 1950ء

3۔ ایضاً 11/ستمبر 1950ء

4۔ ایضاً 12/ستمبر 1950ء

5۔ ایضاً 18/ستمبر 1950ء

6۔ ایضاً 21/ستمبر 1950ء

7- *Report Of the court Inquiry into Punjab Disturbances of 1953,* p. 15

8۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 24رجولائی 1950ء

9۔ ایضاً 29, 30رستمبر 1950ء

10۔ ایضاً 6راکتوبر 1950ء

11۔ ایضاً 9راکتوبر 1950ء

12۔ ایضاً 29رستمبر 1950ء

13- Ch. Muhammad Ali, *Op. cit.* p. 374

14۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 11راکتوبر 1950ء

15- Ch. Muhammad Ali, *Op. cit.* p.373

16۔ فارغ بخاری ''باچہ خاں'' نیا مکتبہ، پشاور۔1957ء ص 266

17- *Dawn*, October 9, 1950

18۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 9راکتوبر 1950ء

19۔ ایضاً 24راکتوبر 1950ء

20- *The Pakistan Times*, November 2 1950

21۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 15رنومبر 1950ء

22۔ ایضاً 20رنومبر 1950ء

23۔ ایضاً یکم دسمبر 1950ء

24۔ ایضاً 2ردسمبر 1950ء

25۔ ایضاً 13ردسمبر 1950ء

26۔ ایضاً 7رجنوری 1950ء

27۔ ایضاً 16رجنوری 1950ء

28۔ ایضاً 19رجنوری 1951ء

29۔ ایضاً 21رجنوری 1951ء

30۔ ایضاً 27رجنوری 1951ء

31۔ ایضاً 28رجنوری 1951ء

باب:13 پنجاب کے انتخابات میں دھاندلی اور لیاقت علی خان کا قتل

1۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 4راپریل 1950ء

2- *The Pakistan Times*, February 18, 1951

3۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور یکم اپریل 1951ء

4۔ روزنامہ جہاد، لاہور 28راپریل 1951ء

5۔ ایضاً 14رمئی 1951ء

6۔ ایضاً 18رمئی 1951ء

7۔ ایضاً 7رجون 1951ء

8۔ روزنامہ نوائے پاکستان، لاہور 18راکتوبر 1951ء

9۔ ایضاً 19راکتوبر 1951ء

10- *The Pakistan Times*, October 17, 1979

11۔ صدیق علی خان۔ محولہ بالا، ص 502 تا 515

12۔ مشتاق احمد وجدی، محولہ بالا، ص 179-178

13۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 25راگست 1983ء

14- Ch. Muhammad Ali, *The Task Before Us,* Research Society of Pakistan, University of Punjab, Lahore 1974, pp. 294-95

15۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 11راپریل 1952ء

16۔ روزنامہ نوائے وقت، لاہور 8اور 9رنومبر 1952ء

کتابیات

کتابیات

کُتب (اُردو)

1۔ اشتیاق حسین قریشی، برعظیم پاک وہند کی ملّت اسلامیہ، مترجم ہلال احمد زبیری۔ کراچی یونیورسٹی 1967ء

2۔ الٰہی بخش، کرنل ڈاکٹر، قائداعظم کے آخری ایّام۔مکتبہ المعارف۔ لاہور 1949ء

3۔ ثریا خورشید، فاطمہ جناح کے شب وروز۔شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور

4۔ صدیق علی خان، بے تیغ سپاہی، الائز بک کارپوریشن کراچی، طبع ثانی۔1971ء

5۔ عاشق حسین بٹالوی، ڈاکٹر۔اقبال کے آخری دوسال۔اقبال اکادمی کراچی 1961ء

6۔ فارغ بخاری، باچہ خان، نیا مکتبہ پشاور، 1957ء

7۔ فضل مقیم، میجر جنرل، تگ وتازِ جادوانہ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی، 1967ء

8۔ فیروز خان نون، چشم دید، فیروز سنز لاہور۔1974ء

9۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور باراوّل 1987ء بار ہفتم 1989ء

10۔ محمد ابراہیم خان۔سردار۔کشمیر کی جنگ آزادی۔کلاسیک لاہور 1966ء

11۔ محمد ظفراللہ خان۔تحدیثِ نعمت۔ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن ڈھاکہ 1971ء

12۔ محمد یامین خان۔نامۂ اعمال۔ (دوجلدوں میں) آئینہ ادب لاہور 1970ء

13۔ مختار مسعود، آوازِ دوست، النور لاہور 1973ء

14۔ مشتاق احمد وجدی، ہنگاموں میں زندگی۔فیروز سنز لاہور 1974ء

15۔ نوراحمد سید۔مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔لاہور 1966ء



1- Abdur Rab, A.S.M., *A.K. Fazlul Haq,* Feroze Sons, Lahore, 1966

2- Ahmad, kamruddin, *A social History of Bengal*, Progoti Publishers, Dacca, First Pub. 1967, Revised And Enlarged 1970.

3- Ahmad, Mushtaq, *Government And Politics of Pakistan*, Space Printers, Karachi 1970.

4- Azad, Abul Kalam, *India Wins Freedom*, Orient Longmans, Calcutta First Pub. 1959. Reprinted 1964.

5- Bolitho, Hector, *Jinnah, Creator of Pakistan*, Oxford University Press, Pakistan Branch, Karachi First Published in 1954. Reprinted 1969.

6- Callard, Keith, *Pakistan A Political Study*, george Allen & Unwrin London and Oxford University Press Karachi, First Pub. in 1957. Third Impression 1968.

7- Griffin, Lapel H. and Massy, Charles Francis, *Chiefs And Families of Note in the Punjab* (2 vols.) Civil And Military Gazette Press, Lahore 1990.

8- Hodson, H.V., *The Great Divide*, Britain - India - Pakistan, Hutchinson Of London, 1969.

9- Ikram, S.M., *Modern Muslim India And The Birth Of Pakistan*, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, First Ed. 1965, Second Revised Ed. 1970.

10- Isphahani, M.A.H., *Quaid-i-Azam Jinnah As I Knew Him*, Forward Publication Trust, Karachi 1966.

11- Jinnah, Fatima, *My Brother*, Quaid-i-Azam Academy Karachi 1987.

12- Johnson, Alan Compbell, *Mission With Mountbatten* Robert Hale London, 1951.

13- Khalid Bin Saeed, *Pakistan The formative Phase* 1857-1948, Oxford University Press London, Karachi & New York, First Pub. in Pakistan in 1960 Reprinted 1968.

14- Khaliquzzaman, Chaudhry, *Pathway To Pakistan*, Longmans, Lahore 1961.

15- Menon, V.P., The *Transfer Of Power In India*, Princeton University Press, New Jersey 1957.

16- Muhammad Ali, Chaudhri, *The Emergence Of Pakistan*, Frist Pub. by Columbia University Press New York & London 1967. Reprinted by Research Society of Pakistan, University of Punbab, Lahore 1973.

17- Qureshi, Ishtiaq Hussain, *The Struggel For Pakistan*, University Of Karachi, Karachi 1974.

18- Wavell, *Viceroy's Journal*, Edited by Penderal Moon, Oxford University Press, Karachi 1974.

شائع شدہ دستاویزات

1- *Constituent Assembly Debates* vol. III 1948.

2- *Gazette Of Pakistan*, May 28, 1948.

3- Jinnah, Quaid-i-Azam Mohammad Ali, *Speeches As Governor General Of Pakistan*, 1947-48, Pakistan Publications, Karachi.

4- Muhammad Ali, Chaudhri, *The Task Before Us, Selected speeches and writings*. Selected and Edited by Salahuddin Khan, Research Society of Pakistan, University of The Punjab Lahore, 1974.

5- *Report of the Court of Inquiry consituted under Punjab Act II of 1954 to Enquire into the Punjab Disturbances of 1953*. Printed by Superintendent, Government Printing, Punjab, Lahore 1954.

6- *The Transfer Of Power 1942-47* (12 Volumes) Editor-in-Chief: Nicholas Mansergh, Editor: Penderal Moon, Her Majesty's Stationery Office London, Vol 10, 1981 and Vol. II, 1982.

اخبارات

1۔ روزنامہ امروز۔لاہور۔فائلیں 1947ء تا 1951ء

2۔ ترجمان مسلم لیگ۔ 31/مارچ 1950ء

3۔ روزنامہ جہاد۔فائلیں۔ 1951ء

4۔ دی پاکستان ٹائمز۔لاہور فائلیں 1947ء تا 1951ء

5۔ روزنامہ ڈان۔دہلی، کراچی۔ فائلیں 1947ء تا 1951ء

6۔ روزنامہ نوائے پاکستان۔ لاہور۔فائلیں 1951ء

7۔ روزنامہ نوائے وقت۔لاہور۔فائلیں 1947ء تا 1951ء

مسودات

1- Jinnah, Fatima, *My Brother (Manuscript)* in Quaid-i-Azam Papers, National Archives Islamabad.

مضامین

Pirzada, Sharifuddin, *The Last Days of The Quaid-i-Azam."* The Pakistan Times, Lahore October 17, 1979.



ق

ک

گ

و